# THE MOHAQQIQ

**BAHAWALPUR**

**a High Class Literary Monthly.**

# محقق

## بہاولپور

ادارۂ تحریر

ڈاکٹر۔ خواجہ شجاع منعمی

ایڈیٹر ۔ رازی عرفانی — مہتمم شعبۂ نسواں ۔ بیگم ح۔ش۔ رفعت دہلوی بی۔اے

نگران عربیات ۔ مولوی حافظ عبدالرحمٰن علامہ مولوی فاضل

نگران سنسکرتات ۔ پنڈت مدن سنگھ شاستری۔ ودیا بھاسکر

# تحقیق کا علمی - ادبی - صنعتی وغیرہ

ماہوار رسالہ

# محقق

## فروری ۱۹۳۷ء

## ادارۂ تحریر


ڈائرکٹر - خواجہ شجاع منعمی - ایم - اے - (علیگ) ایم - ایس - سی - ایم - اے (پنجاب) پروفیسر

ایڈیٹر - رازی - عرفانی          مہتمم شعبۂ نسواں بیگم - ح - ش - رفعت دہلوی - بی - اے

نگراں عربیات - مولوی حافظ عبدالرحمٰن علامہ مولوی - فاضل

نگراں سنسکرتات - پنڈت مدن سنگھ شاستری - ودیا بھاسکر

مذاکرہ علمیہ پروفیسر ایم - ایف - قریشی - ایم - ایس - سی - افسانہ اس حزیں بہاولپور



مقام اشاعت - دفتر رسالہ محقق بہاولپور          سالانہ چندہ تین روپے (سے ر)

(قیمت فی پرچہ چار آنہ)

# فہرست مضامین

جلد ۱ | رسالہ محقق | بابت ماہ فروری ۱۹۳۶ء | نمبر ۲



۲۱ …عو کے متعلق آراء ۵

# شذرات

"محقق" کے ادارۂ تحریر میں اضافہ ہوا ہے۔ میرے لئے یہ امر باعثِ طمانیت ہے۔ اور آپ کے لئے فخر و انبساط کا سبب ہوگا۔ لاہور کے فاضل پروفیسر ایم۔ ایف۔ قریشی صاحب۔ ایم۔ ایس۔ سی۔ مذاکرۂ علمیہ کے ذمہ دار ہوئے ہیں۔ سائنس کے علاوہ آپ کا خاص تعلق۔ عربی۔ فارسی۔ سے ہے۔ اس لئے وہ سائنس کی اختراعات اور ایجادات کو اردو میں جامہ پہنانیکا خاص ملکہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے اس بات کا وعدہ کیا ہے۔ کہ "محقق" کے لئے مذاکرۂ علمیہ لکھا کریں گے۔

بعض دماغ دنیا میں وارد ہونیکے بعد بہت دیر میں پختہ ہوتے ہیں اور بعض تکمیل کو بہت جلد پہنچ جاتے ہیں۔ بہت سے پھل ایک درخت پر لگتے ہیں۔ جن کا رُخ سُورج کیطرف ہوتا ہے۔ سُرخی سے تُدو تُر سرخرو ہو جاتے ہیں۔

علامہ اقبال لاہوری اما ن اللہ خاں کو کہتے ہیں۔

اے امیرِ کامگار اے شہریار　　　نوجوان و مثلِ پیراں پختہ کار

دماغی پختگی کا اندازہ ظاہری صورت سے محال ہے۔ مگر خُدا کو شکل سے نہیں دیکھا۔ اُس کی صفات سے پہچانا ہے میرے عزیز شاگرد امین حزیں شاعر بھی ہیں اور مضمون نگار بھی وہ تیار ہیں اور میں نُورِ علم کا متلاشی "محقق" کا افسانہ کا حصہ ان کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ ترتیب تنظیم اصلاح کے وہ ذمہ دار ٹھیرائے گئے ہیں۔ اِن کا ایک افسانہ "کشمکش حیات" اِس نمبر میں نکل رہا ہے۔ مجھے امید واثق ہے کہ وہ اِس ذمہ داری کے اہل ثابت ہوں گے بلکہ اِس سے بدرجہا بڑھکر۔

میرے ایک اور عزیز شاگرد عبد العزیز ہیں۔ جو ابھی ایم۔ ایس۔ سی کر کے آئے ہیں۔ انہوں نے اِس بات کا ذمہ لیا ہے۔ کہ سائنس کے متعلق اردو میں مضامین لکھا کریں گے۔ امید ہے کہ وہ اِس کام کے لئے وقت نکال لیں گے۔ اور یہ فرض ان کے لئے بہت دلچسپ ثابت ہوگا۔

ڈائرکٹر

## تصویر

گذشتہ مہینے کے محقق میں ایک تصویر شائع ہوئی تھی۔ "عہد قدیم میں ہندوں کا ایک قافلہ" یہ تصویر جناب محمد حسین صاحب قادری وائس پرنسپل میو سکول و آرٹ کا ایک شاہکار ہے۔

اِس مہینے جو تصویر شائع کیجا رہی ہے وہ ملک کے مشہور ماہرِ فن جناب عبد الرحمٰن چغتائی صاحب کی مرہونِ منت ہے نغمۂ حیات گویا گایا جا رہا ہے جو ہر ہر چیز کے رگ و پے سے ہویدا ہے۔ اور سننے والا اِس وجد آفرین لے میں مست۔

# بزمِ جہاں

محقق کا مادہ حق ہے یعنی وہ جڑ جس کے درخت میں یہ پھل لگا ہے۔ یا وہ اصل جس سے اس لفظ کا استخراج کیا گیا ہو "حق" ہے۔ حق کے معنے ہوئے سچ اور لائق۔ اس طرح سے راست و درست "ٹھیک" کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور اس کے ساتھ سزاوار و واجب کے مفہوم میں۔ پھر حق کے ایک اور معنی بھی ہیں یعنی "خدا" یا یوں کہو کہ اسمائے الٰہی میں سے یہ بھی ایک ہے۔ عربی میں تو حق۔ شد کیساتھ مرقوم ہوتا ہے۔ مگر فارسی میں بلاتشدید کے مستعمل ہے۔ اسلئے حقا کے معنی ہوئے درست ہے۔ سچ ہے قسم ہے خدا کی۔
حقانی وہ شخص ہوا جو خدا کی محبت میں مشغول رہے۔ حقانیت خدا کا ذکر اور سچائی و دستی حقوق بھی حق کی جمع ہے۔ مگر یہ ان معنوں میں مروج ہیں۔ جیسے ہم کہیں کہ یہ اسی کا حق ہے حق پرست ہوا۔ سچا اور تابع حق۔ "حق گو" سچ بولنے والا۔
محقق "تحاق" کرہ کیساتھ ہے یعنی تحقیق کرنیوالا۔ اگر ق پر فتح دیجائے تو محقق تو اس کے معنے تحقیق کیا گیا ہو جاتا ہے۔ پیشِ نظر لفظ محقق کے معنی اور بھی ہیں۔ وہ جو بات دلیل کیساتھ ثابت کرے آپ کو یہ تو معلوم ہے کہ صوفیا کے ہاں اپنی اصطلاحات ہیں۔ تصوف میں محقق اس شخص کو کہتے ہیں جس پر اشیاء کی حقیقت کما ینبغی منکشف ہو چکی ہو۔ دلیل و حجت سے وہ اس رتبہ پر پہنچا ہو۔ اور پھر اس سے آگے کشفِ الٰہی تک پہنچ گیا ہو۔ اس نے عین الیقان سے مشاہدہ کر لیا ہو کہ تمام کائنات کی حقیقت صرف ایک ہی یعنی حق۔ واحدِ مطلق کے ہی سب ظہور ہیں۔ اور اس کے سوا کچھ بھی موجود نہیں۔ مختلف اشیاء کی شکل و شباہت کی تخصیص محض اضافی ہے۔ تاکہ ان کی تفریق کیجا سکے۔ ان کے نام رکھے جا سکیں اور انہیں تمیز کرنے سے دنیا کا کاروبار چل سکے۔

تو کیا آپ نہیں سمجھتے کہ محقق کا نام اپنے استقاق اصل اور استعمال کے لحاظ سے بہت ارفع و احاطہ کن ہے۔ جس غرض کے لئے یہ وارد ہوا ہے ان خوبیوں کا مظہر اس کا علم ہے۔

بزمِ احباب میں ایک بزرگ ہیں۔ حسن اتفاق ہے کہ انکی نام کی زینت بھی اسی محقق کے مادہ سے ہے۔ جب عرض کیگئی کہ آپکا نام محقق کے خریداروں کی فہرست میں ہونا چاہئے تو فرمایا ؎

یہ تو میں کیونکر کہوں تیرے خریداروں میں ہوں
تو سراپا ناز ہے میں ناز برداروں میں ہوں

میرا نام محقق کے ناز برداروں میں رکھ لیجیگا۔ کیا شاعری فرمائی ہے۔ مزاج میں شعر ہے۔ زبان سے بھی اکثر تغزل اور سخن کا اظہار ہوتا ہے۔ امید ہے کہ آپ اپنے تازہ کلام سے ہمیں مشکور فرمائیں گے۔

بات تو ٹھیک کہہ دی آج سے ہم نے خریداروں کی فہرست کیساتھ "محقق" کے ناز برداروں کی ایک فہرست بھی مرتب کرنی شروع کر دی ہے۔ جو احباب نام لکھوانا چاہیں وہ مہلت سے کام لیں۔ تاکہ تمام جگہیں اس سے قبل پُر نہ ہو جائیں۔

# ابن خلدون کا فلسفۂ تاریخ

(گذشتہ سے پیوستہ)

اس کا یہ عقیدہ ہے کہ کسی ملک کی ہوا درجۂ حرارت زمین کی کیفیت نباتات وغیرہ کا وہاں کے باشندوں پر بہت اثر ہوتا ہے جسمانی، دماغی روحانی اور اخلاقی کیفیتیں سب اس کے زیر اثر ہوتی ہیں۔ وسط افریقہ کے حبشی کی سیاہ جلد کو ہی صرف اس ملک کی گرم آب و ہوا کا سبب نہیں بتاتا۔ بلکہ وہاں کے باشندوں کے مزاجی حالات اور طرزِ رہائش کو بھی آب و ہوا کا اثر بتاتا ہے۔ اس نے ایک نہایت کامیاب کوشش کی ہے کہ اس بات کا ثبوت پیش کرے کہ کسی ملک کی زمین زرخیزی پر وہاں کے باشندوں کی جسمانی حالت کا کسقدر انحصار ہے۔ قحط یا فراوانی کا وہاں کی سماجی حالت پر بہت بڑا اثر ہوتا ہے۔ اس کا یہ خیال ہے کہ خوراک کی سادگی اور لذت سے اجتناب قوم کی زندگی پر بہت اچھا اثر پیدا کرتے ہیں۔ اس نے بنی نوع انسان کی صحتمندی اور عمدہ جسمانی حالت کا اندازہ تمام تر بادیہ نشین عربوں سے لگایا۔ اور انہی کی عملی زندگی سے حسن و قبح کا معیار قائم کیا ہے۔

اس باب کے آخر میں اس نے نبوت پر بھی بحث کی ہے یہ بتاتا ہے کہ بعض ہستیاں خدائے پاک کی بہت محبوب ہوتی ہیں۔ ان پر خدا کی رحمت نازل کیجاتی ہے۔ اور وہ دنیا میں اس غرض سے نازل ہوتی ہیں۔ کہ عوام کو آگہی ان پس پردہ حالات سے کریں۔ جو مخلوق کے ادراک سے باہر ہیں۔ عالمِ بالا کے معاملات سے وہ خاکی ارض کے ساکنین کو آگاہ کرتے ہیں۔ اس باب میں بہت سی دلچسپ اور مفید مطلب باتیں درج ہیں۔ تمدن کے قیام کے لئے مذہب کا ہونا ضروری ہے اور پیغمبر مذہب کا رہنما ہے۔ صرف نبوت کیواسطے سے ہی انسان مذہبی اور دینی امور کے متعلق صحیح واقفیت پیدا کرسکتا ہے۔

مقدمے کے دوسرے باب میں صحرا کے رہنے والوں اور نیم تہذیب یافتہ اقوام کے تمدن کے متعلق بحث ہے۔ اس باب میں ابن خلدون اپنے پورے جلال میں نظر آتا ہے۔ چونکہ اسکے متعلق اس کا علم وسیع۔ اور تجربہ بسیط ہے۔ ابتدا اس بیان سے کرتا ہے۔ کہ دنیا کی اقوام کی مختلف رسمیں اور عادتیں کسطرح سے اس امر پر منحصر ہیں۔ کہ قوتِ لایموت وہ کن ذرائع سے حاصل کرتی ہیں۔ ابتدا میں بہت سادہ غذا اور چند ضروریات کے ہوتے ہوئے لوگوں کو اطمینانِ قلب حاصل تھا۔ اس بعد شائستگی پیدا ہوئی عیش و عشرت بڑھا اور یہ دونوں باتیں ارتقاء کی کئی منزلیں طے کرنیکے بعد موجودہ عہد تک پہنچیں ازمنۂ قدیم کے تمام مراحل طے کرنے میں قدرتی ماحول اور تمدن کی مطابقت قائم رہی۔ گرد و نواح اور فطرت کی پیدا کردہ مقامی قوتوں نے تمدن کو ڈھالنے میں مقتدر حصہ لیا۔ بلکہ یہ کہ اسی قالب میں تمدن نشوونما پاسکا۔ پھر ابن خلدون یہ بتاتا ہے کہ اس معیار کے مطابق

عربی نسل کے حالات بالکل قدرتی ہیں۔

وہ دیہاتی اور شہری زندگی کے درمیان تفریق اور تعلق کا بیان کرتا ہے اور دیہات کو شہر پر ترجیح دیتا ہے۔ اس کا نظریہ یہ ہے کہ تمدن کا گہوارہ بڑے بڑے شہروں سے دور کھلی ہوا اور دیہات میں واقع ہوتا ہے۔ گاؤں کے بل بوتے پر شہر زندہ رہتے ہیں چونکہ یہیں سے ان کو آباد کرنے والے انسان آتے ہیں اور خور و نوش کے ضروریات زیادہ تر وہی کفیل ہوتے ہیں۔ اگرچہ گفتار اور طرز بود و ماند کے لحاظ سے وہ کچھ زیادہ سخت اور غیر مہذب معلوم دیں۔ اور لباس کے لحاظ سے گندہ ناتراش مگر ان کا جنسی اخلاق شہر کے رہنے والوں کی نسبت بہت بہتر ہوتا ہے۔ اس پر ابن خلدون بہت مصر ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہ وہ زیادہ شیر دل اور باہمت ہوتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انہیں ہر کام خود اعتمادی سے کرنا پڑتا ہے۔ اور اپنی ضمیر کے احکام کے مطابق وہ اپنے قول و فعل کو ڈھال سکتے ہیں

یہ ظاہر بات ہے کہ جہاں پر کوئی بیرونی قانونی حکم ان کی عادت کو کسی سانچے میں ڈھالنے کیلئے موجود ہو۔ تو ایسے افراد کے اندر سے ہمت جسارت اور خود اعتمادی مفقود ہو جاتی ہے

صحرا کے رہنے والوں کی نسبت وہ مفصل بحث کرتا ہے صحرائی قبیلوں کے ہر فرد میں اپنی قوم کی محبت اور برادرانہ جوش موجود ہونا چاہیئے۔ یہ امنگ جوش و خروش کیساتھ صرف انہی رگوں میں پائی جاتی ہے۔ جن میں خون کا رشتہ یا اس کے مترادف کوئی تعلق ہو۔ نسب اور نسل کا خالص ہونا صرف صحرائی میں ممکن ہے یا نیم وحشی اقوام میں۔ ایسی اقوام میں حکومت کی باگ ہمیشہ ایک خاندان میں رہنی چاہیئے۔ جو کہ اس قبیلے کا سب سے بڑا گھرانہ ہو اگر یہ کسی غیر کے ہاتھوں میں چلی جائے تو تباہ کن ثابت ہو گی۔

یہ صرف ان گھرانوں میں ممکن ہے جو کہ آپس میں محبت و خلوص کے تعلقات رکھتے ہوں۔ ضروری ہے کہ وہ اتحاد پیدا کریں جس سے سرداری اور ریاست ممکن ہو سکے۔ اگر یہ نہ ہو تو پھر سرداری صرف نام کی باقی رہ جاتی ہے۔

شہر کے رہنے والوں میں کوئی گھرانے ایسے نہیں ہوتے جو صحیح معنی میں سردار اور نجیب کہلانے کے مستحق ہوں۔ اگرچہ ان کے اخلاق بلند ہوں۔ وہ با رسوخ ہوں۔ اور دنیا ان کی عزت کرتی ہو۔ ایک خاندان اس وجہ سے نجیب نہیں ہوتا کہ اس کے بزرگ نجیب تھے۔ بلکہ اس وجہ سے کہ اس میں نجابت کی روح اور خواہش موجود ہے۔ یہودی دنیا کے بہترین خاندان کے فرد ہیں۔ ان کے بزرگ بہت شاندار تھے۔ لیکن اب یہودیوں میں کہیں خاندانی نجابت موجود نہیں۔ ایک خاندان میں نجابت چار نسلوں سے زائد بہت کم قائم رہتی ہے۔ بہت شاذ و نادر کسی خاندان کے لئے یہ ممکن ہو سکا کہ وہ چھ نسلوں تک اپنی نجابت کو قائم رکھ سکیں۔ صرف وہی ہستیاں حقیقتاً عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لینے کے قابل ہیں۔ جو اپنے آپ کو نجیب خصلتوں اعلٰے خصوصیتوں اور مرفع کارناموں سے امتیاز کر لیتی ہیں۔

اس کے بعد ابن خلدون اس بات کے ثابت کرنے کی طرف بڑھتا ہے۔ کہ نیم وحشی اقوام وسیع فتوحات کرنے کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ ان میں قبیلہ پرستی کے جذبات بہت قوی ہوں۔ ان کا نصب العین ایک ہو اور خیالات مشترکہ۔ مخرب الاخلاق عادتوں اور جنسی بدعتوں سے انہوں نے اپنے آپ کو بگاڑا نہ ہو۔ نہ ہی غلامی اور رذالت سے ان کی ضمیر مردہ ہوئی ہو۔ وہ اپنے اس نظریہ کا بہترین ثبوت عربوں کی تاریخ سے پیش کرتا ہے۔ خاص طور پر جبکہ انہوں نے

رسولِ عربی اور خلفائے راشدین کے بعد میں بہت قلیل عرصہ میں دنیا کے وسیع حصہ کو زیر نگیں کر لیا تھا۔ اس کے ساتھ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ عرب میدان کے رہنے والوں پر اپنا سکہ جما سکے۔ مگر پہاڑی ممالک مثلاً بلستان وغیرہ ان سے فتح نہ ہو سکے۔ وہ اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ عربوں میں کیا نقائص اور سقم ہیں۔ وہ یوں طور پر لکھتا ہے کہ جس ملک میں عرب وارد ہوئے فتح کرنے کے بعد بہت جلد ہی انہوں نے اسے برباد کر دیا۔ چونکہ یہ بات بہت دلچسپ اور معنی خیز ہے۔ اسلئے یہ جائز معلوم ہوتا ہے کہ اس میں سے کچھ حصہ ابنِ خلدون کے ہی الفاظ میں پیش کیا جائے۔ وہ لکھتا ہے۔ بادہ نشین زندگی کی عادات وخصائل نے عربوں کو ایک اجڈ اور وحشی قوم بنا دیا۔ اخلاق میں سختی ان کی فطرت بن گئی۔ بلکہ یہ کہ اس سے انہیں روحانی تسلی حاصل ہوتی ہے۔ چونکہ اس کے سبب سے آزادی کا راستہ کھلتا ہے۔ ایک مقام سے دوسرے مقام میں منتقل ہونا صحرا کا سفر کرنا۔ بہت قدیم زمانے سے ان کا پیشہ ہے۔ لیکن خانہ بدوش زندگی تمدن کی ترقی کے لئے اتنی ہی غیر مفید ہے جتنی کہ ایک مقام پر رہنے کی زندگی اس کے لئے معاون ہے۔ اگر عربوں کو کہیں سے اپنے چولہے بنانے کے لئے پتھر مل سکیں تو وہ ان کو حاصل کرنے کے لئے ایک عالیشان عمارت کو بھی گرانے سے گریز نہیں کریں گے۔ اگر انہیں اپنے خیموں کے کھمبے بنانے کے لئے لکڑی کی ضرورت ہو تو وہ اس کے حصول کے لئے ایک عالیشان عمارت کی چھت گرا دیں گے۔ ان کی زندگی کی طرز ہی ایسی ہے کہ عمارت بنانے کے مخالف ہیں۔ مگر تمدن کا پہلا قدم یہ ہے کہ عمارت بنائی جائیں۔ پھر یہ کہ وہ فطری طور پر زور سے کسی کا مال حاصل کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ اور دولت مسلح ہاتھوں سے حاصل کرتے ہیں۔ جب غارت کے لئے جاتے ہیں تو توازن اور پیمانہ رزق کا خیال نہیں رکھتے۔ جب کبھی ان کی آنکھیں کسی عمدہ ریوڑ یا آرائش خانہ کے سامان یا مفید مطلب چیز پر پڑتی ہیں تو وہ اگر ممکن ہو سکے اسے بزور لیجاتے ہیں۔ جب وہ ایک ملک کو فتح کرتے ہیں۔ یا ایک خاندان حکومت کی بنیاد رکھتا ہے تو وہ تخت گیری پر تُل جاتا ہے۔ اپنے طمع کو پورا کرنے کے لئے وہ ان تمام قوانین کو حقارت سے دیکھتا ہے۔ جو کہ املاک اور دولت کی حفاظت کے لئے بنائے گئے تھے۔ اُن کے ماتحت ہر چیز تباہ ہو جاتی ہے۔ صناعوں اور تاجروں پر ناجائز بوجھ ڈال دیتے ہیں مگر اس تکلیف کو رفع کرنے کے لئے آسائشیں پیدا نہیں کرتے ہیں۔ حالانکہ تجارت اور صنعت میں اضافہ ہونے سے ثروت بڑھتی ہے۔ اگر صناعوں کے ہاتھ جکڑ دئے جائیں تو ان کو کچھ فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ اور منافعہ کی توقع نہیں رہتی۔ وہ کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں سماجی تنظیم بگڑ جاتی ہے۔ اور تمدن رو بہ تنزل ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ عرب سلطنت کے کاروبار میں لاپرواہی برتتے ہیں۔ وہ جرائم کے انسداد میں نہ کوشش کرتے ہیں اور نہ پبلک کی حفاظت میں۔ انکی توجہ صرف ایک کام کیطرف ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ اپنی رعایا سے روپیہ حاصل کریں سختی سے یا ظلم سے۔ اگر وہ اس کام میں کامیاب ہو جائیں تو انہیں اور کوئی تشویش باقی نہیں رہتی ان کے خیالات سلطنت کے کاروبار میں نہیں لگتے۔ نہ ہی رعایا کی بہبودی میں اور نہ بدمعاشوں کی روک وتھام میں۔ ان کو ایک قدیم دستور کے مطابق وہ بدنی سزاؤں کے عوض میں جرمانہ کی سزائیں دیتے ہیں۔ تاکہ آمدنی بڑھے۔ وغیرہ وغیرہ

باقی آئندہ (ڈائرکٹر)

# بحضور شاہ

## بتقریب عید سعید

بخدمت عالیجناب میجر ڈاکٹر ہز ہائینس رکن الدولہ۔ نصرت جنگ۔ سیف الدولہ۔ حافظ الملک۔ مخلص الدولہ۔ معین الدولہ نواب حاجی سر صادق محمد خان صاحب بہادر۔ خامس عباسی۔ ایل۔ ایل۔ ڈی۔ جی۔ سی۔ آئی۔ ای۔ کے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ کے۔ سی۔ وی۔ او۔ فرمانروائے ریاست بہاولپور دام اقبالہٗ وملکہٗ

(از جناب پروفیسر حاجی احمد صاحب)

| | |
|---|---|
| حبذا این روزگار و مرحبا بخت جوان | گلستان علم و فن گشتہ بہر سو گلفشان |
| گلبن امید ما از دیرگاہ افسردہ بود | ابر را بینم گہربار آمدہ بر گلستان |
| کاخہائے علم و فن آراستہ شد ہر سو | بہرہ ور گشتہ ازاں صدہا ہزار طالبان |
| اینکہ مے بینی بہا و زیب و شان فرہی | این ہمہ از فیض جود مفخر عباسیان |
| حضرت صادق محمد خان کہ نام نامیش | بر فلک ہردم ملائک را شدہ ورد زبان |
| منبع جود و سخا و معدن عدل و کرم | صاحب صدق و وفا و معدلتش نوشیروان |
| رافع اسلام علم و قامع آثار جہل | نگہبان شد ملک را و بہر ملت پاسبان |
| آبیاری علم را شد خاصۂ عباسیان[1] | خوب دانی در تواریخ آمدہ صد داستان |
| حاجیا از مدح صادق کلک تو بس قاصر است | ہان کشا دست دعا از صدق دل بر آسمان |
| صبح صادق تا بود تنویر عالم را سبب | آفتاب جود صادق نور پاشد در جہان |
| ملک او شاداب بادا و دولتش سرسبز باد | آب[2] افزودہ رعیت را ز نہر جاودان |

[1] زمان شہرت پر خلفائے عباسیہ کی علم پروری روز روشن سے زیادہ روشن ہے۔

[2] نہر مستقل کیطرف اشارہ ہے۔ جس سے رعیت نہال اور ملک مالا مال ہو گیا ہے۔

# افسانہ

# کشمکش حیات

جناب امین حزیں صاحب

بعض اوقات اس کا تخیل اس کا وسیع پریشانیوں میں گم ہو جاتا۔ وہ اپنے لئے حال یا مستقبل کی دنیا میں کوئی جگہ حاصل کرنے کے متعلق کچھ بھی نہ سوچ سکتا۔ بعض اوقات وہ دنیا کی حدوں کو اپنے اوپر تنگ سمجھ کر اپنی مجروح اور مایوس زندگی کو ختم کر دینے ہی میں نجات سمجھتا۔ لیکن پھر اُسے اپنی بوڑھی ماں کا خیال آتا۔ جس کا اس وسیع دنیا میں کوئی پرسانِ حال نہیں۔

وہ اس تصور ہی سے لرز اُٹھتا... جبکہ اس کی ماں۔ پیاری ماں — دنیا کے ہوس پرست اور گنہگار انسانوں کے دروازوں پر ٹھوکریں کھاتی ہو گی۔؟ نامرادیوں اور ناکامیوں سے روشناس ہو کر بڑھاپے کی کٹھن منزلیں طے کرتی ہوئی نظر آئے گی۔ آہ! اگر وہ کسی کے سامنے دستِ سوال بھی دراز کرے گی تو اس وسیع آسمان کی رحمتیں بھی مجبور ہوں گی...

آج بھی وہ اسی ہیجان آمیز کشمکش میں مبتلا تھا۔ اس کی بوڑھی ماں اس کے سامنے ایک بوسیدہ چٹائی پر بیٹھی ہوئی زمانہ کی سختیوں اور تقدیر کی نافرمانیوں کا ماتم کر رہی تھی۔ اسکے بوڑھے چہرے کی جھریوں میں آنسو لرز رہے تھے۔۔۔ اس نے بارھویں جماعت تک اپنے اس اکلوتے بچے کو اپنی بوڑھی ہڈیوں کی محنت اور کاوش سے پڑھایا تھا، شاید ایک دن ترقی کے ابتدائی مدارج طے کر کے، اس کے آخری ایام میں ایک سہارا ثابت ہو! شاید تقدیر اس پر مہربان ہو کر اس کی غریب امیدوں کو بار آور کرے۔ یا شاید بیٹے کی کامیابی اس کی کمزور ہڈیوں کو محنت سے نجات دلا دے۔ مگر آہ! آج اس کی تمام امیدوں پر پانی پھر چکا تھا۔ اسلم باوجود اپنی تمام کوششوں اور قابلیت کے ایف۔ اے میں فیل ہو چکا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اب وہ اس کی تعلیم جاری رکھنے سے قطعاً قاصر تھی۔

"بیٹا!" بڑھیا ایک مجروح آواز میں بولی "دنیا کے سمندر میں — جس میں حادثات کے بڑے بڑے طوفان آتے ہیں۔ تباہی اور بربادی کی خوفناک لہریں اُٹھتی ہیں — بغیر کسی خدا کی امداد یا بچاؤ کے کودنا، ایک خطرناک غلطی ہے۔ کمزور حال کی بنیادوں پر اپنی شاندار ماضی کی طرح، مستقبل کی تعمیر ایک محض لغزش ہے! زمانہ واقعی بلند عظمت کا متمنی ہے، لیکن یہ ناکام اور مایوس انسانوں پر سوائے طعن اور استہزا کے اور کوئی ہمدردی نہیں رکھتا، اس لیے ایک انسان کو کسی اہم مقصد کے لئے اتنے ہی اہم اہتمام کرنے پڑتے ہیں۔ — دنیا میں ایک آوارہ گرد کی زندگی لاحاصل ہے آؤ! ہم اکٹھے زندگی کی حدوں کو عبور کریں۔ شاندار مستقبل نہ سہی پرسکون حال ہی سہی۔۔۔ میری زندگی اب تھک چکی ہے۔۔۔۔

بیٹا!" بڑھیا کی آواز میں ایک قسم کی کشش تھی۔ "میری درماندہ ہڈیوں کو زمانے کی آگ میں مت پھینکو!۔۔۔ آؤ! ایک واقف کی طرح اس جھونپڑی کے سکوں میں دنیا کی لایعنی اور بے سود جنگ

کا مطالعہ کرو۔۔ ۔۔ں! یہی زندگی ہے! اور اس کا نور تمہاری آنکھوں کو نظاروں سے بے نیاز کر دیگا۔۔۔!

امی جب تک آرزوؤں اور کارناموں سے دنیا روشن ہے، ایک نوجوان کو اس کی منزل ہستی سے باز رکھنا اسے خودکشی پر آمادہ کرنا ہے۔ حملہ کا بہترین وقت وہی ہے۔ جبکہ روح میں غیر معمولی جوش ہو۔ میری زندگی میں اب حیات سرگرنگی طاقت ہے۔ جب یہ اس تگ و دو سے تھک جائیگی، میں خود بخود اس جھونپڑی کی تنہائی اور سکون پر قانع ہوں گا۔" نوجوان کی نگاہوں سے آگ ابل رہی تھی اور اس کی آواز تیز خوش آہنگ تھی میرے دل میں ایک آگ ہے، خصوصاً اس امتحان کی ناکامی نے مجھ میں ایک غیر معمولی جوش اور ہمت پیدا کر دی۔۔ تقدیر، آہ! اگر یہ انسانوں کی امیدوں کے خلاف بھی ہو تو اُسے ظالم نہیں کہنا چاہیئے۔۔۔ دنیا کے سرد و گرم کا مزا چکھنا ہی زندگی ہے ۔۔ میں ان سست رفتار انسانوں میں سے نہیں ہوں جو دنیا کی راہ میں ایک بارِ گراں ہیں۔ میں نے زندگی کو ایک تباہ کن جنگ نہ سہی، ایک بے سُود تماشا اور کھیل بھی نہیں سمجھا ہے۔

بھولے امجد!۔۔ بڑھیا نے پُر درد آواز میں مسکراتے ہوئے کہا تمہارا معصوم دماغ سمجھتا ہے کہ دُنیا اس فرسودہ جھونپڑی کے سکون سے زیادہ راحت دے سکتی ہے؟۔۔۔ ٹھہرو اور سوچو کہ آجتک تمہاری تمام کاوشیں محض امیدوں اور آرزوؤں کی بنیادوں پر تھیں۔۔۔ آہ جبتک انسان آرزوؤں سے آشنا ہے۔ اس کی خوشی ہمیشہ مصیبت کے ہمراہ رہتی ہے۔۔"۔۔۔

امجد نے ایک گہرا سانس لیا۔

اور ایک بڑھیا کے نزدیک سوائے خاموشی، تنہائی اور دل کے سکون کے اور زندگی میں کیا دھرا ہے۔؟ وہ حال میں رہتی ہے مگر مستقبل کی تیز روشنی میں جب فرشتے آسمانوں سے اترتے ہیں۔ وہ سوائے دوسری غیر مادی دنیا کے خیال کے اور کسی چیز میں دلچسپی نہیں لیتی،۔۔۔ زمین پر اس کا جسم ہوتا ہے مگر آسمانوں پر اس کی روح۔۔"

امی!" امجد نے ایک پُر جوش آواز میں کہا "دنیا ہزار بے مروت اور خود غرض سہی مگر میں دُنیا کی ان نازبائیوں پر اپنی زندگی کی منزلیں طے کرنیکے بعد سوچنا چاہتا ہوں۔ تمہیں سکون اور خاموشی پسند ہے کیونکہ تمہاری ہڈیاں مزید کشمکش کی متحمل نہیں۔۔۔ وہ اس لکڑی سے انتہا ہے جو سوکھی ہونیکے بعد آگ پر ڈالدیجاتی ہے۔۔۔۔ افسوس اس دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتا ہے۔ جو اپنی پوری جوانی اور رعنائی کے وقت دنیا کی رنگینیوں سے محروم کر دیا جاتا ہے۔" اس کی آواز میں کچھ غصہ اور کچھ رنج کا اظہار ہونے لگا۔ "مانا کہ تمام دنیا کی فتح فانی انسان کی طاقت سے باہر ہے۔ لیکن اپنی اب طاقت تک اس کشمکش حیات اور تگ و دو میں حصہ لینا اور کامیابی حاصل کرنا" ایک نہایت اہم فرض ہے۔۔۔ اور یہی فرض انسان کی تخلیق کا موجب ہے۔" بڑھیا مسکرانے لگی۔ "جیسے اس کے بیٹے کی تقریر معصومیت کی غلط فہمیوں پر محمول ہے۔" تم سمجھتی ہو کہ میں امتحان میں فیل ہو جانیسے دنیا کے تمام رستوں کو اپنے اوپر مسدود سمجھ لوں بلکہ میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے میری زندگی کے اہم ترین حصہ کو، جبکہ میری رگوں میں خون، روح میں جوش اور طبیعت میں توانائی ہے۔ کالج کی مسموم فضا میں ضائع ہونے سے بچا لیا۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ ایک پر جوش مقرر کیطرح جو اپنے جذبات کی شدت کو دیوانہ ہو جاتا ہے۔

آج تک میری امی! تمہیں معلوم ہے کہ میں دنیا کے کسی امتحان میں ناکام نہیں ہوا۔ اس دفعہ میری ناکامی کی سب سے بڑی وجہ

ہی کیا یہی تہیہ ہے کہ ان یونیورسٹی کے امتحانات کی وقعت ہی میرے نزدیک نہیں تھی، ایک نوجوان کو مجبور کرنا۔ کہ وہ اپنی زندگی کے اہم ترین حصے کو یونیورسٹی کے معین ہونے کے مقرر کردہ نظام کے تحت چلکر، چند متفرق نصابوں کی نظر کردے — اور کسی میں بھی اسکا علم مکمل نہ ہو — اسکی تمام عمر کو تباہی اور بربادی کے تاریک گڑھوں میں دھکیلتا ہے....

بڑھیا کے چہرہ پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ وہ ایک شکست خوردہ سپاہی کیطرح مایوس نگاہوں سے امجد کو دیکھ رہی تھی۔

اب میں آزاد ہوں — ایک طائر کیطرح جو طرح طرح کی رنگینیوں سے روشناس ہونے کے لئے آشیانے میں اپنے پروں کو پھڑ پھڑاتا ہے — اب میرا اس جھونپڑے کے خشک اور غیر دلچسپ سکوں میں رہنا محال ہے.... مجھے اجازت دو! کہ میں دنیا کی رعنائیوں اور رنگینیوں سے روشناس ہوں۔ پیاری امی! میں تمہیں کسی حال میں نہیں بھولوں گا،

اس کی آواز میں اب متانت اور سنجیدگی طول ہو رہی تھی،

امی! ہماری سرشت ایک سہی، مگر انجام مختلف ہیں۔ ہم لکڑی کے ایک ہی شاخ سے تسبیح کے دانے بھی بناتے ہیں اور نیزے بھی.... ایک انسان جو تسبیح کے دانوں کو گننے پر قانع نہیں ہو سکتا اُسے نیزہ پکڑنے پر، اور اس وحشی دنیا کے خونخوار درندوں کا شکار کرنے پر مطمئن نہیں کیا جا سکتا.... ہر ایک اپنی شاہراہ پر گامزن ہے — اور میری راہ مقرر ہو چکی ہے۔ جوانی کی سرسبز شاخوں کو مت کاٹو، ان پر رنگین پرندوں کو چہچہانے دو، ان کو کائنات کی وسیع فضاؤں میں پھیلنے دو۔

اس کی بوڑھی والدہ ایک بے چین اور آزردہ خاطر انسان کیطرح کھڑی ہو گئی۔ اُس کے چہرے کی جھریاں کانپ رہی تھیں۔ وہ بے چین ہو کر اٹھی، اور اپنے جھونپڑے کے کونے میں ایک ٹوٹی ہوئی الماری کے پاس گئی، اور چند روپے لاکر اپنے بیٹے کے سامنے پھینک دئے

اسکی سرخ آنکھوں میں چند آنسوؤں کے قطرے تھے، اس کی زبان کچھ کہنے سے قاصر تھی،

"جاؤ"! اس نے اپنے غصے اور رنج کو ناکام طور پر چھپاتے ہوئے کہا "خدا تمہیں کامیاب کرے"

"جب تک مرد کے بازوؤں میں طاقت اور قدموں میں چلنے کی ہمت ہے۔ وہ مٹی سے بھی روپیہ کما سکتا ہے"۔ امجد نے ایک زوردار آواز میں کہا "مجھے ان روپوں کی ضرورت نہیں۔ میں ان بیکار اور بے سود بھکاریوں کی طرح نہیں۔ جو دوسروں کے چھوڑے ٹکڑوں پر گذارہ کرتے ہیں، اور اپنے ملک اور قوم پر ایک ناخوشندہ بار ہو کر رہتے ہیں"۔

"اچھا امی! اس نے چند لمحات کے توقف سے کہا۔ میں، انشاءاللہ کامیاب تمہارے قدموں میں واپس آؤنگا" وہ یکدم خاموش ہو گیا، اور ایک زبردست حرکت کے ساتھ ماں کے قدموں میں جھکا۔ اور پھر جھونپڑی کے دروازے سے باہر نکل گیا۔

اسی شام کلکتہ میل اسے اپنے دیار سے ایک دوسرے بالکل اجنبی شہر کلکتہ لے جا رہی تھی۔

— ۲ —

"زندگی میں میں نے کئی پریشان خواب دیکھے ہیں.... مگر ایسا ہولناک خواب! الٰہی!

امجد شہر سے باہر ایک بوسیدہ مسجد میں بچھی ہوئی چٹائی سے اٹھا اور آنکھیں مسلتے ہوئے چاروں طرف حیرت سے دیکھنے لگا۔ وہ ایک بیزاری کی لرزتی ہوئی آواز میں بڑبڑا رہا تھا۔ کیا میرا انجام بھی ایسی ناکامیوں کا حامل ہوگا؟

اُسے دو دن کا فاقہ تھا۔ اس کا دماغ ایک ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ اُسے اِس پریشان خواب نے مزید پریشانیوں سے روشناس کر دیا تھا۔ اس کا ایک شبہ لمحہ بلحظہ یقین میں تبدیل ہو رہا تھا۔ شاید موت آوارہ اور بے خانماں ہی اُسے اِس جہان سے لیجائیگی۔ اور وہ اپنی منزل مقصود تک کبھی بھی نہیں پہنچ سکیگا۔

وہ ایک مجروح انسان کی طرح سجدہ سے اُٹھا۔ اور ایک مایوس العلاج مریض کی طرح شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ آہ دُنیا کی جنگ میں وہ ایک ایسا جنگجو تھا، جس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ اس کا دماغ مختل ہو رہا تھا۔ اس کے بلند خیالات۔ غربت کی سختیوں اور تنہائی کی پریشانیوں میں گم ہو رہے تھے۔

وہ ایک بے خودی کے عالم میں چل رہا تھا۔ اُس کے سامنے ایک نوجوان اور حسین لڑکی۔ بغل میں کچھ کتابیں لئے اُس کے سامنے سے گذری۔ امجد نے غلط نگاہوں سے اُسے دیکھا۔ اور پھر اپنے تخیلات کے پریشان کُن پھندوں میں پھنس کر رہ گیا۔

”دولت اور استطاعت کے بغیر یہ زندگی انسان کے لئے موت سے بدتر ہے!“ اُس نے ایک وارفتگی کے عالم میں کہا۔ جیسے وہ اِس موجودہ مادی زندگی کے عوض ایک دوسری روحانی زندگی حاصل کر چکا ہے۔ ”میں کامرانیوں کی امیدیں لیکر چلا تھا لیکن میرے لئے یہاں کوئی خوشی نہیں ہے۔ میرے دماغ نے میری زندگی کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا ہے اور مجھے محض ناکام خوابوں کی دنیا میں دھکیل دیا ہے۔ اور مایوسیوں کو میرا ہمنوا بنا لیا ہے“!

آخر ہم کیوں کامیابی حاصل کریں؟ اس نے زیرِ لب اپنے آپ میں سوال کیا۔ ”کیا اس لئے کہ دنیا میں ہمارا نام روشن ہو۔ اور دولت و ثروت سے چند انسانوں کی زندگیاں خرید سکیں۔؟... لیکن اِس سے کیا حاصل؟ ایک وقت آتا ہے۔ کہ روشن ترین نام بھی سوائے تاریخ کے فرسودہ اوراق کے اور کہیں جگہ حاصل نہیں کرسکتا۔ ہم روزانہ لاکھوں انسانوں کو ہمیشہ ان کا نام رد کیا ہوا دفن کر دیتے ہیں!... دُنیا کتنی وسیع ہے؟

ہماری زندگی کسقدر محدود! کیا ہم اِس مختصر زندگی میں اپنے عزائم کی طویل مہمیں سر کر سکتے ہیں۔؟ ہم اپنے انجام کے لئے کتنی اہم اور مہنگی قیمت ادا کرنیکے بعد بھی کتنا غیر اہم اور معمولی انعام حاصل کرتے ہیں؟... یہ سب کیا ہے؟... کیا یہ سب بیوقوف لوگوں کا ہنگامہ بدتمیزی نہیں۔؟ کیا تمام کچھ خود غرضی اور مکاری کا مکروہ مظاہرہ نہیں۔؟... اِس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اِس دنیا کی حدود سے گذر چکا ہے۔ اور یہاں کی ہر ایک چیز سے بیخبر!

تین چار گھنٹے مسلسل آہستہ چلنے کے بعد وہ ایک کوئیں پر آیا۔ جس کے ارد گرد چار فٹ کی اُونچی پختہ مینڈ تھی اور جس کے پرلی طرف تھوڑی دیر، ایک منفرد اپنی بلند عمارت اور قدیم طرزِ تعمیر کی وجہ سے وہ تمام ماحول میں ایک نمایاں خصوصیت رکھتا تھا۔

وہ کچھ دیر تو مینڈ کا سہارا لئے اپنے خیالات کے طلاطم میں غرق رہا، پھر اچانک۔ جیسے اِس کے دِل و دماغ میں ایک بجلی سی کوند گئی ہے۔ یا اُسے اِس غیرفانی دُنیا میں پہنچنے کے لئے ایک زینہ مل گیا ہے۔ اپنے خیالات سے یکایک چونک کر مینڈ کے اُوپر چڑھا۔ اور چھلانگ کے لئے اپنے ہاتھ بلند کئے یکدم کسی نے اس کا دامن پکڑا اور پیچھے کی طرف کھینچا۔ امجد نیم بیہوشی کے عالم میں مڑا اور ایک نوجوان لڑکی کو کھڑے ہوئے پایا جسکی کتابیں اس کے قدموں میں بکھری پڑی تھیں۔ اور جو اِس کی ایسی نکارہ حرکت پر عجیب طور سے مسکرا رہی تھی۔

”خودکشی؟“ لڑکی نے تنفر آمیز لہجہ میں کہا...

. . . . . . . . . . .

کیا آپ کا ایسے ذلیل فعل پر ضمیر بھی ملامت نہیں کر سکتی؟“

امجد دم بخود تھا۔ اور مبہوت نگاہوں سے اپنے بچانیوالی کو دیکھ رہا تھا۔ جیسے اس کا احساس مردہ اور طاقت گفتار سلب ہو چکی ہے!

اس نے بہت مشکل سے زبان ہلائی جیسے ایک گونگا بولنے کے لئے زبان اور ہونٹوں کو تلملاتا ہے:۔!

"دُنیا۔۔۔ سب ۔۔ بے سو۔۔۔ د۔۔۔ تماشا ہے"

"خوب!۔ لیکن یہ سب کچھ بے معنی ۔۔ نہیں!۔۔۔ نوجوان حسینہ نے ذرا سنجیدگی سے کہا۔ اُس کے دل میں اس راندۂ ہستی اور غم نصیب انسان کے لئے رحم اور ہمدردی موجزن ہو رہی تھی؛ اس نے امجد کے خوبصورت چہرے اور سڈول جسم پر ایک نگاہ کی اور دل میں کہنے لگی" ایسا انسان دُنیا سے بے سُود ضائع ہونیکا حق نہیں رکھتا۔ اُسے۔ ہاں!۔۔ ہاں!! اسے جینا چاہیئے۔۔۔ جیتے رہنا چاہیئے۔۔۔!

امجد کو اپنی زندگی اور اس کے متعلق تمام خیالات بھول گئے۔ وہ ایک دوسری کشمکش میں پھنس گیا۔ اس نے دل میں کہا۔ میں بھول نہیں سکتا۔ اس لڑکی کو میں نے سڑک ۔۔۔ ہاں اُس سڑک پر ۔ چوراہے کے نزدیک ۔ سکول جاتے ہوئے دیکھا تھا۔۔۔" لیکن اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔

"آپ مجھے اس سڑک کے چوراہے پر۔۔۔ ہاں! آپ یہاں کس طرح آئیں۔!!" اس نے ایک لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا۔

"ساجن! واقعی میری منزل یہ نہیں تھی، آہ! بعض اوقات ہمارا دل ہماری منزلیں تبدیل کروا تاہے۔۔ ہمیں اس طرف لیجاتا ہے جدھر جانے کا ہم خیال تک نہیں کر سکتے۔۔۔ میں یہاں کیسے آئی؟" اس کا جواب میری قدرت سے باہر ہے۔"

۔۔۔ ۳ ۔۔۔

"تشریف رکھیئے!" حسینہ نے ملاقاتی کمرہ میں ایک کرسی کیطرف اشارہ کرتے ہوئے کہا"

امجد کی سمجھ میں ابتک نہیں آیا تھا۔ کہ وہ کیطرح اپنی "محسنہ" کے احکامات سے انحراف کرے۔ وہ ایک ربڑ کے بُت کیطرح محض کلوں سے حرکت کر رہا ہو۔ کرسی پر بیٹھ گیا وہ کوئی بات سوچنے یا بولنے سے قاصر تھا۔ اُس کی پریشانی اور حیرت حد سے تجاوز کر چکی تھی۔۔۔ وہ اپنے آپ کو غیر مادی دُنیا میں ایک فرشتہ کی حیثیت میں محسوس کر رہا تھا۔ اس کے لئے یہ دوسری غیر فانی دُنیا تھی۔ جہاں ظالم اور پُر فریب انسانوں کی ہوس پرستی اور خود غرضی نام کو نہیں ہوتی۔ یہاں ہر شخص اپنے بھائی کو ہمدردی اور دوستی کے پردوں میں اپنی حرص و آز کا شکار نہیں کرتا۔ جہاں غریبوں کیساتھ حیوانوں جیسا سلوک نہیں ہوتا۔ جہاں غریبوں کے بچے بلک بلک کر یا سردی سے ٹھٹھر کر جانیں نہیں دیتے۔ بلکہ یہ دنیا اب اس کے لئے ایک بہشت تھی ۔ بے سود ہنگاموں سے بھرپور نہیں۔ بلکہ محبت او راشتی کے نغموں سے گونجتی ہوئی، فریب ہوس میں مبتلا نہیں بلکہ نیکدلی اور ہمدردی کے ترانوں میں رقص کرتی ہوئی"۔۔۔

"آپ مجھے اپنا دوست سمجھیں۔۔۔ اور۔۔۔ حسینہ نے مسکراتے ہوئے کہا

! میں دوستی اور محبت کا تو بہ نہیں رکھتا ہوں"، امجد نے نیم رضامندی سے کہا۔

"ہر چیز کی ابتدا کے لئے تجربہ ضروری نہیں" اُس نے سنجیدگی سے کہنا شروع کیا" بعض اوقات اکثر چیزیں ہمارے تجربات کے خلاف وقوع پذیر ہوتی ہیں! بعض اوقات ضرورت انسانی ہمیں بالکل اجنبی چیزوں سے روشناس کر دیتی ہے۔ جن کے لئے ہمیں مزید تجربات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے: نئے اہتمام کرنے پڑتے ہیں"

امجد سرنگوں ہو کر کچھ سوچ رہا تھا۔۔؟

آپ میرے متعلق پریشان نہ ہوں۔ میں کلکتہ کے مشہور سرمایہ دار مالک رام کی اکلوتی بیٹی سوشیلا ہوں۔ بیگلن کالج میں تھرڈ ایر کی طالبہ ہوں ..... آہ میں نہیں کہہ سکتی، کہ تمہاری پریشان حالی نے میرے دل اور دماغ کو کس قدر متأثر کیا ہے..... میں نے اولین نگاہ سے دیکھتے ہی سمجھ لیا تھا، کہ تمہاری زندگی تکالیف اور مصائب سے تنگ چکی ہے..... اور تم کوئی خطرناک اقدام کرنا چاہتے ہو۔

آپنے مجھے بچانے کی کوشش کیوں کی؟ امجد نے مسکراتے ہوئے اور آنکھوں کو عجیب انداز سے جھپکتے ہوئے پوچھا۔

"آہ دنیا میں کسی انسان کا دل بھی درد سے خالی نہیں" سوشیلا نے ایک سرد آہ بھری۔

..........

"میں نہیں سمجھ سکتی، کہ مجھے کیوں تمہارے حالات سے دلچسپی ہوئی جا رہی ہے...... کیا تمہیں وہ حالات ظاہر کرنے میں کچھ تامل ہے۔ جن سے مجبور ہو کر تم نے اپنے کو گم کر دینے میں نجات سمجھی؟"

تامل امجد نے آہستہ سے کہا۔ "آہ ان سے کوئی مفید مطلب برآمد ہونا دشوار ہے"....

ہر انسان کی ماضی ایک مستقل افسانہ ہوتی ہے، دنیا کے فریب اور ظلم، غربت، کی ناداریاں اور غریبی کی سختیوں سے ہر انسان ابتدا میں روشناس ہوتا ہے، اگرچہ تمام ایسے افسانوں میں ایک قسم کی یگانگت پائی جاتی ہے۔۔ کیونکہ یہ تمام کائنات عالم ایک ہی مرکز کیطرف مائل پرواز ہے۔ لیکن انسانی فطرت کو وہ رنگینی عطا ہوئی ہے کہ یہ ہر انسان کو اپنے سانچے میں ڈھال کر نئی دلچسپیاں اور نئی رنگینیاں پیدا کر دیتی ہے۔ اور ایک نمایاں فرق ہیں ہر ایک واقعہ میں نظر آنے لگتا ہے۔۔ روح کی سیرابی اور عزائم کی بلندی اور ہمت میں توانائی انہی انسانوں سے ہوتی ہے۔

میری ناکام ہستی کی داستان غیر دلچسپ اور پارینہ ہے۔ امجد نے کرسی کی ٹیک لی اور غیر مبہم طور پر مسکراتے ہوئے کہا۔

آپ اسے میری خاطر سمجھئے۔ سوشیلا نے ایک محبت آمیز انداز سے کہا۔

امجد نے چند لمحات کے توقف کے بعد اپنی پیشانی کو مسلا اور پھر مسکراتے ہوئے سوشیلا کے حسین اور نوجوان چہرہ پر اپنی نگاہیں ڈالدیں: "میں صوبہ سرحد کے قصبہ ہندو باغ میں پیدا ہوا تھا میرے والد ایک بلند مرتبت زمیندار تھے۔ میرے چچا برطانوی حکومت ہند کے سفیر کابل تھے۔ ہمارا خاندان افغانستان کے شاہی خاندان سے تھا۔ اور تمام گرد و نواح اور قبائل میں ایک بلند حیثیت رکھتا تھا۔ اسطرح وہ تمام عیش و آرام جو اُسے ماحول میں میسر ہو سکتا ہے۔" مجھے حاصل تھا۔ امجد نے ایک ٹھنڈی سانس لی "میں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ کہ میرے والد بقضائے الٰہی فوت ہو گئے۔۔ بس والد صاحب کی فوتیدگی نے دنیا کی وسعتوں کو ہم پر تنگ کر دیا۔ مصائب اور تکالیف کا ایک انبوہ ہم پر ٹوٹ پڑا۔۔ آہ! ہم دو نفوس اس جہان کی فریب کاریوں کا شکار ہونیکے لئے تنہا رہ گئے۔ یہ دنیا کے خونخوار بھیڑیئے۔ جنہیں ہم رشتہ دار یا عزیز کہتے ہیں چند مجبوریوں کی وجہ سے اپنی وحشی اور ہوس کو محبت اور پیار کے رنگین حجابوں میں چھپائے رہتے ہیں، ورنہ جونہی وہ حجابات، وہ مجبوریاں اٹھ جاتی ہیں۔ وہ حیاداری کے ذریعہ غائب ہو جاتے ہیں۔ تو ان میں سے ہر ایک قاتل بنجاتا ہے ہر ایک ہماری ہڈیاں تک چبانے سے گریز نہیں کرتا، وہ تمام محبت، پیار اور ہمدردی ان کی نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی، ہاں! مال اور دولت کے لئے ان کے ہاتھ کتنے دراز ہیں۔ ان کی خونی

آنکھیں کتنی تیز اور اُنکی لٹکائی ہوئی خوفناک زبانیں کتنی دراز ہوتی ہیں۔ . . اِنکی آواز میں ایک غیر معمولی تیزی تھی جیسے ان سے انتقام لینا چاہتا ہے،" ہم گھر اور زر رکھنے پر بھی بے نوا اور مفلس تھے، رشتہ دار اور اعزار رکھنے پر بھی بیکس رہے... آہ! ہم تمام کمال اِس دُنیا کے رحم پر ہیں۔ ہماری تمام کائنات مال و دولت۔ بے معنی ہے۔ اگر اِس دُنیا کے رہنے والے ہمیں اِن سے لطف اندوز ہونیکا موقع نہ دیں۔

میری عمر اُس وقت بارہ برس کے قریب تھی۔ میری ماں پہلے ہی خورش و خورشس سے تنہا اِن تمام مصائب کا مقابلہ کرتی رہی مگر پھر بھی عورت تھی۔۔۔ اور وہ بھی بے یار و مددگار... امجد کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ ہمارا مکان شہری آبادی سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ اگرچہ دیہاتی طرزِ تعمیر کا تھا لیکن تمام دیہات میں وسعت اور عظمت کے لحاظ سے لاثانی تھا...

ایک رات کوئی دو بجے ہوں گے۔ سردی کا موسم تھا۔ ہم اندر کمروں میں محوِ استراحت تھے۔ اِس رات ہمارے نگواں کمرے میں میری پھوپھی زاد بہن سوئی ہوئی تھی۔۔ جو اُسی شام موضع میم آباد سے میری والدہ کو ملنے کی غرض سے آئی تھی۔

دروازہ کھولو... ورنہ یہاں سے گولی مار دیجائے گی۔" ایک آہستہ مگر بہت تیز آواز آئی۔ ہم سب کھلبلا کر اُٹھ بیٹھے۔ رضیہ بھاگی ہوئی ہمارے کمرے میں آئی۔ اور انتہائے خوف سے کانپتی ہوئی والدہ صاحبہ سے لپٹ گئی۔... میرا دماغ کوئی نتیجہ اخذ کرنے سے قاصر تھا... والدہ صاحبہ کے چہرے پر سنجیدگی برس رہی تھی۔ وہ ٹھٹکی۔ جیسے وہ سارا معاملہ سمجھنا چاہتی تھی۔ پھر وہ جلدی مُڑی اور مجھے مخاطب کرتے ہوئے آہستہ آواز میں کہنے لگی۔

ڈاکو ہماری ڈیوڑھی کی دیوار پھاند کر اِس کمرے کے دروازہ پر بول رہے ہیں۔..." امجد تم اِدھر آؤ!" اِس نے آخری کمرے کیطرف مُڑتے ہوئے کہا۔

میں پریشان حالت میں اِس کے پیچھے ہو لیا۔ اِس کمرے میں ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پڑی تھی۔ جونہی میری والدہ نے مجھے اِس پر لیٹ جانیکا اشارہ کیا میں غیر ارادی طور سے اس پر لیٹ گیا۔ والدہ صاحبہ نے بھی پرانی رضائیاں اور چٹائیاں کا انبار مجھ پر ڈالدیا۔

اگرچہ میں خوف سے کانپ رہا تھا اور اتنے میں ڈاکو دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو رہے تھے۔ کی تمام آوازیں سن رہا تھا۔ میری زبان منجمد تھی۔! لیکن میں مُردہ خبردار! اگر آواز بھی بلند کی... پہلے امجد کا پتہ بتاؤ۔ اور پھر زیورات اور خزانے کی چابیاں۔۔۔ بھئے!" کل سے نوکروں کے ہمراہ شکار کو گیا ہوا ہے" میری پھوپھی زاد بہن نے آگے بڑھکر ایک تیز آواز میں کہا" اور چابیاں تم وحشی اور اِن انسانیت کے خونیوں کو چابیاں۔۔ نہیں مل سکتیں

یکایک ایک چیخ بلند ہوئی۔ اور دھڑام سے کوئی چیز زمین پر گری۔۔ میری پھوپھی زاد بہن اپنے پہلو میں چھُرا لیے ہوئے زمین پر تڑپ رہی تھی۔

میری والدہ ان کی اِس سفاکی پر بھی خاموش تھی۔ ہر لحظہ تازہ پانی سے اِس کے رخساروں کو نہلا رہے تھے۔ اِس نے بغیر کسی حیل و حجت کے چابیاں اِن کے قدموں میں پھینکدیں اور خود ایک درد سے وارفتہ انسان کی طرح ان کی سفاکیوں کا نظارہ کرنے لگے۔

چابیاں لیکر ان نامیوان ہمارے زمین دوز خزانے کی تلاش میں مصروف ہو گئے۔ اور دو میری تلاش میں سرگرم" دو تین دفعہ میری چارپائی کے نزدیک آئے مگر ناکام واپس لوٹ گئے۔

انہیں اس فرسودہ گدڑیوں کے انبار پر شبہ بھی نہ ہو سکا — معلوم ہوتا ہے۔ امجد واقعی شکار گیا ہے۔ ایک نے اُونے مدھم مگر تیز آواز میں کہا۔

"تم نے خوامخواہ اس کی بہن کو قتل کر ڈالا" ایک نسوانی آواز بلند ہوئی۔

. . . . . . . . . . . . . . . . . .

سوشیلا نے قریب پڑی ہوئی میز پر سے سگرٹ کیس اُٹھایا اور امجد کے سامنے پیش کیا۔ امجد نے شکریہ کیساتھ اس میں سے ایک سگرٹ لیا اور اُسے سلگایا۔ پھر ایک لمبا کش لیکر پھر اپنی داستان شروع کر دی "دوسرے روز میری ماں میری جان بچا کر ایک آوارہ اور مجبور انسان کی حیثیت سے ایک ایسی منزل پر گامزن تھی جس کی انتہا اُسے خود بھی نہ معلوم تھی۔

متواتر چار دن کے پیدل اور گاڑی کے سفر کے بعد ہم پنجاب کے ایک مشہور شہر فریدآباد میں پہنچے۔ یہاں ایک نیک اور خدا ترس بزرگ کی کوشش سے ایک بوسیدہ سا جھونپڑا نما مکان ہمیں رہائش کے لئے مل گیا۔

میری ماں مسلسل تین سال تک غربت کی سختیوں سے دوچار ہوتی رہی۔ جو کچھ سرمایہ ساتھ لائی تھی وہ پہلے چند ماہ ہی میں ختم ہو گیا تھا۔ . . .

ایک دن میں جب کھیل کود کے بعد اندر داخل ہوا تو اپنی ماں کو روتے ہوئے پایا اس کے آنسوؤں نے مجھ میں ایک تلاطم ہیجان پیدا کر دیا۔ میں فرطِ غم سے اس سے لپٹ گیا۔

"امی آج تم اسقدر کیوں غمگین ہو؟" میں نے ایک مؤدبانہ طریق سے کہا۔

کچھ نہیں بیٹا! یہی ایک خیال ہے!. . . ہماری زندگی آئندہ کن بنیادوں پر تعمیر ہو گی؟ ہم غربت میں بھوک کے مر جائیں گے؟. . . .

بیٹا! زندگی کی بقا کے لئے روزگار ایک ضروری چیز ہے — اور ہم یہاں خدا کے سوائے اور کس کے سہارے بیٹھے ہیں بیٹے

نہیں امی! آپ کو گھبرانا نہیں چاہیئے۔ بیشک میرے بازوؤں میں ہمت ہے خدا برکت دیگا" میری ماں میری اس ہمت پر مسکرا رہی تھی۔

میں دوسرے روز صبح سویرے اُٹھتے ہی بازار گیا۔ وہاں مجھے ایک ہوٹل پر اپنا پڑوسی عظیم خاں نظر آیا۔ جو نہایت عبادت گزار بزرگ تھا۔ اور جس کے بیٹے کیساتھ میں اکثر کھیلا کرتا تھا۔ میں نے اُس کے پاس جا کر تمام حال بیان کیا۔ وہ میری داستان سُن کر بہت متاثر ہوا۔ اور اُس نے مجھے آٹھ آنہ روز پر برتن مانجھنے پر ملازم رکھ لیا۔ اُس دن سے وہ ہم پر بہت مہربان ہو گیا۔ اور ہماری ہر طرح سے امداد کرنے لگا۔

اسی طرح مجھے دو سال کا عرصہ گذر گیا — میرا سن قریباً پندرہ سال کا ہو چکا تھا —

. . . . . . . . .

"کیا میری تمام زندگی اس ہوٹل کے نذر ہو گی؟" ایک دن میں نے اپنی ماں سے کہا۔ میری ماں میرے اس سوال پر مسکرانے لگی "بیٹا! بلند عظمت کا نشہ ذلت کی زندگی میں بھی نہیں اترتا"

میں نے ایک مؤدبانہ انداز سے کہا "واقعی تم اس ذلیل زندگی پر قانع نہیں ہو سکتے۔؟. . . .

اچھا! اب تم کیا چاہتے ہو۔؟ اپنے مستقبل کی تعمیر کے لئے تمہیں بھی کچھ کرنا چاہیئے — مجھے خود اس کا احساس تھا مگر میں نے اظہار نامناسب سمجھا شاید وقت اور قسمت ہماری آرزوؤں کو پورا کر دیں۔! — لیکن نہیں. . . محنت اور کوشش کے بغیر قسمت کی تشکیل ناممکن ہے. . . . — میں چاہتی ہوں کہ تم پھر سکول داخل ہو جاؤ — میں — جس طرح بھی ہو گا. . . محنت اور مزدوری

سے تمہیں پڑھاؤں گی۔

میں نے وہ نوکری چھوڑ دی اور شہر کے ایک ہائی سکول میں داخل ہو گیا، اور میری ماں پڑوس کے ایک متمول گھرانے میں خدمت پر مامور ہو گئی۔

مسلسل چار سال تک میری ماں محنت اور مزدوری سے میری ہر طرح سے امداد کرتی رہی۔ میں بارھویں جماعت میں پڑھ رہا تھا۔ اس کی امیدوں کا واحد سہارا، محنت اور مشقت کا واحد انجام۔ اور اب اپنی منزل مقصود پر پہنچنے کے قریب تھا، لیکن میری فطرت اور تقدیر میرے خلاف بغاوت پر آمادہ تھی۔ میں باوجود محنت کے بھی امتحان میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس ناکامی سے دنیا اور اس کے ہنگاموں۔ کامیابی اور اس کی آسائشوں میں میرے یقین کی بنیادیں متزلزل ہو گئیں۔ میں ایک ایسے انسان کی طرح تھا، جو ایک بلند پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہو۔ اور جس کے لئے نہ زمین پر اترنے کا راستہ ہو نہ آسمان کی وسیع اور بسیط فضاؤں میں غائب ہونے کا۔

اگرچہ اس میں میرا قصور نہیں تھا۔ لیکن اپنی بیکس اور بوڑھی والدہ کی امیدوں اور آرزوؤں کے فلک بوس قلعے منہدم دیکھ کر میرا ضمیر مجھے خود لعنت کر رہا تھا۔

آہ ہماری زندگی کا کوئی لمحہ بھی اختیاری نہیں۔ ہم واقعات سے مجبور ہو کر اپنے رستوں کو تبدیل کر ڈالتے ہیں۔ اور ماحول سے تنگ یا مجبور ہو کر اپنی فطرت کو نئے سانچوں میں ڈھالنے لگتے ہیں۔ دنیا دکھوں سے بھرپور ہے۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے۔ ناکامیوں اور نامرادیوں، دکھ اور تکالیف اپنے سامنے پایا ہے۔" امجد کی نگاہوں سے آنسو ابل رہے تھے اور اس کی پریشانی ہر لفظ کے ساتھ ساتھ بڑھ رہی تھی۔

آہ! یہ احساس بھی انسان کے لئے موت سے بدتر ہے۔ میں ہمیشہ اس کے بغیر میں ہوٹل میں کام کرتے ہوئے بھی اپنی زندگی امن اور سکون سے بسر کر سکتا، مگر اب موت اور زندگی کی کشمکش میں لڑکھڑا رہا ہوں۔ کوئی رستہ نہیں بتا" کوئی علاج نہیں سوجھتا زندگی کی تلخیوں کا علاج۔ آہ! اتنی تگ و دو کے بعد بھی میسر نہیں ہو سکا۔ مجھے نہیں معلوم خوشی کیا ہے .... آہ سوشیلا تم لوگ اتنے کیوں خوش ہو؟ کیا تمہاری سب آرزوئیں تمہاری منشاء کے مطابق ہوتی ہیں؟ کیا ہمیشہ امن اور آسائش تمہارا ساتھ دیتی ہے؟ آخر وہ کون سی چیز ہے جو تمہاری زندگی کو رنگین اور دلچسپ بناتی ہے؟ .... آہ سوشیلا تم نے مجھے بچا کر پھر اسی کشمکش میں مبتلا کر دیا ہے۔ جس سے۔" امجد خاموش ہو گیا۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا جیسے اس کے دل میں ابھی جوش اور رنج کا طوفان باقی ہو۔ ایک آگ جس کی شدت کی حامل اس کی زبان نہیں ہو سکتی ہے

سوشیلا کی نگاہوں میں ہمدردی کے آنسو تھے۔ مگر وہ عجیب طرح سے مسکرا رہی تھی۔

"تمہیں اپنی آرزوؤں اور امیدوں کی زیادتی اور شدت نے دیوانہ بنا دیا ہے۔" وہ ایک رنگین انداز سے متکلم ہوئی، جو ایسے والہانہ اور بیتابانہ طریق پر اپنے عزائم کی پیروی کرتا ہے، یقیناً اپنی زندگی کو دکھی بنا لیتا ہے۔ اس دنیا میں کامیابی اور ناکامی پہلو بہ پہلو ہے۔ اس لئے کسی انسان کو زندگی کی جنگ میں صبر و سکون ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیئے۔ ہم لوگ تمہیں بہت سکھی اور آسودہ معلوم دیتے ہیں۔ مگر ہمارا جگر چیر کر دیکھو۔ اس میں چھلنی کی طرح چھید ہیں۔ آہ! ہماری یہ تمام دولت اور مال ہمارے دکھوں کا صحیح مداوا نہیں۔" اس کی آواز میں سنجیدگی پیدا ہو گئی۔ "تم لوگ ہماری زندگیوں پر رشک کرتے ہو، مگر آہ! ہماری مسندیں حقیر رعنائیوں میں لپٹی ہوئی ہیں۔ جب ہم ان پر نگاہ کرتے ہیں تو ہمارے دلوں سے دھوئیں اٹھتے ہیں۔ تم نہیں جانتے ہماری ان مسندوں

اور ذہنیوں میں کتنے آلام اور ذہنیں رقص کر رہی ہیں!

خوشی کیا ہے؟ یہ ایک وہم ہے جو محض احساس سے متعلق ہے اور جسے تم نے ابھی تک نہیں سمجھا ہے۔۔ جو بعض اوقات ہماری شکستگی اور ناامیدیوں میں ایک شعاعِ اُمید پیدا کر دیتا ہے۔ اور چند لمحات کے لئے ہمیں اپنی مہم کی کامیابی کا یقین دلا دیتا ہے۔۔۔۔ ہم غیر ممکن کو ممکن سمجھنے لگ جاتے ہیں۔۔ ناپائیدار کو پائیدار سمجھتے ہیں! اخلاق اور عزم کی پاکیزگی خیالات کے امن و سکون پر ہے۔" سوشیلا کا انداز نہایت سنجیدہ اور ہمدرد تھا۔ انہیں دنیا میں آوارہ اور پریشان چھوڑ دینا۔ اپنی زندگی کو بربادی کے گڑھوں میں دھکیل دینا ہے۔ مانا کہ بلند عزائم کے یہ مسموم خواب سانپوں کی طرح ہماری زندگی کے ہمراہ رہتے ہیں۔ اور دنیا میں کوئی بھی انسان ان سے خالی نہیں ہوتا۔ لیکن ان کی تعبیریں بہترین طور پر ہماری قوتِ بازو اور دل کے سکون کی رہین ہیں۔

اسی کشمکش سے گھبرا نا مردوں کی ہمت سے بعید ہے اس جنگ کا نام ہی زندگی ہے۔ کیا ایک دور افتادہ بیراگی کی زندگی جو چٹانوں کی اوٹ میں۔ دنیا سے دور۔ سکوت اور تنہائی میں گم رہتی ہے۔ یا ایک صوفی ریش دراز کی حجرہ نواز زندگی جو محض تسبیح کے دانوں پر ختم ہو جاتی ہے۔ صحیح زندگی ہے؟۔۔۔۔ کیا خدا نے مفلوج اور بے فائدہ محض اپنے تفریحات کے لئے اس دنیا کی تخلیق کی ہے؟ کیا اس دنیا کے وہم مکروفریب کی وسیع لہروں پر ہمیں تنکوں اور ناکاروں اور لنگڑوں کی طرح لڑھکنے کے لئے بھیجا گیا ہے؟

اگر ایسا ہی ہے تو حشرات الارض اور ہماری زندگی میں کوئی فرق نہیں۔ پھر انسان کی کامل زندگی کی ہم آہنگی کے لئے ہمیں کس چیز کی ضرورت ہے؟ ضرورت صرف ایک تندرست اور صحیح عقل ہی سے پوری ہو سکتی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔



عقلمندی یہ؟ سوشیلا نے اپنی کرسی کیف تھامے ہوئے کہا میں سڑکوں اور خانقاہوں پر آوارہ پھرنے زندگی کو محض معمولی واقعات سے لڑکانے اور دوسرے لوگوں کے قائم کردہ۔ پامال اور فرسودہ رستوں کی پیروی کرنے میں نہیں مل سکتی ہے۔۔ سوشیلا یہ کہکر مسکرائی اور اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ امجد حیران اور خاموش تھا۔ اور سوشیلا کے حسین اور پُر رعب چہرے پہ نگاہیں جمائے ہوئے تھا۔ سوشیلا نے ایک فوری حرکت کی اور اپنی بانہیں امجد کے گلے کے گرد حائل کردیں۔

کیا تم میری خاطر بھی زندہ نہ رہو گے؟ امجد سرنگوں ہو گیا اور سوشیلا کے ہاتھ کو پکڑ کر بوسہ دیتے ہوئے بولا۔ مگر ہمارے مذہب۔۔"

"مذاہب؟" سوشیلا کا چہرہ یکدم سنجیدہ ہو گیا۔ وہ پھر اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔ جیسے اس کے دل میں ایک چوٹ لگ گئی۔

ہندوستان میں سینکڑوں مذاہب ہیں اور سب سمجھتے ہیں کہ ہمارا مذہب ہی انسانیت کا بہترین انعام اور خدا کا محبوب ترین ہے تم ہی بتاؤ خدا کس مذہب کو پسند کرتا ہے اور کسے ناپسند؟

تمام مذہب کی بنیادیں اخلاق اور اخوت امن اور آشتی پر ہیں۔ لیکن ہم نے تمام مذاہب کو دکانوں میں تبدیل کر دیا ہے اگر انہیں قتل و غارت جنگ و جدل اور دشمنی اور نفاق کا جواز بنا لیا ہے ہمارے مذہب کو ہمارے اعمال کی ہوا تک نہیں لگتی۔ لیکن ان کو قائم رکھنے کے لئے ہم لاکھوں بے گناہوں کا خون بہا دیتے ہیں! ذرا سوچو! ہم سب ایک ہیں اور ایک ہی مالا کے دانے ہیں۔ امجد نے خوشی بہت میں اُٹھ کر سوشیلا کو اپنی کرسی سے اُٹھا لیا۔ اپنی گود میں لیکر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔ سے کر محبت اور پیار میں ڈوبی ہوئی آواز میں بولا

"تم نے۔۔۔۔ سوشیلا! مجھے نئی زندگی عطا کی ہے۔"

ان دونوں کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔

(امین حزیں)

مضامین کی اشاعت کے لئے [illegible]

# غزل

(پنڈت ہری چند اختر صاحب)

جی کو روگ لگا بیٹھا - جی کے روگ سے مرتا ہوں
اس میں کسی کا شکوہ کیا اپنی کرنی بھرتا ہوں

دنیا سے کچھ فیض نہیں - دنیا کو تج بیٹھا ہوں
اللہ سے امیدیں ہیں - اللہ اللہ کرتا ہوں

ترک گناہ اے واعظ جی - دل سے نہیں مجبوری ہے
آپ خدا سے ڈرتے ہیں - میں دنیا سے ڈرتا ہوں

دور تو ہٹ جاؤں - لیکن فکر محبت نے مارا
بے حد نازک رشتہ ہے - ٹوٹ نہ جائے ڈرتا ہوں -

جو مانگو ملجائے گا - اس میں وہ بھی شامل ہیں -
خوب نمازیں پڑھتا ہوں - خوب دعائیں کرتا ہوں

کاوشِ پیہم آخر تک - حاصل مرگِ مایوسی ہے
یہ بھی کوئی جینا ہے کس جینے پر مرتا ہوں

ناؤ کو اک ساحل تو ملا - طوفانوں سے چین تو ہے
موت ہے اچھا موت بہی - میں اس گھاٹ اترتا ہوں

۱ : ہ چند اختر - ایم - اے ۱

# سچ

جناب صوفی غلام مصطفےٰ صاحب تبسم۔ ایم۔ اے پروفیسر گورنمنٹ کالج۔ لاہور

بشیر اور نذیر۔ دو دوست

سلمیٰ (آٹھ سال کی لڑکی) تختی پر کچھ لکھ رہی ہے۔

نذیر۔ سنا ہے کل میاں سعد اللہ سے پھر تمہارا جھگڑا ہوا۔ اور وہ تم سے بہت بگڑے۔

بشیر۔ بگڑے کیا! غصے میں آکر انہوں نے مجھے وہ بے نقط سنائیں کہ معاذ اللہ! وہ تو میرا ہی دل گردہ تھا کہ خاموش رہا۔ کوئی اور ہوتا تو فساد ہو جاتا۔

نذیر۔ لیکن بات کیا ہوئی تھی؟ ان کی اتنی خفگی کی وجہ؟

بشیر۔ وجہ؟ بھائی وجہ کیا ہونی تھی! بیٹھے دوستوں سے باتیں کر رہے تھے۔ باتوں باتوں میں حمید اللہ۔ جانتے ہو نا انہیں؟ ان کے سوتیلے بھائی ہیں، ان کا ذکر آگیا، بس جونہی ان کا نام سنا، بھڑک گیا تھا، لگے ان کو بے تحاشا کوسنے۔ زمانہ بھر کے عیوب گنوا دیے۔ کیا کچھ نہیں کہا؟ ذلیل، پاجی، کتا، حرام..... حرام زادہ تک کہہ دیا۔ مجھے بہت رنج ہوا۔ میں نے انہیں روکا، اُسے چھوڑ کر میرے پیچھے پڑ گئے۔

نذیر۔ آخر تمہیں رنج کیوں ہوا۔؟

بشیر۔ مجھے رنج کیوں ہوا۔؟ بھائی جان، یونہی ناحق کسی کو؟ آخر یہ کہاں کی شرافت ہے۔

نذیر۔ کوس رہے تھے تو اپنے بھائی کو، آخر تمہیں کیا پڑی تھی کہ درمیان میں آ کودو۔ اور لوگ بھی تو وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ سب خاموش تھے نہ! تم بھی چپ رہتے۔

بشیر۔ ہاں وہ سب کے سب خاموش تھے۔ اور ان کی اس بے محل خاموشی سے میرے دل کو اور بھی دکھ ہوا۔

نذیر۔ تمہارا دل تو ہر بات پر دکھنے لگتا ہے۔ تم دنیا سے نرالے ہو۔

بشیر۔ نہیں نرالا ہونے کی اس میں کیا بات ہے۔؟ کسی کی غیبت میں یوں برا بھلا کہنا۔ مناسب نہیں ہوتا۔ اور پھر اس حالت میں۔ کہ وہ راستی پر بھی ہو اور یہ ساری دنیا کو معلوم ہے۔ کہ حمید اللہ حق بجانب ہے

نذیر۔ اور تم نے اُن سے صاف صاف ہی کہدیا ہوگا؟

بشیر۔ ہاں تو کیا نہ کہتا!

نذیر۔ کیا ضرورت تھی کہنے کی!

بشیر۔ اس کا مطلب ہے کہ سچ بات کو چھپا لیتا؟

نذیر۔ کیا حرج تھا۔؟

بشیر۔ یعنی تمہارا مقصد ہے کہ انسان سچ نہ بولے۔

نذیر۔ اوہو! تم عجیب آدمی ہو۔ سمجھتے ہی نہیں۔ میرا مطلب ہے

آخر دنیا میں سچ بولنے والے تم ہی رہ گئے ہو۔ سچ
بول کر دنیا کو اپنا دشمن بنانیوالے!

بشیر۔ تو تم چاہتے ہو۔ دشمنی کے خوف سے کوئی بھی بات نہ
کرے۔

نذیر۔ زمانہ تو ایسا ہی ہے۔ آخر سچ بولنے کا فائدہ؟

بشیر۔ سچ بولنے کا فائدہ۔

سلیمہ۔ ابا جان!

بشیر۔ ٹھیرو بیٹا!

سلیمہ۔ (پاس آکر) ابا جان!!

بشیر۔ کیوں بیٹا!

سلیمہ استانی جی نے کل ہم سے کہا تھا۔ ہمیشہ سچ بولا کرو

بشیر۔ (نذیر کیطرف دیکھکر۔ قدرے توقف کے بعد) ہاں
بیٹا ٹھیک ہے

سلیمہ۔ لیکن چچا جان تو ابھی ابھی کہہ رہے تھے۔ کہ
سچ نہیں بولنا چاہیئے

(بشیر اور نذیر ایک لمحہ کے لئے خاموش
ایک دوسرے کا منہ تکتے ہیں۔)

آبا!...... ابا جان!!

بشیر۔ کیا کہتی ہو سلیمہ؟

سلیمہ۔ ابا جان ہمیں سچ بولنا چاہیئے۔ یا نہیں!

بشیر۔ بیٹا اپنے چچا سے پوچھو۔!

سلیمہ۔ (نذیر سے مخاطب ہو کر) کیوں چچا جان ہمیں سچ بولنا
چاہیئے نا۔؟

نذیر۔ (توقف کے بعد ذرا ہکتے ہوئے) ہاں سچ بولنا چاہیئے
...... لیکن...... لیکن
جب سچ بولنے کا موقع ہو۔

سلیمہ۔ سچ بولنے کا موقع کون سا ہوتا ہے؟

نذیر۔ اب تمہیں کیا بتاؤں۔ کونسا موقع ہوتا ہے؟

سلیمہ۔ نہیں مجھے ضرور بتایئے۔

نذیر۔ نہیں بیٹا تم ابھی نہیں سمجھ سکتیں۔

سلیمہ۔ میں کیوں نہیں سمجھ سکتی!

نذیر۔ اس لئے کہ تم ابھی نادان ہو۔ جب بڑی ہوگی تو
تمہیں بتائیں گے۔

سلیمہ نہیں مجھے اب بتایئے۔

نذیر (ذرا غصے کی صورت بنا کر) دیکھو [illegible]
سے ذرا ننھے میاں سعید کو تو لاؤ۔ اس سے [illegible]

(سلیمہ باد ل ناخواستہ اندر جاتی ہے)

(نذیر سے مخاطب ہوکر جو مسکرا رہے ہیں)

اتنی کم سن اور اتنی ضدی! آخر تمہاری لڑکی ہے نا!

صوفی تبسم۔ ایم۔ اے

# ہم لوگ

(پروفیسر فراق (گورکھپوری) الٰہ آباد یونیورسٹی)

پیامِ حسنِ چمن خار زار ہیں ہم لوگ — جو سر بسر ہے خزاں وہ بہار ہیں ہم لوگ
تغافلِ نگہِ ناز یار ہیں ہم لوگ — بلاکشانِ غمِ انتظار ہیں ہم لوگ
کوئی سمجھ نہ سکے کوئی بے خبر نہ رہی — کچھ ایسی مصلحتِ کردگار ہیں ہم لوگ
ز فرق تا بقدم بجلیوں میں ڈوبے ہیں — نگاہِ یار ترے بیقرار ہیں ہم لوگ
غرض وصال سے ہم کو نہ کام فرقت سے — نہ جانے کیوں ہمہ تن انتظار ہیں ہم لوگ
ہمیں سے آنکھ ملی حسن کی ہمیں سے جھکی — وہ کشتۂ نگہِ شرمسار ہیں ہم لوگ
تمام خونِ جگر ہیں تمام زخمِ نہاں — یہ کس بہار کے آئینہ دار ہیں ہم لوگ
اٹھو اٹھو کہ وہ زنجیرِ شامِ غم ٹوٹی — صدائے نغمۂ صبحِ بہار ہیں ہم لوگ
ہیں رازدارِ غمِ کاروانِ نہ افلاک — شکستہ رنگِ رخِ روزگار ہیں ہم لوگ
ہمارے زیرِ نگیں ہیں بلندی و پستی — مکینِ ارض و فلک اقتدار ہیں ہم لوگ
چلے ازل سے تو رکنے کا نام تک نہ لیا — وہ نشترِ دلِ ہستی فگار ہیں ہم لوگ
فریبِ حشر نہ کھا آفتابِ محشر کے — جہاں میں جلوۂ نصف النہار ہیں ہم لوگ
تمام شہرِ خموشاں تمام جوشِ حیات — صدائے صور ترے پردہ دار ہیں ہم لوگ
سوادِ شام ہیں پیراہنِ شبِ غم ہیں — وہ پو پھٹی کہ ادھر تار تار ہیں ہم لوگ
ہمیں ہیں مہر و محبت ہمیں ہیں قہر و غضب — جہاں میں جلوۂ صد نور نار ہیں ہم لوگ
ارے یہ سوز نہانی ارے یہ شدتِ ہوش — یہ کس نگاہ کے سرمایہ دار ہیں ہم لوگ

ہر اک نفس میں نہاں سوز و سازِ بزمِ مجاز
دلِ تپاں شمعِ بے قرار ہیں ہم لوگ

تمام برق نشیمن تمام آتشِ گل
چمن میں شعلۂ صوتِ ہزار ہیں ہم لوگ

شبِ ہجر کے اڑانے کو تبسمِ قاتل میں
بجھے ہوئے تبِ آبدار ہیں ہم لوگ

ہزار بادِ مخالف ہزار طوفاں میں
نہ بجھ سکے وہ بھڑکتے شرار ہیں ہم لوگ

ہمیں سے موجِ حوادث کا دل لرزتا ہے
سوارِ کشتیِ طوفاں نگار ہیں ہم لوگ

پھری نہ پیچھے کبھی رزم گاہِ عالم میں
کہ شان و نازشِ صد کارزار ہیں ہم لوگ

جہاں فسردہ ہوئے نبضِ کائنات چھٹی
فریبِ دہر ترے اعتبار ہیں ہم لوگ

ہمیں ہیں دامنِ دشتِ جنوں میں گریۂ شام
چمن میں خندۂ صبحِ بہار ہیں ہم لوگ

ہیں مہر و ماہ کی آنکھوں میں بھی سمائے ہوئے
یہی نہیں ہے کہ مشتِ غبار ہیں ہم لوگ

ہماری جلوہ گری میں بھی شانِ صحرا ہے
بہارِ گلشنِ بے برگ و بار ہیں ہم لوگ

تمام سازِ خموشی تمام ہنگامہ
امینِ جلوۂ منصور و دار ہیں ہم لوگ

جسے سکونِ ابد بھی ترس گیا ہے فراق
وہ سازِ غم وہ دلِ بے قرار ہیں ہم لوگ

فراق گورکھپوری

# اِستبدادیّت

از قلم محمد رحمت اللہ ارشد مدیر "شمس الاسلام" بھیرہ

لاریب آج ہنگامۂ زارِ عالم کا ہر متنفس سیاسی انتفاع اور تدبیر مدن کی بہتر سے بہتر تجاویز سوچنے کے لئے اپنے دل و دماغ کو مصروف عمل کر رہا ہے۔ اقوام شرق اسی شغل میں مست اور اقوام غرب اس کی رنگینی سے سرشار ہیں۔ آزادی فکر و ذوقِ جہدانی کے سطحی مفہوم نے بہت سے تعلیمیافتہ حضرات کی سیاسی دنیا میں انقلاب پیدا کر دیا۔ چونکہ معاملہ فہمی، دقتِ نظری، فکر رسی اور نقطہ بینی کے معیاروں میں بلند و پستی کے لحاظ سے زمین و آسمان کا تفاوت ہے۔ اس لئے نتائج کے لحاظ سے بھی بہت سا تفاوت ہے۔ ہر سیاست دان کا مرتب کردہ نظریہ اسی میدان کے دوسرے شاہسوار کے نتیجہ سے متغایر و متضاد نہیں ہے۔ اور یہی وجہ کہ ہر سلطنت و حکومت کا نظام حکومت و سلطنت اپنا اپنا ہے۔ اور ہر مقتدر حکومت اپنے اپنے نظام کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہے۔

سرزمین ہند میں غیر ملکی حکومت کی استعمار پرستی ایسی حکمت ہی کے باعث عوام و خواص سیاست کے گیت الاپنے میں سرشار مدہوش ہیں۔ اور بعض ایسے حضرات بھی ہیں جو دورِ موجودہ کی رنگینی پر اطمینان کرنے سے بہت سی علمی، عملی، فکری، نظری غلط فہمیوں کا شکار ہو چکے ہیں۔ اسی سلسلہ کے اندر گذشتہ "محقق"[٭] میں ایک فاضل نامہ نگار نے "جمہوریت" کے خلاف قلم اُٹھایا غالباً جمہوریت کے خلاف یہ ایک پہلی آواز تھی جو ہمارے کانوں تک پہنچی۔ آپ نے سب سے پہلے "جمہوریت" کی تعریف ابراہیم لنکن کی زبان سے "افراد کی حکومت افراد کے ذریعہ اور افراد کے لئے" کی ہے۔ ہمارے نقطہ نظر سے بھی جمہوریت کی صحیح ترین تعریف یہی ہے۔ ہمارے محترم مضمون نگار نے جمہوریت کے قیام کی تائید میں حسب ذیل چیزیں اور تفصیل پیش کی ہیں۔

(۱) جرمی بنتھم اور اُس کا شاگرد جمنیرل جمہوریت کے راگ الاپتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ جمہوریت اعلیٰ ترین طرز حکومت ہے۔

(۲) جمہوریت چند افراد کے اختیارات کے غلط استعمال پر ایک زبردست تحفظ ہے۔

(۳) جمہوریت میں زیادہ سے زیادہ افراد کو طمانیت حاصل ہو سکتی ہے۔

(۴) سرمایہ دار و مزدور کی غیر مساویانہ تقسیم صورت حالات کو خطرناک بنا رہی ہے۔

اور اس کے بعد جب جمہوریت کے خلاف اپنے جذبۂ فکر و نظر کی تشریح شروع کی تو اس کی تائید میں ایک افلاطون کا قول پیش کیا۔ اور سب سے بڑا نقص یہ بتلایا کہ جمہوریت میں "قابلیت" کو صرف اکثریت کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھایا جاتا ہے" اور کہ جمہوری نظام میں ارباب اقتدار اکثر ذکاوت سے خالی ہوتے ہیں۔

اس سے متعلق سب سے اولین عرض تو یہ ہے کہ ہمیں اپنے نظریہ کے فہم و علم میں اپنے دماغ کے پیش نظر موجودہ سیاسی مشکلات کا جائزہ لینا چاہیئے سرزمین ہند کی موجودہ سیاست واقعات کی رفتار اور تمام معاملات ہمارے سامنے ہیں ہم۔ اور ہمارے فاضل نامہ نگار کو اس میں قطعاً اختلاف نہیں ہوگا۔ کہ ہم

٭ شمارہ ... بابت ماہ دسمبر ۱۹۳۶ء کے رسالہ میں مضمون "جمہوریت" ملاحظہ فرمائیں۔

سیاست ، بلحاظ کسی معاملہ میں کسی کی تقلید کا طوق اپنی آزاد گردن میں ڈالنا نہیں چاہتے۔ کیونکہ اگر اس مسئلہ میں تقلید و تقلید کو ہی دیکھا جائے تو انہیں خود اعتراف ہے کہ۔

ہندوستان کی سیاسیین کی جو آوازیں ہمارے کانوں میں صدائے بازگشت کے طور پر پڑ رہی ہیں۔ ان کا حاصل آزاد ہندوستان میں جمہوریت کا قیام ہے۔ جب تمام ملت ہندیہ کے مدبر سیاست فہم جمہوریت کے قیام کے حق میں ہیں۔ تو پھر اکثریت کی تقلید چھوڑ کر اقلیت کا اقتدار عقل و دانش بصیرت و ادراک کے خلاف ہے۔

افلاطون نے جس دور زندگی میں جمہوریت کے خلاف جہاد کیا وہ حقیقتاً جمہوریت نہ تھی۔ وہ استبدادیت تھی۔ مگر اپنے بدترین نقائص کو جمہوریت کے الفاظ میں ڈھانپنا چاہتی تھی۔ اگر آزاد جمہوریت ہوتی تو پھر افلاطون جیسے برگزیدہ اہل عقل کو ایسے تلخ حقائق سے آشنا ہونا نہ پڑتا۔ جس کی مثال اُس کی زندگی میں ملتی ہے۔

اگر تعمق نظر سے افلاطون کے بلند پایہ مضمون کے مفہوم کو پرکھا جائے۔ تو یقیناً یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ آزاد جمہوریت کے حق میں ہے۔ اور اسی میں انسانی لوازمات کی بارآوری سمجھتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ:۔

"کہ جب ہم بیمار ہوتے ہیں تو اعلےٰ سے اعلےٰ ڈاکٹر کی تلاش کرتے ہیں۔ تو کیا یہ موزوں و مناسب نہیں کہ جب تمام ملک سیاسی بدحالی کے مہلک امراض میں کراہ رہا ہو۔ اسوقت ایک بہترین دانشمند اور ماہر سیاست کی قیادت و خدمت کی تلاش کرتے وہ قطعاً نہیں چاہتا کہ عنانِ حکومت ایسے افراد کے ہاتھ میں ہو۔ جو عوام کے منافع و مفاد پر غور نہ کرتے ہوئے ملک کو بدترین الجھنوں میں الجھا دے۔ اور سقراط کی سزائے موت بھی اسی تلخ حقیقت کا ایک مفہوم ہے۔ کہ وہ جمہوریت نہیں تھی۔ بلکہ جمہوریت کے پس پردہ ہوا پرستی کا انانیت پسندی کا دیو حکومت کر رہا تھا۔

باقی رہا یہ سوال کہ جس کو زیادہ سے زیادہ افراد حاصل ہو جائیں وہی برسر اقتدار ہو جائے اور قابلیت کی کوئی قدر نہ کی جائے" یہ ایک فرضی دعوےٰ کا صدا بر سر جلوۂ سراب ہے۔ یہ قوم کی جہالت و کم فہمی ہے کہ وہ قابلیت کی قدر نہ کرتے ہوئے "ذکاوت سے خالی"

انسان کے قدموں پر اپنی قیمتی آراء کو قربان کر دیتے ہیں۔ ایسے حالات میں قوم کی جہالت و بدذوقی کی اصلاح کیجائے نہ کہ نفسِ جمہوریت کے خلاف قلمی جہاد شروع کر دیا جائے۔ اور اگر بالفرض ہمارے فاضل مضمون نگار کے حسب منشاء قابلیت کی قدر کرتے ہوئے عوام کی آراء کو بنظرِ نفرت و حقارت ٹھکرا دیا جائے تو ایسے نظامِ حکومت میں کہاں تک استحکام کی امید کیجا سکتی ہے۔ جبتک کسی اقتدار جماعت کیساتھ عوام کا تعاون شامل نہ ہو۔ اور اُنکے قیمتی آراء اُن کے حق میں نہ ہو۔ اُس وقت تک حکومت کی نصرت و فتح کی امید کہاں تک ہو سکتی ہے۔ واقعات شاہد ہیں کہ جبتک حکومت کو رعایا کا تعاون حاصل رہا۔ حکومت کیلئے کس حد تک طمانیت و سکون اور آسانیاں میسر تھیں لیکن جب ملک و ملت نے معمولی سی بے اعتنائی اختیار کی۔ صورتِ حالات کس قدر خطرناک ہوئی۔ اور روز روز نا ملائم و نامناسب حالات پیدا ہو رہے ہیں۔ اربابِ حکومت ہی جانتے ہیں کہ انہیں کس قدر مہیب اور وحشتناک مراحل سے عبور کرنا پڑتا ہے

علاوہ ازیں نفع و نقصان اور فائدہ و خسران کے سمجھنے کے لئے سب سے بہترین شاہد موجودہ حالات اور روز مرہ کے واقعات ہوتے ہیں۔ شخصی حکومت کے خطرناک نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ مگر جمہوری سلطنت کے وہ کون کون سے دفعات و واقعات ہیں۔ جنہیں مضر اور نقصان رساں کہا جا سکتا ہے؟ ربع مسکون میں شخصی اور جمہوری حکومت دونوں موجود ہیں۔

موازنہ آسان ہے۔
فاضل مضمون نگار نے جمہوریت کے خلاف تو بہت کچھ زہر آلود الفاظ استعمال کئے مگر اپنی ذاتی رائے سے مطلع نہ فرمایا۔ کہ وہ کس نظامِ حکومت کے مستحق ہیں۔ اور ان کی نظر میں موجودہ سیاسی۔ بدحالی۔ کس تنظیم کی مقتضی ہے۔ کیونکہ حکومت کی کئی قسمیں ہیں۔ مثلاً۔ اشتراکیت۔ فسطائیت۔ آمریت مطلقہ وغیرہ وغیرہ۔
نیز اُن حقائق کا جواب بھی نہ دیا جو اس سے قبل چار عنوانوں کے ماتحت بیان کئے گئے ہیں۔ مثلاً جمہوریت میں اکثر افراد کو سکون و اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ اور سرمایہ دار و مزدور کی غیر مساویانہ تقسیم صورتِ حالات کو خطرناک بنا دیتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ حالانکہ یہی ایسے واقعات ہیں۔ جن کی تردید جمہوریت کی تردید ہے۔

فسانۂ خمِ گیسو دراز تر گفتم
دلم گلہ ہمیں دارد کہ مختصر گفتم

(علامہ) ارشد جامی

# بادۂ شبانہ

اگر آں ترکِ شیرازی بدست آرد دلِ ما را
بہ بینم در دلِ خود جلوہ ہائے طورِ سینا را

نہ من تنہا ز عشقِ شاہدِ یکتا ہمی سوزم
ز نقشِ داغ میدارد بیا بیں قلبِ لالہ را

بیا در محفلِ ساقی بنوش و کوش در مستی
کہ رندِ مست در جامے بہ بیند سرِ فردا را

ز ہر ذرّہ کہ کوئے او "انا المحبوب" می شنوم
کرا محبوب گردانم کرا سجدہ سزد ما را

خلیل آں یارِ ہر جائی اقامت در دلم دارد
ندارم حاجتِ رفتن بکعبہ یا کلیسا را

خلیل

# ملکی زبان کی ترقی

(جناب طالب جعفری صاحب)

اِس وقت تمام دنیا شاہراہِ ترقی پر گامزن ہے۔ ہر فرد ہر ملک ہر ملت آگے بڑھنے کے لئے بیقرار نظر آتا ہے۔ ہمارا بھی فرض ہے کہ جتنی سعی ہمارے قبضہ قدرت میں ہو۔ اُس کے لئے بخیل نہ بنیں قوم میں افراد کا مجموعہ ہیں۔ اِس لئے ہر فرد کا فرض ہے کہ وہ ملکی زبان کی ترقی میں حصہ لے۔ اِس وقت اردو نہ صرف ہندوستان میں سب سے زیادہ مروج ہے اور جہاں کہیں جاؤ اِس کے سمجھنے والا موجود ہے۔ بلکہ یہ کہ اردو ہندوستان سے نکل کر چین افغانستان۔ ایران۔ عراق۔ عرب مصر تک پہنچ گئی ہے۔ جہاں کہیں ہندوستانی جاتے ہیں وہاں اردو زبان اِن کیساتھ چلی جاتی ہے۔ اصل میں اردو میں صلاحیت موجود ہے۔ یہ تمام زبانوں کا نچوڑ ہے۔ اور پھر کہ کاریگر نے اِن تمام ثقیل چیزوں کو نکال کر باہر کیا ہے۔ جو کسی طرح سے گراں معلوم ہوتی تھیں۔ زبان شستہ اور پاکیزہ ہوتے ہوتے آج اِس حال کو پہنچی ہے۔ بولنے میں بہت آسان اور سمجھنے میں بلا دِقت ہمارا فرض ہے کہ ہر ممکن طریقے سے اردو کی توسیع اشاعت کے لئے سعی فرما کر ملک و قوم کی خدمت عظیم کا ثواب حاصل کریں۔ ورنہ تمہارے بزرگوں کے خونِ جگر سے سینچا ہوا نہال عین شباب کے عالم میں پژمردہ ہو کر رہ جائے گا۔ اور آئندہ آنے والی نسلیں آپ کو مورد نفرین ٹھہرانے کے علاوہ نا فرض شناس قرار دیں گی۔ ملک کے سرکردہ لوگوں کی طرف سے مختلف رسائل اور اخبارات میں وقتاً فوقتاً عملی تجاویز پیش ہو رہی ہیں۔ جن کا ملخص یہ ہے:

(۱) نامور ادبائے ملک کی مالی امداد سے حوصلہ افزائی کیجائے۔

(۲) اخبارات و رسائل کی بصورتِ خریداری اعانت کیجائے۔

(۳) تصنیف و تالیف کے سلسلے کو وسیع کیا جائے اور ایسے اداروں کی مدد کیجائے۔

(۴) نئے اخبارات و رسائل کا اجرا عمل میں لایا جائے

(۵) ادبی مراکز کے حلقۂ کار کو زیادہ با اثر بنایا جائے۔

(۶) سکول اور کالجوں کے طلباء میں ادبی مذاق پیدا کرنے کے لئے لائبریری کی کتابوں کا استعمال کرایا جائے۔ ادبی مجالس کا اجراء کیا جائے۔ کبھی کبھی مقابلے کے یا انعامی مضامین بھی لکھوائے جائیں۔

(۷) محکمہ تعلیم کے افسران اور اساتذہ کرام اردو علم و ادب کی طرف بیش از بیش توجہ مبذول فرما کر ملک کو شکرگزاری کا موقعہ دیں۔

(۸) شہروں کی سرکاری اور قومی لائبریریوں کے سپرد کارکن شکر فائدہ اٹھایا جائے۔

(۹) شہروں اور قصبوں اور گاؤں میں نئی لائبریریاں کھول کر لوگوں میں ادبی مذاق پیدا کیا جائے۔

(۱۰) نئے مضمون نگار حضرات کی حوصلہ افزائی کیجائے تاکہ انکا شوق دن بدن ترقی پر ہو۔

(۱۱) صاحب استطاعت لوگ فیاضی سے کام لیکر عطیات عنایت کریں تاکہ علمی کام میں مدد مل سکے۔

(۱۲) با اثر اور صاحب ذوق لوگ زبان اردو کا پروپیگنڈا کریں اور علمی کام کا افتتاح کریں۔

(۱۳) مشاہیر انکا استقلام کیا جائے۔

(۱۴) جلسے منعقد کرکے قابل اور بااثر لوگوں سے تقاریر کے ذریعہ لوگوں کو ترغیب دلائی جائے۔ کہ وہ اردو کی اشاعت میں حصّہ لینا اپنا فرض سمجھیں۔

(۱۵) انگریزی کے دلدادہ نوجوان اپنی ملکی و ملی زبان سے بے اعتنائی کرنیکی بجائے رشتۂ آشنائی جوڑیں۔

(۱۶) بالغ آدمیوں اور عورتوں کو اردو کی تعلیم دیجائے۔ چھوٹے لڑکیوں کو بھی اردو سے آشنا کیا جائے۔

(۱۷) موجودہ سکولوں سے فائدہ اٹھانے کے علاوہ اردو کی تعلیم کیلئے نئے سکول کھولے جائیں۔

(۱۸) خواندہ اصحاب کو اردو کیطرف مائل کرنے کے لئے پمفلٹ شائع کئے جائیں۔

(۱۹) کوشش کیجائے کہ سکولوں میں ذریعۂ تعلیم اردو قرار دیا جائے۔ نیز یہ بھی کوشش کیجائے کہ سرکاری غیر سرکاری اور ترمی دفاتر کا کام عام خط و کتابت اور نوشت کا کام اردو میں کیا جائے۔

(۲۰) عام لوگ خاصکر نوجوان طبقہ انگریزی وغیرہ کی بجائے اردو میں گفتگو کرے۔

(۲۱) منظم کوشش ہمیشہ زیادہ دیرپا اور مؤثر ثابت ہوتی ہے۔ اس لئے حتی الامکان کام کا زیادہ حصّہ منظم صورت میں کیا جائے۔

(طالب جعفری)

# "محقق" کا اجراء

جناب مولوی حفیظ الرحمٰن صاحب حفیظ

ملک پانی سے ہے زندہ اور رعیت علم سے
جسطرح بغداد میں دجلہ تھا اور دیں نظام

عہدِ صادق میں ہوا ماہِ "محقق" کا طلوع
اسکی علمی چاندنی ہو گی ترقی کا پیام

مرحبا اے چشمۂ علم اے "محقق" مرحبا
تشنگانِ علم و حکمت کو بنا دے شادکام

(حفیظ)

# وائرلیس اور لاسلکی دوربینی

جو بات ایک صدی میں صرف فلسفہ دان ہی سمجھ سکتے ہیں وہ دوسری صدی میں عام خلقت کی زبان پر ہوتی ہے۔ اسی طرح سے ایک چیز جو کہ ایک صدی عجائبات روزگار میں سے ہو دس بیس سال کے بعد عام ہو جاتی ہے۔ آجکل وائرلیس کے سٹ عام ہو رہے ہیں۔ جن کے ذریعے کئی سو میل دور سے انسانی آواز سنی جا سکتی ہے۔ اب اس کو معمولی بات سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ چند سال پیشتر لوگ اسے عجائبات سے گنتے تھے۔ بالکل اسی طرح سے لاسلکی دوربینی جو کہ آجکل عجائبات میں سے گنی جاتی ہے۔ بیس تیس سال بعد ہر ایک گھر میں موجود ہوگی۔ اور ہم اپنے گھر میں بیٹھے یونیورسٹی میچ ہوتے ہوئے یا پولو یا گھوڑدوڑ ہوتی ہوئی یا لنڈن میں بادشاہ کی رسم تاجپوشی ہوتی ہوئی بالکل ایسے دیکھ سکیں گے۔ جیسے کہ ہم وہاں پر موجود ہوں۔ اگر وائرلیس میں برقی کان کی خدمت مستعار لیجاتی ہے تو لاسلکی دوربینی (TELEVISION) میں برقی آنکھ کی۔ وائرلیس کی برقی آنکھ کو انگریزی میں مائیکروفون (MICROPHONE) کہتے ہیں۔ یہ کام بولنے والے کی آواز کا مدوجزر اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ اور اس کو برقی لہروں میں تبدیل کر دیتا ہے۔ یہ لہریں جو کہ آواز کے اتار چڑھاؤ کے مطابق ہلکی یا تیز ہوتی ہیں۔ وائرلیس اسٹیشن کے کھمبے سے فضا میں ہر طرف روانہ ہو جاتی ہیں۔ انکی رفتار ایک لاکھ اسی ہزار میل فی سیکنڈ ہوتی ہے۔ جب یہ ہمارے سٹ کے گھر کے اوپر لگے ہوئے کھمبے یا تار سے ٹکراتی ہیں۔ تو اس میں داخل ہو کر اور نیچے آ کر ایک آلہ صوت کو بیدار کر لاتی ہیں جو کہ ان کو انسانی آواز میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اسطرح سے سننے والے ہر ایک بات جو سٹیشن پر کہی جائے بعینہ اور تقریباً اسی وقت سن لیتے ہیں۔ اسی طرح سے ہم روز شام کو دہلی یا لنڈن سے ہر ایک قسم کے گانے تقریریں منڈیوں کے نرخ اور تازہ تازہ خبریں سنتے ہیں۔

وائرلیس نے انسان کو اس صنعت سے تو بہرہ ور کر دیا کہ وہ دنیا میں ہر جگہ کی خبر لے سکتا ہے۔ مگر ابھی ایک کمی باقی تھی کہ وہ آنکھ سے نہ دیکھ سکتا تھا۔ وہ اپنے گھر بیٹھا جرمنی کے اولمپک کھیلوں کے نتیجے تو سن سکتا تھا۔ لیکن اس کے دل میں حسرت رہ جاتی تھی کہ وہ گول فلاں کھلاڑی نے کس حکمت سے کیا۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے انسان کو ایک اور صنعت طلسم کے لئے جسکی مدد سے وہ اپنے آپ کو ہر جگہ موجود تصور پائے۔ سائنس دانوں نے لاسلکی دوربینی ایجاد کی ہے۔ اس میں ایک برقی آنکھ استعمال کی جاتی ہے۔ یہ آنکھ روشنی اور سائے کے عکس کو لیکر اس کو بجلی کی لہروں میں اسی طرح تبدیل کر دیتی ہے جسطرح کہ برقی کان۔ یہ لہریں ویسے ہی سٹیشن کے کھمبوں سے باہر کو پرواز کر جاتی ہیں۔ اور جب یہ لاسلکی دوربینی کے سٹ میں داخل ہوتی ہیں تو مدھم یا تیز روشنی میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ یہ روشنی جب پردے (SCREEN) پر جا کر پڑتی ہے تو اسپر مکمل تصویریں بن جاتی ہیں اور دیکھنے والے۔ اور گانے والے . گویا اس واقعہ کو بالکل اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتے ہیں۔

لاسلکی دوربینی میں استعمال ہونیوالی یہ آنکھ کئی قسم کی ہوتی ہے مگر اصول سب میں ایک ہی ہوتا ہے۔ طریقہ یہ ہوتا ہے کہ تقریر کرنے والے یا گانے والے کو ایک اندھیرے کمرے میں بٹھا دیتے ہیں

اور ایک آرک لیمپ (ARC LAMP) کی روشنی کی زبردست روشنی کی
کرن BEAN اس پر پھینکی جاتی ہے۔ یہ روشنی مستقل طور
پر اس پر نہیں پڑتی رہتی بلکہ لیمپ کے سامنے ایک تیز گھومنے والی
تھالی ہوتی ہے۔ تیس چوکور سوراخ مندرجہ ذیل شکل میں ترتیب
دئے ہوئے ہوتے ہیں۔ 
انکی وجہ سے روشنی کی موٹی کرن چھوٹے چھوٹے حصوں کی
کافی تعداد میں منقسم ہو جاتی ہے۔ جب یہ تھالی زور سے گھومتی ہے
تو روشنی باری سے پڑتی ہے۔ اور باری سے سوراخ کے راستے
گذر جاتی ہے۔ چونکہ سوراخ سیڑھی کی شکل میں ترتیب دئے ہوئے
ہوتے ہیں۔ روشنی گانے والے کے سر سے پیر تک پھرتی ہے
روشنی کی یہ تیز حرکت آنکھ سے نہیں دیکھی جاسکتی۔ بلکہ گانے والا
ایک مستقل روشنی میں کھڑا نظر آتا ہے
اب ہم برقی آنکھ کی ساخت بیان کرتے ہیں۔ اس میں فوٹو
الیکٹرک سیل (PHOTO ELECTRIC CELL) کے دو سٹ لگے ہوئے ہوتے ہیں۔
جو کہ روشنی سے بہت جلد اثر پذیر ہو سکتے ہیں۔ گانے والے کے
جسم سے روشنی کا تیز یا مدھم پرتو ان پر پڑتا ہے۔ مثلاً اس کے کالے
کوٹ سے اس کے سفید کالر یا چہرے کی روشنی کی مقدار کے برابر
ہوتی ہے۔ پھر ان برقی لہروں کو مجتمع کیا جاتا ہے۔ اور اسٹیشن کے
ذریعے سے باہر کو روانہ ہو جاتی ہیں۔ اسیطرح یہ دنیا میں پھیلجاتی ہیں۔
اور جب راستے میں ریڈیو اور کھمبے ملے تو اس میں سے ہو کر نیر لیمپ
NEARLMP میں داخل ہو جاتی ہیں۔ نیر لیمپ آجکل بازاروں
میں عام طور پر اشتہار بازی کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔
یہ شیشے کی نالیوں کی صورت میں ہوتے ہیں۔ جو کہ سرخ رنگ کی
روشنی سے چمکتے ہیں۔ لاہور میں ٹھنڈی سڑک پر کئی دوکانوں کے
نام مثلاً سیورلا کمپنی وائٹ وے اس لیمپ کے حروف سے بنے
ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ لیمپ برقی لہروں سے اتنے ہی اثر پذیر ہوتے
ہیں۔ جتنا کہ فوٹو الیکٹرک سیل۔ گویا برقی آنکھ روشنی کے کم یا زیادہ
ہونے سے جب برقی لہریں کھمبے میں سے ہو کر لیمپ میں آتی ہیں
تو ان کی طاقت کے مطابق لیمپ تیز یا مدھم ہو کر چمکتا ہے۔ اس لیمپ
کی روشنی ایک گھومنے والی تھالی میں سے ہو کر گذرتی ہے۔ جس میں
بالکل مذکورہ بالا طرح سے سوراخ ہوتے ہیں۔ اور روشنی کی یہ تیز یا مدھم
کرنیں پردہ کے اوپر سے لیکر نیچے تک دورہ کرتی ہیں۔ اور
اس طرح گانے والے کی تصویر پردہ پر آجاتی ہیں۔
لاسلکی دوربینی کے بیشمار فائدے ہیں۔ سکولوں میں بچوں
کی تعلیم کے لئے یہ وہ جانور دنیا کے بڑے بڑے چڑیا گھروں سے لیکر انکو
دکھاسکتی ہے۔ جو کہ وہ مر بھر وہاں جا کر نہیں دیکھ سکتے۔
(سید عزیز احمد گیلانی۔ ایم۔ ایس۔ سی)

## جواہر ریزے

جناب عزیز احمد صاحب کے قلم سے نکلے ہوئے اُن کے افسانہ
"جوہی" میں سے لئے گئے۔
"مرد کئی (عورتوں کی) محبت کا دم بیک وقت بھر سکتا ہے"
(عورت یہ کہتی ہے) "مجھے آپ ہمیشہ یکساں پائینگے۔ میری محبت
میں فرق نہ آئیگا۔ چاہے آپ بدل جائیں (شادی کے بعد) اور
بدل جانا چاہیئے۔ آخر کچھ اس آئیوالی نیک بخت کا بھی تو حق ہے"
"ہر عورت شادی کے بعد اپنا ماضی بھول جاتی ہے"

---

نوٹ:۔ دفتر سے خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر
کا حوالہ ضرور دیں۔
(ایڈیٹر)

# مقاصدِ تعلیم

انسانی زندگی کے میدان میں اب تعلیم ایک نہایت ضروری چیز ہو گئی ہے۔ آجکل غیر تعلیمیافتہ انسان صرف وہی زندہ رہ سکتا ہے۔ جو کسی فن یا صنعت میں ماہر ہو۔ ورنہ بے ہنر اور بے علم آدمی سوسائٹی دنیا پر ایک ناقابل برداشت بوجھ سمجھا جاتا ہے۔ بیشک موجودہ تعلیم میں بہت کچھ اصلاح کی ضرورت ہے۔ پھر بھی تعلیم سے بے بہرہ کوئی شخص بھی نہیں رہنا چاہیئے۔ تاریخ سامنے ہے۔ ہندوستان کے بعض فرقوں کو جسقدر بلحاظ قومیت اور رفتار ترقی کے رُک جانے کے نقصان برداشت کرنا پڑا ہے۔ وہ صرف تعلیم کی بے توجہی سے تھا۔ علم و بصارت۔ زیور اور طاقت کہا گیا ہے۔ فی الواقع ایک بے علم انسان اندھے آدمی کے مشابہ ہے۔ اس کو دنیا و مافیہا کی کوئی خبر نہیں۔ وہ دنیا میں حیوانات سے زیادہ اچھی زندگی کا مالک نہیں قرار دیا جا سکتا۔

اگر کسی فن کا ماہر ان اعلوم سے بھی بہرہ مند ہو۔ اور اپنے فن میں ترقی کے نئی نئی اسلوب پیدا کر سکتا ہے۔ اور اپنی ذریعہ معاش کو زیادہ سے زیادہ مفید اور باعث فلاح بنا سکتا ہے۔

علم کے ذریعہ انسان ایسے ایسے کام سرانجام دے سکتا ہے۔ جن کو بے علم آدمی اپنی طاقت سے بہت زیادہ اور بہت اہم خیال کرتا ہے۔

دُنیا کی اقوام کی تاریخ پر تبصرہ کرنے والے اصحاب جانتے ہیں۔ کہ کسطرح ملکوں اور قوموں نے قعرِ ذلت و گمنامی سے نکلکر علم کے ذریعے رفعت و کامیابی کے خزانوں پر قبضہ حاصل کیا۔

مسلمان بھی جب علوم و فنون میں رغبت رکھتے تھے۔ اسوقت ان کا لوہا تمام دنیا مانتی تھی۔ خلفائے عباسیہ کا عہدِ بغداد کبھی فراموش نہیں ہو سکتا۔ جسکے مدارس علوم و فنون سے تمام دُنیا کے متمدن اور شائستہ اقوام نے ابتدائی سبق سیکھا۔

دُنیا کے علوم و فنون کا ابتدائی گہوارہ بغداد کے مکاتب ہی رہے ہیں۔ مسلمانوں نے جب سے علم کا دامن چھوڑا۔ اس وقت سے ان کے لئے ترقی کیا زندگی کی راہیں تنگ ہو گئی ہیں۔

اگر کوئی قوم زندہ رہنا چاہتی ہے۔ اور یہ ہر ایک قوم کا فطرتی حق ہے۔ کہ وہ زندگی کے لئے جدوجہد کرے۔ سوائے علم و فن کے اور کوئی سبیل نہیں ہے۔

جسقدر لوگ اسوقت تعلیم کیطرف توجہ کرنیکی طرف عملی قدم اُٹھا رہے ہیں۔ وہ تعلیم کو ملازمت کا ذریعہ سمجھ رہے ہیں۔ لیکن یہ خیال اُن کا صحیح نہیں ہے۔ تعلیم کا مقصد یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ وہ انسان کو غلامی اور خلاف ضمیر عادات کی زنجیروں میں جکڑ دے۔ بیشک کامیاب ملازمت بھی تعلیم کا ایک ثمر خیال کیا جا سکتا ہے۔ لیکن تعلیم کے اعلٰے مقاصد میں اس کو کبھی نہیں شمار کیا جا سکتا۔ تعلیم پانیوالے طلبار کے دل میں اپنی تعلیم کے متعلق سب سے پہلا خیال یہی ہونا چاہیئے کہ وہ تعلیم پا کر ایک پختہ کار انسان کیطرح خلق کی خدمت اور ہمدردی کو اپنا نصب العین رکھے گا۔ وہ جس کام میں مشغول ہوگا اپنے پاک مذہب کے پاک اصول سے کبھی غافل نہ رہیگا۔ اسوقت لوگوں کے طبائع سے آل اندیشی کی صفت مفقود ہو گئی ہے۔ اتفاق باہمی ہمدردی ایثار۔ دیانتداری محنت اور نکوکاری کی دنیا کو از حد ضرورت ہے۔ تعلیمافتہ نوجوان ان صفات سے آراستہ ہو کر دنیا کو دکھائیں کہ ان کے اجداد کیا تھے وہ اپنی قوم میں نمونہ بن کر قابل تقلید ثابت ہوں و ملیے گھر اپنی برادری۔

متمدن تہذیب، ملک اور تمام دنیا میں اپنے زندہ ہونے کا ثبوت پیش کریں۔ وہ ایک چھوٹے سے حلقہ کو اپنے صحیح معیار کے مطابق ڈھالنے کے سلسلے کو شروع کریں۔ ان کی عالمانہ زندگی کا مقصد یہی ہونا چاہیے کہ وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ جیسے مدبر حضرت عمر فاروقؓ جیسے عادل حضرت عثمان غنیؓ جیسے فداکار اور حضرت علی المرتضیٰ شیرِ خدا جیسے صلح جو اور خالد بن ولید جیسے سردار، عمر بن عبدالعزیز جیسے نیک سرشت سلطان صلاح الدین جیسے علمبردار خلیفہ ہارون جیسے علم دوست۔ مامون الرشید جیسے منتظم ثابت ہوں۔ زندگی کے جس شعبہ میں ان کو کام کرنے کا موقعہ حاصل ہو۔ وہ اسی شعبہ میں ممتاز و کامیاب ثابت ہونے کے اہل مانے جائیں۔ ملازمت یا کوئی فن سیکھیں۔ یا دنیا کے کسی کام میں مصروف ہوں۔ ہمیشہ وہ پہلے سے بہتر ثابت ہوں۔ وہ صحیح معنی میں اپنے اسلاف کے وارث ہوں۔ پھر اپنی قوم کی حالت کو دیکھیں کہ کیا ہوتی ہے۔

میں نے تعلیم موجودہ کو محتاج اصلاح ظاہر کیا ہے۔ کسی آئندہ صحبت میں ان شاءاللہ تعالیٰ اس ضمن میں کچھ عرض کروں گا۔

موجودہ تعلیم کو فی الحال قومی تعلیم کہنا اور مکمل خیال کرنا درست نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ موجودہ مراکز علمی سے طلبا فارغ ہو کر کوئی خاص کام نہیں کر سکتے۔

حفظہ
محمد حفیظ الرحمن صاحب

# غزل

اسی دھن میں آگے بڑھا جا رہا ہوں — کہ شاید میں پیچھے رہا جا رہا ہوں

سمجھتا ہوں ظالم نگاہوں کا مطلب — اٹھانے سے پہلے اٹھا جا رہا ہوں

مرا ہر نفس اب دمِ واپسیں ہے — چراغِ سحر ہوں بجھا جا رہا ہوں

عجب وقتِ رخصت تھا حسرت کا منظر — "کہا جا رہے ہو، کہا جا رہا ہوں"

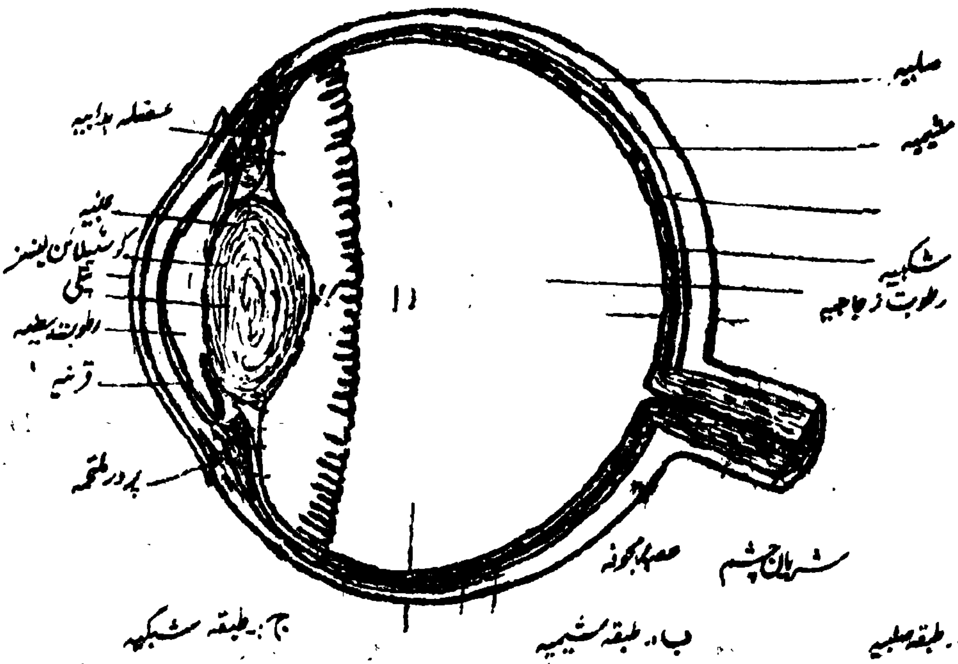
نہیں چھٹتا آزاد طرزِ سخن یہ
بہاؤ کے رخ پہ بہا جا رہا ہوں

(آزاد)

# آنکھ کا بیان

آنکھ قوت بینائی کا آلہ ہے۔ جو حواس خمسہ ظاہری میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے اطلاق میں کرۂ چشم (آئی بال) متعلقات پپوٹے اور پلکیں وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن اس وقت ہمارا مقصود صرف اس کے جزو اول (آئی بال) سے ہے۔ جو تین پردوں دو رطوبتوں اور ایک لینز کا بنا ہوا ہے۔

آنکھ کی بناوٹ کے متعلق قدیم حکماء کے کئی نظریے ہیں بعض تو آنکھ کے پردے پانچ اور بعض چھ کہتے ہیں۔ اور اکثر ان کو سات بیان کرتے ہیں۔ مگر ان سب کو چھوڑ کر جدید اناٹومی کے ذریعے سے تشریح کریں گے۔ جو حقیقی عمل پر مبنی ہے کیونکہ جمہور اطباء نے جو کچھ لکھا۔ اس کا کثیر حصہ نظریہ پر مبنی تھا۔ عملی کام سے وہ امداد لیتے تھے مگر کاملاً انحصار اس پر نہیں ہوتا تھا اسی سبب سے آج تک آنکھ کی تشریح کے متعلق اختلاف چلا آتا ہے۔ اگر ذرا کاوش سے کام لیتے۔ اور خود آنکھ کی بناوٹ کا معائنہ عملی طور سے کر لیتے۔ تو سب پر معاملات واضح ہو جاتے۔ اور کسی کو بھی اختلاف کرنے کا موقعہ نہ ملتا۔ موجودہ اناٹومی کے مطابق پردے تین ہیں




ا۔ طبقہ صلبیہ　　ب۔ طبقہ مشیمیہ　　ج۔ طبقہ شبکیہ

اب پانچ پردے بیان کرنے والے صلبیہ اور طبقہ مشیمیہ کے سامنے حصوں کو بالترتیب طبقہ قرنیہ اور طبقہ عنبیہ کے نام سے پکارتے ہیں۔ اور متشرحین طبقہ ملتحمہ کو بھی آنکھ کے پردوں میں شامل کر کے چھ شمار کرتے ہیں۔ اور سات کہنے والے رطوبت جلیدیہ کے

اوپر استر کرنے والی جھلی کو عنکبوتیہ کے نام سے ایک علیحدہ پردہ خیال کرتے ہیں۔ غرض جمہور علماء کے خیال کے مطابق آنکھ کے یہ سات پردے ہوئے۔

(۱) صلبیہ (SECLEOTICA) (۲) مشیمیہ CHORIOD
(۳) عنبیہ IRIS (۴) شبکیہ RETINA
(۵) قرنیہ (CORNIA) (۶) ملتحمہ CONJUCTIVA
(۷) عنکبوتیہ (CATIUL OF THE LENS)

اب ہم ذیل میں ہر ایک کی تشریح کرتے ہیں۔ تاکہ ہر خیال کا شخص ان سے فائدہ اٹھا سکے۔

(۱) صلبیہ SECLEROTICA وہ سخت اور مضبوط پردہ ہے۔ جو دماغ کی موٹی جھلی سے پیدا ہوا ہے۔ اور اس کا ⅙ حصہ بالکل صاف و شفاف ہے۔ اور باقی حصہ مکدر۔ یہ پردہ آنکھ کی بیرونی جانب ہوتا ہے۔ اور اس سے طبقہ قرنیہ (CORNIA) بنتا ہے۔ اور پیچھے سے قدرے موٹا ہوتا ہے۔ جہاں اس میں ایک سوراخ ہے جس کے راستے عصبہ مجوفہ (بینائی کا پٹھہ) آنکھ کے اندر داخل ہوتا ہے۔

(۲) مشیمیہ (CHORIOD) یہ پردہ ڈھیلے کے زیادہ حصے پر پھیلا ہوا ہے۔ اور طبقہ صلبیہ کی مانند پچھلی طرف سے قدرے موٹا ہوتا ہے۔ اس کا سامنا ⅙ حصہ طبقہ عنبیہ کہلاتا ہے۔ بڑھاپے میں انسان کا نزدیک کی چیزوں کو نہ دیکھ سکنے کی وجہ صرف اسی پردہ کی خرابی ہوتی ہے۔ کیونکہ عضلہ ہدبیہ CILIRY MUSCLES جو اس کی پتلی کو پھیلانے اور سکیڑنے میں مدد دیتا ہے۔ اس کی قوت کم ہو جاتی ہے۔ مشیمیہ کا اندرونی پرت

سیاہ رنگ کا ہوتا ہے۔ جس کے سبب سے روشنی کی شعاعوں کو جذب کر کے آنکھ کی اندرونی روشنی میں اعتدال پیدا کرتا ہے۔ جب کسی انسان کی یہ سیاہی کم ہو جاتی ہے۔ تو اسے روشنی میں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

(۳) عنبیہ ( ) یہ رطوبت بیضہ [illegible] کے پیچھے ایک رنگین پردہ ہے۔ اس کے درمیان ایک گول سوراخ ہوتا ہے جسے پتلی (PUPIL) کہتے ہیں اس کے ذریعہ دکھائی دینے والی چیز کا عکس آنکھ میں پہنچتا ہے۔ اس کا رنگ مختلف لوگوں میں مختلف ہوتا ہے۔

(۴) شبکیہ (RETINA) یہ آنکھ کا سب سے محسس پردہ ہے۔ اور اس پٹھے کا پھیلاؤ ہے۔ جو ڈھیلے کی پچھلی جانب سے خارج ہوا ہے۔ یعنی عصبہ مجوفہ کے پھیلاؤ سے ہی یہ پردہ بنا ہے۔ زندگی میں یہ پردہ شفاف اور گلابی رنگ کا ہوتا ہے۔ اس پردہ کے عین درمیان ایک زرد نقطہ ہے۔ جس کو ییلو سپاٹ (YELLOWSPOT) کہتے ہیں۔ اس جگہ بصارت بھی تیز ہوتی ہے۔ پردہ شبکیہ سے او پٹک عصب دماغ تک جاتا ہے۔ جس سے تمام چیزوں کی حس دماغ تک پہنچتی ہے۔ اور دماغ انہیں محسوس کرتا ہے۔ (۵) قرنیہ (CORNIA) قرن یعنی سینگ کے ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس پردہ کے طبق سینگ کے طبقات کی مانند مختلف ہیں اس لئے اس کا نام قرنیہ رکھ دیا گیا۔ جیسا یہ پردہ صلبیہ ہی کا ⅙ حصہ ہے۔

(۶) ملتحمہ (CONJUCTIVA) یہ ایک باریک جھلی سے بنا ہوا ہے۔ اور آنکھ کے طبقہ صلبیہ کے اگلے حصے پر ڈھیلے طور سے اتصال رکھتا ہے۔ جب کبھی آنکھ میں سرخی

معلوم ہوتی ہے ۔ تو وہ طبقہ ملتحمہ ہی کی خرابی پر دلالت کرتی ہے ۔ اس کو جدید تشریح والے طبقات چشم میں شامل کرتے ہیں
(۷) عنکبوتیہ (CATHALOPTHE LENS) حکماء کا زیادہ گروہ اس کا قائل نہیں چنانچہ ایسے ہیں ۔ جو رطوبت جلیدیہ کے اوپر استر کرنے والی جھلی کو پردہ اختیار کرتے ہیں ۔ مگر دور جدید میں اس کو پردہ نہیں مانتے ۔

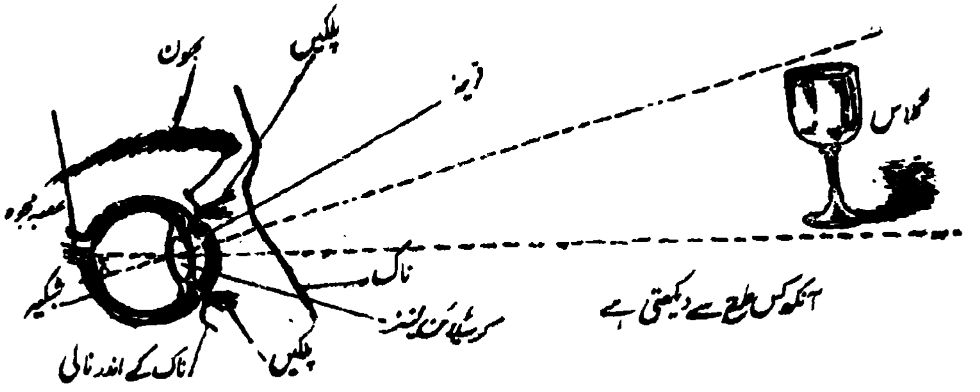
اب ہم رطوبات چشم کا مختصر حال بیان کرتے ہیں ۔

(۱) رطوبت بیضیہ (AQUEOUS HUMOR) یہ انڈے کی سفیدی کی مانند سیال اور شفاف رطوبت ہے ۔ اگر ہم کسی جانور کی آنکھ کا عملاً معائنہ کریں ۔ تو یہ رطوبت قرنیہ (CORNIA) کے پیچھے اور رطوبت جلیدیہ (CRYSTALINE LENS) کے سامنے سے برآمد ہوگی ۔ پردہ عنبیہ اس کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے ۔ اگلا حصہ حجرۂ مقدم (ANTERIAR CHAMBER) اور پچھلا حجرۂ موخر (POSTERIOR CHAMBER) کہلاتا ہے ۔

(۲) رطوبت جلیدیہ (CRYSTALINE LENS) یہ رطوبت صاف و شفاف اور چمکیلی ہونے کے علاوہ بلور یا سود کی طرح گول قدرے محدب اور سخت ہوتی ہے ۔ اس کے سخت ہونے کی وجہ یہ ہے ۔ کہ یہ رطوبت ایک نازک اور شفاف جھلی یعنی پردہ عنبیہ میں ملفوف ہوتی ہے ۔

(۳) رطوبت زجاجیہ (VITROUS HUMOHR) یہ پگھلی ہوئی کانچ کی مانند گاڑھی اور شفاف رطوبت ہوتی ہے ۔ اور رطوبت جلیدیہ کے نیچے کثیر مقدار میں ایک شفاف جھلی کوہا (COHA) میں بند رہتی ہے ۔ آنکھ کا ابھار زیادہ تر اسی رطوبت پر واقع ہے ۔ یہ مقلہ کے ۲/۳ حصے کو پُر کرتی ہے ۔

آنکھ کی بناوٹ سے تو آپ واقف ہو چکے ۔ اب یہ بتانا باقی رہ گیا ہے ۔ کہ آنکھ کس طرح سے دیکھتی ہے ۔




جس طرح کیمرہ کے ذریعے ہماری تصویر اس کی پچھلی پلیٹ پر الٹے طور کھنچ جاتی ہے ۔ بعینہ دیکھے جانے والی چیز کا

عکس پتلی کے راستے رطوبت بیضیہ اور لینز سے گذرتا ہُوا طبقہ شبکیہ پر الٹے طور پر پڑتا ہے۔ آنکھ اور کیمرہ میں فرق صرف اتنا ہے۔ کہ ہماری شکل کو صاف لانے کے لئے فوٹوگرافر کیمرہ کے پوک حصہ کو حرکت دیتا ہے جس سے لینز اور پلیٹ کا فاصلہ مابین کم و بیش ہوتا رہتا ہے۔ اور مختلف فاصلوں کی اشیا کا فوکس پلیٹ پر معین ہو جاتا ہے۔ قدرت کاملہ نے اس کا انتظام اور کیا ہے۔ فاصلہ تو ایک رکھا ہے۔ اور نقطہ معکوس کو بنانے کے لئے پتلی کو سکڑانے اور پھیلنے اور لینز کو سلی اری مسلز کے ذریعے پتلا اور موٹا ہونے کی خاصیت بخشی ہے۔ جس سے دیکھنے کے وقت حسب حاجت پتلی کے سکڑنے یا پھیلنے اور لینز کے پتلا یا موٹا ہو جانے سے مطلوبہ چیز کی شکل و صورت طبقہ شبکیہ پر صاف پڑتی ہے۔ اور فوکس معین ہو جاتا ہے جیسا کہ اوپر کی شکل سے ظاہر ہے۔ فرض کرو۔ ایک چیز کو ہم دیکھنا چاہتے ہیں۔ مثلاً گلاس تو یہ گلاس جس کو آنکھ دیکھ رہی ہے اس کا عکس پتلی کے راستے رطوبت بیضہ اور لینز سے گذرتا ہُوا طبقہ شبکیہ پر الٹا پڑ رہا ہے۔ آنکھ کی بناوٹ یعنی اعضاء میں اگر کوئی عیب پیدا ہو جائے تو انسان میں ذیل کے نقائص پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور طبقہ شبکیہ پر مختلف اشیاء کا عکس صاف نہیں پڑتا گویا انسان ایک یا دوسری وجہ سے اچھی طرح نہیں دیکھ سکتا۔

(ا) قریب نظری (MYOPIA) (ب) بعید نظری (HYPERMETROPIA) (ج) نقص بصارت (ASTIGMATISM) (د) فقدان استعداد تعیین (PRESBIOPIA) جن سے قریب اور دور کی چیزوں کو دیکھنے کے لئے عینکیں ضرورت ہوتی ہیں۔ ان نقائص کا بیان کسی آئندہ پرچہ میں کیا جائے گا۔ فی الحال امراض العین لکھی جاتی ہیں

## امراض العین

(۱) رمد (آنکھ آنا) اس مرض سے آنکھ میں گہری سرخی درد اور چبھک ہوتی ہے۔

(۲) بیاض العین (جالا۔ پھولا) آنکھ کی سیاہی پر سفید نقطہ نظر آتا ہے۔

(۳) اعشا (شبکوری) رات کی تاریکی جوں جوں زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ مریض کو کم دکھائی دینے لگتا ہے۔ سورج کی روشنی میں حسب معمول درست نظر آنے لگتا ہے۔

(۴) جہر (روزکوری) اس مرض میں رات کو تو کچھ ہی نظر آ جاتا ہے۔ لیکن دن کو نظر نہیں آتا۔

(۵) دمعہ (ڈھلکا) آنکھ سے ہمیشہ پانی کے قطرے ٹپکتے رہتے ہیں۔

(۶) شعر زائد (پڑبال) پلک کے اندرونی کنارے پر بال اُگ آتے ہیں۔ جن کے سرے اندر کی طرف مڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ جو آنکھ میں چبھ کر ٹیس اور درد پیدا کرتے ہیں

(۷) ضعف بصارت (کمزور نظری) سینے پرونے اور پڑھنے کے وقت آنکھیں تھکاوٹ محسوس کرتی ہیں۔

حروف کا دکھائی دینا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور تھوڑی دیر بعد سر میں درد شروع ہو جاتا ہے۔

(۸) جرب الاجفان۔ پلکوں کے اندر باریک باریک دانے پیدا ہو جاتے ہیں۔ جس سے آنکھ میں سخت خارش ہونے کی وجہ سے گہری سرخی نمودار ہوتی ہے

**حفظ ماتقدم** اگر انسان کسی دوسری مرض میں مبتلا ہو۔ تو وہ اپنی زندگی کو کسی حیلے بہانے سے گذار سکتا ہے۔ لیکن وہ مریض جس کی آنکھیں اندھی ہو چکی ہوں۔ یا ہر وقت بلائے جان رہتی ہوں۔ تو مریض اپنی زندگی کو موت پر ترجیح دیتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو دنیا میں بدبخت اور بدنصیب خیال کرتا ہے۔ اسے کہیں بھی مسرت و شادمانی کی نورانی کرن نظر نہیں آتی۔ ہر ایک کے ظلم و ستم اور مصائب و تکالیف کا مورد بنتا ہے۔ مگر اپنی زندگی کے چند لمحے گذارنے کے لئے یہ سب صعوبتیں جھیلنے کے لئے مجبور ہوتا ہے۔ اس لئے جہاں تک ہو سکے۔ ان کی نگہداشت اور حفاظت کرنا ضروری ہے۔

(۱) جب بھی آنکھیں خراب ہوں۔ تو کسی لائق اور تجربہ کار حکیم اور ڈاکٹر سے ان کا علاج کرانا چاہئے۔ مریض ایک صاف اور تاریک کمرے میں رکھیں تاکہ گرمی اور روشنی سے آنکھ محفوظ رہے۔ اور اگر باہر نکلنے کی حاجت محسوس ہو۔ تو سبز پارچہ آنکھ پر بندھا رہے۔ یا اس وقت سبز عینک آنکھوں پر چڑھا لینی چاہئے

(۲) ہر کس و ناکس کی بتائی ہوئی ادویات کو استعمال کرنا سخت خطرے کا باعث بن جاتا ہے۔

(۳) کبھی کبھی صاف اور ستھرے پانی سے دھونا انکی صحت کو برقرار رکھتا ہے۔

(۴) سوتے وقت مقوی سرموں کا لگانا بہت سودمند ہوتا ہے۔

(۵) معجونوں۔ اطریفلوں مقویات دماغ اور شلجم کا کثرت استعمال آنکھوں کی محافظت کے لئے عمدہ غذائیں ہیں۔

(۶) سبزہ زاروں اور دل پسند اشیاء کی طرف دیکھنا۔ روغنیات کی سر پر مالش کرنا۔ ہلیلہ اور آملہ کا مربہ کھانا۔ قوت بصارت کے لئے فائدہ مند ہیں۔

(۷) ہمیشہ زود ہضم اور لطیف غذائیں کھانی چاہئیں۔

(۸) جس وقت قبض کی شکایت ہو۔ تو فوراً اس کو رفع کرنے کی سعی کرنی چاہیئے۔

ضرر رساں اشیاء مثلاً زیادہ غم و غصہ کا رکھنا بد ہضمی۔ منشیات و مسکرات اور تبخیر پیدا کرنے والی اشیاء کا کثرت استعمال ضعف دماغ۔ دھواں زیادتی جماع۔ گرم یا سرد ہوا۔ سرخ مرچوں اور مصالحوں کی زیادتی وغیرہ سے حتی الوسع پرہیز کرنی چاہیئے۔

**علاج** زنک سلفاس یہ ایک انگریزی دوا ہے جس کا رنگ بہت سفید ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اور حکیم اسے آنکھوں کے امراض میں بکثرت استعمال کرتے ہیں یہ دوا درد اور بالخصوص آشوب چشم (آنکھ کی سرخی) کے لئے نہایت اکسیر ہے۔ رات کو سوتے وقت ایک سلائی بیمار کی آنکھ میں ڈالیں۔ دو تین دن ایسا کرنے سے صحت ہو جائے گی۔ بورک ایسڈ یہ دوا بہت سی امراض میں مستعمل ہے۔ آنکھوں میں ورم اور درد ہو۔ تو آدھ پاؤ گرم پانی میں تین ماشہ گھول کر اس میں کپڑا

بھگو کر نچوڑ کر سینک کرتے رہیں۔ اور اسی پانی سے آنکھ دھلاتے رہیں۔ یہ آنکھوں کے دو ہیں مفید ہے۔ دو تین دن متواتر رات کو سوتے وقت پوٹہ الٹ کر سرمہ پر ملیں۔ پانی میں حل کرنے کی بجائے ادویات کو عرق گلاب میں حل کیا جائے۔ تو بہت بہتر ہے۔ چونکہ عرق گلاب کی خوشبو آنکھوں کے لئے بذات خود مفید ہے۔

اس کے علاوہ دو اور انگریزی دوائیں تمام امراض چشم کے لئے آجکل بہت استعمال کی جاتی ہیں

(۱) ARGEROL (۲) PROTARGOL

دوائے اکسیری جو ابتدائے نزول الماء میں بہت مفید ہے

| | | |
|---|---|---|
| صابون | نیلہ تھوتھا | دال سفید |
| ۵ تولہ | ۳۰ ماشہ | ۲ ماشہ |

صابون کو چاقو سے باریک ریزہ ریزہ کر کے لوہے کی کڑاہی میں ڈال کر آگ پر رکھیں۔ اور نیلہ تھوتھا کو لوہے کے ہاون دستہ میں پیس کر وزن کر کے صابون میں ڈالیں تاکہ صابون اور نیلہ تھوتھا مثل پانی کے ہو جاوے۔ بعدہٗ دال پیس کر ملائیں۔ اور لوہے کے دستہ سے خوب حل کریں۔ اور کڑاہی کے نیچے خوب آگ تیز کریں۔ تاکہ دوا کا رنگ سیاہ ہو جائے۔ بعدہٗ چولہے پر سے اتار کر چینی یا کانچ کے برتن میں رکھ لیں۔ وقت حاجت دانہ خشخاش کے برابر لے کر سیپ میں تھوڑے پانی کے ہمراہ خوب حل کر کے آنکھ میں لگائیں۔ اور ہر تیسرے روز استعمال کرتے رہیں۔

سرمہ جو آنکھوں کے اکثر امراض مثلاً سلاق۔ دمعہ ضعف بصر۔ رمد۔ خارش۔ شبکوری اور دھند کے لئے مؤثر ہے۔ سیماب ایک تولہ۔ سیسہ ایکتولہ پھول جست ایکتولہ۔ برگ نیم ایکتولہ۔ کافور ایکتولہ رسوت مصفی ایکتولہ۔ نیلہ تھوتھا ایکتولہ۔ فلفل دراز ایکتولہ۔ سرمہ سیاہ ایکتولہ اول سیسہ کو پگھلا کر اس میں پارہ ڈالیں تاکہ منعقد ہو جائے۔ بعدہٗ دیگر ادویہ داخل کر کے اس قدر کھرل کریں۔ کہ مثل غبار کے ہو جائے۔ اس کو شیشی میں بھر کر رکھ لیں۔

**غذا** زود ہضم غذائیں۔ مرغ کے چوزوں کا شوربا مکھن۔ بالائی۔ بیضہ نیم برشت۔ ٹینڈے۔ شلجم کدو۔ چقندر۔ پالک۔ خرفہ۔ پودینہ۔ دال مونگ مونگ کی کھچڑی۔ دال ارہر۔ بسکٹ۔ ڈبل روٹی انگور۔ میٹھا انار۔ سیب۔ ناشپاتی۔ کیلا۔ انجیر بادام۔ اخروٹ۔ اور مغزیات وغیرہ وغیرہ

**پرہیز** اچار۔ چٹنی۔ ترش اشیاء۔ سرخ مرچیں گرم اشیاء۔ گوشت گاؤ۔ بینگن۔ مٹر۔ آلو۔ کچالو۔ اروی گوبھی۔ مسور۔ لوبیا۔ لہسن۔ پیاز۔ مصالحہ۔ ماش کی دال گڑ۔ تیل۔ چنے کی دال۔ بازاری مٹھائیاں۔ شراب چائے۔ تمباکو۔ دودھ۔ دہی۔ بادی اشیاء دھواں۔ تیز روشنی۔ کثرت مباشرت۔ سرد پانی سے غسل وغیرہ وغیرہ

---

ایم اسلم صدیقی

# ایک بیمار تصور سے

جناب احسان دانش لاہور

اے مرے غم آشنا ایسا ملال اچھا نہیں
میرے نامہ سے نمایاں ہے کہ حال اچھا نہیں

عارضِ پُرنور پر زلف پریشاں کس لئے
مطلعِ شادی پہ یہ ابرِ ملال اچھا نہیں

اور بھی لاکھوں ترانے ہیں جسے چاہے الاپ
نغمۂ الفت میرے شیریں مقال اچھا نہیں

رُخ ہے تیری شادمانی کا تباہی کی طرف
تیرے آغازِ تمنا کا مآل اچھا نہیں

رازِ الفت ہے ستاروں میں ابھی رسوا نہ کر
دیکھ ضبطِ غم کے آئینے میں بال اچھا نہیں

مشغلے ہیں اور بھی لاکھوں پئے تسکین روح
دل کی بربادی میں معراجِ کمال اچھا نہیں

بزم انجم ہیں چمن میں گھر میں اک تیرے لئے
لب پہ خاموشی نگاہوں میں سوال اچھا نہیں

آرزو کے سرخ چھالوں سے ٹپکنے دے لہو
یہ جراحت وہ ہے جس کا اندمال اچھا نہیں

تو ہے خود اک غیرتِ ناہید و رشکِ ماہتاب
تجھکو مجھ سے تیرہ اختر کا خیال اچھا نہیں

عشق کی تمکین اس جھوٹے تبسم پر نثار
تیرا ہر انداز کہتا ہے کہ حال اچھا نہیں

---

احسان دانش

ذیشان بک ڈپو مزنگ لاہور

# نشاط باغ کشمیر

جنت کے تذکرے آپ نے بہت پڑھے ہونگے۔ کہانیاں سنی ہوں گی۔ شاید سینما میں بھی فردوس، ارم اور بہشت کے نقشے نظر سے گذرے ہوں۔ اور عمرِ خیام نے تو جنت کی سرزمین کو اسقدر پامال کیا ہے۔ کہ ذرا سا بھی گھر خلد بریں کا نمونہ نظر آتا ہے۔ لیکن اگر اپنی آنکھوں سے جنت کا ملاحظہ کرنا ہو۔ تو انسان کشمیر کے شالا مار اور نشاط باغات کو جاکر دیکھے۔

ز گوئی کہ یزداں بہشت بریں را — نہاد است در دامنِ کوہسارے
کہ تا رحمتش آدمی زادگاں را — رہا سازد از منت انتظارے

(اقبال)

شاہانِ مغلیہ کو صانع قدرت نے وہ موزون طبیعت حسن پرست دل اور جدّت پسند دماغ عطا فرمائے تھے۔ کہ انہوں نے خاک ہندوستان کو ذرہ سے آفتاب بنا دیا۔ خوبصورت و شاندار عمارتیں اس ملک میں ان کی یادگار ہیں۔ کشمیر جنت نظیر کے دارالخلافہ سرینگر کا دلاویز نشاط باغ بھی جو دنیا میں صنعت۔ جدّت نفاست۔ نزاکت اور موزونیت کا بہترین مرقع ہے جہانگیر بادشاہ شہنشاہِ ہندوستان کے حکم سے تعمیر ہوا تھا۔ اسلامی تہذیب و تمدن نے دنیا پر بہت احسان کئے۔ ان میں سے ایک یہ کہ نئی طرز تعمیر کی بنا ڈالی۔ عمارت میں ایک جدت پیدا کی۔ مکان کیا ایک شاعری معلوم ہوتی ہے۔ سپین کا الحمرا، قاہرہ کی مسجد طولون، آگرہ کا روضتاج یوں معلوم ہوتا ہے۔ کہ انسانوں کا کام نہیں۔ فرشتوں نے انہیں تعمیر کیا ہے۔ نشاط باغ بھی انہیں تعمیرات میں سے ہے۔

اسلامی طرز تعمیر کی پانچ قسمیں ہیں۔ ایک مغربی عربی جو سپین سے شروع ہو کر مصر سے پہلے ہی ختم ہو جاتی ہے۔ یعنی اس میں شمالی افریقہ کا تمام علاقہ ٹیونس مراکش وغیرہ شامل ہیں۔ ان ممالک کی تمام عمارتیں اسی طرز کی بنی ہوئی ہیں۔ دوسری دمشقی عربی، جس کا سوریا فلسطین۔ مصر اور ترکی کے کچھ حصہ میں ہے۔ تیسری ایرانی جو سارے ایران میں مروج ہے چوتھی مغلیہ جس کا تعلق ہندوستان سے ہے۔ ان چاروں کے علاوہ ایک طرز اور ہے۔ اسے ترکمانی کہا جا سکتا ہے یا ترکی جو مغربی چین اور ترکستان سے لے کر قسطنطنیہ تک چلی جاتی ہے۔ ترکی کے اس حصہ میں جو سوریا سے ملحق ہے۔ دمشقی طرز مروج ہے۔ اس سے اوپر ترکمانی

ان سب کو سرسری نظر سے دیکھا جائے۔ تو سب میں تفاوت نظر آتا ہے۔ اور ہر ایک کی شان زالی ہے۔ اگر بنظر غائر ملاحظہ کیا جائے۔ تو سب میں مشترک

عناصر موجود ہیں۔ اس لئے یہ طرز اقسام اسلامی کہلاتی ہیں۔ وہی قبہ ہیں گنبد اونچا ہو یا نیچا۔ گردن والا ہو۔ یا بغیر گردن کے۔ وہی محراب اونچی ہو یا نیچی۔ نوکدار ہو۔ یا گول۔ مگر موجود ہیں۔ ان سب طرز تعمیرات کو اگر فن لطیف کے نقطۂ نظر سے جانچا جائے۔ تو مغلئی طرز اپنی نزاکت اور تناسب کے لحاظ سے بہترین معلوم ہوتی ہے۔ فی الحال یہاں دیگر طرز تعمیرات پر بحث کرنے کا موقعہ نہیں۔ مغلئی طرز تعمیرات کے جو بہترین نمونے ہندوستان میں موجود ہیں۔ ان میں نشاط باغ سرینگر بھی شامل ہے۔ یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ مغل گارڈن یا مغلئی باغ کا لفظ انگریزوں کے وہاں ایک ضرب المثل بن چکا ہے۔

نشاط میں پہنچکر جو سب سے پہلا خیال میرے دل میں پیدا ہوا۔ یہ تھا۔ کہ اگر انسان اس دنیاوی زندگی میں جنت دیکھ سکتا ہے۔ تو یہی ہے۔ آہ اس اُجڑی حالت میں بھی جب کہ اس کو دور مغلیہ کی ایسی لطف پرور اور شفقت کن دیکھ بھال میسر نہیں آتی۔ یہ فردوس اضی معلوم ہوتا ہے۔ ایک شاہانہ جلال ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے فردوس نظر مناظر صرف جاذب نظر ہی نہیں۔ بلکہ انسان کو تھوڑی دیر کے لئے مرعوب سا کر دیتے ہیں۔ اور ایک لمحہ کے لئے تو وہ اپنے آپ کو بالکل ہی بھول جاتا ہے۔ وہ تروتازہ سبزے کا حسین مخملی فرش وہ صدہا قسم اور صدہا رنگ کے شاداب خوبصورت پھولوں کی باضابطہ دو رویہ قطاریں وہ چنار کے عظیم الشان سر بفلک درخت وہ سرو سہی کا جلوہ، وہ رقصاں فوارے وہ آب رواں کی نہریں۔ وہ گرتے ہوئے پانی کی سیمین چادریں۔ وہ مست کن فضائیں اور معطر ہوائیں۔ شاعران باکمال کا فلک رس تخیل وہاں تک پہنچ سکے۔ ورنہ وہ نظارہ تو بس دیکھنے ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ نہ قلم میں یہ طاقت کہ اس کو پوری طرح زیب قرطاس کر سکے۔ نہ خیال میں قدرت کہ اس جنتی فضا میں پہنچ سکے۔

نشاط باغ سرینگر سے سات میل کے فاصلہ پر واقع ہے ایک پکی کشادہ سڑک باغ تک جاتی ہے۔ دوسرا راستہ شکاروں کے ذریعہ جھیل ڈل کے شفاف گہرے اور دلفریب پانی سے ہے۔ جس میں ہزاروں چھوٹی چھوٹی مچھلیاں کھیلتی نظر آتی ہیں۔ اور سیدھا باغ تک پہنچتا ہے۔ سب سے ایک عمدہ شاندار عمارت آتی ہے یہاں کا نظارہ بہت ہی فرحت بخش ہے۔ کہ سامنے جھیل ڈل اپنے گوناگون دلکش مناظر کے ساتھ اور دور کی پربت کی شاندار پہاڑیاں نظر آتی ہیں۔ اور پیچھے مہادیو پربت کی سربفلک چوٹیاں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ اس محل وقوع سے باغ کی شان اور بھی بڑھ گئی ہے۔ اب اندر داخل ہو جیئے۔ تو صنعت گران باکمال نے اس کو پانچ مختلف درجوں میں منقسم کیا ہے۔ جو بتدریج نہایت نفاست وحسن کے ساتھ ایک دوسرے سے بلند ہوتے گئے ہیں۔

ہر قطعہ میں شاداب گھاس کی زمردیں روشیں جا بجا سال سے اسی طرح ہونے کے باعث اسقدر نرم وگداز ہیں۔ کہ پاؤں ان پر رکھئے۔ تو اندر کو دبتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے۔ جیسے ایرانی قالین ہو۔ ان پر دونوں طرف رنگین دپر بہار پھولوں کی قطاریں وہ پھول جو شادابی، نزاکت و دل آویزی میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ وہی

پھول ہندوستان کے سب باغوں میں ہوتے ہیں۔ مگر رنگت چمک اور آب میں ان نئے پودوں کے وہ پاسنگ بھی نہیں ہوتے۔ نچلے قطعوں میں سرو کے بلند و بالا درخت جابجا نہایت حسن و سلیقہ سے لگائے گئے ہیں۔ اوپر کے قطعوں میں چنار کے رفیع الشان درخت اپنے شاہانہ وقار اور سپاہیانہ وضع میں ایستادہ ہیں۔ باغ کے بیچوں بیچ ایک نہر بنی ہوئی ہے۔ جس میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر فوارے لگے ہیں۔ اتوار کے دن یہ فوارے کھول دئے جاتے ہیں۔ اور نہر میں پانی رواں ہو جاتا ہے۔ اور چونکہ باغ کے قطع ایک دوسرے سے اونچے ہیں۔ نہروں اور فواروں کا پانی ایک [illegible] قطعہ میں خوبصورت [illegible] ایک کیفیت [illegible] سورج کی کرنیں اس کو سرتاپا سیمیں بنا دیتی ہیں [illegible] ایک جنت کا نمونہ [illegible] دیکھئے قدرت کی نیرنگیوں اور انسانی عقل کے کمالات پر آفریں کہئے۔

کشمیری صناعی کاریگری، کام کی نفاست، نزاکت، [illegible] میں ڈال دیتی ہے۔ [illegible] کشمیر جاکر یہ معلوم ہوا۔ کہ یہ ساقہ تعجب انگیز امر ہے۔ کہ کشمیری رشک پری اپنے آپ کو کشمیری کہتا ہے۔ اپنی نفاست و کم مائیگی کے باوجود اس قدر حسین و دلفریب فضا میں پیدا ہوتا اور زندگی بسر کرتا ہے کہ کائنات کی یکجہتی۔ رنگینی و بہار از خود اس کی فطرت اور تخیل میں بس جاتی ہے۔ کہ اس کے کام سے وہی نقش خیالی اور حسن ظاہر ہوتا ہے۔

یہ باغ اہل سرینگر کی مرغوب ترین تفریح گاہوں میں سے ہے۔ اور ہر اتوار کو خاص طور پر وہاں مخلوق خدا کا ایک اژدہام ہوتا ہے۔ گویا ایک میلہ لگ جاتا ہے اور ہر وضع کے لوگ دکھائی دیتے ہیں۔ پورا دن اسی سیر و تفریح میں بسر ہوتا ہے۔ دوستوں کی محفلیں گرم ہوتی ہیں۔ خوش گپیوں میں وقت صرف ہوتا ہے۔ کھانے پکائے جاتے ہیں۔ (باغ میں ایک طرف کھانا پکانے کی جگہ بھی ہے۔) پھل خریدے جاتے ہیں۔ ہاں میں یہ کہنا تو بھول ہی گیا۔ کہ اس باغ کے کافی بڑے حصے میں نہایت اعلیٰ درجے کا سیب۔ آڑو، آلوبخارا، ناشپاتی اور گوگوشے پیدا ہوتے ہیں۔ بالیدگی کا یہ عالم ہے کہ ایک چھوٹے سے چھوٹے پودے میں بھی اس کثرت سے پھل پیدا ہوتا ہے۔ کہ درخت کو سنبھالنے کی غرض سے کئی کئی لکڑیاں چاروں طرف سہارا دیتی ہیں۔ یوں بھی کشمیری ہوا میں حیرت انگیز بالیدگی تاثیر موجود ہے۔ کشمیری جہاں درخت لگانا چاہتے ہیں۔ بید وغیرہ کی لمبی ٹہنی کاٹ کر زمین میں لگا دیتے ہیں۔ اور شاخیں نکل آتی ہیں۔ نیچے جڑ۔ گویا یہ ٹہنی درخت بن جاتی ہے غروب آفتاب کے بعد یہ گلزار عیش بند کر دیا جاتا ہے۔ اور لوگ اپنے گھروں کو واپس چلے جاتے ہیں۔ یہ واپسی کا سین بھی بذات خود قابل دید ہوتا ہے۔ شکارے میں بیٹھکر آپ واپس آئیں۔ تو منظر بڑا دلکش دکھائی دیتا ہے۔ افق پر شفق کی آتشیں روشنی اپنے پرتو سے ڈل کو شعلہ نما بنا دیتی ہے۔ پہاڑوں کا شاندار عکس آسمان کا شفاف

نیلگوں سایہ سجے سجائے خوبصورت شکاروں کی روانی کے باعث سطح آب کے ساتھ متحرک رزاں نظر آتا ہے۔ شام کو پرسکون سہانی فضا، جھیل کا خاموش دلفریب سین، گانے کے نغمہ خیز صداؤں، لوگوں کے قہقہوں اور مانجی یعنی ملاحوں کی بے ربط آواز "ہوش"، "ہوش" سے مرتعش ہو جاتا ہے۔ خاموشی کا جادو ٹوٹ جاتا ہے

اور آپ اپنی جان دنیا سے عالم خیالات [illegible] میں آجاتے ہیں۔ مگر کس طرح یاد رفتگان [illegible] لئے ہوئے مغلئی سلطنت و شوکت جہانگیری [illegible] نورجہاں کے جہاں افروز رعب حسن کے ہنگامے [illegible] کی مجلسیں زمانے کی گردشوں پر غور کرتے ہوئے [illegible]

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

ادارہ (مہتمم شعبۂ نسواں)

# غزل

مسٹر خلیل احمد سرپٹ دفتر اہار بہاول پور

تھا ضروری میرا آلودۂ عصیاں ہونا — جب فرشتے کے مقدر میں ہو شیطاں ہونا
آگ پردے میں لگا دیہ ہی نیس کے خلاف — اب کوئی عیب نہیں بزم میں عریاں ہونا
تیرے انکار سے جذبات ابھر آتے ہیں — کر کے انکار نہیں ہو گا پشیماں ہونا
ہو ذرا بات تو وہ مجھ سے لپٹ جاتے ہیں — کاش قائم رہے دائم تیرا نادان ہونا

نیس بھر بھر کے حکیموں کی ہوں مفلس سرپٹ
بھاڑ میں جائے مریضِ غمِ ہجراں ہونا

سرپٹ

# سوالات

اس عنوان کے ماتحت "محقق" علمی ۔ ادبی صنعتی وغیرہ ان تمام سوالات کا جواب پیش کریگا۔ جو اس کے حلقہ اقتدار میں ہوں۔ خریدار حضرات اپنی خریداری کا نمبر کا حوالہ دیکر کوئی سوال پوچھ سکتے ہیں۔

(۱) سینما میں متحرک تصاویر کس طرح نقل و حرکت کرتی ہیں۔

ح ۔ م ۔ الف

یہ حرکت عملی نہیں ۔ ذہنی کہنی چاہیئے ۔ کوئی چیز دیکھی جائے آنکھ پر پیش بینی کا احساس ½ سیکنڈ قائم رہتا ہے ۔ اس کے بعد زائل ہوتا ہے ۔ اگر اس عرصہ میں ایک اور احساس اس آنکھ میں پیدا ہو جائے ۔ تو دونوں مدغم ہو جاتے ہیں ۔ اور آنکھ کو یوں معلوم ہوتا ہے ۔ کہ یہ حرکت پیوستہ ہے ۔ سینما کی مشین ایسی ہوتی ہے ۔ کہ اس کے ذریعہ ۱۸ تصویریں فی سیکنڈ باری باری پردے پر آتی ہیں ۔ گویا ایک تصویر 1/18 سیکنڈ آنکھوں کے سامنے رہتی ہے ۔ معلوم ہوتا ہے ۔ کہ تصویر حرکت کر رہی ہے۔

(۲) کیا جانور ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں۔

م ۔ ح ۔ د

جانور اس طرح سے اپنے خیالات کا مفصل اظہار تو نہیں کر سکتے ۔ جس طرح سے انسان کر سکتا ہے ۔ نہ ہی وہ آپس میں لیکچر دیتے ہیں ۔ نہ کتابیں لکھتے ہیں ۔ نہ ہی ان میں اتنی عقل ہے ۔ کہ وہ قبل از وقت کسی امر کے متعلق سوچ کر اسکی مدافعت یا مطابقت کی تدابیر اختیار کریں ۔ ان کے چند اشارے مقرر ہیں ۔ اور وہ ان کے عادی ہو گئے ہیں یہی دو چار آوازیں ہیں ۔ جن کی وساطت سے وہ ایک دوسرے کو خبر دے سکتے ہیں۔

(۳) اردو کا سب سے بڑا شاعر کون ہے۔

ش ۔ ح ۔ ص

اس میں شک نہیں ۔ کہ اردو کا سب سے بڑا غزل گو شاعر غالب ہے ۔ دبیر الملک ۔ نظام جنگ اسداللہ خاں غالب وہی شاعر ہے ۔ جو خود کہتا ہے ۔

گر شعر و سخن بدہر آئیں بودے
دیوان مرا شہرت پرویں بودے
غالب اگر ایں فن سخن دیں بودے
آن دیں را ایزدی کتاب ایں بودے

اور اس کے مشہور دیباچہ نویس ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری یوں رقمطراز ہیں ۔

ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں ۔ مقدس وید اور دیوان غالب ۔ لوح سے تمت تک مشکل سے سو صفحے ہیں ۔ لیکن کیا ہے ۔ جو یہاں حاضر نہیں ۔ کون سا نغمہ ہے ۔ جو اس ساز کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں ہے ۔ شاعری کو اکثر شعراء نے اپنی اپنی حد نگاہ کے مطابق حقیقت اور مجاز، جذبہ اور وجدان ذہن اور تخیل کے لحاظ سے تقسیم کیا ہے ۔ مگر یہ تقسیم خود ان کی قاصری کی دلیل ہے ۔ شاعری انکشاف حیات ہے جس طرح زندگی اپنی نمود میں محدود نہیں شاعری بھی اپنے اظہار میں لا تعین ہے ۔

# "محقق" کے متعلق آراء

## جناب انوار نبی صاحب قریشی۔ ڈپٹی انسپکٹر آف سکولز بہاولپور

اس وقت رسالہ "محقق" کا اولین نمبر میرے پیشِ نظر ہے۔ مجھے اس دیرینہ ضرورت کو پورا ہوتے دیکھکر حقیقی مسرت ہوئی ہے۔ اس میں بعض اعلیٰ پایہ کے اہل قلم کے مضامین اور نظمیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ یہ رسالہ اپنے ادبی۔ علمی۔ صنعتی۔ اور زراعتی مضامین کیوجہ سے ہر دلعزیزی رکھتا ہے۔ موخر الذکر شعبوں پر اس کے مضامین جدید ترین اطلاعات سے اہلِ حرفہ کو مستفیض کریں گے۔ اور چونکہ عام طور سے ریاست بہاولپور اس وقت شاہراہِ ترقی پر گامزن ہے۔ اس لئے یہ امر ضبط تحریر میں لانا بے محل نہ ہوگا۔ کہ ایسی ادبی نشانیوں کو جو تہذیب و تمدن کی علمبردار ہوں۔ اہلِ ریاست بہاولپور بالخصوص اور اہل پنجاب بالعموم بہ نگاہِ تحسین دیکھکر اس کی ترقی اور بہبودی میں کوشاں ہوں گے۔ ۷ر دسمبر ۱۹۳۶ء

انوار نبی قریشی

---

(سرزمین بہاولپور سے جریدہ "محقق" کا اجراء) ریاست بہاولپور ایک ایسی سرزمین ہے۔ جہاں سے آجتک کوئی جریدہ کوئی رسالہ اور کوئی اخبار نہیں نکلا۔ قانون فطرت اور آئین قدرت یہی ہے۔ کہ جمود و سکون کے بعد جب بھی تحریک کی روح پیدا ہوتی ہے تو وہ اپنے جوشِ عزائم اور قوت استقلال میں اتم اور اکمل ہوتی ہے۔ یہ جریدہ بھی چونکہ بہت بڑے جمود و سکون کے بعد عالم وجود آشکار ہو رہا ہے۔ اس لئے علمی تحقیق اور تاریخی توضیح کے پیش نظر اس کا معیار بلند ترین ہوگا۔ ہم ان کے ارکین ادارہ میں سے صرف دو شخصیتوں کو ذاتی طور پر جانتے ہیں۔ ایک جناب محترم۔ الیف ایلم شجاع منشی ایم اے پروفیسر ایس ای کالج بہاولپور کو جو اس رسالہ کے ڈائرکٹر ہیں۔ اور دوسرے علامہ حافظ محمد عبدالرحمٰن صاحب جامی "نوری فاضل" کو جو اس جریدے کے نگران عربیات ہیں۔ ہمیں ان دونوں بلند قدر ہستیوں کے جلالت علم کی پوری توقع ہے۔ کہ رسالہ بہت جلد ترقی کریگا۔ اور وہ دن کسی لمبے زمانے کا رہین نہیں جبکہ یہ رسالہ آسمان علم و فضل کا درخشندہ آفتاب شمار ہو کر علمی تاریخی جذبہ رکھنے والے حضرات کی نگاہوں میں ممتاز اہمیت و وقعت حاصل کریگا۔ مذہب و سیاست سے اس جریدہ کا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ صرف علمی تحقیق اس کا نقطۂ نظر ہے۔ اور بس!

ہم اس جریدہ کا دلی خیر مقدم کرتے ہیں اور خلوص قلب سے اسکی ترقی کیلئے دعا کرتے ہیں

علامہ ارشد بہاولپوری
معاون مدیر ... رسالہ ...

# زندگی نئی زندگی بالکل نئی زندگی

جب ایک ٹوپی پرانی ہوجاتی ہے۔ تو آپ اُسے بدل کر نئی خرید لیتے ہیں۔ تو کیا آپ کا یہ فرض نہیں۔ کہ جب آپ کے خیالات پرانے ہوجائیں۔ تو ان کی بجائے آپ نئے خیالات مہیا کریں۔ یہی آپ کی زندگی ہے۔ اور اس میں تازگی کی روح موجود رہنی چاہیئے۔ خیال سے تکلم کی صورت میں اظہار ہوتا ہے۔ پھر عمل کی نوبت آتی ہے۔ تو خیال تمام اعمال کی جڑ ہے۔

نئی زندگی پیدا کرنے کا طریقہ یہ ہے۔ کہ آپ "محقق" کے خریدار بن جائیں۔ چونکہ یہ آپ کو دورِ جدید کے تمام معلومات سے واقف کرا دے گا۔ اس سے آپ کا علم بڑھے گا۔ اور تخیل صیقل ہوجائے گا۔ اتنی بڑی خدمت کے عوض میں "محقق" آپ سے کچھ بڑی رقم نہیں مانگتا۔ سالانہ چندہ صرف تین روپے بمعہ محصول ڈاک ہے۔ آپ بذریعہ منی آرڈر تین روپیہ بھجوا دیں۔ تو بڑی عنایت ہے۔ نہیں تو مندرجہ ذیل پرچہ پُر کر کے دفتر رسالہ "محقق" بہاولپور میں بھجوا دیں۔

اس لکیر سے قینچی کے ذریعہ کاٹ لیا جائے۔

---

بخدمت ایڈیٹر صاحب۔ ماہوار رسالہ محقق بہاولپور

مجھے محقق کی خریداری منظور ہے۔ میرے نام ایک پرچہ بذریعہ وی پی بھجوا دیا جائے۔ وی۔ پی کے پہنچنے پر میں اس کی رقم سالانہ چندہ تین روپے اور خرچ وی۔ پی ادا کر کے وی۔ پی چھڑا لوں گا۔

(مہربانی کر کے صاف صاف لکھیئے)

اسم گرامی ..........................................................

ڈگریاں عہدہ وغیرہ ..........................................................

محلہ

مقام .................. تحصیل .................. ضلع ..................

دستخط ..........................................................

# تجارت

آجکل کی دنیا اشتہار پر منحصر ہے۔ آپ کا مال کتنا ہی اچھا ہو۔ جب تک کسی کو اس کی خوبیاں بتائی نہ جائیں۔ یہ ممکن نہیں کہ اسے ان کا علم ہو سکے۔ اگر آپ اپنی تجارت کو فروغ دینا چاہتے ہیں۔ تو محقق میں اشتہار دیجئے۔ بہت اچھا موقعہ ہے۔ شرح اشتہارات بہت واجبی ہے۔

# شرح اشتہارات

| ضخامت | بارہ اشاعتیں | چھ اشاعتیں | تین اشاعتیں | ایک اشاعت |
|---|---|---|---|---|
| پورا صفحہ | ۵۰ روپیہ | ۳۰ روپیہ | ۱۸ روپیہ | ۷ روپیہ |
| آدھا صفحہ | ۳۰ روپیہ | ۱۸ روپیہ | ۱۰ روپیہ | ۴ روپیہ |
| چوتھائی صفحہ | ۱۸ روپیہ | ۱۰ روپیہ | ۶ روپیہ | ۲½ روپیہ |

فرمائش اشتہارات کے ساتھ پوری قیمت کا پیشگی وصول ہونا ضروری ہے

رسالہ محقق بہاولپور

Others can join in your merriment but not in your work. Take care of yourself.

Nature has provided you with an instrument for self-development, the inner sense of power. Start with a conviction that you can command resources and you will get them. Every possible goal is accessible to genius or talent with honest ambition.

The adverse circumstances become a spur to goad the man up the steep mount. You will find him victorious with fresh lourals every time. In a stormy sea the man is thrown over-board. He is there to sink or swim. The world has never known a man to have got drowned who was worth the saving.

Do not leave millions to your son. Let him inherit a character with self-help. Wealth may mean lethargy, indolence, inaction and ignorance for him. There is a joy felt in growth and acquisition which the born rich has never enjoyed. Character—accuracy, method, promptness, honesty of dealing, politeness of manner, let these be his inheritance. Let him develop muscle, Stamina and self-confidence. Give him no props. Knock these out one by one. He will stand upon his feet.

Do not wait for your place to be made for you. Make it yourself. Do not wait for some body to come and help you. Help yourself.

Director

*(English contributions especially those dealing on cultural matters will be received with thanks. These should be written, better typewritten, on one side only of foolscap size paper.)*

# SELF-HELP

A great soul seeks within itself the light which illuminates the dark paths of unknown future. A person who goes begging for the light from door to door proves his inferiority complex.

" Let every eye negotiate for itself

And trust no agent "

Shakespeare

How can others help you if you do not help yourself? It is your own heart, your on head who are your best friends. You have to depend upon them for sincere help Every person receives two educations, one he receives through external agents, the second, which is the more important of the two, he receives through the reconstruction of internal feelings and mental images He educates himself.

The greatest educator, you can find, is within you. It is the inner sense of your power, reliance on yourself, Confidence of making every job a success, which open the door of the school of self-help for you A commanding ease which is the outward evidence of the immense reserve of energy creates a place for you in the hearts of people.

A man without the sense of having a task to perform in this transitory world, is nothing better than an animal. He eats, drinks, sleeps but has got no head and heart which raise him above the animal world.

Take up the task with a will and purpose. Do not wait for others to come and help you. You have to fight the battle of life single handed.

"Who waits to have his task marked out

Shall die and leave his errand unfulfilled".

Lowell

Reg. No. L. 3972



باہتمام برکت علی پرنٹر آزاد پریس ہسپتال روڈ لاہور میں چھپکر دفتر محقق بہاولپور سے ایف ایم شجاع منشی پبلشر نے شائع کیا

# THE MOHAQQIQ
## BAHAWALPUR
A High Class Literary Monthly

# محقق

1(3)

بہاولپور

ادارۂ تحریر

ڈاکٹر خواجہ شجاع منعمی

ایڈیٹر مولوی عرفانی — مہتمم شعبۂ نسواں بیگم مس نعمت دہلوی بی اے

نگران معلومات — مولوی حافظ عبدالرحمن علامہ مولوی فاضل

نگران [illegible] سنگھ شاستری [illegible]

تحقیق کا علمی - ادبی - صنعتی وغیرہ

ماھوار رسالہ

مارچ سنہ ۱۹۳۷ء

ادارۂ تحریر

# محقق

ڈائرکٹر - خواجہ شجاع منعمی - ایم - اے (علیگ) ایم ایس - سی - ایم - اے (پنجاب) پروفیسر
ایڈیٹر - رازی - عرفانی -     مہتمم شعبۂ نسواں - بیگم - ح - ش - رفعت دہلوی - بی - اے
نگراں - عربیات - مولوی حافظ عبدالرحمٰن - علامہ مولوی فاضل
نگراں سنسکرتیات - پنڈت مدن سنگھ شاستری ودیابھاسکر

نگراں شعبہ جات

افسانہ امین حزیں     مذاکرہ علمیہ پروفیسر ایم - ایف قریشی - ایم - ایس - سی -

مقام اشاعت دفتر رسالہ محقق بہاولپور ——— سالانہ چندہ تین روپے (ستر)

(قیمت فی پرچہ چار آنہ)

# فہرست مضامین

جلد ا | رسالہ محقق | ماہ مارچ ۱۹۳۷ء | رسالہ محقق | نمبر ۳

# شذرات

علم کی تحصیل کارخانۂ زندگی کا وہ شعبہ ہے جس میں خرچ ہی خرچ ہے۔ جس طرح سے ہم ایک عزیز بچے کی پرورش اور تربیت پر خرچ کرتے ہیں۔ اور پھر وہ بڑا ہو کر کہیں اس قابل ہوتا ہے۔ کہ دنیا کی دوڑ میں کامیابی حاصل کر سکے۔ کچھ کما سکے۔ اپنی معیشت کا سہارا تلاش کرے۔ اور دوسروں کے لئے سہارا بن سکے۔ تو کیا ان مصارف کو جو اس بچے پر جوان ہونے سے پہلے کئے جاتے ہیں۔ آپ فضول خرچی گردانتے ہیں۔ کوئی صاحب فہم اس بات سے انکار نہیں کریگا۔ کہ یہ خرچ ہے۔ مگر یہ خرچ بہت ضروری ہے۔ جو شخص اس سے اجتناب کرتا ہے وہ صرف اپنے پاؤں پر ہی کلہاڑی نہیں مارتا ہے بلکہ اپنے آئندہ آنے والی نسلوں کو بھی تباہ و برباد کرتا ہے۔ شاید اپنی زندگی کو برباد کرنیکا [illegible] اُسے کوئی استحقاق حاصل نہیں۔ ان کے حقوق کی نگہداشت بہت لازم امر ہے۔

تعلیم کا محکمہ بھی اسی لحاظ سے زندگی کے باقی شعبوں کے مقابل میں بچے کے قبل از جوانی کے دور کے مشابہ ہے۔ وہ محکمے جن سے کمائی ہوتی ہے، وہ اس جوان آدمی کے مشابہ ہیں۔ جو تعلیم و تربیت سے مرصع ہو کر اپنے دست و بازو میں ہمت پیدا کرنے کے بعد میدانِ زندگی میں داخل ہو جاتا ہے۔ لیکن ایک لمحہ کے لئے فرض کر و۔ کہ کوئی تعلیمی ادارہ ملک میں موجود نہ ہو تو باقی محکمے طب انجنیری وکالت عدالت کیا رہ جاتے ہیں۔ سب اُسی کے سر پر تو ہیں۔ تو گویا تعلیمی اداروں پر خرچ کرنا قوم کی زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے بہت ضروری ہے۔ اس کے علاوہ اس ایمان کیساتھ یہ خرچ کرنا چاہیئے کہ اس میں سے فی الحال کچھ ہماری جیب میں واپس نہیں آئیگا۔ تعلیم پر صرف خرچ ہی ہوگا۔ اور یہ خرچ ضروری ہے۔

عوام میں علم کا نور پھیلانے کے ذمہ وار جرائد و رسائل ہیں۔ اور اسی قبیل کی کتب جو عام فہم زبان میں لکھی گئی ہوں۔ یہ بھی تعلیم کا ایک ضروری حصہ ہے۔ یہ حصہ زیادہ اہم اس سبب بھی معلوم دیتا ہے کہ اسکی آواز عامۃ الناس کے کانوں تک پہنچتی ہے۔ جن کے دلوں میں اثر پیدا کرنیکا کوئی اور ذریعہ موجود نہیں۔

ہر حکومت اور مملکت نے اس بات کو ہمیشہ اپنا فرض سمجھا ہے۔ کہ علم کے نور کو تنگ و تار دنیا کے دور دراز کونوں تک پہنچائے۔ اس سے رعایا کی فلاحت اور ترقی مقصود ہے۔

خاندانِ عباسی کے علمی کارنامے اور انکی فضیلت کی سرپرستی۔ آج کتابوں کی رونق بنی ہوئی ہے۔ الف لیلے کے قصے، بو علی کی حکمت غزالی کی حجت فارابی کا فلسفہ سب انہیں کے سرہونِ منت ہے۔ رسالہ "محقق" کی بڑی خوش قسمتی ہے کہ ان خاندانی روایات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے حکمرانِ خاندان کی ایک محترم ہستی یعنی

## صاحبزادہ محمد حاجی خاں صاحب بہادر عباسی

عم بزرگوار حضور تاجدار ریاست بہاولپور خلد اللہ ملکہٗ واجلالہٗ

نے محقق کی سرپرستی قبول فرمائی ہے۔ اور یہ امر زیادہ قابل ستائش ہے۔ کہ ادارے کو اس کا خیال تک بھی نہ تھا۔ یہ مبارک تحریک انکی اپنی طرف سے تھی۔ زبانِ مبارک سے فرمایا بھی۔ اور محقق کے نام ایک پیغام بھی بھجوایا۔ جو آئیندہ شائع ہوگا۔ ہمیں امید واثق ہے کہ خاندانِ شاہی کے اراکین و دیگر بزرگانِ دولت و کبار مملکت اسی جذبے سے معمور ہو کر محقق کی سرپرستی فرمائیں گے۔ اور اس کی توسیع و اشاعت کے لئے کوشش کریں گے۔ حکومت بہاولپور سے بھی یہ توقع ہے کہ وہ اپنے علمی فرائض کو فراموش نہیں کریگی۔

# بزم جہاں

دنیا میں پھر بہار آگئی ہے۔ زندگی نئے لباس میں اپنے خرامِ ناز میں مست نظر آتی ہے۔ شاخیں جھومتی ہیں۔ کلیاں چٹکتی ہیں۔ چڑیاں اپنے راگ میں ولولہ و وجد میں مصروف ہیں۔
دنیا کی یہ بہاریں آتی رہی ہیں اور آتی رہینگی قدرت کی عنایات کا سلسلہ

عالم اور ساکنین عالم پر لامتناہی ہے مگر ان کی حالت یکساں نہیں۔ بنی آدم اپنے ابتدائی ادوار میں سے گذر کر عہد متوسط میں سے ہوتے ہوئے اس زمانے تک پہنچے ہیں ہر زمانے کا نظریہ الگ۔ نقطۂ نگاہ جداگانہ سطح نظر علیحدہ۔ اخلاق آداب کے طریقے مختلف۔ عیوب و

ومحاسن کی پرکھ - ذوق - فرق - سماجی تعلقات کا معیار نرالا بعض اوقات ہم یہ دیکھکر متحیر ہو جاتے ہیں کہ ایک عہد اور دوسرے عہد کا اندازہ ایک ہی واقعہ کے متعلق ایک دوسرے سے مختلف ہے - بلکہ سیاہ و سفید کا اختلاف ہے۔

آج دنیا تاریخ عالم کے بڑے نازک دور میں سے گذر رہی ہے۔ یورپ تو جنگ عظیم کے بعد سے اپنی جنگی تیاریوں کے سبب دنیا میں بدنام ہو چکا ہے۔ مگر باقی دنیا کی اقوام بھی اس کشمکش سے آزاد نہیں۔ اپنے اختیار سے یا مجبوراً ہمسایوں کی دیکھا دیکھی، خربوزے کو دیکھکر خربوزہ رنگ بدلتا ہے۔ یا کسی کے کہنے سننے سے تمام دنیا سرعت سے قدم اُٹھائے ایک ہی انجام کیطرف بڑھ رہی ہے۔ یعنی پیکار۔ خدا کرے اس پیکار کا نتیجہ ہولناک ثابت نہ ہو۔ یہ مانا کہ دنیا میں اسوقت تسکین قلب کی کمی ہے۔ یہ مانا کہ اقوام عالم کا دماغی توازن بگڑ گیا ہے۔ یہ مانا کہ ہر فرد اپنی ترقی کے لئے کوشاں ہے۔ مگر ایسا نہ ہو کہ اس کوشش میں ہمسایوں کو بگاڑتے بگاڑتے اپنے گلے پر خنجر کی دھار چل جائے۔

ہمیں ان باتوں سے تعلق نہیں مگر رونا اس بات کا ہے کہ سیاسی استحکام اور امن کیساتھ علم و ادب کا دامن وابستہ ہے۔ اگر امن اور چین کسی ملک کو میسر نہ ہو تو شاعر اور مصور کیا خاک کام کریگا۔ عالم کو نہ اتنا وقت ملیگا کہ اپنی توجہ صحافت کیطرف دے سکے۔ نہ مصنف کے دل میں تسکین ہوگی کہ وہ پوری توجہ سے قلم کو سنبھالے۔

دنیا میں جتنی تہذیبیں وجود میں آئی ہیں - مصری - کلدانی - چینی - ہندی - رومی - اسلامی - یورپائی سب کو ایک طویل عرصے کا امن اور سکون میسر رہا ہے۔ زراعت - صنعت حرفت کو جھولیاں بھر بھر دینے کے لئے بے پایاں دولت میسر آئی ہے - تو جا کر کہیں وہ تہذیب اوج ترقی پر پہنچ سکی ہے۔

اگر قوم اپنی تمام قوتیں جنگ میں صرف کر دے - اگر ملت کے بہترین دماغ اور محنت کش دل لڑائی کی دار و گیر میں مصروف رہیں - اگر حکومت کا تمام خزانہ و اندوختہ عسکری تیاریوں میں خرچ کر دیا جائے تو علم و فضل پر صرف کرنے کے لئے باقی کیا رہ جاتا ہے - نہ صاحب دل مرد - جو قوم کی سب سے بڑی دولت ہے - نہ وقت - نہ زر - لازم ہے کہ تنزل ہو جائے۔

آج اتفاق سے تمام عالم ایک گھرانہ بن گیا ہے - یہ ناممکن ہے کہ دو مقتدر اقوام - کوئی دو - آپس میں برسر پیکار ہوں اور باقی دنیا خاموشی سے بیٹھی دیکھا کرے - یعنی باقی دنیا پر بھی اس کا اثر ہونا ضروری ہے - ممکن ہے - بعض وجوہ کی بناء پر ساری دنیا اس جنگ کی آگ میں کود پڑے اور عالم کی تہذیب کا صدیوں کا اندوختہ ایک شعلہ بلکہ ایک چنگاری کی نذر ہو جائے۔

ہمارا خیال ہے کہ اقوام عالم اپنی فراست کا ثبوت دینگی - اور اس ہولناک جنگ کو واقع ہونے سے روکیں گی - جس کے تخیل سے زہرہ آب آب ہوتا ہے۔

ہندوستان کی تاریخ میں سنہ ۱۹۳۷ء کا سال اہمیت کی نگاہوں سے دیکھا جائیگا - اپریل سنہ ۱۹۳۷ء سے تمام براعظم ہند میں نیا آئین جاری ہو جائیگا - جو برطانوی حکومت ہند نے مرتب کیا ہے - ہمیں امید ہے کہ یہ نیا دور علم و ادب کے لئے بہت مفید ثابت ہوگا۔

دیکھئے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے۔
(غالب)

# ابن خلدون کا فلسفہ تاریخ

(گذشتہ سے پیوستہ)

اس سے اگلے باب میں یہ دکھایا گیا ہے۔ کہ عرب ایک بہت سرشور۔ حاسد اور جھگڑالو قوم ہے۔ انمیں ہم آہنگی بہت کم ہے۔ اور ایک وسیع سلطنت قائم کرنے کے لئے مادہ موجود نہیں۔ مگر اس کے ساتھ ابن خلدون یہ بھی بتاتا ہے کہ سادہ زندگی۔ ضمیر کی ہمت۔ قبیلے کی محبت۔ خدائے پاک کی عظمت ان کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ جس کے سبب وہ تمام دنیا کی اقوام سے بہتر کسی پیغمبر کی منادی پر لبیک کہنے کو تیار ہیں۔ اگر وہ ان کی اپنی قوم کا ہو۔ عربوں کے لئے فتوحات کرنا۔ اور سلطنتوں کو وجود میں لانا اس وقت ممکن ہوا۔ جب وہ مذہبی جوش سے معمور ہو گئے۔ لیکن وہ عرصہ دراز تک اس پر کامیاب حکمرانی کرنے کے قابل ثابت نہ ہوئے۔ جب کبھی انہوں نے ایک سلطنت کی بنیاد رکھی۔ ان کے قومی غرور۔ اور سرشوری نے جلد ہی اپنا جلوہ دکھایا۔ اس کے ساتھ ہی ان کا مذہبی جوش یا تو کم ہو گیا یا بالکل مفقود ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ یکے بعد دیگرے سرداروں اور قبائل نے مرکزی حکومت کا جوا اتار کر پھینک دیا اور واپس اپنی اصلی وحشی حالت پر لوٹ آئے۔

ابن خلدون کے مقدمہ کے تیسرے حصے میں یہ درج ہے کہ قومیں کسطرح سے بنتی اور بگڑتی ہیں۔ حکومت کی بنا کن اصولوں پر ہوتی ہے۔ سلطنت بڑھتی ہے اور پھر اس پر تنزل واقع ہوتا ہے یہ بہت لمبا باب ہے۔ اور زیادہ تر تاریخ نہیں بلکہ سیاست کے متعلق ہے۔ اس میں یہ مرقوم ہے کہ ایک مسلمان حکومت کا نظام کس طرح سے ہونا چاہیئے۔ اس کے قوانین کی صورت کیا ہو۔ اس کے مختلف اداروں اور محکموں کے طریقے اور فرائض کیا ہوں۔ یہ حصہ بہت دلچسپ بھی ہے۔ اور مفید اور سبق آموز بھی۔

ملکی فتوحات کے لئے سب سے بڑی شرط یہ ہے۔ کہ عوام کی رائے فاتح کی مطابقت میں ہو۔ یہ ایک ایسا حربہ ہے جسکا کوئی غنیم مقابلہ نہیں کرسکتا۔ جب کسی قوم یا فوج یا فرقہ کے افراد متفق ہوں۔ اور ان کے قلب کسی مشترک نصب العین سے شعلہ زن ہوں۔ اسطرح کہ وہ تمام تکالیف کو سہنے اور تمام قربانیاں کرنے کے لئے تیار ہوں۔ تو ان لوگوں کے سپہ سالار آسانی سے حکومت کرسکتے ہیں۔ تاہم انہیں یہ نہیں چاہیئے۔ کہ وہ اپنے سپاہیوں کے جوش اور ہمدردی پر ہی بالکل انحصار کریں۔ بلکہ یہ بھی۔ کہ ان لوگوں کو بھی اپنے حکم کے تابع رکھیں۔ جنکی کوششوں اور ہمتوں سے وہ تخت نشین ہو سکے تھے۔ کسی ایسے حکمران خاندان کا قیام جو بہت دراز عرصے تک سلطنت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں رکھ سکے۔ صرف اس وقت ممکن ہے جب ملکی نظام عمدہ ہوں۔ انصاف کا دور دورہ ہو۔ قوانین مفید ہوں۔ منظم فوج موجود ہو۔ اور اپنی اور اپنے خاندان کیطرف وہ اپنی رعایا کی توجہ مبذول کر سکیں۔ وہ پھر اس بات کو نہایت وضاحت کیساتھ لکھتا ہے۔ کہ وہ مذہب جو نبوت کی وساطت سے حاصل ہوتا ہے۔

اس قابل ہے۔ کہ حسد۔ تفرقے۔ لڑائیوں کے بدلے ملک میں اتفاق۔ باہمی ہمدردی اور جوش فراوان پیدا کردے۔ اس سے ایک وسیع سلطنت قائم کیجا سکتی ہے۔ لیکن صرف مذہبی جوش ناکافی ہے۔ جبتک کہ یہ ایک بہت عظیم اور مضبوط گروہ پر حاوی نہ ہو جائے۔ خدا کبھی دنیا کو زیر نگیں کرنے کا حکم اس قوم کے قبضہ میں نہیں دیتا۔ جو اس امر کی اہلیت نہ رکھتی ہو وہ پیغمبر جن کی امت کی تعداد بہت زیادہ نہ ہو۔ وہ خدا کیطرف سے نہیں ہوتے۔ عوام کا اعتراف اور عملی زندگی میں کامیابی مذہب کی سچائی کا ثبوت ہے۔ ابن خلدون نے ان سب امور کی مشرقی تاریخ سے مثالیں پیش کی ہیں۔

حکومتوں کی عمر کے متعلق وہ یہ کہتا ہے۔ کہ بعض اس لئے کمزور ہو جاتی ہیں کہ ان کا رقبہ بہت بڑا ہوتا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ تمام دنیا کو ایک ہی حکومت میں جکڑ دیا جائے۔ چونکہ اس کے راستے میں بہت سی دقتیں ہیں۔ جن پر حاوی ہونا ممکن نہیں وہ یہ کہتا ہے کہ عربوں کی فتوحات اس سرعت سے ہوئیں۔ کہ ان کا دوام ممکن نہ ہو سکا۔ پھر عربی حکومتیں زیادہ تر اس لئے ضائع ہوگئیں۔ کہ ان کی وسعت بہت زیادہ تھی۔ وہ حکومتیں جو فتوحات سے حاصل ہوتی ہیں۔ اس وقت کے تناسب کے مطابق زندہ رہتی ہیں۔ جس سے ان ممالک کو فتح کیا گیا۔ جس ملک میں بہت سے قبیلے آباد ہوں وہاں فتوحات باہستگی ہونے چاہییں۔ عراق اور سوریا پر بہت جلدی اور کامل قبضہ ہو گیا۔ مگر افریقہ پر بدقت قبضہ ہوا۔ اور وہ بھی اس کے کچھ حصہ پر۔ ابن خلدون یہ بیان کرتا ہے۔ کہ تاجداروں کی طبیعت کس طرح سے استبداد اور فرعونیت کیطرف راغب ہوتی ہے۔ پھر عیش و عشرت کا زمانہ آتا ہے۔ اس کا نتیجہ بدعملی اور تباہی۔ مشرقی تاریخ میں بیشمار مثالیں ہیں۔ جن سے ان امور کی وضاحت کیجا سکتی ہے اور یہ تاریخ کے اصول بنجاتے ہیں۔

کسی حکومت کی حیات کا عرصہ وہ اسطرح سے بیان کرتا ہے گویا یہ حکومت کا قانون حیات ہے۔ وہ مثالوں سے اس کا ثبوت بھی بہم پہنچاتا ہے۔ ایک فرد کیطرح سے سلطنت کی زندگی کا بھی عرصہ معین ہے۔ عموماً سلطنت کی زندگی تین نسلوں سے زیادہ نہیں ہوا کرتی۔ ایک نسل کوئی چالیس سال سمجھ لو۔ بیس سال کے عرصے میں تو بچہ بڑھکر مرد بنتا ہے اور اس قابل ہوتا ہے کہ دنیا کے کاروبار کو سنبھال سکے۔ ساٹھ سال کی عمر میں اسکے قوے اسقدر ضعیف ہو جاتے ہیں۔ کہ وہ عملی طور پر زندگی کے کسی کام میں حصہ نہیں لے سکتا۔ اس طرح سے چالیس سال باقی رہگئے۔ ایک آدمی کی اوسط زندگی کے عرصے کا تین گنا ایکسو بیس سال ہوئے۔ اس قانون کی وہ اسطرح تشریح کرتا ہے۔ ہر سلطنت میں پہلی نسل فوقہ دارانہ جوش سے معمور ہوتی ہے۔ ان میں صحرا نشینوں کا عسکری جوش نمایاں ہوتا ہے۔ اور وہ سخت کوش و سخت گیر ہونیسے ہر جگہ کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ دوسری نسل زیادہ آرام طلب ہو جاتی ہے۔ اس کی ہمت اور زور مٹ جاتا ہے اس کا سبب یہ ہوتا ہے۔ کہ دولت اور ثروت انہیں ناکارہ کردیتی ہے۔ ان کی خود اعتمادی باقی رہتی ہے۔ اور وہ جنسی معاملات میں زیادہ حصہ لینے لگتے ہیں۔ تیسری نسل میں بادیہ نشینوں کی تمام خصوصیات ان سے غائب ہو جاتی ہیں۔ اور وہ خاندان اس قابل نہیں رہتا کہ کسی لشکر عظیم کا مقابلہ کر سکے۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ تمام تفصیلیں مشرق کی تاریخ سے دیکھی ہیں۔ اور انہیں پر یہ تمام قوانین حاوی ہوتے ہیں۔ یورپ کی اقوام اور حکمران خاندانوں پر ان کا اطلاق بہت صحیح معلوم نہیں دیتا۔

ابن خلدون اس بات کا بھی اظہار کرتا ہے۔ کہ تاریخ ایک سلسلہ ہے۔ واقعات کی ایک لڑی۔ یہ تبدیلی پیوستہ قائم رہتی ہے۔ تاریخی واقعات منتشر اور منقطع ہنگامے نہیں ہوتے۔ بلکہ سب ایک دوسرے سے منسلک۔ ہر ایک سلطنت کئی ادوار میں سے گزرتی ہے۔ اس میں کئی تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں۔ جنکا اثر سماج پر پڑتا ہے۔ اس نسل کے تمام افراد کے جذبات اور طرز تخیل میں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ کسی قوم کے اس وقت کے لوگوں کے حالات اور چلن اس عہد کے احوال اور تاریخی فلسفہ کے مطابق ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ ازمنۂ وسطیٰ کے تمام نصرانی تاریخ نویسوں سے سبقت لے گیا ہے۔ ان کو اس بات کا احساس نہ تھا۔ کہ زمانے کیسا تھ سماج اور سلطنت میں پیوستہ تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ابن خلدون اس بات کو بہت اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اس نے بوضاحت اس امر کو کئی بار دھرایا ہے اور اس حقیقت کا شرح اور بسط کیساتھ اظہار کیا ہے۔ کہ تاریخ ایک اجتماعی اور پیوستہ حرکت ہے۔ ایک لامتناہی سلسلہ جس کے سامنے کوئی سر نہیں پھیر سکتا۔ وہ اس بات کا ثبوت بہت سی مثالوں سے پیش کرتا ہے۔ اور یہ بتاتا ہے۔ کس طرح سے ایک تہذیب کا دور دوسرے میں داخل ہو جاتا ہے۔ مغرب میں اس امر کا احساس ابن خلدون کی حیات کے بہت عرصہ کے بعد ہوا۔ یہ اس کا فیض تھا۔ کہ اٹھارویں صدی عیسوی میں یورپین محققین نے تاریخ کی تدریس اس طرح سے کی کہ علم التاریخ دلائل سے مزین ہو کر فلسفہ بن گیا۔ اس کے دلائل اور بنا کردہ اسباب پر ایک عمارت کھڑی کی۔ اور جدید فلسفۂ تاریخ وجود میں آگیا۔

چوتھے باب میں شہر میں رہنے والوں کا ذکر ہے۔ جنکی زندگی کی حرکات معین ہوتی ہیں۔ اور وہ عمر اپنے مکانوں میں ایک مقام پر گزارتے ہیں۔ تہذیب کا ظہور شہروں میں بڑے زور شور سے ہوتا ہے۔ جب سلطنتیں معرض ظہور میں آتی ہیں تو شہر اپنی وسعت اور ثروت میں بڑھتے ہیں۔ جب حکومت رو بہ تنزل ہوتی ہے۔ تو شہروں میں اس تنزل کے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں۔ سلطنت کے قیام کے ساتھ شہر آباد ہو جاتے ہیں۔ لیکن سلطنت کی بربادی کے ساتھ وہ ممکن ہے کہ برباد ہو جائیں۔ یا اس کے بعد بھی قائم رہیں۔ وہ یہ بھی بتاتا ہے۔ کہ اقوام کو شہر آباد کرنیکی ضرورت کیوں محسوس ہوتی ہے۔ اور کسی شہر کا محل وقوع کن اصولوں پر انتخاب کیا جاتا ہے اس موقعہ پر ابن خلدون نے بہت سی عجیب وغریب روایات جمع کردی ہیں۔ جو مشہور و معروف شہروں۔ مسجدوں۔ اور عبادتگاہوں اور دوسری بڑی بڑی تعمیرات کے متعلق ہیں۔

یہاں پر ابن خلدون یہ بھی لکھتا ہے۔ کہ اس نے اپنی قوم کی فراست اور کارناموں کے متعلق غلو سے کام نہیں لیا۔ ان کی عمارات اس شان وشوکت کی حامل نہیں۔ جو اس کی قوم کو حاصل ہیں۔ اور اقوام سلف سے بہت گھٹیا ہیں۔ اسکا خیال ہے۔ کہ عربی ذہانت فن تعمیرات اور فنون لطیفہ میں پیچھے ہے۔ وہ اپنی فطرت کے لحاظ سے بہت شاہانہ عمارات یا شوکت کے مخالف ہیں۔ تاہم وہ اس امر کا اعتراف کرتا ہے کہ سپین کے مسلمانوں نے فنون لطیفہ اور فن تعمیرات میں انتہائی تکمیل حاصل کر لی تھی۔ اور اس کا سبب یہ پیش کرتا ہے کہ وہاں پر اسلامی تمدن کئی صدیوں تک مسلسل قائم رہا۔ اور کئی خاندان برسر حکومت ہوئے۔ اگرچہ یہ واقعہ اصول فلسفۂ تاریخ سے مستثنےٰ ہے۔

اس کے بعد وہ یہ بتاتا ہے۔ کہ شہروں کا اثر گرد و نواح

کے ضلعوں پر کیا ہوتا ہے۔ مختلف خاندانوں کے عہد میں شہر کی وقعت کس طرح سے گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ شہروں کا تعلق آبادی۔ ثروت اور اخلاق کے ساتھ ہے۔ شہر کا اثر تمدن اور فنونِ لطیفہ پر کیا ہوتا ہے۔ پھر وہ اس بات کا تذکرہ کرتا ہے۔ کہ شہر کے اندر سماجی اور سیاسی کیا کیا تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ اور وہ اسباب بیان کرتا ہے۔ جس سے شہروں کا تنزل ہوتا ہے۔ پھر تباہی و بربادی۔

مقدمہ کے پانچویں باب میں ابنِ خلدون یہ بیان کرتا ہے کہ قوم کے لیے خوراک اور سامانِ حیات کن ذرائع سے حاصل کرنا چاہیئے۔ قومی ترقی کن طریقوں سے ممکن ہے۔ اس ترقی کے ضمن میں ان تمام علوم و فنون کا ذکر کرتا ہے۔ جس پر قومی ترقی کی بنا ہے۔ مثلاً۔ صنعتی۔ اقتصادی۔ طبی تفریحی وغیرہ

چھٹے باب میں سائنس کے تمام شعبوں پر مبسوط اور محققانہ بحث کیگئی ہے۔ اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ بہت سبق آموز اور دلچسپ ہے۔ اس کا مضمون تاریخ کی سائنس تھا اس نے تاریخ کی سائنس کا تعلق تمدن کی سائنس کیساتھ پیدا کیا یہ ایک ایسا علم ہے جو کہ وسیع بھی ہے۔ اور سلطنت کے امور میں بہت دخیل بھی۔ اس میں تمام علوم و فنون فرداً فرداً آ چکی ہے۔

شامل ہیں۔ یا اس کے ماتحت ہیں۔ اس لئے ابن خلدون نے یہاں پہ تمام علوم و فنون پر بحث کرنا جائز سمجھا ہے۔

اس عالیقدر مصنف کی کتاب پر تنقید کرنیکی یہاں ضرورت نہیں۔ یورپ کی تاریخ سے اس کی واقفیت نامکمل تھی۔ نہ ہی وہ وہاں کے تمدن کو کامل طور پہ جانتا تھا۔ اگر وہ کہیں عیسائی دنیا کی قدیم اور وسطی تاریخ پر عبور حاصل کر لیتا۔ جتنا کہ اسے اسلامی دنیا کی تاریخ پر تھا۔ اور پھر وہ اس سے نتائج اخذ کرتا۔ اور فلسفۂ تاریخ کے اصول بناتا۔ تو بلاشبہ دنیا کی ادبیات میں اس کا صحیفہ بہترین کتابوں میں سے ایک ہوتا۔ اسمیں شک نہیں۔ رائے آزادانہ تھی۔ فکر فلک رس۔ ضمیر احاطہ کُن اور طبیعت معنی خیز اُن سے وہ نہایت جائز اور درست اصول بنا سکتا تھا۔ تاہم اسکی تصنیفات میں سے جو کچھ بھی ہمارے سامنے ہے۔ وہ اس قدر اہم۔ قابلِ تعظیم اور پُر معنی ہے۔ کہ رہتی دُنیا تک اس کا نام زندہ رہیگا۔ وہ عہدِ جدید کے تمام مدلل تاریخ نویسوں کا بزرگ ہے۔ اور فلسفۂ تاریخ میں سب کا اُستاد۔ اسیکے اصول پر چلکر جدید زمانے میں اسطرح سے مدلل۔ واضح اور مسلسل تاریخ لکھنے کی عادت مصنفوں میں پیدا ہوئی۔ گویا یہ اسیکا احسان ہے کہ آج تاریخ فلسفہ تاریخ کی منزلت پر پہونچ

چکی ہے۔ جبتک چاند میں چمک اور شمس میں روشنی باقی ہے۔ ابن خلدون کا نام تاریخ کی دنیا میں مہر و ماہ بن کر چمکتا رہیگا۔

ادارہ (ڈائرکٹر)

# انمول موتی

(۱) طبیعت ایک زمین ہے۔ اس کے لئے تعلیم کھیتی ہے۔ اور تعلیم کیساتھ تربیت اس عمدہ زمین میں تخم ریزی کرتا ہے۔ (بقراط)

(۲) علم بہت ہے اور عمر تھوڑی۔ اس لئے اس علم کو حاصل کرنا چاہیئے۔ جس کا تھوڑا بھی زیادہ پر حاوی ہوتا۔ "

# علوم عربیہ

## عرب مؤلفین پر علامہ براؤن کے ایک اعتراض کی تنقیح

جناب حکیم علی احمد نیر واسطی صاحب لاہور

علامہ ایڈورڈ جی براؤن نے اپنی کتاب اریبین میڈیسن میں علوم عربیہ کی تدوین کی نسبت یہ رائے ظاہر کی ہے۔ کہ عربی علوم و فنون کی تالیف میں غیر عربوں کے مقابلے میں عربوں کی تعداد بہت کم ہے۔ اور اس سلسلے میں آپ لکھتے ہیں کہ گولڈزیہر جو ہمارے عہد کا علوم عربیہ کا بہترین عالم ہے۔ لکھتا ہے کہ لیگارڈے نے یہ کہنے میں مبالغہ کیا ہے کہ ان مسلمانوں میں سے جو علوم میں ممتاز ہوئے ایک بھی سامی النسل عرب نہیں۔ لیکن وہ یہ خود تسلیم کرتا ہے۔ کہ علوم اسلامیہ مثلاً تفسیر۔ حدیث۔ فقہ وغیرہ میں بھی غیر عربوں کے مقابلے میں عربوں کی تعداد کم ہے۔[1]

یہ صحیح ہے کہ علوم و فنون کی کتابوں کی تصنیف و تالیف میں خالص عربوں کا حصہ نسبتاً کم ہے۔ چنانچہ ابن خلدون نے بھی اس امر کا اعتراف کیا ہے۔ اور اس نے اپنے مقدمہ تاریخ میں اس موضوع پر ایک باب **حملۃ العلم اکثرھم العجم** کے عنوان سے باندھا ہے۔[2] علیٰ ہذا جرجی زیدان نے اس امر کی توضیح کی ہے۔ اور اس نے بھی اپنی کتاب تاریخ التمدن الاسلامی میں اسی عنوان سے ایک باب باندھا ہے۔[3]

یہ بھی صحیح ہے کہ نہ صرف علوم دخیلہ مثلاً منطق۔ فلسفہ۔ طب وغیرہ اور علوم لغت و صرف و نحو وغیرہ میں ہی غیر عربوں کی تصانیف زیادہ نظر آتی ہیں۔ بلکہ مذہبی علوم میں بھی ہم علمائے حدیث و فقہ میں وہب بن منبہ۔ محمد بن ابی الحسن عطاء بن ابی رباح۔ طاؤس یمنی۔ مکحول شامی وغیرہ وغیرہ عربوں کے اسمائے گرامی پیش پیش دیکھتے ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ خاکدان عرب کے اصل باشندے تصنیف و تالیف کا کوئی ذوق نہ رکھتے تھے۔ یا وہ اس چیز کے قدردان نہ تھے۔ بلکہ اس کے حقیقی اسباب کچھ اور ہیں۔ اس سلسلے میں حسب ذیل امور قابل غور ہیں۔

(۱) اہل عرب ابتداً اہل بادیہ تھے پھر جب وہ اسلام کی دولت سے متمتع ہوئے۔ تو انہوں نے تبلیغ و دعوت قرآن حکیم شروع کی۔ اس کے مابعد انہوں نے شام عراق مصر۔ افریقہ اور فارس وغیرہ ممالک فتح کئے اور خطۂ عرب کی یہ ایک قلیل ترین جماعت تھی۔ جو دنیا کے تمام حصوں میں پھیل گئی۔ پس اگر دیگر کثیر التعداد اقوام کے مقابلے میں عرب کی اس قلیل جماعت کی تصانیف کی تعداد کم ہے۔ تو

[1] ملاحظہ ہو۔ اریبین میڈیسن صفحہ، مطبوعہ کیمبرج یونیورسٹی پریس۔
[2] ملاحظہ ہو۔ مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۵۹۰ مطبوعہ بولاق۔
[3] ملاحظہ ہو تاریخ التمدن الاسلامی جلد سوم صفحہ ۴۸

اِس میں تعجب یا شکایت کا کوئی مقام نہیں۔

(۲) عربی زبان کی صرف و نحو اور لغت وغیرہ کے سلسلے میں اہلِ عرب خود اِن علوم کی تحصیل کے چنداں ضرورت مند نہ تھے۔ اور اِن علوم کی اگر زیادہ ضرورت تھی تو غیر عربوں کو۔ لہٰذا غیر عربوں مثلاً حماد الروایۃ خلیل سیبویہ اخفش۔ زجاج وغیرہم نے بیشتر اِس سلسلے کی کتابیں لکھیں۔ تاہم عربی حکومتوں نے اِس کام میں ان کی مدد کی تاکہ اِن علوم کی تدوین سے علومِ اسلامیہ کی اصل زبان کا تحفظ ہو سکے۔ اور اِس زبان کی ترویج ملک میں زیادہ سے زیادہ ہو۔

(۳) علوم طب و فلسفہ وغیرہ کے سلسلے میں ابتداً تو ان علوم کی نقل و ترجمہ و شرح وغیرہ کے لئے غیر زبانوں کا علم ضروری تھا۔ اور ظاہر ہے کہ عرب ابتداً اِن زبانوں سے بالعموم ناآشنا تھے۔ لہٰذا انہوں نے یونان۔ فارس۔ ہند وغیرہ کی فنی کتابوں کے نقل و ترجمہ و تہذیب کے لئے یونانی سریانی۔ فارسی اور ہندی زبانوں کے علماء کو اِس خدمت پر متعین کیا۔ جو اکثر غیر عرب تھے۔

(۴) خلافتِ عباسیہ میں بہت سے عربوں نے تمام علوم و فنون پر بہت سی کتابیں لکھیں۔ لیکن ان کو عرب شمار نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ اس دور میں عربوں اور غیر عربوں کے باہم گرا اختلاط اور تعلقاتِ مناکحت کیوجہ سے اکثر عربی خاندان خالص عربی نہ رہے تھے۔ حتیٰ کہ اکثر خلفاء کی مائیں غیر عرب تھیں۔

(۵) ممالک مفتوحہ میں عربوں کی تعداد بہت کم تھی۔ اور ممالک محروسہ کا رقبہ بہت وسیع تھا۔ اِس لئے عربوں کی توجہ زیادہ تر تبلیغ و دعوت۔ قوانینِ جہانبانی کی تاسیس اور انصرامِ مہماتِ سلطنت کی مشکلات کے حل کرنے پر مرکوز رہی۔ لہٰذا تصنیف و تالیف کا کام انہوں نے زیادہ تر اُن قوموں اور جماعتوں کے حوالہ کر دیا۔ جو اِس کام کے لئے زیادہ مناسب اور موزوں تھیں۔ اور خود علوم و فنون اور مؤلفین و مصنفین کی اسطرح اعانت اور سرپرستی کی کہ جا بجا دار المصنفین بنوائے۔ کتب خانے قائم کرائے مدارس و بیمارستانات تعمیر کرائے اور علماء اور مصنفین کے بیش قرار وظائف مقرر کئے۔

نظر بحالاتِ بالا اگرچہ ہم دورِ اول میں خالص عربوں کی تصانیف اور تالیفات کی تعداد غیر عربوں کے مقابلے میں نسبتاً کم دیکھتے ہیں۔ لیکن اِس سے عربی دماغ کی علمی عظمت کا اور زیادہ اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ کہ عربوں نے کس حُسن اسلوب کیساتھ تقسیم عمل کرتے ہوئے علوم و فنون کی تحصیل و تکمیل اور سرپرستی کی۔ ان کی اپنے سایہ میں پرورش کی اور تمام دُنیا میں اُن کی نشر و اشاعت کی۔

(علی احمد نیر واسطی حکیم۔)

---

## رباعی

میخانے کی یہ واردات ہے کیا
یاں جام کی تہ میں بات ہے کیا
پیمانہ اُٹھاتے ہی میں کھو جاتا ہوں
ساقی میری کائنات ہے کیا

(اسیر انور رضائی دکن)

# خوشامد

خوشامد فارسی کے دو الفاظ "خوش" اور "آمد" کا مرکب ہے۔ متکلم کی وہ کلام جو مخاطب کو پسند آئے اور خوش کر دے خوشامد کہلائے گی۔ یہ لفظ عموماً بُرے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اِس مکروہ لفظ سے کسی کی بیجا تعریف مقصود ہوتی ہے۔ ادیب اور منشی اِسے مختلف ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ چنانچہ خوشامد تملق چاپلوسی ملمع یعنی زُدیت اور بیجا تعریف تقریباً ہم معنی الفاظ ہیں۔ ممدوح کے مُنہ پر اُسکی توصیف میں توغل کرنا اور اُس کے سامنے اس کے مصنوعی خدوخال پیش کرنا۔ خوشامد کہلاتا ہے۔ یہ ایک بے باق ہتھیار ہے۔ جس کا اوچھا وار بھی خالی نہیں جاتا۔ یہ وہ موذی طریقہ ہے جس سے آپ تھوڑے وقت میں۔ عارف کی معرفت، زاہد کے زہد، شیخ کی بزرگی، عالم کے علم۔ منطقی کی منطق۔ شریف کی شرافت اور شریر کی شرارت علےٰ ہذالقیاس پر قماش و قطار کے آدمی۔ کے زعم و خیال میں تزلزل و تعدد پیدا کر سکتے ہیں۔ اور اُسے بیوقوف و اُلّو بنا سکتے ہیں۔ غرضمند انسان عموماً اپنے مذموم یا مقبول ارادہ و خواہش کی تکمیل کے لئے ارباب نعمت و اختیار کے حق میں یہ ذلیل اور ناپاک حربہ استعمال کرتا ہے۔ جہاں ایک خوشامدی دوسروں کو غلط فہمی میں ڈالتا ہے۔ وہاں وہ بھی گناہِ عظیم کا ارتکاب کرتا ہے۔ اپنے ضمیر کو فنا مُنہ کو سیاہ اور جذبات کو تباہ کرتا ہے۔

خوشامدی اللہ تعالےٰ کی قدرت و طاقت کا انکار کرتا ہے۔ وہ جلبِ منفعت اور حصولِ زر و مال کے لئے غیر کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہے۔ اور بُری طرح پھیلاتا ہے۔ وہ نہیں سمجھتا کہ خُدا قادرِ مطلق، کارساز اکبر، رب العالمین، غفور الرحیم، سمیع و بصیر، معبودِ حقیقی اور واحد لاشریک ہے۔ وہ غیر کے در پر جبہ سائی اور ناصیہ فرسائی کرتا ہے۔ وہ کمزور اور بے بس انسانوں اور حیوانوں کو پالنہار اور مشکلکشا تصور کرتا ہے۔ وہ خُدا کے جلال اور غیرت کو چھیڑتا ہے۔ اُس کی آتش قہر و عذاب کو پھونکتا ہے۔ اور اُس کے جذبۂ انتقام کو دعوت دیتا ہے۔ کہ وہ اِس نامرادِ نالائق کو کیفرِ کردار تک پہنچانے میں ہزاروں گھنٹوں کو بھی پیس ڈالے۔

خوشامد غلام قوم کا شعار و شیوہ ہوتا ہے۔ کیونکہ غلام کی تربیت اور نشوونما ایسے ماحول میں ہوتی ہے کہ اُس کی ذہنیت اُس کے بے پناہ وار سے بچ نہیں سکتی۔ یہ دُنیا کو عاجزی و انکساری۔ کمزوری۔ و ناداری۔ بے بسی و بے کسی اور ذلت و خواری کی تعلیم دیتی ہے۔ یہ خُدا سے غافل اور مخلوق کا دست نگر بناتی ہے۔ اِس سے انسانی عزائم و ارادے پست اور اسفل ہوتے ہیں۔ یہ خودداری اور حق پرستی کی مخالف اور دشمن ہوتی ہے۔ خوشامد سے خیالات فاسد اور افکار پراگندہ ہوتے ہیں۔

غلام قوم کی جہاں سلطنت و حکومت اور مال و دولت غصب کر لیجاتی ہے۔ وہاں اُس کی ذہنیت بھی بگاڑ دیجاتی ہے۔ غرض انکو غلط سے درست معلوم ہوتی ہے۔ اور ہر بُری

چیز اچھی لگتی ہے۔ جہاں اُس میں منافقت۔ خیانت اور اشرارات ایسی قبیح عادات پیدا ہو جاتی ہیں۔ وہاں اس پر خوشامد و خلق کی لعنت بھی سوار ہوتی ہے۔ نوکری حاکم کی چاپلوسی اور خوشامد کر کے اپنا الو سیدھا کرتا ہے۔ اور ناپاک و نجس مال سے اپنے تنورِ شکم کو پُر کرتا ہے۔ حاکم ان کی تمام حرکات و سکنات اور طرزِ تکلم کو خوب سمجھتا ہے۔ وہ اُسے محض معاند اور سبکاری سمجھ کر اُس کے دامنِ امید و بیم میں چند لالچ کے ٹکڑے ڈال دیتا ہے۔ یہ اُس کی ساحری ہوتی ہے۔ جو اس تیرہ بخت کو سلائے رکھتی ہے۔ اور اس کی عقل پہ پردے پڑے رہتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ روسیاہ اجتماعی مفاد کو اپنے انفرادی نفع پر قربان کر دیتا ہے۔ قوم کے ساتھ بدعملی اور غداری کرتا ہے۔ غلامی کے اطواق و سلاسل کو مضبوط و دراز کرتا ہے۔ خوشامدی نہ صرف قوم بلکہ انسانیت کے مصفا و مجلا چہرے پر بدنما داغ ہوتا ہے۔ مخلوق اس سے رنجیدہ اور خالق ناراض ہوتا ہے۔ یہ صفحۂ گیتی پر شقاوت و ضلالت کا علمبردار ہوتا ہے۔ انسان کے لباس میں بندر و بھیڑیا ہوتا ہے۔ خوشامدی اور خوشامد پسند دونوں خراب ہوتے ہیں۔ انکی صحبت میں ایک صاف گو اور خوددار انسان کا گذارا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ خودداری انسانیت کی زیب و زینت ہے لیکن خوشامد کو خودی سے ازل سے مخاصمت و مخالفت ہے۔ چونکہ خوشامد کی موجودگی میں پاک و پوتر اعلٰے وارفع جذبات و احساسات مفقود ہوتے ہیں۔

(اے۔ م۔ نسیم۔ داجلی۔)

---

# زِندگی

## (ایک رُخ)

(جناب ڈاکٹر تصدق حسین خالد صاحب۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (لنڈن) ایف آر۔ ایک۔ ایس۔ بار ایٹ لا)

جہانِ این وآں کے اِس طرف پنہائے امکاں میں
خلاؤں کی خموشی میں شرارِ زندگی چمکی
متاعِ بجلی تڑپی
درختوں کی جواں رعنائیوں کے حُسن لرزاں میں
تصور کے مقابل اِک حیات آراستہ سا تھا۔
چمن افروز پھولوں کا
میں کیا تھا؟ کون تھا؟ کیوں رو دیا یوں بزمِ خنداں میں
شکایت ہے۔ مجھے اِس ذہن کی آشفتہ کاری کی
سنی ہے یاد تک اس کی
اندھیری رات میں طغیانی امواج خیزاں میں
سُنا ہے گیت طوفانی ہواؤں کے تلاطم کا؟
ترنم روحِ قلزم کا
ازل کے بازوؤں پر گریۂ پیہم کناں جانا
ابد کے گوشۂ خلوت میں آخر نیند کا آنا!

خالد

# کہسار کی دیوی

جناب امین۔ حزین صاحب

بین بجاتی ــــ کون ہے آتی؛
لہراتی ــــ پھر کون ہے آتی؛
اُونچے اونچے کہساروں سے، رنگین رنگین نظاروں کو
دور۔ شفق کی رنگینی سے
شرماتی ــــ پھر کون ہے آتی
بین بجاتی؛
فطرت کے باغوں کی مالن، آپ ہی پریتم آپ ہی ساجن
اپنے حُسن کے اندازوں پر
اتراتی۔ پھر کون ہے آتی
بین بجاتی؛
ہنستی بھی ہے روتی بھی ہے، پاتی بھی ہے کھوتی بھی ہے
ہستی کی اُونچی موجوں پر
لہراتی۔ پھر کون ہے آتی
بین بجاتی؛
فطرت کی گودی میں پلی ہے، فطرت میں پروان چڑھی ہے
کہساروں میں حورِ عرشی
اٹھلاتی ــــ پھر کون ہے آتی
بین بجاتی؛
من ہی مندر من ہی نیا، آپ پجارن آپ کھویا
اس ظالم دنیا کو ہنس کر
بہکاتی ــــ پھر کون ہے آتی
بین بجاتی؛
بال کھلے ہیں آنچل الجھا، رخ پہ شفق کا رنگین ٹیکا
ایسے سندر روپ کو پاکر
اتراتی۔ پھر کون ہے آتی
بین بجاتی؛
دنیا کا انجام سمجھ کر۔ انسانوں کا کام سمجھ کر
تنہائی میں پریم کی دیوی
لہراتی، پھر کون ہے آتی؛
بین بجاتی!

(امین حزین)
بہاولپور

# مجبور ہستی

وہ پیدائشی لنگڑا تھا۔ اور بھیک مانگا کرتا۔ ایک دن کسی کار کے نیچے آ کر اس کی دوسری ٹانگ بھی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ مقامات جہاں لوگوں کی آمدورفت زیادہ رہتی تھی۔ اُسے خوب یاد تھے۔ وہ علی الصبح اُٹھتا۔ چوک منڈی یا مال روڈ کی فٹ پاتھ پر بیٹھ جاتا اور فانی ہے سنسار بابا فانی ہے سنسار" کی رٹ لگانا شروع کر دیتا۔ اور جب اپنے مخصوص الفاظ کو بار بار دہراتے ہوئے تھک جاتا۔ تو ایک آہ سرد کھینچکر چند لمحوں کے لئے خاموش ہو جاتا۔ اور پھر وہی الفاظ دہرانے شروع کر دیتا۔ جیسے کوئی اندرونی قوت اُسے ایسا کرنے پر اُکسا رہی ہے۔

اُس کی آواز میں ایک خاص ترنم اور درد تھا۔ جس کو سُنتے ہی دِل میں ایک چوٹ سی لگتی۔ مگر لوگوں کے کان اُس سے اس قدر مانوس ہو چکے تھے۔ کہ انہیں اِس بوڑھے کی آواز کا نمایاں سوز بھی شہر کی ہاؤ ہو کا ایک غیر معروف جزو معلوم ہوتی تھی۔ وہ اِس سے نفرت کرتے تھے۔ اور اس کے بھیانک چہرے کو جسے گھنے بالوں نے اور بھی قبیح بنا دیا تھا دیکھ لینا بُرا شگون سمجھتے تھے۔ جب وہ شام کو کسی بھٹیارے کی دوکان سے دال روٹی لینے جاتا۔ تو وہ بھی اُسے حقارت آمیز نگاہوں سے گھورتے ہوئے دُور ہی رہنے کی تلقین کرتا۔ تانگہ ڈرائیوروں کو اُس سے اس لئے شکایت تھی۔ کہ بعض اوقات انہیں اس اپاہج کی جان بچانے کے لئے اپنی گاڑیاں روکنا پڑتیں۔ شہر کے چھوٹے بڑے اُس سے خوب واقف تھے۔ نوجوان اس لئے کہ وہ بچپن میں بارہا اس کی لاٹھیاں چھین چکے تھے۔ اور بچے اِس لئے کہ وہ اُن کا اب تختہ مشق بنا ہوا تھا۔

گذشتہ نصف صدی سے اُس کے مصائب میں ذرہ بھر بھی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ زندگی کی ایک بے کیف رَو میں بہا جا رہا تھا۔ جس میں تنوع نام کو نہیں تھا۔ جسے غم کے مستقل بادلوں نے تاریک کر رکھا تھا۔ اس کے لئے دُنیا حقیقۃً دارالمحن تھی۔ اگر اُسے کوئی نیا تجربہ ہوتا تھا۔ تو تلخ۔ وہ دنیا کا ذلیل ترین انسان تھا۔ اُس کا معیار حیات پستی کیطرف تو جا سکتا تھا۔ مگر بلندی کیجانب نہیں۔ دُنیا کے انقلابات اور شب و روز کی گردش اُس کے لئے لایعنی تھی۔ ہر آنیوالا لمحہ اُس کے لئے نئے مصائب کا پیش خیمہ ہوتا۔ جاڑے کے اختتام پر اُس کے دل میں مسرت کی ایک جھلک پیدا ہو جاتی کہ اب اُسے سردی کی مصیبت سے نجات ملجائے گی۔ مگر آنیوالے موسم گرما کی جھلسا دینے والی لو کے خیال سے اس کے چہرے پر پھر چھا جاتی۔

جب شام کو نوجوان سیر کے لئے نکلتے تو وہ اپنی آواز کو زیادہ دلسوز اور ترحم انگیز بنا لیتا۔ مگر وہ اس پر صرف ایک نگاہِ غلط انداز ڈالتے ہوئے۔ ہنستے بولتے، شباب کے رنگین خیالوں میں مست گذر جاتے۔ بدنصیب اپاہج محسوس کرتا کہ وہ تنہا ہے اس پرشور دُنیا میں رہتے ہوئے بھی وہ تنہا ہے۔ اور اِس ہنگامہ زار ہستی میں بے دست و پا ہے

بے یار و مددگار چھینک دیا گیا ہے۔ بسیرگاہوں پارکوں۔ اور ہوٹلوں میں جانا اس کے لئے ممنوع تھا۔ وہ صرف سڑکوں پر بھی بھیک مانگنے پر اکتفا کرتا۔ شکم پری کرنے پیٹ پر ذریعہ معاش چھن جانیکے باوجود بھی اُس کے ساتھ تھا۔ حسین مناظر میں لوگوں کی نگاہیں ایک بھونڈے اپاہج کو دیکھنا گوارہ نہیں کرتی تھیں۔ انہوں نے کبھی خود کو اس کی جگہ تصور کر کے اُس بوڑھے کی مشکلات کا اندازہ نہیں کیا تھا۔ انہوں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ کہ اس کی زندگی کتنی تباہیوں کا مرکز بڑھے وہ بلے اقتدار تھے۔ بادۂ عیش کے نہ ٹوٹنے والے خمار کیطرح ...... آخرکار وہ دن بھر بھیک مانگنے کے بعد ایک کیکر کے درخت کے نیچے پڑ رہتا۔ یہ درخت سٹیشن سے جانیوالی سڑک پر شہر سے باہر تھا۔ مدتوں وہیں رہتے رہتے اُسے اس درخت پر اپنی ملکیت کا دھوکا ہوتا تھا۔ اگر کوئی اس کا مونس و غمخوار تھا۔ تو درخت۔ کبھی کسی نے اُسے گرمی میں بیقرار دیکھکر ٹھنڈا پانی پیش نہیں کیا تھا۔ یا کسی نے خون منجمد کر دینے والے جاڑوں میں اُس کو دھکتی ہوئی انگیٹھی پر لاکر نہیں بٹھایا تھا۔ لیکن یہ درخت اس کا رفیق تھا۔ انتہائی جاڑوں میں موسلا دھار بارشوں میں بیباک ہواؤں اور شعلہ ریز طوفانوں میں یہی درخت اُسے محفوظ رکھتا تھا۔ وہ اُسے اپنا سمجھتا تھا۔ اُسے وہاں آکر ایک روحانی طمانیت حاصل ہوتی تھی۔ یہ درخت اُس کے اطمینان قلب کا باعث تھا۔ وہ اُس سے محبت کرتا تھا۔ ایک درخت سے جو آبادی نما ویرانہ کے مکینوں کیطرح حساس دل رکھنے کا مصنوعی دعوے نہیں کرتا تھا۔ اب اُس کے قوا مضمحل ہو چکے تھے۔ طوفانِ حیات کے پیہم حوادث نے اُسے تھکا دیا تھا۔ اب وہ آرام چاہتا تھا۔ یہ ہستی کے ذلیل کن تھپیڑوں سے بچکر اب وہ ایک پُرامن جگہ کا متلاشی تھا۔ اور اس کے وجود سے فائدہ بھی کیا تھا۔ دنیا پر اس کی زندگی بار تھی۔ وہ کسی کے کام کا نہیں تھا۔ لوگ چاہتے تھے کہ وہ مر جائے۔ ہاں وہ خود بھی جینا نہیں چاہتا تھا۔

( ۲ )

ایک دن اُسے بخار آگیا۔ وہ بھیک مانگنے نہ جا سکا۔ بارہا فاقوں سے وہ بھوکا رہنے کا عادی ہو چکا تھا۔ گرسنہ شکم پڑا رہا۔ آج دن بھر بادل چھا رہے تھے۔ سرِ شام ہی سے فضا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ ہوا تیز ہو گئی تھی۔ گاہ بگاہ بوندا باندی بھی شروع ہو جاتی تھی۔ وہ اپنا کمبل سمیٹ کر تنہ کی آڑ میں ہو بیٹھا۔ ہر چند کہ سردی نشتر چبھو رہی تھی۔ تاہم کبھی کبھی وہ اُونگھ ہی جاتا۔ نصف شب گذر جانیکے بعد اُس نے کسی کے پاؤں کی مدھم سی چاپ سُنی معلوم ہوا کہ کوئی اُسکی طرف بڑھ رہا ہے۔ کون ہے؟ بڈھے نے چلا کر کہا۔

ایک کانپتی ہوئی نازک چیخ بلند ہوئی اور کسی کے زمین پر گرنیکی آواز آئی۔ ایک سات آٹھ سال کا بچہ زمین پر پڑا ہوا تھا۔ جو گھسٹ گھسٹ کر اُس کے نزدیک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ نُورپور کے ایک متمول زمیندار کریم خاں کی لڑکی زبیدہ تھی جس کی کمسنی میں ماں مر گئی تھی۔ اور اس کے باپ نے دوسری شادی کر لی تھی۔ ابتداءً تو سوتیلی ماں نے اُس سے بہت محبت جتلائی۔ مگر بیٹے سلیم کے پیدا ہونے پر ماں باپ کے تیور بدل گئے۔ غریب زبیدہ بات بات پر پٹ جاتی اس پر ہر وقت ملامت کی بوچھاڑ رہتی۔ اُس کا پھول سا چہرہ مرجھا گیا۔ جن نگاہوں میں پہلے مسرت رقص کیا کرتی تھی۔ اب اُن سے موٹے موٹے آنسو ٹپکا کرتے۔

اس واقعہ سے ایک دن پہلے کریم خاں کسی کام سے باہر گیا ہوا تھا۔ سلیم کو بخار آیا۔ یکایک تکلیف بڑھ گئی۔ ماں نے دوا کی شیشی جو دیکھی خالی تھی۔ اتفاقاً کلو حجام نے اپنے نواسے کی منگنی پر شہر جانا تھا۔ زبیدہ کی ماں نے اس کو آنے دیکر زبیدہ کو اس کے ہمراہ کر دیا۔ کہ وہ اسے شہر سے دوائی لیکر دیوے۔

کلو تو دوائی زبیدہ کو دلوا کر چلتا بنا۔ لیکن زبیدہ ہنگامہ ہائے شہر میں بھٹک کر رہ گئی۔ تاریکی بڑھ رہی تھی۔ اور معصوم لڑکی لاتعداد لوگوں کے درمیان بھٹک کر رہ گئی۔ وہ بالکل بے نیاز ہو کر بازاروں میں آہستہ آہستہ گھومتی رہی۔ گلزار ہوٹل کے موڑ پر برابر کی عالیشان عمارت کے تماشا میں محو تھی۔ تو بجلی کی سی تیزی سے ایک موٹر سامنے سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ مجبوراً وہ آگے چلتی گئی۔ اس کے ننھے ننھے ہاتھ سرخ ہو رہے تھے۔ کان۔ ناک اور چہرہ سردی سے سن ہو چکا تھا۔ جب ہوا کے تند جھونکے اس کے چہرے سے ٹکراتے تھے تو سردی کی شدت کی وجہ سے اسے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ شعلے اس کے منہ کو نوچ رہے ہیں کئی بار گرنے سے کپڑے کیچڑ میں لت پت ہو رہے تھے۔ وہ سراپا تصویر بیکسی تھی۔ شفقت مادری کے محبت خیز ہاتھوں سے دور۔

آخر چلتے چلتے اس درخت کے پاس پہنچی۔ جو ضعیف اپاہج کا مسکن تھا۔ اس خیال سے کہ شاید درخت کے نیچے کچھ پناہ مل جائے آگے بڑھی۔ اندھے کی اچانک آواز سے ڈر کر بھاگنا چاہا۔ مگر لڑکھڑا کر گر پڑی۔

(۳)

بڈھے نے زبیدہ کو اٹھایا اور اپنا کمبل اوڑھا کر خشک جگہ پر لٹا دیا۔ آج عمر بھر میں پہلی بار ایک بیچارہ لڑکی اس سے طالب امداد ہوئی تھی۔ کس سے؟ ایک بھکاری سے جو فلاکت کی فضا میں پلا تھا۔ جس کا کوئی گھر بار نہ تھا۔ جو خدمت خلق سے قطعاً نابلد تھا۔ مگر اس کے پاس ایک چیز تھی۔ ایثار۔ تو پھر وہ کیوں نہ اپنا سرمایہ۔ اپنی پونجی۔ دوسروں پر قربان کر دیتا؟ غیر کی تکالیف کا اندازہ وہ زیادہ صحیح طور پر کر سکتا تھا۔ اس نے اپنا سب کچھ زبیدہ پر قربان کر دیا۔ ایک بوسیدہ کمبل یا چند بالشت زمین جو کچھ گرم تھی۔

علی الصبح پہلی گاڑی کے مسافر شہر کو آئے تو انہوں نے کمسن زبیدہ کو آرام سے سوتا ہوا پایا۔ اور قریب ہی بڈھے اپاہج کی لاش۔

(علی احمد رفعت)

# پالیسی کی وضاحت

ظریف اس نے یہ جب پوچھا ہیں پالیسی کے کیا معنے
کہا میں نے گلا کمزور لوگوں کا دبا دینا
غرض ہو جن سے کرنا انکی بیجا ناز برداری
جو ہوں آفت رسیدہ خاک میں ان کو ملا دینا

ظریف

# ظرافت

## شیخ سعدی شیرازی رح

حضرت شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی ایران کی مملکت میں اپنی زندہ دلی اور ظرافت کے سبب اسیطرح مشہور ہیں جس طرح سے ہندوستان میں بیربل۔ قہوہ خانوں اور محفلوں میں "شیخ" کے قصے آج بھی ذوق کیساتھ دہرائے جاتے ہیں۔ اور دلچسپی کے ساتھ سنے جاتے ہیں۔

سعدی بڑا ذہین اور طباع مصنف تھا۔ ہر چیز کو غور سے دیکھتا۔ اس کا کھوج نکالتا۔ وجہ تسمیہ دریافت کرتا دل میں سوچتا اور آخر اس کا سبب نکال لیتا۔ یہ عادت اُس نے اپنی جہاں گردی سے حاصل کی تھی۔ سعدی سیر و سیاحت کا بڑا شائق تھا۔ اور کوئی مسافر اپنا لباس اور بدن صحیح حالت میں لیکر واپس نہیں آسکتا۔ جبتک کہ اسکا دل و دماغ حقائق کے مطالعہ کے لئے پختہ نہ ہو چکا ہو۔ زمانے کی ٹھوکریں کھا کر غریب الوطنی میں غیروں کا تختۂ مشق بن کر یہ سب باتیں آپ سے آپ پیدا ہو جاتی ہیں۔

سعدی کے متعلق ایک قصہ ہے کہ وہ کہیں مسافرت میں دور تھا۔ قافلہ صحرا کو عبور کر رہا تھا۔ قزاقوں نے ڈاکہ مارا۔ مال و متاع تو لوٹنا ان کے باپ دادا کا حق تھا۔ گویا شیر مادر۔ مگر وہ انسانوں کو بھی اپنے ہمراہ غلام بنا کر لے گئے۔ اور شہر میں جا کر انہیں بیچ دیا۔ سعدی بشرے سے کچھ سنجیدہ انسان دکھائی دیتا تھا مگر بھی کہولت کا پتا دیتی تھی ایک کھاتے پیتے شریف آدمی کی نگاہ میں آپ بچ گئے۔ اُس نے دس روپے میں خرید لیا۔

سعدی غلام بن کر اس کے گھر میں رہنے لگا۔ چند روز میں معلوم ہوا کہ یہ غلام تو پڑھا لکھا اور عالم انسان ہے پھر وہ گھر میں گھر والوں کی طرح رہنے لگا۔ آخر رسوخ اسقدر بڑھا کہ سعدی کے آقا نے اپنی بیٹی کی شادی اُس سے کر دی۔ اب وہ گھر میں داماد کی حیثیت سے براجمان تھا۔

سعدی کی بیوی شکل و صورت میں تو وہ یکتا نہیں کہ کیسی تھی۔ مگر زبان درازی میں وہ اپنا ثانی زمانے میں نہیں رکھتی تھی۔ سعدی اُس کی دریدہ دہنی سے بہت تنگ آگیا۔ مگر نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔ وہ تو غلام تھا۔ ایک دن محترمہ نے میاں کو فرمایا۔ کہ تم وہی آدمی ہو نا۔ جس کو میرے باپ نے دس روپے میں خریدا تھا۔ اور وہ بطور غلام میری خدمت کیا کرتا تھا" سعدی کے مقابل میں حاضر جوابی کے میدان میں آنا گویا پہاڑ سے ٹکر مارنا تھا۔ شیخ صاحب نے کہا۔ آپ سچ فرماتی ہیں۔ "خریدا تو دس روپے میں تھا مگر آپ کے ہاتھ مفت بیچ ڈالا" نہ بہار کے پرندے ایک جگہ ٹھکانا بنائیں اور نہ دولت اور خوش بختی کسی کی غلام بن کر رہیں نہ سعدی کسی جگہ پر جم کر نہ بیٹھ سکے وہ تو فطرتاً ایسا تھا۔ اور اُس کے ساتھ ایسی بیوی سے ایسے میاں کو کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ آخر شیخ ایک رات کو گھر سے گئے اور ایسے گئے کہ پھر لوٹ کر وہاں نہ آئے۔

# جنگ میں گیس باری کا خطرۂ عظیم

## عام شہری کیونکر اپنی حفاظت کر سکتے ہیں؟

جب سے جنگ حبشہ و اطالیہ میں اطالوی بربریت نے زہریلی ہواؤں کے ذریعہ سے غریب حبشیوں کی ہولناک تباہی و بربادی کا منظر دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ یورپ میں اور ہر جگہ لوگ بہت خوف زدہ ہو گئے ہیں۔ اور زہریلی گیس سے محفوظ رہنے کے طریقے سوچے جا رہے ہیں۔ مصر میں حال ہی میں ایک تحقیقاتی ادارہ قائم ہوا ہے۔ اور مصر کے سائنس دان پوری کوشش کر رہے ہیں کہ اس زہر کا تریاق معلوم کریں۔ جب "شیطانی دماغ" انسان کو برباد کرنیوالی چیزوں کی ایجادیں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ تو امید رکھنی چاہیے۔ کہ وہ انسانی دماغ بھی ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔ جن کو بندگانِ خدا کی حفاظت اور بھلائی کے لئے "شیطانی حربہ" سے اللہ کے بندوں کو محفوظ رکھنے کے مؤثر اور کامیاب طریقے معلوم کرنیکی تلاش و جستجو ہے۔ اس سلسلہ میں ایک سائنس دان کا مضمون "ہمّ تیغ ویکلی" سے نقل کرتے ہیں۔ امید ہے کہ دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

اس بات کا چرچا تو ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ کہ آئندہ جنگ بہت خوفناک ہوگی۔ اور ہوائی خطرہ سب سے زیادہ مشکلات کا باعث ہوگا۔ یہ بھی دہشت ہے کہ زہریلی گیسیں انسانوں کے لئے ایسا زبردست حملہ ثابت ہوں گی۔ کہ ان کے آگے اور چیزوں کی ہلاکت بے حقیقت ہو جائے گی۔ مگر ہمیں اس امر پر غور کرنا ہے۔ کہ گیس باری سے بچنے کی کوئی تدبیر ہے۔ شہروں پر اگر زہریلے بم گرائے گئے تو ان سے سول آبادی کو کیونکر بچایا جا سکتا ہے۔ اور کیا تدابیر حفظِ ماتقدم کی عام شہری استعمال کر سکتے ہیں۔

"گذشتہ جنگِ عظیم میں آتشگیر مادوں اور زہریلی گیسوں کا استعمال تجربے کے طور پر آزادی کیساتھ کیا گیا تھا۔ اسکے بعد سے گیسوں کی خوفناکی میں اور بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ ہوائی طاقتیں بھی بڑھ گئی ہیں۔ اور یہ لازمی ہے۔ کہ اگر ہوا میں سے گیس کے بم آئندہ جنگ میں پھینکے گئے تو سخت خوف و ہراس پھیل جائے گا۔ گیس باری سے اتنا نقصان ہو یا نہ ہو۔ مگر خوف و دہشت اور شہریوں میں ہنگامہ مچ جائے گا۔ اس سے جو خطرات اور نقصانات ظہور میں آئیں گے۔ اس سے بڑی تشویش پیدا ہو گئی ہے۔

اس مسئلہ میں کافی مضمون لکھے گئے ہیں۔ اور مختلف خیالات ظاہر کئے جاتے رہے ہیں۔ اگر اس مسئلہ کا قریبی معائنہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ معاملات اس قدر سنجیدہ نہیں ہیں جس قدر سمجھ لئے گئے ہیں۔ اگر انسان ذرا بھی ہوشیاری اور مستعدی سے کام لے تو گیس کے خطرہ

سے شہریوں کو محفوظ کرنیکی آسان تدابیر اختیار کرسکتا ہے فرض کر لیجئے۔ شہر لندن کے جنوب مغرب کیطرف سے دشمن نے فضائی حملہ کیا ہے۔ گیس پھینکی جارہی ہے۔ پھٹنے والے بم اور گولے گر گر کر تباہی اور ہولناک صورت حال پیدا کر رہے ہیں۔ لوگ خوف و دہشت سے مرے جا رہے ہیں......

ذرا اب یہ سمجھ لیجئے۔ کہ گیس کسے کہتے ہیں۔ گیس سے مراد صرف بخارات یا بھاپ کی قسم کے مادے ہی نہیں ہیں بلکہ ٹھوس اور پانی جیسے پتلے (رقیق) ابھار کن مادے کو بھی آجکل گیس شمار کیا جاتا ہے۔ گیس کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی وہ قسم جو دیرپا کہی جاسکتی ہے۔ یعنی پھیلنے کے بعد وہ فضا میں قائم و ثابت رہ سکتی ہے۔ دوسرے "غیر دیرپا" گیس جو زمین پر آتے آتے اپنی ہلاکت خیزی کھو دیتی ہے۔ اس تقسیم کے سمجھنے کے بعد یہ آسانی کیساتھ سمجھا جا سکتا ہے۔ کہ جو گیسیں جلد غائب ہو جاتی ہیں۔ کسی بلند زاویہ سے نہیں پھینکی جاسکتیں۔ اگر پھینکی گئیں تو آتے آتے بیکار ہو جائیں گی۔ مگر بموں میں بھر کر ہر قسم کی گیس پھینکی جاسکتی ہے۔ جو پھٹنے کے دھماکے کیساتھ موت و دہشت پھیلا سکے گی۔ گیس پاشی کے لئے موسمی حالات کا اچھا ہونا بھی ضروری ہے۔ مثلاً بارش نہ ہو۔ کہر نہ ہو۔ حرارت کا درجہ معمولی ہو۔ تیز و تند ہوا نہ چل رہی ہو۔ (وغیرہ وغیرہ)

کاربونیل کلورائیڈ گیس ایک غیر دیرپا گیس ہے۔ اسے اگر پھینکا جائے تو ہوا میں سطح زمین سے بارہ فٹ پر ایک خطرناک بادل نمودار ہوگا۔ حتیٰ کہ تازہ ہوا اس بادل کو فوراً منتشر کردیگی مگر "سرسوں" گیس ایسی خطرناک گیس ہے کہ ہفتوں اور مہینوں تک اس رقبہ کی فضا زہریلی رہیگی۔ اور سانس کیساتھ انسان کے جسم میں جاتی رہیگی۔

بستیوں اور آبادیوں میں انسان بموں اور گیسوں سے کیونکر محفوظ رہ سکتا ہے۔ یہ بحث سب سے زیادہ ضروری ہے۔ ایسی محفوظ عمارتیں بنانا کہ بموں کے حملہ کو سہار سکیں۔ ایک طول مل ہے۔ گیسوں سے بچنے کے لئے یہ لازمی ہے۔ کہ انسان تہ خانوں اور زمین دوز مقاموں میں گھس جائے۔ گیس باہر کی سطح پر دیواروں اور پتھروں سے ٹکرا کر اپنی حرارت و ہلاکت فنا کردیگی آئندہ عمارتیں ایسی بنائی جائیں۔ کہ دو منزلیں ہونگی بجائے اوپر کی سطح ہونیکے زیر زمین ہوں۔ ایک منزل اوپر ہو اور باقی تمام رہائشی جگہیں زیر زمین بنائی جائیں۔ ایک آدمی کے لئے کم از کم ۲۰ فٹ مربع جگہ ہو۔ اور ایک کمرہ کی اونچائی ۹ فٹ ہو۔ بیشتر کی کھڑکیوں پر باہر کی جانب کارڈ بورڈ اور اندر کی طرف معمولی کاغذ چپکا دیا جائے۔ جہاں کہیں فریم میں روزن اور معمولی سی درز بھی دکھائی دے۔ اسے موٹی پٹی یا کاغذ کی چیپی سے بند کر دیا جائے۔ تاکہ گیس داخل نہ ہو سکے۔ آگ جلانیکی جگہیں اور دروازوں کو بھی اسیطرح مضبوطی کیساتھ محفوظ اور بند کر دیا جائے۔ یہ احتیاطی تدابیر بارہ گھنٹہ کیلئے زمین دوز قیام کے لئے مفید ہوسکتی ہیں۔ زیادہ عرصہ تک اگر فضائی حملہ کا خطرہ محسوس کیا جائے تو اور تدابیر اختیار کیجاسکتی ہیں۔ مثلاً پینے کا پانی اور کھانیکی چیزوں کا معقول ذخیرہ تہ خانوں میں موجود ہو۔ ان گھریلو احتیاطوں کے علاوہ ہر شخص آسانی کیساتھ "گیس روک" نقابیں بھی ہر جگہ سے حاصل کر سکیگا۔ اگر کسی جگہ سے گیس آپ کے کمرہ میں داخل ہو بھی جائے تو یہ نقاب پہن لینے سے آپ محفوظ ہو جائینگے اور احتیاط کے طور پر گھر کے ہر متنفس کے لئے ایک ایک نقاب موجود رہنی چاہیئے۔ تاکہ فوری ضرورت پڑنے پر کام دیسکے

بطلوع سمندری سفر میں انسان کے لئے الالف ہیلٹ (
جان بچانے والی سمندری [illegible] ایجاد ہوگئی ہے۔
جب کبھی [illegible] کا اعلان ہو جائے کہ گیس پھینکی جانی شروع ہو گئی ہے۔ اس وقت تمام ایسی شہری آبادی جو کسی جنگی کام پر مامور نہیں ہے۔ اپنے اپنے کمروں میں گھس جائے گی

اور جب تک گیس ختم نہ ہو جائے۔ باہر نہیں نکلیگی۔ اس لئے ان نقابوں کا استعمال باہر نکلنے کے بعد بھی ضروری ہوگا۔ مسٹرڈ گیس بہت خراب اور مہلک گیس ہے۔ بھاپ کی صورت میں دکھائی نہیں دیتی۔ مگر جب رقیق (پتلی) ہو تو زرد رنگ کی چیز معلوم ہوتی ہے۔ اس کا اثر آدھ گھنٹہ بعد معلوم ہوتا ہے۔

(از مسٹر سی۔ ڈی بوور)

# ایران سے تازہ موصول شدہ چند اشعار

## غزل

حضرت فاضل دہر عالم دانشمند محترم جناب شعاع الملک شیرازی

ایران اس وقت اپنی زندگی کے عجیب دور میں سے گزر رہا ہے۔ اس ملک کے ساکنین کا نظریہ بالکل بدل گیا ہے۔ اب کے وہ مغرب کے دوش بدوش چلنا چاہتے ہیں۔ ان کے ہاں ایک وہم یہ بھی ہے۔ کہ فارسی رسم الخط کی بجائے رومن خط کو رواج دیا جائے۔ ترکی نے تو ایک مثال قائم کردی ہے۔ اب ایران کو اس کا خیال ہوا ہے۔

اس ذہنی تبدیلی کا اثر زبان اور ادب پر بھی ہوا ہے۔ مغربی خیالات نے ادب میں اپنی مستقل جگہ بنا لی ہے۔ مغربی الفاظ کی بھرمار ہے۔ جس نے فارسی میں اپنا داخلہ شروع کر دیا ہے۔ خاص طور پر فرانسیسی جملے کی بناوٹ اور تحریر کی طرز بھی پُرزور مگر خشک جامد اور پُرمعنی ہو گئی ہے۔ آرائش ہر روز کم ہوتی جا رہی ہے۔

ہمیں ایران سے کچھ تازہ جدید کلام موصول ہوا ہے۔ جو بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

دلبر من که سراپا همه غنج است و دلال | بجمالش که ندارد بجهان شبه و مثال
بشکر خنده اگر باز کند غنچهٔ لب | بکَنَد گل بچمن پیش من غنج و دلال
گر بمجلس همه خوبانِ جهان جمع شوند | او بود صدر نشین و دگران صف نعال
پیشِ رویش دگران صورت بر دیوارند | راست گفته است چه من سعدی فرخنده مقال

گر مہ چاردہ او را نگرد از سرِ ناز — بہلالش کہ شود ماہ دو ہفتہ چو ہلال
زہرہ را زہرہ نباشد کہ ببیند رویش — مگر از اوج بزیر آید و گردد زوال
گر فرود آید و بیند کہ زند چنگ بچنگ — از حسد بلبل شکم را بدرد با چنگال
ہر زمانے کہ بجنبد ز زمین انپئے رقص — بر سرش چرخ زند چرخ و فتد از دنبال
فصلِ گل بلبل شوریدہ شنید آوازش — بازدہ ماہِ نجومی لبشد از خواندن لال
تا جرِ مشک تتاری شود و عنبر تر — گر تبارِ سرِ زلفش بوزد باد شمال
من چہ گویم زد و برگ گل لب شگفتہ او — حوض سیمی است کہ پروردہ درو ماہی زلال
خلاق در خوبی، خلاق بود لیکن نیست — رحم و انصاف و مروت بدلش یکمثقال
نگرد عاشق بیچارہ چو من در عالم — گر کند جملہ عشاق حزیں را غربال
مے کنی صید غزالاں بغزل خوب شعاع — دیدہ باز ترا ناز مہ و چشمان غزال

# ایران کی تازہ سیاحت کے حالات

آجکل پہلوی سے رشت تک کی مسافت موٹروں میں بیٹھ چند گھنٹوں کے اندر طے ہو جاتی ہے پہلے یہ زحمت تھی۔ کہ قایق کے وسیلہ سے مرداب کو عبور کرنا پڑتا تھا۔ اور خلیج کوچکی سے پیر بازار ہوتے ہوئے ورشکہ زمین ہیں بیٹھکر رشت تک پہنچتے تھے۔

رشت ناسالم ہے مگر مشرقی گیلان کا پایہ تخت۔ پہلے یہاں ابریشم کے متعلق ہر قسم کا کام بہت کثرت سے ہوتا تھا۔ اب سیاسی حیثیت سے صرف یہی پہلو جاذب توجہ ہے کہ شمال کیطرف بحری مخرج صرف یہی ایک ہے۔

جب آپ شمال سے جنوب کیطرف چلتے ہیں۔ تو برہنہ چوٹیاں ننگے پہاڑ اور گھنے جنگل بہت ملتے ہیں۔ مگر ان سب میں ایک حسن ہے۔ اِک جذب ہے اِک دلکشی ہے۔

بایر اراضی، بنجر زمین، اور منتشر و مختصر قریوں میں سے گذر کر آب دفعتاً بہ رشت سے دوچار ہو جاتے ہیں۔ جو زمرد ین نباتات بنفشہ، بہاری پھولوں اور کلیوں سے مستور سا رہتا ہے۔

رشت سے نکلکر تنگ و عمیق درے اور سفید رود کے گردنے ملتے ہیں۔ راستہ خطرناک ہو جاتا ہے۔ مگر ہر نیا خطرہ ایک نئے جذبہ انبساط کا حامل ہوتا ہے۔ اور پھر یکایک طبیعی سبزہ زاروں کا سیل سا دکھائی دیتا ہے۔

غالباً تاریخ قزوین نے ساسانیوں کے عہد سے خوشگوار کروٹ لی ہے۔ اور شاپور دوم نے اس کی بنا ڈالی ہے۔ ہارون الرشید نے بھی ایک مسجد بنوائی تھی۔ حسن صباح نے مدرسہ عمر خیام (۱) (نیع قزوین) پر قبضہ کر لیا تھا۔ اور قلعۂ الموت پر بھی اسی کا قبضہ ہوتا تھا۔ جو قزوین سے چالیس میل پر ہے۔ یہیں شاہ طہماسپ نے ہمایون کو پناہ دی تھی۔ شاہ عباس نے جب سے دارالحکومت قزوین سے اصفہان کو منتقل کر دیا پھر کبھی اس سوکھی ندی میں پانی نہ لوٹا۔ یہاں سے قدیم صفوی خرابوں میں سب سے مشہور علی قاپی کا دروازہ ہے۔ جو طہماسپ کے قصر مخروبہ کے پہلو میں ہے۔ اور اس شہر میں مشہور عالم مسجد شاہ بھی موجود ہے۔

جب قزوین سے مغرب کی طرف بڑھے۔ تو خدابندہ سلطان الجایتو کی نظر فریب مسجد کے شاداب گنبد نظر آتے ہیں۔

قریہ سلطانیہ کے پہلو میں ایک ہشت ضلعی مقبرہ بنا ہوا ہے۔ اس کے بعد زنجان ہے۔ جہاں کی مشبک زرگری اور ملمع کاری مشہور ہے۔ کسی زمانے میں یہی زنجان بابیوں کا مضبوط قلعہ تھا۔ اس کے بعد قریہ میانہ ہے۔ جہاں کے زہریلے سانس سے فرانسوی سیاح (ARGASPER) نے زہر کا گھونٹ پی کر جان دی تھی۔ اب قریہ کمانجائے سے گذر کر ہم لوگ تبریز پہنچ جاتے ہیں۔ دورۂ قاچاریہ میں یہی مقام ولیعہدوں کے لئے مخصوص تھا۔ شاید ہی پردۂ دنیا میں کسی اور شہر میں خطرناک زلزلے آئے ہوں۔ سنہ ۱۷۸۰ء کے زلزلے میں ۱۲۰۰۰۰ آدمی ہلاک ہو گئے تھے۔ جہاں شاہ قرہ قویونلو کی پندرھویں صدی والی مرصع اور بیش بہا مسجد بھی اسی زلزلے کی نذر ہو گئی۔

میانہ و تبریز کے بیچ بیچ ساسانیوں کے زمانہ کا پل دختری الملک قائم ہے۔ اردبیل بھی سرحد کے پہلو میں ہے۔ جہاں شیخ صفی الدین سلسلہ صوفیہ کے موجد رہتے تھے۔ اسی لئے مشہور ہے۔

اب ہم مغرب کی طرف بڑھتے ہوئے۔ البرز کے سادہ دامنوں سے گذر کر طہران کے سامنے پہنچ جاتے ہیں۔ اس شہر کی چار دیواری میں بارہ دروازہ ہیں۔ ہر ایک میں نفیس کاشی کاری ہے۔ طہران کے جبروت کا راز قلعہ دماوند میں مستور ہے۔ چوٹیاں گرمیوں میں برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔ اور چاروں طرف پہاڑ ہی پہاڑ ہیں۔

دماوند کی بلندی ۱۸۶۰۰ قدم ہے۔ کشتی نوح کے ٹھہراؤ کی داستان بھی یہیں سے متعلق ہے۔ ناصر الدین شاہ نے طہران کو بلند کیا۔ مگر اب رضا شاہی دور میں مدارج کمال کے زینے طے ہو رہے ہیں۔ دن دونی رات چوگنی ترقیاں ہو رہی ہیں۔ بہت بڑی بڑی سڑکیں۔ وسیع فٹ پاتھ۔ سر بفلک عمارتیں۔ بینک۔ بلدیہ کا دفتر۔ انحصار۔ لقا لنطے۔ سینما۔ ہوٹل۔ دوکان۔ باغات۔ کثرت سے تیار ہو رہے ہیں۔ سنگ فرش کی سڑکوں پر کئی کوس تک سایہ دار بلند درخت۔ دو رویہ لگائے گئے ہیں۔ نیاوری قصر، مجلس شورائے ملی۔ اور شاہی محلات قابل دید ہیں۔ خصوصاً قصر گلستان۔ جہاں قلمی اور نادر کتابوں کا گنجینہ ہے۔ اور اسی کے پہلو میں ایک بڑے ہال میں موزہ (میوزیم) بنایا گیا ہے۔ جس میں قریب قریب ہر صدی کے پارچہ جات اطلسی و ریشمی و پشمی اور قالی کے نمونے ہیں۔ ان کے علاوہ دو جواہرات مرصع چیزیں بھی جالب نظر ہیں۔ ایک تو تخت ہے۔ جسکو اکثر لوگ تخت طاؤس سمجھتے اور کہتے ہیں۔ وہی تخت جو نادر شاہ دہلی کے دیوان

خاص سے لیا گیا تھا۔ مگر بقول لارڈ کرزن نیور نیر نے ۱۷۶۵ء میں اس تخت کو دیکھا تھا۔ اور جو تفصیلات بیان کی ہیں۔ وہ بالکل جداگانہ ہیں۔ تخت دہلی میں بارہ ستون تھے۔ تخت طہران میں صرف سات ستون ہیں۔ کرزن کی تحقیق کے مطابق فتح علیخاں نے طاؤس خانم نام ایک نازنیں سے اصفہان میں شادی کی تھی۔ اور تخت مکلل دمرصع اصفہان کو اس کے نام سے منسوب کردیا تھا۔

دوسری چیز کرۂ بزرگ ہے جو جواھرات سے ناصرالدین شاہ قاچار کے لئے بنوایا گیا تھا۔ جہاں کہیں دریا ہیں وہ زمرد سے دکھائے گئے ہیں۔ انگلش اور فرانسوی حکومتیں۔ الماس سے افریقہ یاقوت سرخ سے ہندوستان یاقوت کبود سے اور ایران فیروزہ سے دکھایا گیا ہے۔

طہران سے جنوب کیطرف شاہ عبدالعظیم کا مقبرہ ہے۔ ریل بھی جاتی ہے۔ موٹر بھی۔ ان کا انتقال نویں صدی میں ہوا تھا۔ صرف ۵ میل کا فاصلہ ہے۔ یہاں سے زیارت حضرت شہربانو دو میل کے فاصلے پر ہے۔ شاہ عبدالعظیم میں اب زواروں کے لئے مکانات کثرت سے بن گئے ہیں یہاں کی دیواروں میں کثرت کیساتھ شبیہیں اور معرکۂ کربلا کی تصویریں آویزاں ہیں۔ جو مصوری کے لحاظ سے کوئی قیمت رکھتی ہوں۔ مگر تقدس اور احترام اور دوسرے سادگیوں کے پہلو بہ پہلو بہت انمل اور بے جوڑ معلوم ہوتی ہیں۔ زیارات طاہر ابن زین العابدین حمزہ ابن جعفر۔ مرجع رسول اور ناصرالدین شاہ کی قبر بھی ہے۔ شاہ کا فوٹو اور شاہ کا مجسمہ بالکل یکساں ہے۔ بیرون شہر مقام شہربانو چشمہ علی اور مقام عبداللہ ہے۔

دوسرا شہر رے ہے۔ ہنجامنشیوں، سلجوقیوں، پارسیوں اور ساسانیوں کے زمانہ میں کافی شہرت رکھتا تھا۔ ابتک کسی کاشف نے ان شہریوں کو تعین نہیں کیا جو زلزلوں میں یا اور اسباب سے زیر زمیں دفن ہوچکے ہیں۔ عرب جغرافیہ دان اسطخری نے دسویں صدی کے مضامین میں شہر رے کو بغداد کے بعد سب سے اچھا شہر بتایا ہے۔ طغرل بیگ سلجوقی کی قبر یہیں ہے۔ کلادیجو سفیر اسپین نے ۱۴۰۴ء میں رے کو بالکل غیرآباد پایا تھا۔ نویں صدی میلادی میں سیاح بیلچہ و کلنک لئے ہوئے رے کے سینے میں مدفونہ خزائن ڈھونڈتے پھرتے تھے۔

دکن اور پورب کے کونے میں ۲۵ میل کے فاصلے پر ایک اور شہر کے خرابے موجود ہیں۔ مگر منتظر کاوش اور مترصد جستجو۔

اگر ہم قزوین سے دکھن اور پچھم کا زاویہ بناتے ہوئے چلیں تو ہمدان میں پہنچ جائیں گے۔ ہمدان وماوند کے دامن ہیں سطح سمندر سے چھ ہزار قدم بلندی پر واقع ہے۔ ابن سینا (۹۸۰ء۔ ۱۰۳۶ء) کا مقبرہ ہے۔ چوتھی صدی کے ایک مجلل اور باشکوہ مسجد ہے۔ جس کے اشکال ونقوش میں ہندسی ترمیمات صرف ہوئے ہیں۔ پہلو میں اکبا تانا یا ہگاتانا کے کچھ آثار ملتے ہیں۔ یہیں سے کاشفیں نے ایک بہت بڑی لوح طلائی پائی ہے۔ جس پر میخی خط میں تین زبانوں میں کتبے ہیں۔ اس لئے اب ہمدان سے دکھن کیطرف چلیں۔ اسدآباد کے پہلو میں نہاوند کو سلام کرتے ہوئے ہم لوگ کرمانشاہ سے ۴ میل اس طرف لبستوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ لبستوں (باغستانہ) غالبا اسی لئے کہلاتا ہے کہ بالکل سر پر آتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہ پہاڑ سیاہی مائل ہے اور بہت بلند ہے۔ ایک ادنے نکتہ اس جگہ بیان کردینے کے قابل ہے، قصر شیریں اور لبستوں

کا فاصلہ ۱۰۰ میل سے زیادہ ہے۔ جوئے شیر یا جوئے فرہاد یہاں سے قصرِ شیریں تک لیجانا ناممکنات سے تھا۔ تاریخی حیثیت سے کوئی بات اس حقیقہ اور رومانیہ داستان کی موافقت میں نہیں ملتی۔ یہاں صخروں اور پتھروں پر بڑے عمدہ اور بعید کتبے ہیں۔ جنہیں سر ہنری رولنسن ماہر آثارِ قدیمہ نے مطالعہ کرکے اس تحقیق کو مالا مال کر دیا ہے۔ یہ کتبے ۳۰۰ قدم کی بلندی پر ۱۸۰۰ قدم کے پھیلاؤں میں ہیں۔

چار میل بسطرف طاق بستان کی سنگ تراشیاں اور پیکر تراشیاں باعثِ حیرت اور موجبِ مسرت ہیں۔ خود سطحِ کوہ میں ایک عمارت بنی ہوئی ہے۔ اور طاق درست کیا گیا ہے۔ دونوں ساسانیوں کی داستان سرائیں۔ پشتِ طاقچہ پر اورمزد اور ناہیت کے دیوتاؤں کی جھرمٹ میں خسرو کو گھوڑے پر سوار دکھایا ہے۔ دیواروں میں شکارگاہ کے مناظر تفصیل اور کمال کیساتھ دکھائے گئے ہیں۔ قسم قسم کے حیوانات جنکا اب نشان بھی نہیں ہے۔ موجود ہیں۔

بارہ دری کی پشت پر پہاڑ کاٹکر زینہ بنایا گیا ہے۔ میں خود ان خوفناک زینوں پر چڑھکر طاق کی چھت تک گیا تھا اب کہیں کہیں سے پلے خراب ہوگئے ہیں۔ مگر ہمت والے کیلئے سب سے اوپر کی چوٹی تک پہنچ جانا مشکل نہیں ہے سقفِ طاق تک ۱۰۰ سیڑھیاں ہونگی۔ اس کے بعد بھی سیڑھیوں کے بنے ہوئے سے نشان دکھائی دیتے ہیں۔ اور قرینہ سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ قلۂ کوہ پر پہنچکر یقیناً کچھ مینا توری یا حجرا آتش ہوگی۔ اور کیا عجب ہے کہ طاقِ بستان کیطرح قلبِ کوہ میں کوئی جگہ چٹانیں کاٹ کر نکالی گئی ہو۔ جس میں آثاری خزائن کے علاوہ اور کچھ بھی ہو دوسرے دن میں صبح کو اس نیت کر آیا تھا۔ کہ چوٹی تک جاؤں۔ مگر نظمیہ والوں نے روک دیا۔ خیر کسی اور سفر میں سہی۔

کرمانشاہ بڑا شہر ہے، ساٹھ پینسٹھ ہزار آدمیوں کی بستی ہوگی۔ جدید تمدن کی لہریں یہاں بھی پہنچ گئی ہیں۔ مگر جس تیزی سے مشہد اور طہران میں انقلابات ہو رہے ہیں، وہ حالت یہاں نہیں ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو یہاں رہ کر نئی تہذیب اور پرانے تمدن کا دوش بدوش لطف اٹھاتے ہیں۔ یہیں سے تبریز طہران اصفہان اور بغداد کو راستے جاتے ہیں۔ بانیٔ شہر بہرام چہارم ساسانی تھا۔

اتر کیطرف فلک بوس تودہ ہائے کوہی واقع ہیں جنہیں سبز، سرخ، زرد، کالے، بھورے، ابری اور مختلف رنگ کی چٹانیں ہیں۔ یہاں سے قصرِ شیریں ہو کر جائیں تو گویا ایران و عراق کے سرحدی پوسٹ تک رسائی ہوجاتی ہے اس کے بعد صرف خسروی ملتا ہے۔ جہاں ایران کا جانے میں آخری اور آنے میں اول گمرک ہے۔ اگر آپ نے اپنے پاسپورٹ پر عراقی قونصل کی وزا، مشہد، طہران، یا کرمانشاہ میں نہیں لی ہے۔ تو یہیں لینی پڑے گی۔ ورنہ حدود ایران سے خارج اور عراق میں داخل نہیں ہو سکتے۔ وزا کی فیس گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ آج کل سات تومان سات قران تقریباً (۱۳ روپیہ) تھی۔

(باقی باقی) (مسافر)

---

**دفتر سے خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔** (ایڈیٹر)

# آگ پر چلنا

لاہور میں آجکل ایک کارنیوال آیا ہوا ہے۔ جس کا نام ٹالی وڈ (TOLLYWOOD) ہے۔ یہ میکلوڈ روڈ کے قریب ایک طرف واقع ہے۔ اس میں ایک اداکار آگ پر چلتا ہے۔ شیشے کے ٹکڑے کھاتا ہے۔ کانچ کا گلاس توڑ کر آپ کے سامنے چبا کر نگل لیتا ہے۔ کچے سانپ کھاتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ فی الحال ہمیں آگ پر چلنے سے غرض ہے۔

لکڑی کے بڑے بڑے ٹکڑوں سے آگ روشن کیجاتی ہے۔ اور یہ دو تین گھنٹے جلتی رہتی ہے۔ تاکہ تازہ کوئلے بہت بڑی مقدار میں حاصل ہو سکیں۔ اس کے بعد لکڑی سے کوئلے الگ کر دئے جاتے ہیں۔ ان جلی لکڑی کے ٹکڑے الگ پھینک دئے جاتے ہیں۔ ان دہکتے ہوئے انگاروں کو برابر کیا جاتا ہے۔ بڑے بڑے کوئلوں کو چھوٹا کر کے فرش بچھا دیا جاتا ہے۔ گویا زمین پر ایک آتشیں فرش ہو جاتا ہے۔ ایک شخص آہستہ خرامی سے ان کوئلوں کے اوپر سے چلتا ہے۔ اور بعض دفعہ وہ ان انگاروں کے عین وسط میں آکر ایک آدھ منٹ کے لئے کھڑا بھی ہو جاتا ہے۔ مگر بہت طویل عرصے کے لئے نہیں۔ وہ اس کرتب کو دو تین دفعہ دُہراتا ہے۔ اس عرصے میں کوئلے آہستہ آہستہ ٹھنڈے ہوتے رہتے ہیں۔ پانچ سات منٹ کے بعد ان کوئلوں کی تمازت کم ہو جاتی ہے۔ ان کی حرارت اتنی تیز معلوم نہیں ہوتی۔ اور کھیل بند کر دیا جاتا ہے۔ اب بھی کوئلے اتنے گرم ہوتے ہیں۔ کہ اگر کوئی شخص ان کے قریب جائے تو منہ کو گرمی معلوم ہوتی ہے۔ اور ہاتھ یا پاؤں ان کے قریب لایا جائے۔ تو فوراً جل جاتا ہے۔ چھالے پڑ جاتے ہیں۔ اور ہیں آدمی درد سے چلا اٹھتا ہے۔

میں نے اپنی آنکھوں سے یہ تماشہ دیکھا ہے۔ اور اچھی طرح سے جانچا ہے۔ کہ اس میں کوئی نظر بندی نہیں۔ ایندھن قبل از وقت دو تین گھنٹے کے لئے جلتا رہتا ہے۔ اس میں سے گرمی نکلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اور لکڑی کے ان جلے ٹکڑے صبح کو جا کر دیکھو تو وہیں پڑے ہوتے ہیں گویا مادی لکڑی موجود ہے۔ جس میں نظر بندی یا مسمریزم کو دخل نہیں۔ اس عامل کا اور ٹالی وڈ کے کارکنوں کا یہ دعویٰ ہے۔ کہ کوئی چیز پاؤں کے اوپر نہیں لگائی جاتی۔ جس سے کہ پاؤں آگ کی تمازت سے محفوظ رہیں۔ میں نے خود امتحان کیا ہے۔ مگر وقت رات کا تھا۔ کوئی ایک گھنٹہ بعد از غروب مصنوعی روشنی کی امداد سے دیکھا گیا۔ اس کے علاوہ امتحان سرسری تھا۔ کوئی آلہ یا دوائی امتحان کرنے کے لئے موجود نہ تھی۔ مگر معلوم یہی ہوا۔ کہ پاؤں کے اوپر کچھ لگا یا نہیں گیا۔

تو اب ثابت یہ ہوا۔ کہ یہ عامل آگ کے اوپر چلتا ہے۔ انگارے روشن اور گرم ان کے پاؤں کو نہیں جلاتے۔ اور وہ کوئی ایک منٹ تک ان کے اوپر کبھی کبھی ایک پاؤں اٹھا کر کھڑا رہ سکتا ہے۔ اس میں کوئی نظر بندی اجتماع یا MASSH? PROTISM کو دخل نہیں۔ چونکہ بات اور تجربہ بدیہی ہے۔ کوئی دوائی استعمال نہیں کی جاتی۔ تو بظاہر یہ نہایت بڑا تعجب خیز اور حیرت انگیز معلوم دیتا ہے۔ اس کی تشریح کی جستجو مجھے ہوئی۔ دوسرے دن خاص طور پر میں اس نائی وڈ میں گیا۔ اور عامل سے نجی طور پر سب باتیں پوچھیں اس گفتگو کا ماحصل یہ ہے۔

عامل کا نام محمد بوٹا ہے۔ اس کا وطن شہر لودھیانہ ہے اور وہاں محلہ کریم پورے میں اس کی رہائش ہے۔ وہ گذشتہ سات سال سے اپنے استاد احمد شاہ کے پاس اس علم کو سیکھ رہا ہے۔ احمد شاہ لاہور مزنگ میں ایک مشہور جادوگر اور عامل ہے۔ مزنگ کا ہر خاص و عام اس کو جانتا ہے۔ اس سات سال کے عرصے میں محمد بوٹا نے احمد شاہ سے جادو یعنی ہاتھ کی صفائی کے کھیل۔ بلیک آرٹ وہ بھی اسی قبیل کا علم مگر زیادہ بیہودہ سیکھا ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ کام جس کا مظاہرہ وہ ٹائی وڈ میں کر رہا تھا۔ یعنی آگ پر چلنا۔ کانچ کھانا۔ زندہ سانپ چبانا وغیرہ

میں نے محمد بوٹا سے پوچھا۔ کہ تم کوئی کلام پڑھتے ہو تو اس نے انکار کر دیا۔ علم یا جادو یا منتر میں کچھ نہیں پڑھتا۔ یہ محض مشق ہے۔ میں نے استاد کی ہدایت کے مطابق پہلے آگ کے قریب آہستہ آہستہ اپنے پاؤں کو رکھ کر مشق کی۔ اور پھر تمازت کو بڑھاتا گیا۔ حتیٰ کہ میرے پاؤں کو آگ پر چلنے کی عادت ہو گئی۔ اور اب میں دو تین منٹ تک انگاروں کے اوپر کھڑا ہو سکتا ہوں۔ وہ کہنے لگا۔ کہ صرف میرے پاؤں ہی اس قابل ہیں۔ کہ آگ کے قریب ہوں۔ اور نہ جلیں۔ اگر میں ہاتھ قریب لے جاؤں۔ تو وہ جل جاتا ہے۔ اس میں کوئی نظر بندی نہیں۔ نہ کوئی جادو ہے۔ میں نے پوچھا کہ نقطوں کا جادو بھی کوئی ہوتا ہے۔ اس نے کہا۔ کہ نہیں سب شعبدہ بازی ہے۔ ہاتھ کی صفائی اور دوسرے کو دھوکا دینا۔ کام تو ایسا ایسا بھی ہے۔ کہ عقل گم ہو جاتی ہے۔ اور آدمی کو ماننا ہی پڑتا ہے۔ کہ اس میں کچھ جادو ٹونکا ہے۔ مگر ہوتی صرف ہاتھ کی صفائی ہے۔ مسمریزم کے متعلق پوچھا۔ تو اس نے کہا۔ کہ دنیا میں مسمریزم بھی کوئی چیز نہیں۔ میں ذاتی طور پر اس بات سے اختلاف رکھتا ہوں۔ میرا خیال ہے۔ کہ مسمریزم ایک قوت ہے۔ جو انسان کے اندر موجود ہے۔ اسے جذبہ کہہ لو مقناطیسی قوت نام رکھ لو۔ آنکھوں کی قوت کہہ لو۔ مگر موجود یہ ضرور ہے۔ خیر یہ میں مانتا ہوں۔ کہ میں محمد بوٹا کو اسکا علم نہیں ہو گا۔ یا اس نے اس امر کا تجربہ ابھی تک نہیں کیا ہو گا۔

اصل میں یہ محمد بوٹا جوان آدمی ہے۔ کوئی بائیس چوبیس سال کی عمر۔ درمیانہ قد۔ گہرا رنگ۔ کچھ دبلا بدن اور ابھی تک دنیا داری اور زمانہ سازی سے ناآشنا۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا۔ اگر کوئی گرگ باراں دیدہ۔ کہنہ مشق، زمانہ چشیدہ ہوتا۔ تو اس بات سے کم کبھی رہتا بھی نہیں کہ یہ کلام ہے۔ مسمریزم ہے۔ اور میں ہی دنیا میں اس کام کو کر سکتا ہوں۔

اہل بصیرت اور صاحب نظر لوگوں کے لئے یہ ایک موقعہ ہے تحقیق کا۔ اور ایک خاص نتیجے پر پہنچنا کا۔ جن لوگوں کو اس میں شغف ہو۔ یا دلچسپی لینا چاہتے ہوں۔ ان کو دعوت ہے۔ کہ وہ اس موضوع پر روشنی ڈالیں۔ اور بتائیں کہ اس کا سبب علت اور اثر کیا ہے۔

کچھ عرصہ ہوا۔ انگلستان میں ایک آدمی گیا تھا۔ جو آگ پر چلتا تھا۔ اس کا نام خدا بخش تھا۔ کشمیر کا رہنے والا وہ ولایت اسی شعبدہ کو دکھانے کے لئے پہنچا تھا۔ ٹائمز آف انڈیا السٹریٹڈ ویکلی (TIME OF INDIA ILLUSSTRA-TED WEEKLY) بمبئی نے اس کا مفصل حال دو اشاعتوں میں چھاپا تھا اور خدا بخش کی متعدد تصاویر یہ شعبدہ دکھاتے وقت دی تھیں۔ لندن میں خدا بخش کا پورا پورا امتحان کیا گیا۔ تاکہ کوئی نظر بندی یا دھوکا بازی کا عنصر باقی نہ رہے۔ ادھر سائنس کے پروفیسر جمع کئے گئے۔ تاکہ وہ آگ کا آگ کی حرارت کا۔ عرصے کا۔ جتنا وقت وہ آگ کے اوپر رہتا ہے۔ امتحان کریں۔ اور ادھر طب کے پروفیسر جمع کئے گئے۔ تاکہ ڈاکٹری کے ذریعہ سے وہ پاؤں کا قبل از تجربہ اور بعد از تجربہ امتحان کریں۔ جلنے نہ جلنے کا معائنہ کریں۔ اور یہ معلوم کریں۔ کہ پاؤں کیوں نہیں جلتے۔

لنڈن کے محقق اس نتیجہ پر پہنچے تھے۔ کہ خدا بخش اپنے پاؤں پر کوئی دوائی استعمال نہیں کرتا ہے۔ اور اس کیساتھ یہ بھی کہ وہ تقریباً ایک منٹ تک آگ کے اوپر کھڑا رہتا ہے اور اس کے پاؤں نہیں جلتے۔ آگ پر چلنے سے پہلے خدا بخش کے پاؤں کا امتحان کیا گیا۔ دواؤں سے۔ خوردبین کے ذریعہ وغیرہ وغیرہ۔ اور اس بات کا یقین کر لیا گیا۔ کہ پاؤں پر کوئی چیز استعمال نہیں کی گئی۔ خدا بخش آگ پر چلا۔ اور اس کے بعد اس کے پاؤں کا امتحان کیا گیا۔ نتیجہ یہ تھا کہ اس کے پاؤں نہیں جلے۔ اور کسی طرح سے مجروح نہیں ہوئے دنیا حیرت میں آگئی۔

اس یقین کے بعد کہ خدا بخش کے پاؤں کو کوئی گزند نہیں پہنچا۔ انہیں محققین میں سے ایک نوجوان پروفیسر نے اپنا بوٹ اور جرابیں اتاریں۔ اور بلا دھڑک آگ پر چلنے لگا۔ ابھی ایک پاؤں رکھا ہی تھا۔ کہ اس کے پاؤں میں چھالے پڑ گئے۔ اور وہ فوراً باہر آگیا۔ اسے بہت تکلیف ہوئی۔ اور اس کی خدا بخش سے جب اس عجیب قوت کا سبب پوچھا گیا تو اس نے جواب دیا۔ کہ میں قرآن مجید کی ایک آیت پڑھتا ہوں میں نے اس آیت کا چلہ نکالا ہوا ہے۔ اور اب میں اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہوں۔ یہ سب کلام الٰہی کی برکت ہے مغرب کے محقق بھلا ایسی باتوں پر کیا کان دھرتے ہیں۔ انہوں نے اس بات کو تو نہیں مانا۔ مگر ہاں اپنی تحقیق میں یہ درج کر دیا۔ کہ انسان کے لئے یہ ممکن ہے۔ وہ دہکتے ہوئے انگاروں کے اوپر ایک منٹ کے قریب کھڑا ہو جائے۔ یا اوپر سے گذر سکے۔ اور اس کے پاؤں کو بالکل کچھ گزند نہ پہنچے۔ اس کا سبب ہم ابھی تک معلوم نہیں کر سکے۔

لاہور میں اس آگ پر چلنے کی تحقیق کرتے کرتے ہماری خدا بخش ساکن کشمیر کے چند ملنے والوں سے ملاقات ہوئی۔ ان میں سے ایک صاحب خدا بخش کے ہم جماعت بھی رہ چکے تھے۔ ان کے کہنے کے مطابق خدا بخش کسی طرح بھی مذہبی

آدمی کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ متقی، پرہیزگار، قرآن کا حافظ وہ نہیں ہے۔ کلام کے اثر کے متعلق انہوں نے کہا۔ مجھے کچھ پتا نہیں۔

تو آگ پر چلنے کی دی ہوئی دلیل ولایت کے فاضلوں کو پسند نہیں آئی۔ دوسری دلیل جو محمد نے دی۔ اب موجود ہے۔ آگ پر چلنے کے لیے تدریجاً مشق کرنا ضروری ہے۔ پہلے پاؤں کو کم حرارت کی آگ کے قریب رکھا جائے۔ اسی طرح پھر تیز آگ کے قریب رکھا جائے۔ آہستہ آہستہ پاؤں کو عادت ہو جائے گی۔ اور وہ آگ سے نہیں جلے گا۔ مگر بظاہر یہ تشریح بھی بہت عجیب سی معلوم ہوتی ہے آگ کا نہ جلانا ایک فوق العادہ فعل معلوم ہوتا ہے۔

ہمیں امید ہے۔ قارئین میں سے جو اصحاب اس کے متعلق مزید اور مفصل واقفیت رکھتے ہوں۔ وہ اس مسئلے پر مبسوط روشنی ڈالیں گے۔

---

خواجہ شجاع منعمی

# پشاور کا دائرہ ادبیہ

حضرت خواجہ نظام الدین صاحب، اولیاء دہلوی فرمایا کرتے تھے کہ اگر خدا مجھ سے پوچھے گا دنیا میں کیا کر کے آئے ہو۔ تو میں اس ترک کو پیش کروں گا۔ جس سے غرض حضرت امیر خسرو دہلوی ہوا کرتی تھی۔ بیشک خسرو ہندوستان کا سب سے بڑا فارسی گو شاعر، بے مثل، منشی بلند پایہ، متقی، عالی مرتبہ صوفی، مورخ۔ اور بہت کچھ ہے۔ میرا یقین ہے کہ قیامت کے دن اگر خدا پشاور کے ساکنین سے پوچھیگا تم نے دنیا میں کوئی نیک کام کیا ہے۔ تو دائرہ ادبیہ پشاور کا نام پیش کر دینا۔ اس امر کا ثبوت ہوگا کہ انہوں نے خیال نیک گفتار نیک۔ کردار نیک میں کاوش سے کوشش کی ہے۔ یہ کس درجہ قابل ستائش ہے۔ کہ یہ آرزو کسی ذاتی شہرت کی غرض سے ہیں۔ وہ شخصیتیں بنانے کے متمنی نہیں۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ منظم طریقہ پر ان کی قابلیتیں کسی کام آئیں۔ ان کے فرصت کے لمحات بجائے لہو و لعب کے خدمات علم و ادب میں صرف ہوں"

قتل گناہ ہے۔ کسی کو کام سے باز رکھنا۔ اس سے بڑا گناہ ہے۔ مگر کسی کے بنے ہوئے کو بگاڑنا۔ اس سے بھی بڑا گناہ ہے۔ انسان وہ جو تعمیری پروگرام لیکر میدان میں آئے۔ تخریب تو انسانی تمدن پر ایک بدنما داغ ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ بعض تخریب پسند دماغوں نے اپنے اعمال میں اضافہ کرنا چاہا تھا۔ مگر ادارہ ادبیہ پشاور ان کے اندازہ سے بہت زیادہ مستحکم اساس پر قائم ہے۔ اور اس کی تشکیل میں مضبوط ہاتھ کام کر رہے ہیں۔

ہندوستان بھر کے لکھے پڑھے لوگ اس کو احترام کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ اور وطن میں ایسے اداروں کی بیحد ضرورت ہے۔ جو خلوص نیت اور عشق معارف سے معمور ہوں۔ سرحد کا علم دوست طبقہ اس کی پشت و پناہ ہے۔ امید ہے کہ سرکاری اور غیر سرکاری حلقے ایسے مفید اور دور جدید کے حامی ادارے کو ہر طرح بہم پہنچائیں گے۔ تاکہ علم و ادب میں ترقی اور بنی نوع انسان کی تہذیب میں اضافہ ہوتا رہے۔

**اطلاع:۔** رسالہ عموماً ہر ماہ کی سات تاریخ کو شائع ہو جایا کرے گا۔ اس لئے خریدار حضرات دس تاریخ تک انتظار فرما لیا کریں۔ (ایڈیٹر)

# مخمس بر غزلِ غالب رح

کس قدر چکا پڑا ہے خونِ بے تقصیر کا
رُخ بدل ڈالا ہے ظلمِ آسمانِ پیر کا
اب خدا حافظ ہے جانِ عاشقِ دلگیر کا
نقش زیادی ہے. کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

منزلِ عشقِ بتاں کی جلوہ آسائی نہ پوچھ
کس قدر ہے حسرتِ ذوقِ جبیں سائی نہ پوچھ
ناتوانِ عشقِ جاناں کی توانائی نہ پوچھ
کادِ کادِ سخت جانیہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

جاں بلب ہوں انتظارِ شوق دیکھا چاہیے
کون ہے مجبور سا نثارِ شوق دیکھا چاہیے
جوشش پر ہے کیا بہارِ شوق دیکھا چاہیے
جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

چہرۂ معشوق سے پردہ کوئی کیونکر اٹھائے
جلوۂ حسنِ حقیقی کی جھلک کیونکر دکھائے
غیر ممکن ہے کسی سے کیا کوئی مطلب بتائے
آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

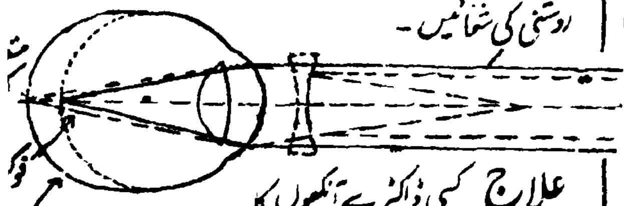
برق پاروں کی محبت کا نتیجہ دیکھنا
دل جلا کر مثلِ خاکِ طورِ سینا دیکھنا
کون ہے دمساز جز ناسخ جہاں میں دوسرا
بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرپا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ میری زنجیر کا

ابو الامتیاز قاضی فتح محمد فاتح منشی فاضل استاذ الشرق

# نقائص چشم اور عینک

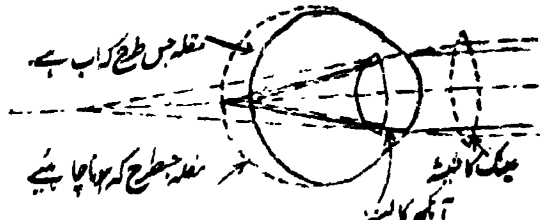
ہم گذشتہ پرچہ میں بیان کر آئے ہیں۔ کہ آنکھ کس طرح دیکھتی ہے۔ اس کے مطالعہ سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا۔ کہ جتنی نزدیک کی چیز کو ہم دیکھنا چاہیں گے۔ اُتنا ہی ہمیں لینز کو موٹا کرنا پڑیگا۔ چنانچہ یہ فوکس کم از کم ۱۰ انچ تک ہو سکتا ہے۔ گویا دس دس انچ سے کم دوری پر دیکھے جانے والی چیز کی شعاعیں پردہ شبکیہ پر فوکس پیدا نہیں کریں گی۔ جس کی وجہ سے وہ چیز دکھائی نہیں دیگی۔ . . . . . . . . . . . . اس لئے ہمیں اس چیز کے دیکھنے کے لئے لینز کو مجبوراً محدب کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ شام کو سیر کرنا۔ یا سبزہ کو دیکھنا۔ اسی لئے مفید ہے۔ کہ آنکھ دن بھر کی تھکی ہوئی ہوتی ہے۔ اور بہت دور کی چیز دیکھنے سے اُسے راحت ملتی ہے۔ بعض شرحین کے خیال سے دیکھے جانے والی چیز اور آنکھ میں فاصلہ معین ہوتا ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ بلکہ ریٹینا (پردہ شبکیہ) اور لینز میں فاصلہ معین ہوتا ہے۔ اور لینز کی موٹائی بدلتی ہے۔ جس سے نزدیک اور دور کی چیزیں فوکس ہوتی ہیں صحت کی حالت میں لینز لچکدار ہوتا ہے۔ جس کو سسپنسری لگمنٹ (رباط معلق) سلی اری مسلز کے سکڑنے سے ڈھیلا ہو کر محدب بنا دیتا ہے۔ اگر لینز لچکدار نہ ہو۔ یا سلی اری مسلز فعل میں خلل واقع ہو جائے۔ تو سسپنسری لگمنٹ لینز کو محدب نہیں بنا سکتے۔ آپ نے بارہا دیکھا ہو گا کہ بوڑھے جن کی عمر ۶۰ و ۷۰ سال کی ہوتی ہے۔ وہ نزدیک کی چیزوں کی نسبت دور کی اشیاء کو آسانی سے دیکھ سکتے ہیں۔ اس حالت کو پریس بائی اوپیا (بصر الیشوخ) کہتے ہیں جس کا اصلی سبب یہ ہے۔ کہ جسقدر انسان کی عمر زیادہ ہوتی ہے۔ اسی قدر سکڑنے اور پھیلنے کے عضلات کمزور ہوتے ہیں۔ جو لینز کو محدب نہیں بنا سکتے ہیں لہذا جب کسی سبب سے شعائیں شبکیہ کے اوپر فوکس ہونے کی بجائے اس سے آگے فوکس ہو جائیں۔ اور پھر پھیل کر طبقہ شبکیہ پر پہنچیں۔ تو قریب نظری (MYOPIA) کا عارضہ لاحق ہو جاتا ہے۔ جیساکہ

روشنی کی شعاعیں۔



**علاج** کسی ڈاکٹر سے آنکھوں کا معائینہ کرا کر مناسب عینک لگائیں۔ اگر ابتدائے مرض میں عینک لگائی جائے۔ تو مرض رک جاتا ہے۔ ورنہ جوں جوں میعاد زیادہ ہوتی جائے گی۔ مرض ترقی کرتا چلا جائیگا۔ عموماً ڈاکٹر ایسے مریضوں کو مقعر شیشہ والی عینک لگواتے ہیں۔ تاکہ شعائیں زیادہ منتشر ہو کر طبقہ شبکیہ پر فوکس ہوں۔

**بعید النظری** اور جب مذکورہ بالا حالت کے برعکس شعائیں بجائے طبقۂ شبکیہ کے آگے فوکس ہونے کے اس کے پیچھے فوکس ہوں جیسا کہ شکل سے ظاہر ہے۔ تو مرض طول البصر




پیدا ہو جاتا ہے۔ اس میں مریض دور کی چیزوں کو آسانی دیکھ سکتا ہے۔ لیکن قریب کی چیزیں اسے نظر نہیں آتیں۔

**علاج** سوائے مناسب عینک کے اور کوئی چارہ نہیں اس کے لئے محدب شیشہ والی عینک بہتر خیال کیجاتی ہے کیونکہ اس سے کچھ قدرے لینز کی طاقت بڑھ جاتی ہے۔ جس سے متوازی شعائیں بجائے شبکیہ کے پیچھے پڑنے کے شبکیہ کے اوپر پڑتی ہیں۔

**خلل بصارت** (ASTIGMATISM) یہ وہ مرض ہے۔ جس میں چیزیں نظر نہیں آتیں اور اگر زیادہ نزدیک ہونے کی وجہ سے دکھائی بھی دیں۔ تو ان کی شکل اچھی طرح اور صاف نہ ہونے کے علاوہ ٹیڑھی یا چپٹی معلوم ہوگی۔ اس میں مقلہ (EYEBALL) کی شکل متناسب نہیں رہتی۔ اس کی ایک طرف ہلکی ہوتی ہے دوسری طرف بھاری۔ اگر متوازی الافق لکیریں فوکس میں ہوں۔ تو اسی وقت عمود الافق لکیریں فوکس میں نہیں ہوتیں اور اس کے برعکس

**علاج**۔ اکثر ڈاکٹر لوگ سلنڈری کل عینک کا استعمال عمل میں لاتے ہیں۔

**فقدان استعداد تعین** (HYPERMETROPIA) اس مرض میں دور کی چیزوں کا فوکس مختلف ہوتا ہے۔ اور نزدیک کی چیزوں کا مختلف گویا ایک عینک کے ذریعہ سے دور اور نزدیک کی چیزیں بیک وقت وضاحت کے ساتھ نہیں دیکھی جا سکتیں گویا آنکھ کے فوکس بدلنے والے عضلات میں اتنی قابلیت نہیں رہتی۔ کہ وہ لینز کو موٹا یا پتلا کر سکیں۔

**علاج** اس مرض میں دو عینکوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو مختلف اوقات میں علیحدہ علیحدہ استعمال کی جاتی ہیں۔ مگر اس تکلیف کو رفع کرنے کے لئے موجودہ زمانے میں ان دونوں کا کام ایک سے لیا جاتا ہے۔ جیسا کہ آپ نے بارہا دیکھا ہوگا۔ کہ اس عینک کے ہر دو شیشے دو حصوں میں منقسم ہوتے ہیں۔ جو ایک دوسرے کے برابر نہیں ہوتے۔ اوپر کا حصہ بڑا اور قدرے محدب ہوتا ہے۔ جو دور کی چیزوں کو دیکھنے میں مدد دیتا ہے۔ نچلا حصہ چھوٹا اور زیادہ محدب ہوتا ہے۔ جس سے قریب کی اشیاء آسانی سے نظر آسکتی ہیں۔

# عینک کا استعمال

جس قدر عینک کے فوائد بیان کئے جاتے ہیں۔ اگر ان کو صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے۔ تو بھی ان کے نقصانات کی فہرست کم نہ ہوگی۔ اگر کسی سبب سے آنکھ کی بصارت کمزور ہو جائے۔ یا کوئی اور خلل واقع ہو۔ تو ہمارا اولین فرض ہے۔ کہ اس کے سبب سے واقف و آشنا ہو کر مناسب دواؤں سے

اس کا تدارک کیا جائے ۔ مثلاً کسی وقت ضعف دماغ عارض ہونے سے بھی آنکھوں کی بینائی میں فرق آجاتا ہے ۔ جو مقویات دماغ ۔ معجونوں ۔ اطریفلوں ۔ اور مغزیات کے استعمال سے تندرست ہو سکتی ہیں ۔ اگر بجائے اس کے ہم اندھا دھند عینک کا استعمال صرف اس غرض کے لئے کریں ۔ کہ بینائی کم نہ ہو جائے تو یہ اپنے پاؤں پر خود کلہاڑا مارنے کے مترادف ہے ۔

قدرتی اور مصنوعی چیزمیں زمین و آسمان کا فرق ہے ۔ جو لوگ عینک لگانے کے عادی ہو چکے ہیں ۔ ان سے حقیقت دریافت کریں ۔ کہ کس قدر مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔ اگر کسی وقت اچانک حادثے سے عینک ٹوٹ جائے ۔ یا گم ہو جائے ۔ تو بغیر اس عینک کے کہ وہ اسی وقت نئی خریدیں ۔ اور کوئی چارہ نہیں کیونکہ جو کام وہ عینک لگانے سے کر سکتے ہیں ۔ وہ مذکورہ حالت میں نہیں کر سکتے ۔

آجکل اس کا استعمال اس قدر زیادہ ہو چکا ہے ۔ کہ اس کو بھی فیشن میں شمار کیا جاتا ہے ۔ اور اس کو اپنی آرائش حسن کا ایک جزو قرار دیا جاتا ہے ۔ امراء و رؤسا کے ہزار ہا بچے آپ کو ایسے نظر آئیں گے ۔ جنہوں نے اوائل عمر میں ہی اپنی بینائی کو عینک کی بھینٹ چڑھایا ہے ۔ علاوہ ازیں اس کا اثر دماغ پر پڑتا ہے ۔ جس سے عموماً وہ کند ذہن اور ان کی اعصابی قوتیں معدوم ہو جاتی ہیں ۔ عمدہ اور لذیذ غذاؤں کے کھانے سے جسم نحیف و لاغر رہتا ہے ۔ جب بڑھاپے میں قدرتی طور پر بصارت کمزور ہو جاتی ہے ۔ تو عینک بھی ان کی آنکھوں کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے ۔ جس سے عمر کا بقیہ حصہ عذاب الیم معلوم ہوتا ہے ۔

اس لئے جہاں تک ہو سکے ۔ عینک کے استعمال سے گریز کرنا چاہیے ۔ اور اپنی آنکھوں کی بینائی کو برقرار رکھنے کیلئے مفید سرمہ جات ۔ مربہ جات مقوی دماغ اور زود ہضم غذاؤں کے علاوہ مناسب تدابیر عمل میں لائیں ۔ جن کا گذشتہ پرچہ میں ذکر ہو چکا ہے ۔ ہاں اگر مجبوری ہو ۔ تو عینک کو لگا لینا چاہیئے ۔ مگر احتیاط کے ساتھ ۔

(ایم اسلم صدیقی)

---

# اُردُو میں مروّج ضرب الامثال

از جناب شیخ محمد اسماعیل صاحب پانی پتی

## دیکھئے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے

یہ مثل ایسے موقعہ پر بولتے ہیں۔ جب کسی بات کا انجام معلوم نہ ہو۔ اور امید و بیم کی سی حالت ہو۔ اس مثل کی ابتدا کے متعلق یہ قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ ایک کمہار اور ایک سبزی فروش نے شراکت میں ایک اونٹ کرایہ پر لیا۔ اور اس کے ایک طرف ترکاری اور دوسری طرف مٹی کے برتن باندھ کر دونوں شہر سے گاؤں کو چل پڑے۔ راستہ میں اونٹ گردن پھیر کر ترکاری کھاتا جاتا تھا۔ یہ دیکھکر کمہار سبزی فروش کا مذاق اڑانے لگا۔ سبزی فروش نے کہا۔ میرے نقصان پر کیا ہنستا ہے۔ ابھی تو یہ دیکھنا ہے۔ کہ "اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے"۔ اس کے بعد پتہ لگے گا۔ کہ نقصان کس کا زیادہ ہوا۔؟ اتفاق کی بات کہ منزل مقصود پر پہنچ کر اونٹ برتنوں کی طرف بیٹھا۔ جس کی وجہ سے برتن چکنا چور ہو گئے۔ اب تو کنجڑے کی بن آئی۔ اور کہنے لگا۔ کہ میں نہ کہتا تھا۔ کہ دیکھئے اونٹ کس کروٹ بیٹھے۔ اب میری تو تھوڑی ترکاری اونٹ نے کھائی۔ اور تیرے سارے مال کا صفایا ہو گیا۔ تب سے یہ مثل بولی جانے لگی۔

## ڈوبا بنس کبیر کا جو جائے پوت کمال
## رام رام دھن بیچ کے لائے چار ہنوال

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں۔ جہاں اولاد کے متعلق یہ بتانا مقصود ہو۔ کہ وہ نہایت نالائق اور ناخلف ہے۔ مثل کا سلیس ترجمہ یہ ہے۔ کہ کبیر کی نسل ہلاک ہو گئی۔ جس میں کمال جیسا لڑکا پیدا ہوا۔ جس نے عاقبت کو چھوڑ کر دنیا کو اختیار کیا۔ ہنوال کے معنی گدھے یا خچر کے ہیں۔ اس کا قصہ یوں مشہور ہے۔ کہ کبیر بھگت کے زمانہ میں کسی راجہ کا لڑکا اتنا شدید بیمار ہوا کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ ہر چند علاج کئے۔ مگر مرض بڑھتا ہی گیا جب کوئی چارہ کار باقی نہ رہا۔ تو ایک شخص نے راجہ کو صلاح دی کہ کبیر کا لڑکا شاہ کمال بڑا پہنچا ہوا فقیر ہے۔ اگر راجہ اس کے پاس جائے۔ اور اپنے لڑکے کیلئے اس سے صحت کی دعا کرائے۔ تو یقین ہے۔ کہ اس کی دعا سے لڑکے کو تندرستی حاصل ہو گی۔ راجہ مصیبت کا مارا شاہ کمال کے پاس جا پہنچا۔ اور خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ شاہ کمال کی دعا سے راجہ کے لڑکے کو صحت ہو گئی۔ اس پر راجہ نے بطور اظہار شکر گذاری بہت سی اشرفیاں چار خچروں پر لدوا کر شاہ کمال کے حضور میں بطور نذر بھیجیں۔ شاہ کمال نے

ان کو قبول کرلیا۔ اور ان کا ڈھیر اپنے مکان کے سامنے لگوا دیا۔ اس وقت گھر میں کبیر بھگت موجود نہیں تھے۔ کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ واپس آئے تو دیکھا۔ کہ انگنائی میں اشرفیوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ بڑا تعجب ہوا کہ یہ اشرفیاں کہاں سے آئیں بیٹے نے سارا واقعہ باپ کی خدمت میں عرض کیا۔ یہ سن کر کبیر بیٹے پر بہت ناراض ہوئے۔ کہ تو نے یہ اشرفیاں لیکر اپنی خود داری اور استغنا کو بٹہ لگایا۔ اور دعا کے بدلے میں یہ اشرفیاں کیوں وصول کیں۔ اس وقت انہوں نے یہ دوہا پڑھا۔ جو بعد میں زبان زد عوام ہوگیا۔ اور بعد میں عام طور پر ایسے شخص کے متعلق بولا جانے لگا۔ جو اپنی نازیبا حرکتوں سے اپنے آباؤ اجداد کو بد نام کرے۔

## ڈوم کا تیر خدا جھوٹ کرے

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں۔ جہاں کوئی شخص کسی مشکل میں پھنس جائے۔ اور وہ اپنی مصیبت کو عام لوگوں سے مخفی رکھنا چاہتا ہو۔ یا کوئی شخص کسی بالکل ظاہر بات کو چھپانا چاہے۔

اس کا قصہ اس طرح مشہور ہے۔ کہ ایک دفعہ اتفاقاً کسی ڈوم کی ران میں ایک تیر لگ گیا۔ اور زخم سے خون بہنے لگا۔ لوگوں نے دیکھا۔ تو ہمدردی کا اظہار کرنے لگے۔ مگر ڈوم زخم پونچھتا جاتا تھا۔ اور کہتا جاتا تھا۔ خدا نہ کرے۔ کہ میرے تیر لگے۔ خدا کرے۔ کہ لوگوں کا یہ کہنا جھوٹ ہو جائے۔ کہ میرے تیر لگا۔ تماشائیوں نے سنا۔ تو ہنسنے لگے۔ کہ بیوقوف جب تیر لگ چکا۔ تو اب کیا جھوٹ ہوگا۔ اس وقت سے یہ مثل بولنے لگے۔

## رام رام دو نیاں گلے مل چونیاں

یہ مثل ایسے موقع پر برتتے ہیں۔ جب کوئی عیار اور چالاک شخص بہ نسبت غیروں کے اپنے دوستوں اور واقف کاروں کو کسی خرید و فروخت کے معاملہ میں زیادہ لوٹے۔ اور دل سے اگر کسی چیز پر مثلاً چار آنے نفع لیتا ہو۔ تو اپنے دوست آٹھ آنے نفع وصول کرے۔

اس مثل کی ابتداء کے متعلق یہ قصہ مشہور ہے۔ کہ ایک مرتبہ کسی شخص نے اپنے ایک دوست سے کہا۔ کہ بھئی مجھے بازار سے کچھ سودا خریدنا ہے۔ کوئی ایسی دکان بتلاؤ۔ جہاں سے چیز سستی بھی ملے۔ اور عمدہ بھی۔ دوست نے جواب دیا۔ کہ فلاں دکاندار نہایت دیانتدار اور ایماندار ہے۔ اس نے اپنا اصول مقرر کر رکھا ہے۔ کہ گاہک کے ہاتھ ہمیشہ اچھی اور عمدہ چیز بیچے گا۔ اور نفع نہایت ہی کم لے گا۔ یعنی صرف ایک پیسہ فی روپیہ۔ آج تک کوئی گاہک اس کے پاس اس کی چیز کی شکایت لے کر نہیں آیا۔ اس کے ہاں سے بہتر آپ کو اس شہر میں اور کہیں چیز نہیں مل سکے گی۔ میرا پرانا واقف ہے۔ اور میرا بہت لحاظ کرتا ہے۔ یقین ہے۔ کہ بہ نسبت دوسروں کے میری خاطر سے آپ کو چیز اور بھی سستی دیدیگا۔ چلئے اس کے ہاں چلیں۔ اور جس چیز کی آپکو ضرورت ہو۔ وہاں سے لے لیں۔ چنانچہ دونوں دوست اس کی دکان پر پہنچے اور بہت سا سودا خریدا۔ لے کر گھر آئے۔ اور بیوی نے ہر ایک چیز کے دام پوچھے۔ تو چونکہ عورتوں کو عام طور پر استعمالی اشیاء کے بھاؤ معلوم رہتے ہیں۔ اس لئے اس نے کہا۔ کہ یہ چیزیں تو تم بہت مہنگی اٹھا لائے۔ شوہر نے بازار میں

جاکر تحقیق کی۔ تو معلوم ہوا۔ کہ دوسرے دکان دار دو دو پائی فی روپیہ منافع لیتے ہیں۔ مگر اُس "دیانتدار" دکان دار نے فی روپیہ چونی کے حساب سے منافع لیا۔ جس میں دلال صاحب کا جو ساتھ تھے۔ پورا نصف کا ساجھا تھا۔ تب اس شخص نے مذکورہ بالا جملہ کہا۔ اور اس وقت سے یہ بطور ضرب المثل استعمال ہونے لگا۔

## ریوڑی کے پھیر میں آ گئے

یعنی کسی بڑی مصیبت اور چکر میں پھنس گئے۔ مقدمہ بازی میں گرفتار ہو گئے۔ یا قرض کی آفت میں گرفتار ہو گئے۔ یا کوئی اور ایسی مشکل آ پڑی۔ کہ دن رات بے چینی اور پریشانی میں بسر ہونے لگی۔

اس مثل کی ابتدا یوں بیان کی جاتی ہے۔ کہ ایک مرتبہ چند نوجوان اور بے فکرے دوست بیٹھے ہوئے خوش فعلیاں کر رہے تھے۔ جاڑوں کے دن تھے۔ ایک دوست نے کہا۔ بھئی۔ ہم تو اُس کو بہادر جانیں۔ جو اس طرح ریوڑیاں کھائے۔ پہلے ایک پھر وعلیٰ ہذا القیاس ہر مرتبہ دگنی کرتا جائے۔ یہاں تک کہ دس دفعہ کھائے۔ دوستوں میں ایک جو ذرا خیر سے زیادہ عقلمند واقع ہوئے تھے۔ جھٹ بول اُٹھے۔ کہ واہ یہ کیا مشکل ہے۔ لاؤ میں کھاتا ہوں۔ چنانچہ شرط بندی ہو گئی۔ اور ریوڑیاں آ گئیں۔ ان صاحب نے شروع میں تو بظاہر اس کو بہت ہی آسان کام سمجھا تھا اور خیال کیا تھا۔ کہ صرف چند ریوڑیاں کھانی پڑیں گی۔ اور شرط مفت میں جیت جاؤں گا۔ مگر جب ریوڑیاں کھانے بیٹھے اور حساب کیا۔ کہ اگر ہر مرتبہ ریوڑیوں کو دگنا کیا جائے۔ تو دس مرتبہ میں کتنی ریوڑیاں ہوں گی۔ تو معلوم ہوا۔ کہ اس طرح ایک ہزار اور تیئیس ریوڑیاں کھانی پڑیں گی۔ اب تو یہ صاحب بڑے چکرائے۔ مگر کر کیا سکتے تھے۔ شرط کر چکے تھے چنانچہ بادل ناخواستہ ریوڑیاں کھانی شروع کیں۔ مگر آخر کہاں تک ۱۰۲۳ ریوڑیاں کھانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ کھاتے کھاتے منہ دکھنے لگا۔ اور تھوڑی دیر میں یہ نوبت ہوئی۔ کہ منہ چلتا ہی نہ تھا۔ اب دوستوں نے مذاق اڑانا شروع کیا۔ اور کہنے لگے۔ دیکھا کیا خوب پھنسے۔ آخر "ریوڑی کے پھیر میں آ گئے نا"۔ دوست مذاق اڑا رہے تھے۔ اور ان صاحب کا نہ پوچھو۔ کہ کتنا برا حال ریوڑیاں کھاتے کھاتے ہو گیا تھا۔ آخر کو شرط ہار گئے۔ ان سے ریوڑیاں نہ کھائی گئیں۔ اور تھک کر فرش پر لیٹ گئے۔ اُس وقت سے یہ مثل بولی جانے لگی۔

## ساٹھ گاؤں بکری چر گئی

جب کسی بڑے نقصان کی طرف اشارہ کرنا ہوتا ہے۔ تو علی العموم یہ مثل بولتے ہیں۔ اس کی ابتدا اس طرح بیان کی جاتی ہے۔ کہ ایک مرتبہ کوئی بادشاہ شکار کھیلنے جنگل میں گیا۔ وہاں اتفاق سے اپنے ساتھیوں سے بچھڑ کر اکیلا رہ گیا۔ بھوک پیاس کی شدت سے مجبور ہو کر ایک کسان کے جھونپڑے میں چلا گیا۔ اور اس کو کہا۔ کہ کچھ کھانے کو ہو۔ تو لاؤ۔ میں مسافر ہوں۔ اور سخت بھوکا ہوں۔ کسان نے اس کی بڑی خاطر مدارات کی۔ فوراً پانی لایا۔ بادشاہ کا ہاتھ منہ دھلایا۔ پھر لسی کا ایک پیالہ بھر کر دیا۔ پھر روٹی اور چنے کا ساگ لایا۔ اور بادشاہ کے

آگے رکھ دیا۔ بادشاہ بھوکا تو تھا ہی۔ ایسا ٹوٹ کر روٹی پر گرا کہ تھوڑی سی دیر میں ساری روٹیاں ختم ہو گئیں۔ اُس وقت وہ روٹیاں اس کو اعلیٰ درجہ کے لذیذ کھانوں سے بھی زیادہ مزے کی معلوم ہوئیں۔ بادشاہ کسان کی خاطر مدارات اور مہمان داری سے نہایت خوش ہوا۔ اور کہنے لگا۔ "دراصل میں اس ملک کا بادشاہ ہوں۔ اور تمہارے اس سلوک سے مجھے بڑی خوشی اور مسرت حاصل ہوئی ہے۔ تمہارے اس جھونپڑے سے مکان میں میں نے بہت آرام پایا ہے۔ میں تمہیں ساٹھ گاؤں جاگیر میں دیتا ہوں۔ تاکہ تم ہر مسافر کی اچھی طرح خاطر مدارات کر سکو۔ چونکہ وہاں سند لکھنے کے لئے کاغذ نہ مل سکا۔ لہذا بادشاہ نے ایک پیپل کے پتے پر کسان کو ساٹھ گاؤں کی سند لکھ کر دیدی اور چلا گیا۔

اب اتفاق یہ ہوا۔ کہ کسان کی بکری جو شام کو جھونپڑے میں آئی۔ تو وہ پتہ رکھا ہوا تھا۔ اُسے کیا پتہ کہ یہ پتہ اس وقت کتنی قیمتی دستاویز ہے۔ وہ اسے اٹھا اور کھا گئی۔ کسان کی نظر بکری پر اس وقت پڑی۔ جب آدھا پتہ بکری کے منہ کے اندر اور آدھا باہر تھا۔ یہ دیکھ کر کسان کی جان ہی نکل گئی۔ اور دوڑا۔ کہ بکری کے منہ میں ہاتھ ڈال کر پتے کو نکال لے۔ بہت دوڑتا رہا مگر اتنے میں بکری پتے کو نگل گئی۔ اب سوائے افسوس کے کیا رکھا تھا۔ مجبوراً کسان روتا پیٹتا دار الخلافہ میں پہنچا۔ مشکل سے بادشاہ سلامت تک رسائی ہوئی۔ اور بیچارے نے اپنی مصیبت کی کہانی رو رو کر بادشاہ کو سنائی۔ بادشاہ سن کر ہنسا۔ اور کہنے لگا۔ تو یوں کہو۔ کہ "ساٹھ گاؤں بکری چر گئی"۔ یہ کہہ کر دوسری دستاویز اُسے لکھدی اور وہ خوش خوش گھر واپس چلا گیا۔

## سارا گھر جل گیا تب چوڑیاں پوچھیں

یہ مثل ایسے موقع پر کہتے ہیں۔ جب کہیں بہت کچھ نقصان ہو چکنے کے بعد اپنی قدر دانی ہو۔ نام ونمود اور دکھاوے کی خواہش میں اپنا نقصان کر لینے کے موقع پر بھی یہ مثل بولتے ہیں۔ اس مثل کی ابتدا اس طرح بیان کی جاتی ہے۔ کہ ایک مرتبہ کسی شیخی باز عورت نے عید کے موقع پر بڑی بیش قیمت چوڑیاں پہنیں۔ اور اس امید میں۔ کہ لوگ میری چوڑیوں کی تعریف کرینگے۔ ہر ایک کے آگے ہاتھ مٹکاتی پھرے۔ مگر بدقسمتی سے نہ تو کسی نے چوڑیوں کو دیکھا۔ اور نہ ان کی تعریف کی۔ اب تو عورت کو بڑا غصہ آیا۔ کہ میں نے تو اتنے دام خرچ کئے۔ اور کسی نے چوڑیوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا مگر غصہ ظاہر ہے۔ کہ فضول تھا۔ اور دوسرے آدمیوں پر کیا اثر کر سکتا تھا۔ آخر سوچتے سوچتے ایک ترکیب اس کے ذہن میں آگئی چنانچہ وہ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے گھر آئی۔ اور دیا سلائی کھینچ مکان کو آگ لگادی۔ مکان دھڑا دھڑ جلنے لگا۔ لوگ دوڑ پڑے۔ بمشکل آگ بجھائی۔ اور عورت سے پوچھا۔ کہ آگ کس طرح لگی۔ عورت نے ہاتھ اٹھا کر چولہے کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ اور کہنے لگی۔ کہ اس چولہے میں سے کوئی چنگاری اُڑ کر گھر میں جا پڑی۔ اور اس سے سارے مکان میں آگ لگ گئی۔ کسی کی نظر چوڑیوں پر بھی جا پڑی۔ کہنے لگا۔ چوڑیاں تو بڑی خوبصورت ہیں۔ کہاں سے بنوائیں۔ عورت نے کہا۔ کم بخت پہلے سے نہ پوچھا۔ جب سارا گھر جل گیا تب چوڑیاں پوچھیں۔ پہلے سے پوچھ لیتا۔ تو سارا گھر کیوں جلتا۔ اس وقت

# محقّق کا خاص نمبر

دفتر کا ارادہ ہے۔ کہ محقق کا ایک خاص نمبر بہت جلد شائع کیا جائے۔ اس میں بلند پایہ افسانے مضمون۔ نظمیں۔ غزلیں وغیرہ ہوں گی۔ تحقیق اور علمی مضامین کو خاص جگہ دی جائے گی۔ موجودہ زندگی کی ضروریات جن کا تعلق سائینس سے ہے۔ ان کو اہمیت دی جائے گی۔

مضامین نگار حضرات سے استدعا ہے۔ کہ وہ قلمی اعانت سے ہمیں مشکور فرمائیں۔ ان کے کرم ہم پر پہلے ہی بہت زیادہ ہیں۔ مگر رسالے کی زندگی کا انحصار انہیں کا دست شفقت ہے۔ ہم امید رکھتے ہیں۔ کہ آپ اپنے شاہکاروں میں سے بہت جلد دفتر میں بھجوا دیں گے۔ تاکہ اس کو مناسب جگہ دیجا سکے۔

اس خاص نمبر میں تصاویر فوٹو کے بلاک وغیرہ بھی ہوں گے۔ جن حضرات کے پاس ایسی تصاویر و فوٹو ہوں۔ یا وہ مضمون کا مصور کرنے کے لئے ساتھ بھجوانا چاہیں۔ کرم ہو گا۔ اگر وہ دفتر میں بہت جلد بھیج دیں۔ تاکہ ان کے بلاک بنوائے جاسکیں۔

## ادارۂ تحریر

خواجہ شجاع منعمی

ایڈیٹر۔ رازی عرفانی     مہتمم شعبۂ نسواں بیگم ح۔ ش۔ رفعت دہلوی بی۔ اے

نگران عربیات۔ مولوی حافظ عبدالرحمن۔ علامہ مولوی فاضل

نگران سنسکرتات۔ پنڈت مدن سنگھ شاستری ودیا بھاسکر

نگران شعبہ جات

افسانہ ایس حزیں     مذاکرہ علمیہ پروفیسر ایم۔ ایف۔ قریشی۔ ایم۔ ایس۔ سی

# محققؔ کے متعلق رائے

ایک وقت تھا۔ کہ عباسی زمانروا کے زیرنگیں بغداد کا پرچم شوکت وعظمت دو بڑے اعظموں پر لہرا رہا تھا۔ اور علوم وفنون کا گہوارہ ہونے کی وجہ سے بغداد کی شہرت کا ڈنکا چاردانگ عالم میں بجتا تھا۔ انقلابات زمانہ کی کئی صدیاں گذر جانے کے بعد اسی دودمان کے چشم وچراغ یعنی موجودہ تاجدار ریاست بہاولپور کے عہد میمنت مہد میں جب ہم روایات قدیمہ کا احیاء اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ تو لامحالہ اس مقولہ کی تصدیق ہوتی ہے۔ کہ تاریخ خود کو دہراتی ہے۔ اس عہد ہمایوں کی گوناگون ترقیات سے قطع نظر جس سرعت کے ساتھ ریاست ہذا کا شاہراہ علم پر گامزن ہے۔ اُسے دیکھکر بوثوق کہا جا سکتا ہے۔ کہ انشاء اللہ وہ دن دور نہیں جبکہ ریاست بہاولپور کا بغداد الجدید صحیح معنوں میں بغداد القدیم کا نمونہ ثابت ہوگا۔ حال ہی میں رسالہ محقق کے اجراء نے ثابت کر دیا ہے۔ کہ علمی ترقی کی راہ میں ریاست ہر قدم پر اپنے اسپ تیزگام کو مہمیز کر رہی ہے۔ علمی اور ادبی رسائل کی اشاعت خواندہ طبقہ میں صحیح مذاق پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ یہ ضرورت اگرچہ پہلے بھی چندمرتبہ محسوس کی گئی۔ لیکن میں جناب خواجہ شجاع شمسی اور اُن کے رفیقان کار کو ہدیہ تبریک وتحسین پیش کرتا ہوں کہ اس احساس کو عملی جامہ پہنانے کی اولیت کا سہرا ان کے سر بندھا ہے۔ علامہ شجاع شمسی کی ذات کسی مزید تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ کی نمایاں شخصیت اعلیٰ قابلیت علمی شغف اور ادبی ذوق اس امر کے کفیل ہیں۔ کہ مستقبل قریب میں یہ رسالہ صحیح معیار صحافت تک پہنچکر ہندوستان کے بلند پایہ اور بہترین رسائل کی صف اول میں کھڑا ہوگا۔ ایک نمایاں خصوصیت اس رسالہ کی یہ ہے، کہ ناظرین کے مختلف مذاق اور طبائع کی رعائت سے متنوع مضامین کم وبیش سب کے لئے سامان ضیافت پیش کرتا ہے اور ایک عالم وادیب سے لیکر ایک طالب علم کی منزل تک اس کے مطالعہ سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ قومی تعصبات اور فرقہ وارانہ میلان سے کامل اجتناب بھی اس رسالہ کی ایک شان امتیازی ہے۔ الغرض خواجہ صاحب نے ایک ادبی فرض ادا کیا ہے۔ اور اب لوگوں کا فرض ہے۔ کہ کثرت سے رسالہ کے خریدار بن کر اپنی بیداری اور زندہ دلی کا ثبوت دیں اور اپنے تعاون محقق کو اس قابل بنا دیں۔ کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو کر اور ان خطرات سے جو عموماً نئے رسائل کو پیش آتے ہیں محفوظ ومامون رہکر ملک کی وہ خدمت کر سکے۔ جس کے لئے اس نے اقتصادی مشکلات کے زمانہ میں اپنی کمرہمت باندھی ہے۔ اگر قدردان حکام نے حوصلہ افزائی کی۔ اور بامذاق طبقہ عوام نے دلی تپاک سے اس کا خیرمقدم کیا۔ تو جناب شمسی صاحب سے امید واثق ہے۔ کہ اپنی بے بہا علمیت اور وسیع تجربہ کی بنا پر وہ محقق کو مرقع ادبیات اور گنجینہ معلومات بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرینگے

۱۸ جنوری ۱۹۳۷ء	خاکسار

قاضی علاؤالدین احمد عفی عنہ ہیڈماسٹر

# سوالات

اس عنوان کے ماتحت "تحقیق" علمی ۔ ادبی صنعتی ۔ ان تمام سوالات کا جواب پیش کیا کرے گا۔ جو اس کے حلقۂ اقتدار میں ہوں ۔ خریدار حضرات اپنے خریداری نمبر کا حوالہ دے کر کوئی سوال پوچھ سکتے ہیں۔

**سوال** :۔ سردی لگنے سے ہمارے چہرے کا رنگ نیلا کیوں پڑجاتا ہے ۔

ہماری جلد کا رنگ ہمارے جسم میں دورہ کرنے والے خون کی مقدار پر منحصر ہے ۔جب ایک آدمی خوب ورزش کرے ۔ تو سُرخ رنگ کا خون بہت مقدار میں جلد کے نزدیک آجاتا ہے ۔ آرٹریز پھیلتی ہیں ۔ اور جلد سُرخ نظر آتی ہے جب سردی لگے ۔ تو اس کا برعکس ہوتا ہے ۔ سُرخ خون کم آتا ہے ۔ آرٹریز سکڑ جاتی ہے ۔ اور وینز جن میں غلیظ خون ہوتا ہے ۔ پھیل جاتی ہیں ۔ یہ غلیظ خون نیلے رنگ کا ہوتا ہے ۔ وینز جلد کے بہت قریب ہونے کی وجہ سے بہت جلد نظر آتی ہیں ۔ اور خون کی نیلاہٹ پن جلد میں نظر آتی ہے ۔ اس کو ہم کہتے ہیں ۔ کہ جلد نیلی نظر آرہی ہے ۔

**سوال** :۔ کیا دودھ سے ہماری بیرونی ضرورت کی چیز تیار کی جاسکتی ہے ۔

دودھ آجکل نشوونما کے علاوہ کئی چیزیں مثلاً بٹن ۔ کنگھیاں وغیرہ سگریٹ ہولڈر تسبیح کے دانے بنانے کے کام میں بھی لایا جاتا ہے ۔ اس کا طریقہ مندرجہ ذیل دودھ میں تیزاب ملانے سے نیچے دہی بیٹھ جاتی ہے ۔ اس کو سکھا کر میدے کی شکل باریک پیس لیا جاتا ہے ۔ اس کو کیسین (CAISINE) کہتے ہیں ۔ اس کیسین کے سفوف کو کاسٹک سوڈا کے پانی میں حل کرلیا جاتا ہے ۔ جس میں رنگ اور بھاری کرنے کے لئے اور چیزیں ملائی جاتی ہیں ۔ اب پھر تیزاب کی مدد سے دہی سی نیچے بٹھائی جاتی ہے ۔ یہ آٹے کی شکل گوندھی جاسکتی ہے ۔ اور جس قسم کی چیز بنانی ہو ۔ اس سے بنائی جاسکتی ہے ۔ کیسین سے تیار شدہ چیزیں شفاف بھی تیار ہوسکتی ہیں ۔ اور رنگدار بھی یہ مضبوط ہوتی ہیں ۔ اور سیلیولائیڈ کے برعکس جلدی آگ نہیں لگتی

**سوال** :۔ زنجیر کھینچنے سے ریل گاڑی کیوں کھڑی ہوجاتی ہے ۔

یہ ایک بوگی کے پچھلی طرف اوپر کے لوہے کی ایک موٹی سلاخ ہوتی ہے ۔ جو کہ وسط میں ایک ڈبے میں سے گذرتی ہے یہ ڈبہ چھت کے قریب ہوتا ہے ۔ اور اس کو ہوا کا ڈبہ یا (AIR BOX) کہتے ہیں ۔ اس ڈبے سے ایک لوہے کی چوڑی نالی گاڑی کے نیچے کی طرف جاتی ہے اس کو کہتے ہیں ۔ جب ہم اپنے کمرے میں خطرے کے وقت زنجیر کھینچتے ہیں ۔ تو لوہے کی سلاخ ایک چوتھائی دائرے میں گھومتی ہے ۔ اس کے گھومنے سے ہوا کی نالی کے سرے پر پڑا ہوا ڈھکنا خود بخود اُٹھ جاتا ہے ۔ نالی کا منہ کھل جاتا ہے ۔ اور اندر داخل ہونے لگتی ہے ۔ یہ ہوا نالی میں داخل ہوتی ہوئی گاڑی کے ایک ڈبے میں داخل ہوتی ہے ۔ اس ڈبے کو کہتے ہیں ۔ یہ کوئی ۲ ½ فٹ قطر کا گول شکل کا ہوتا ہے ۔

اس میں سے لوہے کی ایک موٹی سلاخ نکلکر پہیوں کے بریکوں کو کنٹرول کرتی ہے۔ اور اس بڑے ڈبے میں ایک اس سلاخ کے سرے پر لگا ہوا ایک فشارہ (PISTON) ہوتا ہے۔ جس کے نیچے خلا ہوتا ہے۔ سب گاڑیوں کے نیچے یہ خلا انجن اپنی بھاپ کی مدد سے کرتا ہے۔ جب ہوا اس ڈبے (AIR BOX) کے نیچے سے داخل ہوتی ہے۔ تو اس کو دباؤ (PRESSURE) کو اوپر کی طرف دھکیل دیتا ہے۔ فشارے کے اوپر جانے سے بریک پہیوں پر لگ جاتے ہیں۔ اور گاڑی دھیمی پڑجاتی ہے۔ ڈرائیور یہ دیکھ کر گاڑی ٹھہرا لیتا ہے۔

**سوال:۔** ریلوے انجن کا دھواں چلتے وقت بھک بھک کرکے کیوں نکلتا ہے۔

انجن کی چمنی میں سے نکلنے والی شے میں ایک تو وہ دھواں ہوتا ہے۔ جو کہ انگیٹھی میں سے آرہا ہوتا ہے۔ دوسرے اس میں وہ بھاپ ہوتی ہے۔ جو کہ انجن کو چلانے میں اپنی طاقت خرچ کر چکنے کے بعد ناکارہ ہو جاتی ہے۔ اور اس راستے سے باہر نکال دی جاتی ہے۔ یہ بھاپ مسلسل طور پر نہیں نکلتی۔ بلکہ (PUFFS) کی صورت میں سلنڈر میں سے نکلتی ہے۔ ان (PUFFS) کی وجہ سے دھواں رک رک کر نکلتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

**سوال:۔** اگر پانی کسی مٹی کے برتن میں رکھا جائے۔ تو جولائی اگست کے مہینوں کی نسبت مئی جون میں زیادہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اس کا کیا سبب ہے۔

مٹی کے برتن مسام دار ہوتے ہیں۔ ان میں سے پانی رس رس کر نکلتا رہتا ہے۔ اور باہر کی سطح پر آکر بخارات کی شکل میں تبدیل ہو کر ہوا میں اڑ جاتا ہے۔ بخارات میں تبدیل ہونے کے لئے حرارت کی ضرورت ہے۔ وہ حرارت اندر والے پانی سے حاصل کی جاتی ہے۔ جو کہ اس طرح سے رفتہ رفتہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔

ہوا مئی جون میں خشک اور جولائی اگست میں بارشوں کی وجہ سے تر ہوتی ہے۔ اس وجہ سے مئی جون میں زیادہ بخارات بنتے ہیں۔ اور پانی زیادہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اور جولائی اگست میں کم۔

---

# ارشادِ اُستاد

جناب شمس الحسن صاحب صدیقی اختر

میرے ایک استاد بھائی بیچارے شاعری کا کچھ بہت ہی ذوق وشوق رکھتے ہیں۔ لیکن سوء اتفاق یہ ہے۔ کہ غریب دماغ سے کورے ہیں۔ چونکہ سینہ میں ایک تو بے عشق پر ایک خاص لگن رکھتے ہیں۔ اس لئے یہ بیچارے اس آگ کے مارے اپنی لگی سے یہ دل لگی فرماتے ہیں۔ کہ حضرت قبلہ استاد مدظلہ العالی کے دسترخوان دولت ونعمت ہائے گوناگون کی زلہ چینی سے سیر ہوتے ہیں۔ اور ہاضمہ کی گولیاں کھا کھا کر بے ڈکار لئے نفس امارہ کو خوب بھاری بھرکم بنانے کی کوشش فرماتے رہتے ہیں۔ اپنی کمائی کا یقین دلانے اور غذا کو اپنی نظر میں لطافت بخشنے کے لئے نت نئے ڈھنگ ایجاد فرماتے ہیں۔

ابتداء میں تو کھا سستا پھوسٹر یہ طریقہ تھا۔ کہ جو کچھ دسترخوان عالی سے دانہ دنکا گرا گرایا ہاتھ لگا کسی کونے کھدرے میں چپ چپاتے سٹک گئے۔ اگر کبھی حسن ونزاکت کے میدان میں بھولے بھٹکے کوئی پھریری آتی بھی تو آپ ہی آپ دیکھ بھال کر بھول لیا کرتے۔ پھر یہ جی میں سمائی۔ کہ حضرت قبلہ استاذی مدظلہٗ کو کسی طرح استاد بنا کر اپنا نام بھی فہرست میں لایا جائے۔ اس کا یہ طریقہ نکالا

کہ شور شکر آمیز کر کے حضرت قبلہ مدظلہٗ کے حضور پیش کرتے کہ حضرت جی یہ غریب کے خون پسینے کی گاڑھی کمائی ہے۔ ملاحظہ فرما کر "شوریت" کم فرما دیجئے۔ حضرت محترم مدظلہٗ ایک عرصہ تک بے خیالی میں اصلاح فرماتے رہے۔ آخر کبتک ایک روز بھانڈا پھوٹ ہی گیا۔ استاد مدظلہٗ العالی سخت برہم ہوئے بہت کچھ سخت سست کہا۔ غیرت دلائی۔ مگر واہ رے شیر اس واقعہ نے تو گویا نقاب ہی اٹھا دی۔ اب کیا تھا۔ جہاں کوئی ٹکڑا ہاتھ سے چھوٹا۔ یا نظر سے چوکا۔ مال یاروں کا تھا۔ اس روز افزوں جسارت میں چار چاند یہ لگے۔ کہ گھر سے نکل نکل کر داد حسن طلب کرنے لگے۔ واہ وا سبحان اللہ۔ ہم غم جہاں تھوڑا ہی تھے "چشم ما روشن دل ما شاد"۔ کوئی تعریف کرتا ہے۔ تو کرے۔ ہم پر تو اس کا کچھ اثر نہیں پڑتا۔ اکثر ایسا بھی ہوا۔ کہ مجمع احباب میں اگر کبھی اس قبیل کی بات آ پڑتی۔ تو ہمارے سامنے بھی جناب خوب خوب بل کھایا کرتے۔ گو چونکہ عموماً یار لوگ ہمارے اس ضعف اور ان کی قوت وحسن عارضی کے نکتہ شناس تھے۔ اس لئے ان پر جی نہ کھولتے۔ بلکہ اکثر اشاروں کنایوں میں ان کی دکھتی رگ ہی دبا دیتے۔

ایک روز ایسا اتفاق ہوا۔ کہ ایک حضرت "صاحب فن"

ناآشنا رہ۔ ایک دوست کے ہاں مقیم ہوئے۔ سب احباب جمع ہوئے۔ آپ بھی کہیں سے آ دھمکے۔ تو فن موضوع پر گفتگو چھڑ گئی

حضرت مہمان کی تواضع فرمائش کے بعد ایک صاحب نے انگڑائی لی۔ اور حضرات نے بھی باری باری دیر سے بھری مسکائیں بہار بھی اس شاک چمک میں نکل آیا۔ چونکہ مہمان صاحب سے حضور کا بہ خاص تعارف نہیں کرایا گیا تھا اس لئے امید تھی۔ کہ وہ بلبل رہیں گے۔ مگر جناب آخر کیوں؟ ابھی ہم اپنا پارٹ ادا کرکے سستا بھی نہیں پائے تھے۔ کہ سرکار بھی چہچہا اٹھے۔ بڑا ناگوار گذرا بحث تک آیا۔ مگر تھوڑی دیر پیش بر جان و پیش جی ہی جی میں کڑھ کر رہ گئے۔ نو وارد بیچارے ناواقف "اسرار" تھے۔ تڑپ تڑپ گئے۔ پھڑک پھڑک اٹھے ہر ہر ناز پر بچھ جاتے۔ ہر ہر انداز پر دوہرے ہو جاتے۔ غرضیکہ یہ بیچارے ان "حضرت" پر لوٹ ہو گئے۔ ان کو کیا معلوم تھا کہ یہ کس درجے کے ذروں کی چمک ہے۔ کہ تمام محفل منور ہو گئی۔ بھلا دن میں ہمارے چراغ کیا چمکتے۔ اتنی دیر کی محنت سے چڑھایا ہوا رنگ بھی ذرا کی ذرا میں اڑ گیا۔

سچ یہ ہے۔ کہ ہمیں اپنی ہیٹی ہونے پر بے انتہا ملال ہوا۔ غصہ بھی آیا۔ یہاں تو پی گئے۔ مگر اگلے روز حضرت قبلہ استاذ محترم مدظلہٗ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ طرح ڈال کر یہ واقعہ بھی عرض کیا۔ دبی زبان سے شکایت بھی کی۔ کہ حضرت کو علم ہے۔ اور پھر بھی حضرت کچھ خیال نہیں فرماتے۔ کچھ تعلی نہیں ہے۔ ان حضرت میں ہمارے مقابلہ کی قوت معلوم۔ مگر تو جناب کی دولت اپنا کر دکھائیں تو حضرت سچ ہم میں تاب مقابلہ کہاں رہ سکتی ہے۔

ارشاد عالی ہوا۔ عزیزم وہ تو اپنے نفس و ضمیر کا دشمن۔ اپنے دل و دماغ کا رہزن ہے۔ کئی مرتبہ رہبری کر چکا ہوں۔ اب مجھے اس سے چونکہ کوئی ہمدردی باقی نہیں رہی۔ اس لئے مانع نہیں آتا۔ تم سے تمہارے دل و دماغ سے خلوص و محبت رکھتا ہوں۔ تم میرے عزیز ہو۔ وہ اپنا دشمن۔ تم کچھ ہو جاؤ گے۔ وہ سر پکڑ کر رہ جائے گا۔ وہ بھٹکا ہوا ہے۔ قعر مذمت کی طرف جا رہا ہے۔ جانے دو۔ جو اپنے کو دھوکا دیتا ہے۔ وہ کبھی دنیا میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

اختر صدیقی

# بچوں کی دُنیا

## کہانی

ایک مُلک میں دو بھائی رہتے تھے۔ بڑا بھائی بڑا امیر زمیندار تھا۔ اس کے پاس زمین بھی بہت تھی۔ اور مویشی بھی کافی تھے۔ مگر اس کا چھوٹا بھائی بچارہ بہت غریب تھا۔ اپنا گزر اوقات بھی مشکل سے کرتا تھا۔ اس کے ایک بیٹی بھی تھی۔ جس کا نام فاطمہ تھا۔ جو بہت عقلمند تھی۔ دونوں باپ بیٹی محنت کرکے اپنا پیٹ پالتے تھے۔ ایک دفعہ بڑے بھائی کی ایک گائے بہت بیمار ہوگئی۔ دودھ بھی بالکل نہیں دیتی تھی۔ اور دُبلی بھی بہت ہوگئی تھی۔ اُس نے اپنے دل میں سوچا۔ کہ یہ گائے کسی کام کی تو اب نہیں رہی۔ لاؤ اپنے غریب بھائی کو ہی تحفتاً دے دو۔ اُس پر احسان ہوجائے گا۔ مرتو اس نے جانا ہی ہے۔ غرضیکہ اُس نے وہ گائے اپنے چھوٹے بھائی کو دیدی۔ اُس کے چھوٹے بھائی نے اور فاطمہ نے اُس کی دیکھ بھال کی۔ اس کو خُوب دانہ اور چارا کھلایا۔ اُن کی خدمت اور محنت سے گائے تھوڑے ہی دن میں خُوب مضبوط اور موٹی ہوگئی۔ اور اُس نے ایک بچھڑا بھی دیا۔ جب بڑے بھائی کو یہ خبر ملی۔ تو اُس نے اپنے چھوٹے

بھائی سے کہا۔ کہ بھائی تم بچھڑا تو مجھے دیدو۔ میں نے تو تم کو صرف گائے دی تھی۔ اس کا بچھڑا نہیں دیا تھا۔ مگر چھوٹے بھائی نے بچھڑا دینے سے صاف انکار کر دیا۔ اب بڑا بھائی بہت ناراض ہوا۔ اور اس نے مجسٹریٹ کی عدالت میں چھوٹے بھائی کے خلاف نالش کر دی۔ مجسٹریٹ نے دونوں بھائیوں کو بلوایا۔ اور ان سے کہا۔ کہ تم میں سے جو میرے تین سوالوں کا جواب دیگا۔ اس کو بچھڑا دے دیا جائے گا۔ پہلا سوال یہ ہے کہ دُنیا میں سب سے زیادہ تیز رفتار چیز کیا ہے۔ اس وقت تم دونوں اپنے گھر جاؤ کل صبح آکر اس کا جواب بتانا۔ چھوٹا بھائی اپنے دل میں بڑا اُداس تھا۔ جو وہ اپنے گھر پہونچا۔ اور فاطمہ نے اس کے سامنے لاکر کھانا رکھا۔ تو اس نے بہت تھوڑا سا کھانا کھایا۔ فاطمہ نے پوچھا۔ ابا جان! آج آپ اتنے رنجیدہ کیوں ہیں۔ اس نے سارا واقعہ اوّل سے آخر تک کہہ سُنایا۔ اور غمگین آواز میں بولا۔ کہ مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ صبح کو کیا جواب دُونگا۔ فاطمہ نے اُس کو تسلّی دی۔ اور کہا۔ فکر نہ کریئے۔ خدا مالک ہے۔ اب تو آرام سے سوجائیے۔ صبح کو جو کچھ میں بتاؤں گی۔ آپ وہی جاکر جواب دیدیجئے گا۔

بوڑھے باپ کی اس باتوں سے تسلّی ہوئی۔ اور وہ سو گیا۔

جب صبح ہوئی۔ اور جانے کا وقت آیا۔ فاطمہ نے کہا۔ ابا جان! جب حاکم آپ سے اپنے سوال کا جواب پوچھے۔ تو آپ کہئے گا۔ کہ دُنیا میں سب سے زیادہ تیز رفتار چیز انسان کا خیال ہے۔ کہ لمحہ بھر میں لاکھوں میل کی مسافت، اور سالہا سال کا عرصہ طے

کر سکتا ہے۔ دونوں بھائی حاکم کی عدالت میں پہونچے۔ حاکم نے پہلے بڑے بھائی سے اپنے سوال کا جواب پُوچھا۔ اُس نے کہا دُنیا میں سب سے زیادہ تیز رفتار چیز ہمارے راجہ صاحب کا گھوڑا ہے جو ہوا کو بھی پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ جب چھوٹے بھائی کی باری آئی۔ تو اُس نے فاطمہ کا یاد کرایا ہُوا جواب بتا دیا۔ حاکم نے کہا۔ اچھا کل کو آکر یہ بتاؤ۔ کہ دُنیا میں سب سے زیادہ موٹی چیز کیا ہے۔ فاطمہ کا باپ آج پھر محنت مزدوری کے بعد بہت غمگین گھر پہونچا۔ فاطمہ نے پھر اُس کی تسلّی تشفّی کر دی۔ اور صبح کو جب چلنے کا وقت ہُوا۔ تو اُس کو بتایا۔ کہ حاکم سے کہیئے گا۔ کہ دُنیا میں سب سے زیادہ موٹی چیز دُنیا ہی ہے۔ جس کے اندر دُنیا کی بڑی سے بڑی چیزیں سمائی ہوئی ہیں۔ حاکم نے حسبِ معمول پہلے بڑے بھائی سے اپنے سوال کا جواب پوچھا۔ اُس نے کہا۔ کہ دُنیا میں سب سے موٹی چیز میری ایک لومڑی ہے جسکا پیٹ مشک کی طرح پھُول گیا ہے۔ چھوٹے بھائی نے پھر وُہی فاطمہ کا بتایا ہُوا جواب بتا دیا۔ حاکم نے کہا اچھا کل پھر آکر اس سوال کا جواب بتاؤ۔ کہ دُنیا میں سب سے زیادہ پیاری چیز کیا ہے۔ فاطمہ کے باپ آج پھر آکر فاطمہ کو حاکم کا سوال بتا دیا۔ اور اُس کے تسلّی دینے پر بے فکر ہو کر سو رہا صبح ہوئی۔ جانے کا وقت آیا۔ فاطمہ نے کہا۔ حاکم سے کہنا۔ کہ دُنیا کی سب سے زیادہ پیاری چیز نیند ہے۔ کیونکہ جب آدمی سو جاتا ہے۔ تو اپنا سارا دُکھ اور غم بھُول جاتا ہے۔

دُونوں بھائی عدالت میں پہنچے۔ حاکم نے حسبِ دستور پہلے بڑے بھائی سے اپنے سوال کا جواب مانگا۔ اُس نے کہا۔ کہ دُنیا میں سب سے پیاری چیز اولاد ہے۔ جب چھوٹے بھائی کی باری آئی۔ تو اُس نے وُہی فاطمہ کا بتایا ہُوا جواب سُنا دیا۔ حاکم جواب سُن کر بہت خوش ہُوا۔ اور اُس نے فیصلہ کیا کہ چھوٹے بھائی کے تینوں جواب بہت ٹھیک اور عقل کے ہیں۔

لہٰذا بچھڑا اسی کو دیا جاتا ہے۔ یہ فیصلہ سُن کر بڑا بھائی اپنے دل میں بہت ناراض ہُوا۔ اور فوراً عدالت سے اپنے گھر چلا گیا۔ مگر چھوٹا بھائی حاکم کے انصاف اور غریب پروری کا شکریہ ادا کرنے کے لئے وُہیں ٹھہرا رہا۔ تھوڑی دیر میں حاکم نے اُس کو اپنے نزدیک بُلایا۔ اور دریافت کیا۔ کہ سچ بتاؤ۔ تم کو یہ جواب کس نے بتائے تھے۔ اُس نے جواب دیا۔ کہ تینوں جواب میری بیٹی نے مجھکو بتائے تھے۔ حاکم اُس کی سچائی سے اور بھی خوش ہُوا۔ اور اُس نے کہا۔ اچھا اپنی بیٹی سے کہو۔ کہ ہم سے ملنے آئے۔ مگر اس طرح سے آئے۔ کہ اپنا لباس بھی نہ پہنا ہُوا ہو۔ مگر ننگی بھی نہ ہو۔ ننگے پاؤں بھی نہ ہو۔ مگر اپنی جوتی بھی نہ پہنے ہوئے ہو۔ خالی ہاتھ بھی نہ آئے۔ مگر ہمارے لئے کوئی تحفہ بھی نہ لائے۔ باپ یہ شرائط سُن کر بہت گھبرایا۔ اور گھر جاکر بیٹی سے سب حال بتایا۔ فاطمہ یہ باتیں سُن کر بہت خوش ہوئی۔ اور بولی۔ کل آپ ضرور مجھے حاکم سے ملنے کے لئے لے جائیے گا۔

صُبح روانہ ہونے کا وقت آیا۔ تو فاطمہ نے بجائے اپنا لباس پہننے کے اپنے باپ کا بڑا لباس پہن لیا۔ پاؤں میں برف پر چلنے والی جوتی پہنی۔ ہاتھ میں ایک کبوتر لیا۔ اور باپ کے ساتھ چل پڑی جب حاکم کے قریب پہنچی۔ تو سلام کرکے کبوتر پیش کیا۔ جب حاکم نے ہاتھ کبوتر پکڑنے کو بڑھایا۔ تو فاطمہ نے اپنا ہاتھ کھول دیا۔ کبوتر فوراً پھُر سے اڑ گیا۔ اس کی فہم و دانش دیکھ کر حاکم بہت خوش ہُوا۔ اور اُس نے اپنی شادی فاطمہ سے کرلی۔ اب فاطمہ خوب امیر ہوگئی۔ اُس نے اپنے بُوڑھے باپ کو اپنے پاس رکھا۔ اور تمام عمر غریبوں کی مدد کرتی رہی۔

---

# لطیفہ

ایک لڑکے نے ایک دفعہ کسی بات پر ناراض ہوکر اپنی دادی اماں کو بیوقوف کہا۔ اس لڑکے

کا باپ اس بات پر اُس سے ناراض ہونے لگا۔ اور کہا۔ تم بڑے شریر لڑکے ہو۔ تم ہماری اماں جان کو بیوقوف کہتے ہو۔ لڑکے نے جواب دیا۔ ابا جان! آپ بھی تو میری اماں جان کو ہمیشہ بیوقوف کہا کرتے ہیں۔ مگر میں تو کبھی آپ سے ناراض ہوا۔ آج آپ کی اماں جان کو میں نے بیوقوف کہا۔ تو آپ ناراض ہونے لگے۔

---

# تجارت

آجکل تجارت کا راز اشتہار ہے۔ وہ کون جہاں آپ کی صدا نہیں پہنچ سکتی۔ اشتہار کے ذریعہ آپ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ محقق کامیاب رسالہ ہے۔ اور اس میں اشتہار دینا اپنی تجارت کو فروغ دینا ہے۔ شرح بہت کم ہے۔ آپ اس نادر موقع سے فائدہ اٹھائیے۔

## شرح اشتہارات

| ضخامت | بارہ اشاعتیں | چھ اشاعتیں | تین اشاعتیں | ایک اشاعت |
| --- | --- | --- | --- | --- |
| پورا صفحہ | ۵۰ روپیہ | ۳۰ روپیہ | ۱۸ روپیہ | ۷ روپیہ |
| آدھا صفحہ | ۳۰ روپیہ | ۱۸ روپیہ | ۱۰ روپیہ | ۴ روپیہ |
| چوتھائی صفحہ | ۱۸ روپیہ | ۱۰ روپیہ | ۶ روپیہ | ۲½ روپیہ |

فرمائش اشتہارات کیساتھ پوری قیمت کا پیشگی وصول ہونا ضروری ہے۔

## رسالہ مُحقّق بہاولپور

***Always remember!*** **It is not the idea which makes a man great, it is its putting into action.** To be visionary is foolish, to be lazy a sin and to have a destructive policy, a greater sin. Let your great idea add to the good and welfare of the world.

The world always opposes new ideas, however good they may be: nay, it scorns at them. There have always been brave spirits, fortunately for the cause of human progress, who stood all apposition and scorn. Let your conviction and nerves both be strong.

"A profound conviction raises a man above the feeling of ridicule."

J. Stuart Mill.

This ridicule changes into repect, nay praise, even worship according to the greatness of purpose of the idea, when success has been achieved.

"Yet nerve thy spirit to the roof, and blench not at thy chosen lot;
The timid good may stand aloof, the sage may frown, yet faint those not:
Nor heed the shaft too surely cast, the foul and hissing bolt of scorn,
For with thy side shall dwell, at last, the victory of endurance born.

Bryant

So my friend! live with an idea. Living without a great purpose is no life.

*Director*

*English contirbutions especially those dealing on cultural matters will be received with thanks. These should be written, better typewritten, on one side only of foolscap size paper.*

# A GREAT IDEA

## *Is the Real Great Man inside him*

A man is not great because of his tall stature, bulky body or fine dresses. Millions count little, belongings afford no help and geneology is of no use in making a man great. The real greatness of his personality depends upon the *ideas* which play hide & seek inside his mind But there must be one dominant idea

"He who wishes to fulfil his mission must be a man of one idea, that is, of one great overmastering purpose, overshadowing all his aims, and guiding and controlling his entire life." Bate

You have not to go to some other world in search of ideas. They lie scattered round about you—hidden, unknown or demolished. Select one which suits you best and make it your own.

Now ! Consider, ponder, weigh, consult and read, before you finally decide to go forward. Take not a step, which you may have to retrace. One wrong step may mean sufficient engagement for your whole life.

Beware, the mischief-monger is at your side, the enemy is seeking for an opportunity, the time is passing fast. Do not forget them.

# Modern Laboratories Bahawalpur

[illegible]

[illegible]

[illegible]

**Iksire Meda (Stomach Remedy)** It is an infallible remedy for all stomach troubles, indigestion, bad liver etc. It improves the working of the stomach if taken constantly. In case of bad digestion it should be used every half hour.

*Price Rupee One only (Rs. 1/-) per bottle.*

**Dental Powder (The Scientific Dental Powder)** It is the best remedy for pyorrhoea, bleeding gums, spongy gums, coloured teeth, offensive smell in the mouth, etc. It has been specially prepared for the purpose and is not an ordinary dental powder. Try it once to see the results.

*Price annas (As. 10/-) per bottle.*

**Spermotene (For Spermatorrhoea)** Most of us suffer from Spermatorrhoea but we are not aware of it. The emission occurs involuntarily when asleep or awake. The energies of the whole system are sapped away. Try a bottle of SPERRMOTENE to see how much you improve in health, strength and mental powers. You must try it to see its miraculous effects. It is specially recommended to young men, students, teachers and all those persons whose occupations are sedantry.

*Price Rupees two only (Rs. 2/-) per bottle.*

## Modern Laboratories Bahawalpur

*The Home of Efficacious Medicines*

# THE MOHAQQIQ

## BAHAWALPUR

**A High Class Literary Monthly.**

# محقق

تحقیق کا ماہوار رسالہ محقق علمی - ادبی - تنقیدی



## بہاولپور

---

ادارۂ تحریر

ڈائرکٹر - خواجہ شجاع منعمی

ایڈیٹر - رازی عرفانی مہتمم شعبۂ نسواں بیگم ح ش - رفعت دہلوی بی - اے

نگران عربیات - مولوی حافظ عبدالرحمٰن علامہ مولوی فاضل

نگران سنسکرتیات - پنڈت مدن سنگھ شاستری - ودیا بھاسکر

فنی علمی - ادبی صنعتی وغیرہ

ماہوار رسالہ

# مُحقق



قیمت سالانہ تین روپے (للعہ) طلباء سے دو روپے (للعہ)

فی پرچہ چار آنہ (۴) رؤسا سے دس روپے (للعہ)

مئی ۱۹۳۷ء

## ادارۂ تحریر


| | |
|---|---|
| ڈائرکٹر | خواجہ شجاع شمسی - ایم - اے - (علیگ) - ایم - ایس سی - ایم - اے (پنجاب) پروفیسر |
| ایڈیٹر | رازی عرفانی |
| مہتمم شعبۂ نسواں | بیگم - ر - ش - رفعت دھلوی - بی - اے |
| نگران عربیات | مولوی حافظ عبد الرحمٰن علامہ مولوی - فاضل |
| نگران سنسکریات | پنڈت مدن سنگھ شاستری - ودیا بھاسکر |
| مذاکرہ علمیہ | پروفیسر ایم - الیف - قریشی - ایم - ایس سی - افسانہ - ایمن حزین بہاولپور |
| مقام اشاعت | دفتر رسالہ - محقق بہاولپور |

جلد ۱ | فہرست مضامین ماہ مئی ۱۹۳۷ء | نمبر ۵

# شذرات

عباسیہ لٹریری لیگ بہاولپور۔ دنیا کے شب و روز ایک زنجیر کی کڑیوں کی طرح سے ہیں جو سیاہی اور سفیدی کی بہار دکھلاتے ہوئے آگے بڑھے چلے جاتے ہیں۔ ہر روز مستقبل کی بنیاد قدریہ ہوتی ہے۔ جس طرح سے اس کے بغیر عمارت کا بننا ناممکن ہے۔ اس طرح سے ابتدائی کاوشوں کے بغیر انتہا تک پہنچنا محال ہے۔

عوام الناس کی ذہنی ترقی ایسے علمی مواد سے ہوتی ہے جو ان کے سامنے اس طرح سے پیش کیا جائے کہ انہیں اس کے حاصل کرنے میں بہت دقت نہ اٹھانی پڑے۔ عباسیہ لٹریری لیگ کا اجرا انہیں اسباب سے ہوا ہے۔ اب تک ایک مفید مطلب لیکچر بلند پایہ مضمون پہ کالج ہال میں ہوا اور دوسرا شاندار مشاعرہ عید کے دوسرے دن سینما ہال میں باہر سے بھی بہت سے شعرا تشریف لائے تھے۔ ایک نظم جو اس موقعہ پر آزاد صاحب نے پڑھی تھی وہ کہیں اور اسی رسالے میں درج ہے:۔

محقق کے متعلق جن اصحاب نے کوشش فرمائی وہ سب ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں۔ رسالہ کے سرپرست عالیجناب صاحبزادہ محمد حاجی خان صاحب بہادر عباسی تو سرپرست ہی ٹھہرے۔ جناب پیرزادہ محمد سلیم صاحب۔ ایم۔ اے ایل ایل بی صدر عباسیہ لٹریری لیگ اور جناب عبدالودود خان صاحب تمر بی۔ اے ناظم دائرہ ادبیہ نے خاص طور پر توجہ فرمائی جس کے لئے ادارہ ان کا بہت شکر گزار ہے۔

تصویر۔ اس رسالے میں "عمر خیام (ایرانی آنکھوں سے)" شامل ہے۔ شب ماہتاب بھی کیا جنوں انگیز کیفیت ہوتی ہے۔ غالب کہتا ہے۔ ؎

غالبؔ چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی　　پیتا ہوں روز ابر و شب ماہتاب میں

گویا شب ماہتاب میں پینا ایک طرح کا فرض ہے:۔

عمر خیام نے بھی کئی جگہ اس مست کن منظر کا سماں باندھا ہے۔ کہتا ہے۔ ؎

ساقی عیش است و مہ برافروختہ است　　مے دہ کہ فلک نکتہ آموختہ است
دانی کہ اجل چوں برق خرمن است　　تا درنگری خرمن ما سوختہ است

اسی پر اکتفا نہیں پھر ارشاد ہوتا ہے۔ ؎

چوں عہدہ نمی شود کسے فردا را　　حالے خوش کن تو ایں دل سودا را　　مے نوش بنور ماہ اے ماہ کہ ماہ　　بسیار بتابد و نیابد ما را

اگر تصویر کو دیکھا جائے تو وہ ان دونوں رباعیوں سے بڑھ کر ہے۔ بولتی ہوئی جیتی جاگتی ایک دنیا دکھائی دیتی ہے۔ شاعر کا تصور مصور کا تخیل مصنف کا خیال۔ اپنی ذات میں مکمل۔ خلوت بھی ہے۔ جلوت بھی۔ [illegible]۔ تصورات کی رنگین دنیا بھی۔

# بزم جہاں

انسانی پیکر میں بہت سی قوتیں پنہاں ہیں. خدا کی صفات بھی اور شیطان سے آموختہ خیالات بھی. کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ دنیا کے دماغ نیکی کے راستے پر گامزن ہوتے ہیں. اور دنیا تعمیر کے پروگرام میں دل وجان سے منہمک نظر آتی ہے. اس کے برخلاف کبھی شیطانی قوتیں کارفرما ہوتی ہیں. اور عالم غلط پرستی کا محشرستان نظر آتا ہے۔

آج دنیا کی ہر قوم ایک دوسرے سے سبقت لے جانے میں کوشاں ہے. مگر سبقت تخریب کے کاموں میں. ایک قوم کے پاس اگر دس توپیں ہیں تو دوسری بیس بنوانے کے فکر میں ہے. اگر توپ کا دہانہ ۱۴ انچ ہے تو ماہرین فن اس فکر میں ہیں کہ ۱۶ انچ کر دیا جائے. کیا ہوس ہے. کیا حرص ہے جو ضمیر انسانی کو دبائے چلی جا رہی ہے. اس وقت ایسے مواد کی بے حد ضرورت ہے جو دنیا کے بہترین دماغوں کو امن اور صلح کی طرف راغب کرے. جس سے ان کا میلان طبع اس سانچے میں ڈھل جائے کہ ان کے دل میں جنگ اور عناد سے نفرت پیدا ہو جائے. نظیر کہتا ہے۔ ؎

اگرچہ رواں زر سے ہیں کاروبار ۔۔ پر اتنی بھی مت حرص کر اختیار
ذرا صبر کر اور نہ ہو بیقرار ۔۔ کہاں تک کہوں تجھ سے اے میرے یار

چناں عاشق روئے زر گشتۂ
کہ شوریدہ احوال و سرگشتۂ

یورپ کے مبصرین یہ کہتے ہیں کہ دنیا کی تاریخ میں کبھی ہتھیاروں اور جنگی سامانوں کی مقدار اس قدر نہیں ہوئی جتنی آج ہے جرمنی میدان جنگ میں فی الفور تربیت یافتہ مسلح فوجی جوان جنگ میں لا سکتا ہے جن کی تعداد ساڑھے بارہ لاکھ ہے. روس میں لاکھ. یہ تو محض امدادی فوجیں ہیں جو ہوائی بیڑوں کی ممد و معاون بھی جاتی ہیں. آجکل فوجی قوت کا معیار ہوائی طاقت سے یورپ کی کم نظری ملاحظہ ہو جائے۔

جرمنی کے ڈکٹیٹر ہر ہٹلر نے اپنی پالیسی کو وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے "میں نے یہ تبدیلیاں اپنے قدیم حریفوں سے مشورہ کرنے کے بغیر کر دی تھیں کہ مد مخالف کے لئے ہمارے فیصلوں کو آسانی کے ساتھ مان لے جن کو بہرصورت انہیں ماننا ہوگا" یہ میں زبردستی کے مظاہرے جرمنی میں لازمی فوجی بھرتی قرار دیگئی ہے نئے جنگی جہاز اور نئے ہوائی جہاز بنائے گئے ہیں. رائن پر قبضہ جمالیا گیا. گویا آدھ عہد نامہ ورسائی کی خلاف ورزی ہو گئی ہے اور ادھر فرانس بھی ان حرکات کو خاموشی سے نہیں دیکھ رہا ہے. اگرچہ ہٹلر نے کہدیا ہے کہ اس سے بعد جرمنی اور فرانس کے درمیان عناد کا کوئی سبب نہیں رہا. لیکن کون یقین کرتا ہے اور اطمینان کسے ہے. فرانس نے جرمنی کی سرحد پر زمین دوز قلعوں کی ملحقہ ایک لائن بنائی ہے. اس کو مضبوط اور طویل کیا جائے گا. ملک کے نوجوانوں کو کارخانوں میں کام کرنے کی تربیت دی جائے گی (باقی صفحہ ۱۷ پر)

# اسلامی علم التواریخ کی تواریخ

گزشتہ سے پیوستہ

لغت اور محاورات کے طلبگار نحوی صرفی کچھ اور مضمون لیکر گھر سے نکلے تھے مگر اب نساب، تاریخ دان اور محقق بن گئے۔ ہشام ابن الکلبی (متوفی ۸۱۹ء) اور اس کے والد محمد نے اس مضمون پر بہت کاوش اور محنت سے کام کیا۔ ان کے صحائف قابل اعتماد اور وقیع ہیں واقعات اور حالات پوری چھان بین کے ساتھ قلمبند کئے گئے ہیں۔

شعر کو عربوں کے خیال میں بڑا دخل ہے۔ اظہار خیال کے لئے اس کا استعمال اکثر کیا جاتا ہے۔ اہم اور تاریخی موقعوں پر تو اس سے فائدہ اٹھانا بہت ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اسی لئے ان کے ہاں قبل از اسلام، شعر گوئی میں بہت ترقی ہو چکی تھی۔ اور یہ فن مکمل ہو چکا تھا۔ اس قدر مکمل کہ آج بھی زمانہ جاہلیہ کے لکھے ہوئے سبعہ معلقہ اور دیگر قصائد کو عربی منظومات میں سے بہترین خیال کرتے ہیں۔ جب شعر کی تعین اور تحقیق شروع ہوئی تو جو نام اور مقام اس میں مرقوم تھے۔ ان کی بھی تحقیق لازم ہوئی۔ گویا دواوین کی تدوین کے ساتھ تاریخی استقصا کا بھی سلسلہ شروع ہو گیا جب نسب جغرافی مقام تاریخی واقعات سب کے متعلق دریافت کی ضرورت پڑی اور یہ تاریخی موضوع بن گیا۔

اسی طرح سے مذہبی ادبیات، روایات اور دینی صحائف میں جہاں جہاں مقامات یا اشخاص کے نام درج ہیں۔ مذہبی علما نے اس کی تحقیق شروع کی۔ یہ دیکھنا لازم ہوا کہ وہ کون ہیں کس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے اعزا نے کس کس جنگ میں حصہ لیا۔ وہ کب مسلمان ہوئے اور اسلام کی انہوں نے کیا کیا خدمات سرانجام دیں۔ اس طرح سے مذہبی علما کو بھی تاریخ کے میدان میں آنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور انہوں نے تاریخی استقصا اور تحقیق کا سلسلہ شروع کر دیا۔

تو اس طرح سے عربی فن تاریخ کے مندرجہ ذیل ماخذ قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ اور تاریخی واقعات کو زیب صفحہ قرطاس کرنے کے اسباب بھی یہی ہوئے۔

(۱) زمانہ جاہلیہ کی روایات، حکایات، اور لطائف

(۲) احادیث جو رسول اللہ کی زندگی اور آپ کے صحابہ کے متعلق ہیں

(۳) اسلام کے ابتدائی دور میں جو واقعات پیش آئے مغازی، ہجرت، مختلف قبائل کا قبول اسلام یا ارتداد۔

(۴) قبل از اسلام کی منظومات جن سے لغت اور محاورہ میں امداد لی گئی۔

(۵) رسول اللہ کے متعلقین اور عرب قبائل کے نسب ناموں کی تحقیق۔

ان سب میں سے احادیث زیادہ اہم ہیں۔ تاریخ کو تحریر، شائع اور نشر کرنے کا سبب بڑی حد تک مومنین کی وہ محبت تھی۔ جو وہ اپنے آقائے نامدار سے رکھتے تھے۔ انہوں نے رسول اللہ کی سوانح عمری لکھی۔ صحابہ کی حدیثوں کو قلمبند کیا۔ اور پھر ہر مسلمان کو اس کے حاصل کرنے کی خواہش ہوئی۔ اس

طرح سے تاریخی مواد جمع کرنے اور تاریخی کتب لکھنے کی تحریک مسلمان عالموں کے دل میں پیدا ہوئی۔

ایک اور مصنف سیرت رسول اللہ کے متعلق قابل ذکر ہے۔ محمد ابن مسلم ابن شہاب جو الزہری کے نام سے مشہور ہے۔ دربار بنو امیہ کے متعلق تھا۔ وہ ۷۲ سال کی عمر میں ۱۲۴ ہجری میں فوت ہوا۔ اس کے قول کے مطابق احادیث کو قلمبند کرنے کا رواج پہلی صدی ہجری کے اخیر میں ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ الزہری اور اس کے آقا عروا ابن الزبیر نے رسول اللہ کے واقعات پر باقاعدہ کتابیں لکھیں۔ اگرچہ ایسا نہ بھی ہو تاہم اتنا ضرور ہے۔ کہ انہوں نے ایک موضوع واقعہ یا جنگ کے ماتحت جتنی احادیث مل سکیں۔ سب کو جمع کیا۔ نبی کریم کے ہر دور کے متعلق الگ الگ مواد اکٹھا کیا۔ اور مغازی کو اس میں نمایاں جگہ دی گئی۔ اس کا طرز تحریر محققانہ اور بے لوث معلوم ہوتا ہے۔ الزہری کی کتاب اس وقت مستقل شکل میں موجود نہیں۔ مگر بعد میں آنے والے مصنفین نے اس کے بہت سے حوالے دیئے ہیں۔ اور جو حالات غزووں کے متعلق انہوں نے لکھے ہیں۔ ان کا بیشتر حصہ غالباً ایسا ہے جو الزہری کی کتاب پر مبنی ہے۔ یعنی انہوں نے الزہری کے جمع کردہ مواد سے فائدہ اٹھایا۔ گویا الزہری کی محنت کا پھل ان کو حاصل ہوا۔

کہا جاتا ہے۔ کہ دوسری صدی ہجری میں دو اور مصنفین نے بھی سیرت رسول اللہ پر کتابیں لکھیں۔ موسیٰ بن عقبیٰ (متوفی ۱۴۱ھ) جس نے کتاب مغازی لکھی۔ اور ابو معشر ان دونوں میں سے کسی کی کتاب بھی اب دنیا میں موجود نہیں مگر ابو معشر کی سند الزہری نے اپنی تحریر میں اکثر دی ہے۔

ابن اسحاق (متوفی ۱۸۸ھ) نے سیرت رسول اللہ لکھی۔ مگر یہ بھی اپنے اصلی حالات میں ہم تک نہیں پہونچ سکی۔ المدائنی تیسری صدی ہجری کی ابتدا تک زندہ رہا۔ اس نے رسول خدا کے متعلق کئی کتابیں تحریر کیں۔ مگر ان میں سے ایک بھی زمانہ کی دستبرد سے نہیں بچ سکی۔ ابن اسحاق ۱۸۸ھ = ۷۶۸ء میں خلیفہ منصور کے عہد میں فوت ہوا۔ اس کے بعد ایک اور مصنف ابن ہشام وجود میں آیا۔ ۲۱۳ھ یا ۲۱۸ھ دونوں میں سے کسی ایک سال فوت ہوا ہے۔ اس نے ابن اسحاق کی کتاب سے وہ حصہ لیا۔ جو رسول اللہ کی زندگی کے متعلق ہے۔ اس پر اپنی طرف سے اضافہ کیا۔ گویا ایک نئی کتاب لکھ دی۔ اس کا نام سیرت رسول اللہ رکھا۔ ابن اسحاق کی اصل کتاب تو ناپید ہے یہی ابن ہشام کی کتاب کی کتاب سیرت رسول اللہ ہمارے پاس موجود ہے۔ اس کتاب کی وقعت اور اہمیت بے اندازہ ہے۔ ابن ہشام اپنے علم و فضل کے لئے مشہور تھا صرف و نحو و نساب میں بڑا عالم تھا۔ اس نے شعر اور نسب پر کتابیں لکھی ہیں۔ اگرچہ وہ قدیم قاہرہ کا رہنے والا تھا۔ مگر اس کا خاندان بصرہ سے یہاں آکر آباد ہوا تھا۔

ابن اسحاق دو ہیں۔ ایک وہ جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے جو ۱۸۸ھ میں فوت ہوا۔ ایک اور محمد ابن اسحاق ہے جو ۱۵۱ھ (۷۷۰ء) یعنی بنی امیہ کے تخت خلافت خالی کرنے کے بیس سال بعد فوت ہوا۔ اس کی تاریخ موجود ہے۔ اور کافی مبسوط بھی ہے۔ اس کتاب کو شاہی خاندان امیہ کے لئے خاص طور پر لکھا گیا تھا۔ اور بعض کے نکتۂ خیال سے اس میں کچھ حالات یکطرفہ ہیں۔ مگر کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ محمد ابن اسحاق بہت چھان بین کرنے کے بعد لکھتا تھا۔

بعد میں آنے والے مصنفین نے اکثر اس کے حوالے دیئے ہیں

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ نبی کریم نے ۶۲۲ء میں ہجرت کی۔ اور اس سے اسلامی سال ہجری کا آغاز ہوا۔ ۶۳۲ء میں آنحضرت کی وفات ہوئی۔ اس کے بعد چار خلیفے رسول اکرم کے جانشین ہوئے۔ جو خلفائے راشدہ کہلاتے ہیں۔ ابو بکرؓ۔ عمرؓ۔ عثمانؓ۔ علیؓ۔ ان کا زمانہ ۶۳۲ء سے ۶۶۱ء تک تھا۔ بنی امیہ نے ۶۶۱ میں اسلامی ممالک کی عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ ان کا دارالسلطنت دمشق تھا خلافت راشدہ کے زمانہ میں اسلامی مدینۃ النبی یعنی یثرب اسلامی سلطنت کا دارالحکومت تھا۔ زمانے نے کروٹ بدلی۔ اور ۷۵۰ء میں بنو عباس اسلامی دنیا کے حکمران قرار پائے۔ دنیا میں قیام و دوام فقط خدا کے نام کو ہے۔ ہلاکو خان مغل نے ۱۲۵۸ء میں بغداد شہر کو فتح کیا۔ اور اینٹ سے اینٹ بجادی۔ حکمران عباسی خاندان کو نیست و نابود کرنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔

اسلام کی ذہنی ترقی کا بہترین زمانہ بنو عباس کے پہلے سو سال ہیں یعنی ۷۵۰ء سے لیکر ۸۴۷ء تک۔ جو تقریباً سو سال ہوا۔ اس زمانے میں سفاح۔ منصور۔ مہدی۔ ہادی۔ الرشید۔ امین۔ مامون۔ معتصم۔ واثق سریر آرائے سلطنت ہوئے۔ ۸۴۷ء میں متوکل نے عنان حکومت ہاتھ میں لی۔ تو زمانے کی ذہانت اور سماج کی فضیلت نے اپنے اظہار کے اور طریقے اختیار کر لئے۔ گویا اس کے بعد سے علمی انحطاط شروع ہو گیا۔ ہلاکو مغل (۱۲۵۸) نے نہ صرف عباسی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ بلکہ یہ کہ اسلامی دنیا کا نقشہ بدل دیا۔ اسلامی ملک میں الگ الگ حکومتیں قائم ہو گئیں۔ شیرازہ بکھر گیا۔ تنظیم جاتی رہی۔ عربی زبان جو اس سے قبل تمام اسلامی حلقے میں علم و فضل اور مذہب کی زبان تھی۔ اب صرف مذہب تک محدود رہ گئی۔ اور مختلف اقوام نے اپنی اپنی مادری زبان میں ادبیات پیدا کرنا شروع کر دیا۔

تو آؤ اب ذرا ہم ان سنین کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسلامی علم التواریخ پر طائرانہ نظر ڈالیں۔ اور دیکھیں کہ اس میں تدریجاً ترقی کس طرح سے ہوئی۔

بنی امیہ کے تمام ادبیات میں سے غیر اسلامی عنصر کی بو آتی ہے۔ منظومات کا بھی یہی حال ہے۔ اور تاریخ کا بھی۔ دربار دمشق شاعروں کی قدر دانی کرتا تھا۔ مگر قابل افسوس یہ بات ہے۔ کہ اس عہد کی بہت ہی کتابیں ہم تک پہونچی ہیں جن سے صحیح ذہنی ترقی کا اندازہ لگایا جا سکے۔

ایک یمن کا رہنے والا عبید بن شریا تھا۔ وہ پرانی روایات کو نئے سانچے میں ڈھالتا اور لوگوں کے سامنے ایسی شکل میں پیش کرتا۔ کہ وہ معقول ہوں۔ ایک اور یمینی وہب بن منبہ ایرانی تھا جس نے "اوائل" (یعنی ابتدائی حالات پر بہت کچھ روشنی ڈالی ہے۔ مسلمان تاریخ نویس ان واقعات کا اپنی تاریخوں کی ابتدا میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ اسلامی مذہبی لڑائیوں (مغازی) کا چرچا اسلامی سماج میں بہت تھا ہشام ابن الکلبی کا ذکر ہو چکا ہے۔ کہ اس نے جاہلیہ کی روایات کو قلمبند کیا۔

محمد ابن عمر الواقدی کا تعلق تمام عمر خاندان عباسی سے رہا۔ خلفا کی اس پر نگاہ کرم بھی رہی۔ کچھ عرصہ وہ دربار خلافت میں رہا۔ بعد میں وہ بغداد کا قاضی بنا دیا گیا۔ المامون اس کا بہت احترام کرتا تھا۔ اس کی تحریر کا اندازہ

کرتے ہوئے ہمیں ہمیشہ یہ پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ کہ عباسی اثر اس پر غالب ہے۔ اس کے استقصا کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ آغاز اسلام کی تاریخ پر بھی اس نے قلم اٹھایا ہے۔ جو روایات اس کی وساطت سے پہونچی ہیں۔ ان سب کو قوی نہیں سمجھا جاتا بعض تو نمایاں طور پر کمزور دکھائی دیتی ہیں۔ اس کی تصنیفات میں سے اکثر ضائع ہو چکی ہیں :

دوسری صدی ہجری میں حشام سب سے مشہور نساب تھا۔ مگر بعض کو اس کے خیالات سے بھی اختلاف ہے۔ معمر بن المثنیٰ متوفی ۲۰۹ ہجری (۸۲۱ء) نے دو سو کے قریب کتابیں شائع کیں جن میں سے اکثر تاریخ کے متعلق تھیں۔ ان میں سے تاریخ مکہ اور تاریخ مدینہ بھی ہے۔ بیشتر کتب جنگوں کے متعلق ہیں وہ ایران کے ایک یہودی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اگرچہ عربوں کے فتوحات کا تذکرہ اس نے بڑے ذوق و شوق کے ساتھ کیا ہے۔ لیکن یہ لکھنے سے بھی باز نہ رہ سکا۔ کہ عربوں کو اپنے سے نفرت ہے۔ اس طرح سے لوگ اس سے متنفر ہو گئے۔ اس کا

واقدی | محمد واقدی متوفی ۲۰۷ ہجری بہت ہر دلعزیز مصنف تھا۔ ۱۳۰ھ میں مدینہ میں پیدا ہوا۔ مشرق میں اس کی شہرت اب تک قائم ہے۔ علمی کاروبار میں اس کی محنت قابل داد ہے وہ اتنی کتابوں کا مصنف ہے کہ اعتبار نہیں آتا۔ دو غلام اس کام پر مامور تھے کہ اس کی کتابوں کی نقل کرتے رہیں۔ اس کی تصانیف اتنی ہیں کہ اس سے ۶۰۰ صندوق بھر جاتے ہیں۔ اور ہر صندوق کو دو آدمی اٹھاتے۔ اس کی شہرۂ آفاق تصنیف کتاب المغازی فتوحات اسلامی کے متعلق ہے۔ اور حقیقتاً بہت بلند پایہ تصنیف ہے۔

ابن سعد | ابن سعد (متوفی ۸۴۴ء) کی تاریخ کا نام طبقات الکبیر ابن سعد نے اپنی کتاب میں نبی کریم کے صحابہ کا ذکر کیا ہے۔ ان کے درجات پر بحث کی ہے۔ اور تابعین کا تذکرہ کیا ہے حدیث کی کتابوں کا ذکر ہم یہاں نہیں کر رہے ہیں۔ نہ ہی حدیث کے علما کو اس مضمون میں شامل کیا گیا ہے۔ چونکہ یہ مقالہ علم التواریخ کے متعلق ہے۔

بلاذری | احمد بن یحییٰ البلاذری (متوفی ۸۹۲ء) ایرانی النسل تھا اس نے اپنی کتاب "فتوح البلدان" میں اسلامی فتوحات پر بحث کی ہے۔ اور یہ دکھایا ہے۔ کہ اسلامی سلطنت کس طرح سے پھیلی۔ ڈی گائبے نے اس کے متن کا مقابلہ کر کے یورپ میں اس کو شائع کیا ہے۔ اس کی ایک اور تصنیف "کتاب انساب الاشراف" ہے۔ جس کی دو جلدیں موجود ہیں۔

دینوری | ابو حنیفہ احمد الدینوری (متوفی ۸۹۵ء) بھی ایرانی النسل تھا۔ اس نے اپنی کتاب الاخبار الطوال ایرانی نقطۂ نگاہ سے لکھی ہے۔ اور اس میں ایرانی قومی روایات درج ہیں

یعقوبی | ابن واضح الیعقوبی عقائد کے لحاظ سے خاندان علیؓ کی طرف میلان طبع رکھتا تھا۔ اس کی تاریخ تمام دنیا پر حاوی ہے۔ اور اس لئے زیادہ وقیع ہو گئی ہے۔ کہ ابتدائی اور صحیح شیعہ روایات کو اس نے قلمبند کیا ہے۔ اس کی تصنیف کو پروفیسر ہوتسما (                    ) تنقید اور مقابلے کے بعد لیڈن سے (۱۸۸۳ء) میں شائع کیا ہے۔ (باقی آئندہ)

ڈاکٹر (دائرہ)

(نوٹ) محقق مضمون چھاپتا ہے۔ جو معیار ادب پر پورے اتریں۔ جو مضمون بھیجے جائیں۔ وہ کاغذ کی صرف ایک طرف لکھے ہوئے ہوں۔ اور کاغذ فلسکیپ سائز کا ہو۔

# غزل

از مصور جذبات حضرت سید ضیا جعفری صدر دائرہ ادبیہ

جو غم میں جاں سے گذر جائیں ہم غنیمت ہے | رہیں جو عشق میں ثابت قدم غنیمت ہے
کرم نہیں نہ سہی یہ ستم غنیمت ہے | ہم ان کو یاد تو آئیں کیا یہ کم غنیمت ہے
کشاکش غم ہستی سے بے نیاز کیا | بھلا ہو عشق کا تیرے یہ غم غنیمت ہے
کسی کی زلف سے وابستہ خیال تو ہوں | جو صبح وصل نہیں شام غم غنیمت ہے
نفس کی آمد و شد کا کچھ اعتبار نہیں | جو تیری یاد میں گذرے وہ دم غنیمت ہے
چمن چمن ہی میرا گھر تمہارے آنے سے | مجھے یہ جنت نقش قدم غنیمت ہے
شراب وصل نہیں زہر غم سہی ساقی | یہ تلخی شب غم ہے تو کم غنیمت ہے
حرم کو جاتے ہوئے تھک کے بیٹھنے والے | ملے جو راہ میں بیت الصنم غنیمت ہے
جہاں نما ہے جو ساغر خدا نما ساقی | یہ میکدہ ہمیں یہ جام جم غنیمت ہے
کسی کے عکس جبیں ہیں روشناس آنکھیں | یہ اجر گریہ ہمیں چشم نم غنیمت ہے
کچھ ایسی نیند میں سوئے ہیں جاگنے والے | شب فراق یہ خواب عدم غنیمت ہے
متاع درد کو سود و زیاں سے کیا مطلب | جو اس دکاں سے ملے بیش و کم غنیمت ہے
زمانہ تفرقہ پرداز آسمان دشمن | یہ چند روز جو گذریں بہم غنیمت ہے
تمہارے دم سے ہے رونق بہار معنی کی | ضیا یہ کلک جواہر رقم غنیمت ہے

# ہندوستان کی قومی زبان

اجلاس عباسیہ لٹریری لیگ بہاولپور منجانب حفیظ ہوشیارپوری ایم۔اے اسسٹنٹ سکرٹری انجمن اردو پنجاب

یہ مقالہ ۲۵ فروری کے جلسہ میں صادق ایجرٹن کالج بہاولپور کے ہال میں پڑھا گیا۔

---

ہندوستان ایک وسیع جزیرہ نما کی مانند ہے جہاں بھانت بھانت کی بولیاں بولی جاتی ہیں۔ اور ایسے ملک میں جہاں نسل اور مذہب کے اعتبار سے مختلف قسم کی قومیں آباد ہوں ہونا بھی یہی چاہیئے بعض حضرات اس بات کو تعجب سے دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کی ایک مشترکہ زبان کیوں نہیں۔ غالباً ان کے پیش نظر یورپ کے وہ ممالک ہوتے ہیں جن کے مقابلے میں اپنی وسعت کے لحاظ سے ہندوستان بذات خود ایک براعظم کی حیثیت رکھتا ہے۔ یورپ کے ان ممالک میں مشترکہ زبانیں اس لئے موجود ہیں کہ ان میں مختلف نسلوں، قوموں اور مذہبوں کے لوگ اس طرح نہیں رہتے بستے جس طرح ہمارے ہاں دیکھنے میں آتا ہے۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں چلے جایئے، معاشرت میں زمین آسمان کا فرق نظر آئیگا۔

لیکن ان حالات کے باوجود کچھ عرصہ سے یہ کوشش کی جارہی ہے کہ ہندوستان کی ایک مشترکہ قومی زبان قرار دی جائے ارباب سیاست نے اس نازک مسئلے سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ حالانکہ اس کا تعلق سیاسیات کی بہ نسبت لسانیات سے زیادہ ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ صرف نام اور رسم الخط کا جھگڑا ہے۔ یعنی ہندوستان کی قومی زبان کا نام کیا ہونا چاہیئے۔ اور مروجہ رسم الخطوں میں سے کونسا رسم الخط اس کے لئے زیادہ موزوں ثابت ہوگا۔ میں اس مقالہ میں قومی زبان کے مسئلہ کے ان دونوں پہلوؤں پر خالص لسانی نقطۂ نظر سے بحث کروں گا۔

ہندوستان کی قومی زبان کے لئے تین نام تجویز کئے جاچکے ہیں۔ ہندوستانی، ہندی، اردو۔ "ہندوستانی" نام تجویز کرنے والوں کو "اردو" اور "ہندی" سے اس بنا پر اختلاف ہے کہ بعض غلط فہمیوں کی وجہ سے "اردو" مسلمانوں کے ساتھ منسوب ہوچکی ہے اور "ہندی" ہندوؤں کے ساتھ۔ چونکہ قومی زبان کا ہندوستان کی تمام قوموں پر حاوی ہونا لازمی ہے اس لئے اس کا نام "ہندوستانی" ہونا چاہیئے۔ دوسری دلیل وہ یہ پیش کرتے ہیں کہ ملک کی زبان کا نام اس ملک کے نام کی نسبت سے ہوتا ہے مثلاً انگلستان کی زبان "انگریزی" فرانس کی "فرانسیسی" جاپان کی "جاپانی" اور چین کی "چینی" کہلاتی ہے۔ اس لئے ہندوستان کی قومی زبان کے لئے بھی "ہندوستانی" کا نام زیادہ قرین قیاس اور مصلحت آمیز معلوم ہوتا ہے۔

بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ یہ ملکی نسبت لفظ "ہندی" میں پہلے ہی سے موجود ہے۔ اس لئے اپنی قومی زبان کے لئے ہندی کی بجائے "ہندوستانی" کا نام انتخاب کرنا بے معنی ہے لیکن اگر ہندی کے لفظ پر اصرار کرنے والوں کے دل و دماغ کو ٹٹولا جائے تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح آشکار ہوجائے گی کہ ان کے ذہن میں لفظ "ہندی" کی یائے نسبتی کا تعلق "ہندوستان"

کی بہ نسبت "ہندو" سے زیادہ ہے۔ اور یہی بات لفظ "ہندی" کی مخالفت کی وجہ ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں اردو بولنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ بعض علاقوں میں جس زبان کو ہندی کہا جاتا ہے اصل میں وہ بھی اردو ہی ہے کیونکہ بولنے میں چنداں فرق نہیں۔ لکھنے میں اگر اسی زبان کو ہندی رسم الخط کا جامہ پہنا دیا جائے تو ہندی بن جائے گی اور اگر فارسی رسم الخط میں ملبوس کر دیا جائے تو اردو کہلائے گی جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ اختلاف صرف رسم الخط کا ہے لفظ "ہندی" کے ساتھ چونکہ فرقہ پرستی کے خیالات کے وابستہ ہونے کا احتمال ہے۔ اس لئے ہماری قومی زبان کے لئے یہ نام غیر موزوں اور خلاف مصلحت ہے۔

لفظ "ہندوستانی" اس لئے موزوں نہیں کہ یہ اس خاص زبان کا نام بن چکا ہے۔ جو انگریز لوگ بولتے ہیں مثلاً "ہم وہاں جانا مانگتا ہے"۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی زبان نہیں انگریز اپنے ہندوستانی ماتحتوں اور نوکروں سے اسی لنگڑی لولی زبان میں گفتگو فرماتے ہیں۔ پادری لوگوں کا ذریعۂ اشاعت بھی یہی عجیب و غریب زبان ہے اور اس کو "ہندوستانی" بولتے ہیں اگر ہم غلاموں نے بھی ان "آقاؤں" کی پیروی میں قومی زبان کا نام ہندوستانی رکھ لیا تو اس بات کا اندیشہ ہے کہ ہماری آئندہ نسلیں یہی زبان نہ بولنے لگ جائیں۔ نام کا اثر زبان پر بہت پڑتا ہے۔ اور یہ اثر اب بھی کہیں کہیں نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ پڑھے لکھے نوجوان بھی اس سے بچ نہیں سکے۔ میں نے اکثر دوستوں کو "کھانے" اور "پینے" کی بجائے "لینے" کا استعمال کرتے سنا ہے۔ مثلاً "میں چائے کی صرف ایک پیالی لیتا ہوں" یعنی "I take only one cup of tea." حالانکہ کھانے پینے اور لینے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

اب لفظ "اردو" کو لیجئے۔ صرف یہی ایک نام ہے جس سے فرقہ پرستی کی بو نہیں آتی۔ کیونکہ یہ ہندوستان کی مختلف قوموں کے تمدن کے ملاپ کی یادگار ہے اور اس زبان کو ترقی دینے میں ہندو اور مسلمان دونوں برابر کے شریک ہیں۔ جہاں میر و غالب حالی و آزاد، اکبر و اقبال وغیرہ کی نگرانی میں یہ زبان پروان چڑھی وہاں رتن ناتھ سرشار، پنڈت چکبست، منشی پریم چند، علامہ برجموہن کیفی اور دیگر بے شمار ہندو حضرات نے بھی خون جگر سے اس کی پرورش کی۔

زبان کے نام کے بعد سب سے ضروری مسئلہ رسم الخط کا ہے چونکہ ہندوستان میں بہت سے رسم الخط موجود ہیں اس لئے ہمیں یہ فیصلہ کر لینا چاہیئے کہ کونسا رسم الخط اختیار کریں۔ اس کے متعلق تین تجویزیں ہیں۔ (۱) فارسی رسم الخط (۲) انگریزی رسم الخط اور (۳) رومن رسم الخط۔ ان تینوں کے حق میں اور ان کے خلاف دلائل موجود ہیں اور اب ہندوستان کی قومی زبان کا سوال سمٹ کر انہیں دلائل تک محدود ہو گیا ہے۔

فارسی رسم الخط میں بہت سی خامیاں ثابت کی جاتی ہیں اور اس بات کے تسلیم کرنے میں مجھے کوئی باک نہیں کہ وہ کسی حد تک درست ہیں لیکن ان خامیوں پر فتح پانے کی کوشش کرنے کی بجائے کوئی اور رسم الخط اختیار کر لینا ان حضرات کے اعتراف عجز و شکست کی دلیل ہے جو انگریزی اور رومن انداز تحریر کو فارسی طرز تحریر پر ترجیح دیتے ہیں۔ ہماری تمام مساعی اس بات پر مرکوز ہو جانی چاہئیں کہ فارسی رسم الخط میں کمزوریاں نظر آتی ہیں اور انہیں دور یا حتی الوسع کم کر دیا جائے۔

اردو کے موجودہ رسم الخط میں یہ نقائص بیان کئے جاتے ہیں

(۱) اس میں اعراب یا حرکات و سکنات کا خاطر خواہ انتظام نہیں۔ بعض الفاظ لکھے اور طرح جاتے ہیں اور پڑھے اور طرح۔ یہ اعتراض اب تک میری سمجھ میں نہیں آیا۔ معترضین کا یہ خیال کہ فارسی رسم الخط میں اعراب کا خاطر خواہ انتظام نہیں سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ اعراب سب موجود ہیں صرف ان کا استعمال کیا جانا چاہئے۔ عام طور پر اس خامی کی ایک نہایت ہی مضحکہ خیز مثال پیش کی جاتی ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ لفظ "ان" میں جب تک "زبر، زیر، پیش" وغیرہ نہ لگائے جائیں پڑھنے والوں کو یہ معلوم نہیں ہوسکتا کہ لفظ "اَن" ہے یا "اِن" ہے یا "اُن"۔ ان بھلے مانسوں سے کوئی پوچھے کہ جب آپ اس بات کے قائل ہیں کہ "زبر، زیر اور پیش" کی علامتیں موجود ہیں تو کون کہتا ہے کہ انہیں اپنے اپنے محل پر استعمال نہ کیا جائے۔ اگر وہ اس قدر ہی سبتدی واقع ہوئے ہیں کہ عبارت کے سیاق و سباق کی مدد سے اَن اِن یا اُن کا تعین نہیں کر سکتے تو یہ رسم الخط کا قصور نہیں بلکہ ان کی سمجھ کا۔ اس بات کا علاج صرف یہ ہو سکتا ہے کہ کاتب حضرات کو اس قسم کی ہدایات کر دی جایا کریں کہ ہر معمولی سے معمولی لفظ پر بھی حرکات کی علامات باقاعدگی کے ساتھ لگایا کریں۔

مجھے اس بات پر کوئی اعتراض نہیں کہ موجودہ ضروریات کے مطابق چند نئے اعراب کا اضافہ کر دیا جائے کیونکہ اس وقت دیگر غیر ملکی زبانوں خصوصاً انگریزی کے بہت سے الفاظ اردو میں شامل ہو رہے ہیں جس کی وجہ سے یہ ضرورت بڑی شدت کے ساتھ محسوس کی جا رہی ہے۔ حیدرآباد والوں نے جو اردو کے ابتدائی قاعدے اور کتابیں شائع کی ہیں ان میں نئے اعراب کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔ افسوس کہ وقت وہ میرے پیش نظر نہیں۔ بہرحال ان کا یہ اقدام بہت مبارک ہے۔

(۲) دوسرا اعتراض دراصل پہلے اعتراض کا ایک جزو ہے اور وہ یہ ہے کہ بعض الفاظ میں جو حروف لکھے جاتے ہیں وہ بولے نہیں جاتے۔ اب تک معترضین اس خامی کی صرف ایک مثال پیش کر سکے ہیں اور وہ بھی صرف فارسی زبان سے۔ یہ واو معدولہ جیسے ان الفاظ میں۔ خود۔ خوش۔ خویش۔ خوار۔ حالانکہ موجودہ زمانے کی سب سے زیادہ متمدن زبان انگریزی ان بے قاعدگیوں سے بھری پڑی ہے۔ اگر اردو میں ایک واو معدولہ موجود ہے تو انگریزی سے بیسیوں مثالیں ایسے الفاظ کی پیش کی جا سکتی ہیں جن میں "سائلنٹ" حروف ہوتے ہیں۔ مثلاً ہم پڑھتے تو ہیں "سائیکالوجی" لیکن لکھتے ہیں "پسائی کیالوگی" PSYCHOLOGY! اسی طرح ہم پڑھتے تو ہیں "سٹل" لیکن لکھتے ہیں "سب ٹل" ! SUBTLE یہ حقیقت بھی آپ سے پوشیدہ نہیں ہو گی کہ اہل امریکہ نے ایسے الفاظ میں سے "بے کار" یا سائلنٹ حروف کو خارج کرنا شروع کر دیا ہے۔ مثلاً اب وہ COLOUR کی بجائے COLOR لکھتے ہیں۔

مختصر یہ کہ معترض حضرات کا یہ اعتراض کوئی اہمیت نہیں رکھتا اول تو وہ اس کی صرف ایک مثال پیش کر سکتے ہیں۔ حالانکہ یہاں بھی ایک علامت سیدھی لکیر کی شکل میں واؤ کے نیچے موجود ہوتی ہے جو یہ ظاہر کرتی ہے کہ اس لفظ میں واو بولی نہیں جاتی۔ اگر پڑھنے والے کو اس بات کا علم ہو تو وہ کبھی اس میں غلطی نہیں کرے گا کیونکہ اردو کی پہلی کتاب بلکہ قاعدے ہی میں اس بات کی تشریح کر دی جاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اور زبانوں میں بھی اس قسم کی بے قاعدگیاں کثرت کے ساتھ موجود ہیں۔

ذاتی طور پر میرا یہ خیال ہے کہ واو معدولہ کو اگر بالکل اڑا بھی

دیا جائے تو کوئی ہرج نہیں کیونکہ فارسی رسم الخط پہلے ہی مختصر نویسی کے لحاظ سے بہت ممتاز ہے۔ اس لئے اگر واو معدولہ کو لکھنے میں بھی حذف کر دیا جائے تو بات اس طرز تحریر کے بنیادی اصول کے عین مطابق ہوگی۔ اس میں کوئی بڑی بات نہیں کہ آئندہ "خود"۔ "خوش"۔ "خویش" اور "خوار" کی بجائے "خد"۔ "خش"۔ "خیش"۔ اور "خار" لکھا جائے۔ "خار" پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ "کانٹا" کے معنوں میں یہ لفظ پہلے ہی موجود ہے۔ جس کی وجہ سے معنی میں تمیز کرنا مشکل ہو جائے گا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہر زبان میں ذو معنی اور مترادف الفاظ ہوتے ہیں۔ اور خود اردو اور فارسی میں ایسے بے شمار لفظ ہیں۔

(۳) تیسرا اعتراض یہ ہے کہ فارسی رسم الخط میں حروف کو جوڑتے وقت ان کی شکلیں بدلتی رہتی ہیں اور اس طرح حروف تہجی کی تعداد بہت بڑھ جاتی ہے جس کی وجہ سے مبتدی کو ان کی شناخت میں بہت تکلیف ہوتی ہے۔ کیونکہ ایک ہی حرف کی شکل لفظ کے شروع میں اور ہوتی ہے، درمیان میں کچھ اور بن جاتی ہے۔ اور اخیر میں کچھ اور۔ مثلاً عین کو لیجئے ان الفاظ میں اس کی تین مختلف شکلیں نظر آتی ہیں۔ "علم"۔ "بعد"۔ "شروع"۔

یہ اعتراض اس لحاظ سے بہت دلچسپ ہے کہ فارسی رسم الخط کے حق میں بھی اسے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس طرز تحریر کی مختصر نویسی کی خصوصیت کے متعلق میں پہلے بھی اشارہ کر چکا ہوں یہ خصوصیت اور کہیں نظر نہیں آتی۔ اس سے وقت بھی کم خرچ ہوتا ہے اور کاغذ بھی۔ باقی رہا یہ سوال کہ بچوں کو پڑھنے میں دقت ہوتی ہے اور وہ ایک ہی حرف کی مختلف شکلوں میں آسانی سے تمیز نہیں کر سکتے، تو اس کے جواب میں صرف یہ کہہ دینا کافی ہوگا کہ اس دقت کے باوجود لوگ ہمیشہ اردو پڑھتے رہے ہیں اور پڑھ رہے ہیں، آخر ہر زبان سیکھنے سے آیا کرتی ہے۔

(۴) چوتھا اعتراض یہ ہے کہ اس رسم الخط کی وجہ سے کتابیں چھاپنے کا طریقہ بہت طول ہے۔ پہلے کاتب صاحب لکھتے ہیں۔ اور جہاں جی چاہے اپنی طرف سے تصرف بھی کر جاتے ہیں۔ پھر کاپی آتی ہے اور کاتب صاحب کو ان کے ناجائز تصرفات سے آگاہ کیا جاتا ہے۔ کاپی درست ہو کر پریس کے سپرد ہوتی ہے۔ وہاں سے پروف آتا ہے جس میں کچھ حروف تو پتھر سے خود اڑ جاتے ہیں اور کچھ سنگساز صاحب کے نوک قلم کی بدولت کچھ سے کچھ بن جاتے ہیں۔ پروف درست ہونے کے بعد پھر پریس میں جاتا ہے۔ تب کہیں جا کر اصلی حالت میں چھپنے کی نوبت آتی ہے۔ لیکن اس کے بعد بھی یہ خطرہ رہتا ہے کہ کسی جگہ سے کوئی چیز یونہی اڑ گیا ہو۔

یہ اعتراض کسی حد تک معقول ہے اور اس کا علاج صرف یہی ہے کہ حروف کا ٹائپ بنایا جائے۔ ٹائپ بنانے میں پھر وہی مشکل پیش آتی ہے کہ ایک ایک حرف کی کئی کئی شکلیں بنانی پڑتی ہیں۔ مصری ٹائپ پہلے سے ہی موجود ہے لیکن چونکہ ہماری آنکھیں لیتھو کی چھپائی کی عادی ہو چکی ہیں اس لئے مصری ٹائپ میں وہ خوبصورتی نظر نہیں آتی جو کاتب حضرات کی چابکدستی کی مرہون منت ہوتی ہے۔ حیدرآباد والوں نے ایک نئی قسم کا ٹائپ ایجاد کر لیا ہے لیکن اس میں بھی ابھی بہت سی ترمیموں کی ضرورت ہے۔ اور مقامات پر بھی کوششیں ہو رہی ہیں۔ غرض اس وقت ہمیں اردو حروف تہجی کے ایسے مکمل ٹائپ کی ضرورت ہے جو تمام لسانی ضروریات کو پورا کرے۔

لیکن اس بات کا فیصلہ کر لینے کے بعد کہ لیتھو کی چھپائی وقت ضائع ہونے اور اخراجات کی زیادتی کی وجہ سے ترک کر دینی چاہیئے ہمیں مجوزہ نیو ٹائپ میں اس خوبصورتی دائروں کے تناسب اور حروف کی نوک پلک سے بالکل مایوس ہو جانا چاہیئے جو فن کتابت کی بدولت فارسی رسم الخط کا سرمایہ ناز بن چکے ہیں۔ مسلمانوں کے ہاں کتابت بھی دیگر فنون لطیفہ کی طرح ایک باقاعدہ فن کی حیثیت رکھتا تھا اور اس میں استادان فن نے وہ کمال دکھائے جن کی نظیر نہیں۔ چھوٹی چھوٹی تقطیع میں زیادہ سے زیادہ متن کو اس طرح سمونا کہ خوبصورتی بھی قائم رہے اور آسانی سے پڑھا بھی جا سکے۔ فن کتابت کا ہی کمال ہے۔

اردو ٹائپ کے ساتھ رائٹر مشین کا سوال بھی وابستہ ہے۔ ٹائپ رائیٹر بن چکا ہے اور بعض جگہ استعمال بھی کیا جا رہا ہے لیکن اس میں بھی یہ خامی ہے کہ حروف کی مختلف شکلیں ہونے کی وجہ سے ان کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے جس کی وجہ سے ٹائپسٹ اردو ٹائپ رائیٹر پر اس آسانی اور سرعت سے کام نہیں کر سکتا جس طرح انگریزی ٹائپ رائٹر پر۔ اس کے علاوہ اس ٹائپ رائٹر میں اعراب یعنی "زیر" "زبر" اور "پیش" کا کوئی انتظام نہیں۔

مندرجہ بالا نقائص کو دور کرنے کے لئے بعض حضرات نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ فارسی رسم الخط میں حروف کے ملانے کا وہی طریقہ اختیار کیا جائے جو انگریزی یا ہندی میں ہے یعنی سب حروف الگ الگ لکھے جائیں۔ اس طریقہ کے جواز میں وہ یہ ثبوت پیش کرتے ہیں کہ فارسی میں پہلے ہی بے شمار ایسے الفاظ موجود ہیں جن میں سب حروف علیحدہ علیحدہ لکھے جاتے ہیں۔ مثلاً "زور" "درد" "دورہ" "زردار" "روزن" وغیرہ تو پھر کیوں نہ تمام الفاظ اسی طریقہ پر لکھنے شروع کر دیئے جائیں۔

بظاہر یہ طریقہ بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اور اسے تجویز کرنیوالے حضرات کی جدت پسندی کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا لیکن وہی مختصر نویسی کی خصوصیت تباہ ہو جائیگی۔ اس لئے اس تجویز کو قبول کرنے کی بجائے ہمیں موجودہ ٹائپ رائٹر کی خامیاں دور کرنے کا کوئی اور طریقہ سوچنا چاہیئے یہ کام ایک دو دن کا نہیں بلکہ ہزاروں دماغوں اور برسوں کی محنت کا۔

فارسی رسم الخط رسم الخط کی بحث ختم ہو چکی اب ناگری کو لیجئے جو حضرات ہندوستان میں ناگری رسم الخط کو عام کرنا چاہتے ہیں وہ اس کے حق میں صرف ایک دلیل پیش کر سکتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ چھپائی کی سہولتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ناگری رسم الخط فارسی تحریر کی بہ نسبت بہتر ہے کیونکہ اس میں بھی انگریزی کی طرح حروف کی اصلی شکل وصورت قائم رہتی ہے جس کی وجہ سے یہ رسم الخط آسانی سے سیکھا جا سکتا ہے۔ اور اس کا ٹائپ بھی موجود ہے:۔

لیکن اس ایک خوبی کے مقابلے میں ہندی رسم الخط میں بے شمار خامیاں ہیں۔ جنہیں خود ہندی والے دور کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے ہندی سے کچھ واقفیت نہیں لیکن ہندی جاننے والے احباب سے جہاں تک معلوم ہو سکا ہے اس کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ ناگری رسم الخط بھی تشنۂ تکمیل ہے۔ گذشتہ نومبر میں "بھارتیہ ساہتیہ پرشد" کے آنریری سکرٹری کاکا کالیلکر جی لاہور تشریف لائے ہوئے تھے۔ انہوں نے بھی اپنے پبلک لکچروں اور پرائیوٹ گفتگو کے دوران میں یہی کہا کہ ہندی کے طرز تحریر میں بہت نقص ہیں جنہیں ہم دور یا کم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

مختلف ذرائع سے ہندی رسم الخط کی جو خامیاں مجھے

معلوم ہو سکی ہیں وہ یہ ہیں۔

(۱) بعض حروف کی کئی مختلف شکلیں ہوتی ہیں (یہی اعتراض فارسی رسم الخط پر بھی کیا جاتا ہے جس کی تشریح میں کر چکا ہوں)

(۲) بعض الفاظ لکھے اور طرح جاتے ہیں لیکن ان کے پڑھنے کا طریقہ اور ہوتا ہے گویا SPELLING اور PRONOUNciation میں کوئی مطابقت نہیں ہوتی۔ مثلاً ایک لفظ ہے मि یہ "MI" پڑھا جاتا ہے حالانکہ IM لکھا جاتا ہے۔

(۳) ماترا یعنی اعراب کی پوزیشن اور معنی SIGNIFICANCE میں یکسانیت نہیں۔ کبھی ماترا حروف کے اوپر آتی ہے کبھی نیچے اور کبھی پیٹ میں۔ اس بے قاعدگی کی وجہ سے ہندی ٹائپ میں دو خامیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ اول یہ کہ ہندی ٹائپ ایک مقررہ حد سے زیادہ باریک نہیں بنایا جا سکتا۔ دوسرے کمپوز کرنے میں کمپازیٹر کا بہت وقت ضائع ہوتا ہے کیونکہ اعراب کی بے ترتیبی اور بے قاعدگی کی وجہ سے حروف کے نیچے یا اوپر خالی جگہوں میں SPACES ڈالنے کی ضرورت پڑتی ہے جس پر ضرورت سے زیادہ وقت صرف ہو جاتا ہے۔

(۴) انگریزی اور دوسری زبانوں کے لفظ شامل ہو جانے کی وجہ سے نئی آوازوں کے لئے ہندی رسم الخط میں نئے اعراب یا حروف علت کی ضرورت ہے۔ مثلاً انگریزی میں GATE اور GET کی آوازوں میں جو فرق ہے وہ ہندی رسم الخط میں ظاہر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ GATE میں تو ے استعمال ہو سکتا ہے لیکن GET کی آواز ظاہر کرنے کے لئے کوئی حرف علت نہیں۔ اگر GET میں ے زاویہ استعمال کیا جائے تو گیٹ پڑھا جائے گا۔

فارسی رسم الخط کے مقابلے میں ناگری رسم الخط کو بغیر سوچے سمجھے قبول نہیں کر لینا چاہئے کیونکہ اس کی خامیوں کی تعداد اول الذکر کی خامیوں سے بھی زیادہ ہے۔

تیسری تجویز یہ ہے کہ فارسی اور ہندی دونوں رسم الخط ترک کر دیئے جائیں اور رومن طرز تحریر اختیار کر لیا جائے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہو گا کہ بیرونی ممالک کے لوگ ہندوستان کی زبان کو زیادہ آسانی کے ساتھ پڑھ سکیں گے۔ کیونکہ انگریزی تقریباً عالمگیر زبان بن چکی ہے۔ لیکن یہ تجویز مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر ناقابل قبول ہے:

(۱) جس طرح فارسی رسم الخط اور ناگری طرز تحریر میں بے قاعدگیاں ثابت کی گئی ہیں اسی طرح انگریزی میں بھی یہ بہت بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ جس کی مثال لفظ PSYCHOLOGY سے پیش کر چکا ہوں۔

(۲) ہر زبان کے بولنے والوں کا اپنا مخصوص لب و لہجہ ہوتا ہے اور الفاظ کے تلفظ کی بنیاد اسی لب و لہجہ پر ہوتی ہے بعض آوازیں ایک زبان میں تو ادا ہو سکتی ہیں لیکن دوسری زبان میں ادا نہیں کی جا سکتیں۔ مثلاً ع کی آواز یا ص، ث اور س کی آوازوں کا فرق یا اسی طرح ز۔ ذ۔ ض۔ اور ظ کی آوازوں کا فرق انگریزی رسم الخط میں ادا نہیں کیا جا سکتا

(۳) انسان کے دل میں الفاظ کی ساخت اور ترکیب کا ایک خاص تصور ہوتا ہے اور اس کے ساتھ بہت سے ذہنی لوازمات وابستہ ہوتے ہیں جن کی مدد سے انسان سوچتا ہے۔ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے۔ ہمارے ذہن میں اردو کے ذریعہ سے سنسکرت عربی اور فارسی کے الفاظ اس طرح

جاگزین ہو چکے ہیں کہ ہم صفحۂ قرطاس پر انہیں کسی اور صورت میں دیکھنا گوارا نہیں کر سکتے۔ الفاظ کے صحیح تصور کے فنا ہو جانے سے ہمارے خیالات میں بھی اجنبیت پیدا ہو جائے گی۔

(۴) زبان کی تمدنی قدر و قیمت CULTURAL VALUE بہت اہمیت رکھتی ہے۔ زبان اور تمدن کا گہرا تعلق ہے۔ اگر ہندوستانیوں نے رومن طریقہ اختیار کر لیا تو اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ رفتہ رفتہ ہندو اور مسلمان دونو اپنے اپنے تمدن سے بیگانہ اور علیحدہ ہوتے چلے جائیں گے۔

میرے خیال میں ہندوستان کی قومی زبان کا نام اردو ہونا چاہئے۔ اس کا رسم الخط وہی رہے جو اس وقت رائج ہے البتہ لسانی ضروریات کے ماتحت اس میں ضروری تبدیلیاں کی جائیں مثلاً حروف تہجی کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اگر کم کر دی جائے تو اچھا ہے۔ جدت پسند دماغوں کو اس بات کی دعوت دی جائے کہ اردو کے موجودہ ٹائپ اور ٹائپ رائیٹر میں جو خامیاں ہیں انہیں دور کرنے کے ذرائع سوچیں۔

اخیر میں میری استدعا ہے کہ خدا کے لئے زبان کو سیاست اور مذہب کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھنے سے بچائیے، کیونکہ جب سے اردو ہندی جھگڑا شروع ہوا ہے طرفین میں غیر معمولی جوش و خروش کے آثار نظر آتے ہیں۔ کانفرنسیں منعقد ہوتی ہیں۔ ریزولیوشن پاس ہوتے ہیں۔ انجمنیں بنائی جاتی ہیں۔ اور سیاسی رہنماؤں کو زبان و ادب کے میدان کا حریف سمجھ کر قومیت متحدہ کے خیالی ایوان کی اینٹ سے اینٹ بجائی جا رہی ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ اس نازک مسئلہ کو ماہرین سیاست کی خونخوار اور سنگین گرفت سے چھڑایا جائے۔

# فردوس خواب

(۱)

نشاطِ رنگ گھٹائیں تھیں فضاؤں میں
ندی کے ساز سے انداز ترنم مجذوب
سرور زائیاں پیدا ہوئیں ہواؤں میں
شفق کے سایوں کی تاثیر ہو گئی مرطوب
وفورِ شوق سمایا مری وفاؤں میں
نظر کے سامنے آیا تصورِ محبوب
دلِ خراب تھا حسن کی ضیاؤں میں
تخیلات کے انداز ہو گئے مرغوب
سکوں نواز مری کربتِ مہیب ہوئی
مرا حبیب ہوا جلوۂ جمالِ فروش

(۲)

تفکرات تصور بنا رہا تھا میں
جھلک رہا تھا نظاروں میں جلوۂ آرائی
جگر کی آگ کے شعلے دبا رہا تھا میں
بھری ہوئی تھی نگاہوں میں غم کی عشرت بھی
جمیل خواب کی بستی بسا رہا تھا میں
مری نظر میں سمائی ہوئی تھی رعنائی
تعینات کے جھگڑے مٹا رہا تھا میں
دل و نگاہ کی دنیا ہوئی تھی نورانی
نگاہ ڈوب گئی کیف کی گھٹاؤں میں
ہوئے ذرۂ نظارے مسرتوں میں غرقاب

(۳)

مری بہار مرے قلب کے قریب ہوئی
مرے خیال کی آبادیاں ہوئیں گلپوش
مجھے نشاط فشاں زندگی نصیب ہوئی
میں ہو رہا تھا تماشائے خواب میں مدہوش
جنوں کی کیف طرازی بھی کچھ عجیب ہوئی
حیات رنگ ہوئے مردہ آرزو کے نقوش
حقیقتوں کی فضا درد کی طبیب ہوئی
ترانہ ہائے غم و سوز ہو گئے خاموش
کسی فریب کے کہنے سے گا رہا تھا میں
بہارِ رنگِ تصور کی کیف سامانی

وہ خواب عشق کا رنگیں مآل تھا گویا
خیال تھا، تو حقیقت مثال تھا گویا

بہزاد لکھنوی

# مقدس پیار

تارے آسمان پر قطرات اشک کی مانند چمک رہے ہیں، زندگی کا فرشتہ پرواز کے لئے بے قرار ہے.... سعیدہ! سعیدہ!! نسیمہ کو بلاؤ.... یہ بدبخت محمود اپنی ہمیشہ کے لئے جدا ہونے والی زندگی کے روبرو شکریہ کے طور پر ایک آخری سجدہ کر لے.... آہ دیکھو! موت اپنا تاریک بے رحم ہاتھ اس طرف بڑھا رہی ہے.... ہاں صرف آخری دفعہ...."

محمود بستر مرگ پر پڑا تھا، اس کی زندگی دنیا میں اب ایک آخری صورت دیکھ رہی تھی، اس وقت اسے اپنی تمام گذشتہ ناکامیوں کا احساس تھا، اس کی روح ناامید قفس طائر کی طرح صیاد کے پنجوں سے آزاد ہونا چاہتی تھی۔ اس وقت اسے اپنی زندگی کے مایوس لمحات بے چین کر رہے تھے، اس نے اپنی مختصر حیات میں کئی بار دیکھا تھا کہ نسیمہ نے اس پاکیزہ محبت کو ٹھکرا دیا۔ اس کی رنگین آرزوؤں کو ہمیشہ تباہی کی خوفناک آندھیوں کے سپرد کر دیا۔

سعیدہ! کیا نسیمہ مجھ سے نفرت کرتی ہے؟ محمود نے آہستہ سے اپنی بند آنکھیں کھولیں۔ اور ایک لرزتی ہوئی آواز میں بوڑھی سعیدہ سے پوچھا،

"بچے چھوڑو.... ناحق اپنے آپ کو پریشان نہ کرو...."

سعیدہ نے مشفقانہ انداز میں کہا،

محمود سعیدہ کو اپنی والدہ کی طرح محترم سمجھتا تھا، انہیں معلوم نہیں تھا، کہ اس کے حقیقی والدین کون تھے؟ وہ کس طرح سعیدہ کے پاس آیا تھا؟ کس طرح وہ اس قدر سرمایہ کا مالک ہوا، یہ سب باتیں اس کے لئے ایک گہرا راز تھیں، جو صرف سعیدہ تک محدود تھیں، وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ سعیدہ کے غریب ہاتھوں نے اسے پالا ہے، سعیدہ کو نسیمہ کی سرد مہریاں ہمیشہ بے چین اور مغموم کر دیتی تھیں، وہ دیکھتی تھیں، کہ محمود اپنی تمام کائنات سمیت کس طرح نسیمہ کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہوتا ہے اور مایوس واپس آتا ہے، وہ کس طرح اپنی عقیدتوں کو پیش کرتا ہے اور کس بے دردی سے ٹھکرایا جاتا ہے۔

اس نے بارہا دیکھا تھا، کہ محمود باہر بارش میں پڑا بھیگ رہا ہے اور نسیمہ مزے سے اندر نیند کے خراٹے لے رہی ہے، وہ اندر درد سے کراہ رہا ہے اور وہ باہر سینے پرونے میں مصروف ہے۔

سعیدہ کئی بار ایک مہربان ماں کی طرح اسے تسلی دیتی اور محمود کو یقین دلاتی کہ نسیمہ واقعی اس سے محبت کرتی ہے۔ مگر درحقیقت نسیمہ کے تاریک دل میں محبت کی روشنی ہی نہیں ہوئی تھی، اس کا دل ہی ایک ڈھیلے کی مانند تھا۔ جو احساس اور درد کی گہرائیوں سے ناواقف تھا۔

مدت سے تو محمود کی شادی ہو گئی تھی، مگر انہوں نے ایک لمحہ بھی چین سے نہ گزارا تھا، دونوں اپنا اپنا راستہ چلتے رہے۔ دونوں اپنے اپنے نظام کی تکمیل میں کوشاں رہے۔ لیکن دونوں نے کبھی ایک دوسرے کو مجبور نہیں کیا تھا، کہ آپس میں اختلافات کی قربانی کرکے ایک ہو جائیں۔

قربانی جاری رہی لیکن امید منقطع نہ ہوئی........

سعیدہ محمود کے بستر کے قریب ایک کرسی پر بیٹھی تھی——

وہ اسے آخری بار ایک ناممکن چیز کا یقین دلا رہی تھی——

نسیمہ اُسے محبت کرتی ہے۔ سعیدہ نے محمود کو خاموش دیکھ کر خیال کیا کہ وہ سو گیا ہے ــــ لیکن حقیقت میں وہ آنسو بہا رہا تھا۔

آہ! ہمیشہ کے لئے جدا ہونیوالا محمود اپنے دل ــــ بیتاب کے لئے آخری تسکین کا متلاشی تھا۔ لیکن ناکامی کے طوفانی سمندر میں اس کی کشتی امید الٹ چکی تھی۔ نیا سرمایہ تلاش بے سود تھی۔ امید موہوم تھی۔

"سعیدہ!" محمود نے مجروح ہنسی سے اس پر نگاہ کی اور یاس انگیز آواز میں کہا..... "بقا کے مسافر کا سامان بندھ چکا ہے..... مجھے زندگی کی کوئی امید نہیں..... لیکن نسیمہ سے..... آہ! مجھے..... امید.....

آہ! دیکھو چاند کی چاندنی تمام عالم کو اپنے نور سے منور کرتی ہے۔ مگر تمام تاریکی کو یہ بھی ختم نہیں کر سکتی۔ کوئی جگہ باقی رہ جاتی ہے جہاں تاریکی کی حکومت ہے۔ ہم زندگی میں بعض اوقات خطرناک غلطیاں کرتے ہیں۔ لاکھوں دفعہ امید نا امیدی کا جامہ پہن لیتی ہے۔ بہت دفعہ ہم حالات کے غلط موازنہ کرتے ہیں اور زبردست دھوکہ کھاتے ہیں، لیکن پھر بھی امید باقی رہتی ہے، ہماری روح میں کچھ جوش کچھ ہمت کچھ احساس باقی رہ جاتا ہے۔ ہم ایک شکست خوردہ سپاہی کی طرح پھر اٹھتے ہیں اور زندگی کی ناقابل فہم اور پیچیدہ اور لگاتار جنگ میں شریک ہو جاتے ہیں، یہ سب..... امید..... کی کارستانی ہے.....

"ہاں بیٹا"..... سعیدہ نے سر ہلاتے ہوئے کہا.....

"سعیدہ!" محمود نے پھر آنسو بہاتے ہوئے کہا..... جس دن سے میں نے شادی کی، زندگی کی راحت محبت کی آسمانی لطافت سے ہمیشہ محروم رہا۔ آہ! میں نے کئی دفعہ زندگی کو ظاہری چادر اتارنے پر مجبور کیا..... کئی دفعہ میں نے اپنے آپ کو گم کر دینے میں رہائی سمجھی ــــ لیکن آہ! یاس اور ناکامی کے بے پناہ طوفان میں خوشی اور رہائی ــــ محال.....

"بھولے محمود" سعیدہ نے بناوٹی ہنسی مسکراہٹ سے کہا" کیا زندگی میں خوشی کوئی بالکل ضروری چیز ہے؟"

"اس کا جواب میں نے کبھی مکمل نہیں پایا" محمود نے دوسری طرف منہ پھیرتے ہوئے کہا۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ خاموش ہو گیا ــــ ہمیشہ کے لئے نہیں ــــ کچھ دیر اور مصائب کا شکار ہونے کے لئے۔ وہ بظاہر خاموش تھا، مگر حقیقتاً اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ اب اس کے غم و اندوہ کا علاج اس کے مکان کی چار دیواری میں نہیں تھا، بلکہ فضا کی بلندیوں میں ــــ دور ــــ جہاں ان کی نظر ناکام ہو جاتی ہے۔ وہ نسیمہ کی مہربانیوں کی فہرست دہرا رہا تھا..... کہ ایک آواز نے اسے چونکا دیا.....

حضور بی بی صاحبہ دلہن ایدر اپنے میکے جا رہی ہیں..... بھائی کی شادی پر..... ایک نوکرانی نے مودبانہ آواز میں کہا.....

محمود بیتاب ہو گیا..... اس کی نظر تاریک ہو گئی..... اسے آخری موت سے پیشتر ایک دوسری موت نے آلیا.....

اس کے جذبات میں تلاطم اور روح میں ہیجان پیدا ہو گیا۔ انتہائی یاس کے وقت انسان کے قابو سے ہر چیز آزاد ہو جایا کرتی ہے..... اس نے بیتابانہ..... لرزتی زبان میں کہا،

"کیا..... میرا..... دل محبت سے تہی دست تھا.....!"

محمود اگر چاہتا تو اپنی عورت پر جبر کر سکتا تھا..... اُسے

اکراہ سے اپنے قابو میں رکھ سکتا تھا ــــ اس کی محبت اور وفا حاصل کرنے کے لئے اسے شوہرانہ اختیارات برتنے کا حق حاصل تھا لیکن یہ محمود کی فطرت سے بعید تھا ــــ وہ ایک ناقابل حصول چیز کے لئے کوشش کرنا بیوقوفی سمجھتا تھا، وہ عورت پر ظلم کرنا ــــ جس کے دل میں اس کی محبت نہ تھی۔ ایک زبردست گناہ سمجھتا تھا ــــ اس نے دنیا صرف ایک پرستش جائز سمجھی تھی، اور وہ ایک حسین دیوی نسیم کی تھی، ــــ نسیم ــــ اتنی حسین دیوی پر جبر و اکراہ اور شوہرانہ اختیارات کا استعمال! وہ اس خیال سے لرز اٹھتا تھا،

"سعیدہ! اس نے اکھڑی ہوئی ہوئی آواز میں کہا" نسیمہ نے میری زندگی کی کشتی کو بوجھل کر کے موت کے طوفانی سمندر میں ــــ تنہا بقا کی طرف دھکیل دیا ہے" ــــ میری امید کی رسی کاٹ ڈالی ہے ــــ آہ! ــــ لیکن مجھے ایک بات پر فخر ہے" ــــ کہ ــــ میں نے ــــ نسیمہ پر ظلم نہیں کیا ــــ اپنی "مقدس محبت" کے لئے اس کو بے چین نہیں کیا ــــ میں نے بہت انتظار کیا کہ شاید وہ میری ہو لیکن آہ! سعیدہ،

نسیمہ!....

اس نے آنکھیں بند کر لیں..... موت کا فرشتہ اس کے سرہانے کھڑا تھا....

سعیدہ کی آنکھوں میں سے آنسو رواں تھے.....

اس کی آنکھیں محمود کے چہرے پر گڑی تھیں اور وہ مایوس حکیم کی طرح خاموشی سے بیٹھی محمود کی بیتابیوں کو دیکھ رہی تھی وہ اپنی کوششیں محمود کے لئے قربان کر چکی تھی.........

یکدم دروازہ کھلا اور کوئی عورت تیزی سے اندر داخل ہوئی اور دھاڑ مار کر محمود کی ٹانگوں سے لپٹ گئی ــــ سعیدہ اپنی جگہ جمے ہوئے حیرت سے دیکھنے لگی۔ اس کے آنسو کے اس کے بھرایاں پڑے ہوئے چہرے پر چمک رہے تھے ــــ اس نے نسیمہ کو پہچان لیا تھا۔ دونوں رو نے لگیں لیکن آہ! اب عشق بے صبر ہو چکا تھا حسن اپنی نافرمانیوں پر شرمندگی سے رو رہا تھا،

محمود پیارے محمود! تمہاری نسیمہ تمہارے قدموں پر پڑی ہے"

سعیدہ نے محمود کا کندھا پکڑ کر جگاتے ہوئے کہا ــ نسیمہ محمود کے قدموں پر پڑی ہے۔ اس مداوت میں اس کا احساس تیز ہو گیا تھا ایک دفعہ پھر اسے زندہ کرنا چاہتی تھی۔

عشق کی چاپلوسیاں حسن پر کاری ہو رہی تھیں۔ وہ ایک دفعہ پھر اس کے بے تابیاں اور دیوانگیاں دیکھنا چاہتا تھا، وہ اپنے جادو سے ایک دفعہ پھر اس کی سرمستیاں بیدار کرنی چاہتا تھا، مگر اب وقت گذر چکا تھا،

"کون؟ محمود نے باریک آواز میں پوچھا۔

نسیمہ ــــ تمہارے قدموں پر پڑی ہے ــــ حسن عشق کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہے۔

"ناممکن ــــ"

اپنی آنکھوں سے دیکھ لو ــــ حسن کی شرمندگیوں کو۔

محمود نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں ــــ اسے اپنی ٹانگوں پر بوجھ کا احساس ہوا۔ نسیمہ اس کے قدموں پر پڑی ہوئی رو رہی تھی ــــ وہ یکدم اٹھ بیٹھا ــــ جنون اور محبت نے کمزوری اور موت پر فتح پا لی تھی ــــــــــــــــ

موت کا فرشتہ انتظار کرنے لگا۔

جاؤ محمود نے جوش دیوانگی میں کہا ــــ جس طرح میں اس دنیا سے ہمیشہ کے لئے جا رہا ہوں ــــ میں تمہاری طرف ایک نگاہ ڈالنا بھی جرم سمجھتا ہوں ــــ اس لئے نہیں کہ میری نگاہوں میں تمہارے دیکھنے کی ہوس نہیں رہی ــــ

بکھر میں جاتے ہوئے تمہیں دنیا میں ——— جس کے لئے تم میری مقدس عقیدتوں کو ٹھکرایا ہے ——— تنہا چھوڑنا چاہتا ہوں ——— جاؤ میں تم سے کلام کرنا نہیں چاہتا ——— اس لئے نہیں کہ میری زبان تمہاری شیرینی بھول چکی ہے ——— بلکہ دنیا کے سخت بجوبوں میں پھنس کر تمہیں معلوم ہو جائے کہ تمہارا حقیقی دوست، خیر خواہ اور حبیب صرف محمود تھا۔ ہر انسان کی زندگی میں ایک وقت آتا ہے، جبکہ اسے مایوسیوں میں ایک سچے غمگسار دوست کی ضرورت محسوس ہوتی ہے ——— وہ ادھر ادھر نگاہ ڈالتا ہے، مگر اسے وفادار روحیں، ہمدردی اور دوستی کا حسین جامہ پہنے ہوئے نظر نہیں آتی ہیں ——— مکر و فریب کے لباس میں جلوہ گر ہوتا ہے ——— اس وقت اس کی آنکھیں کھلتی ہیں ——— وہ افسوس کرتا ہے ——— مگر بیکار ——— وہ روتا ہے ——— مگر بے سود۔

وفادار روحیں غائب ہو چکی ہوتی ہیں ——— جس طرح میں تم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہا ہوں دنیا میں سچا۔ صداقت پرست وفادار ایک ہی دوست ہو سکتا ہے ——— وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ اس کے تمام جسم نے فوری حرکت کی ——— اور وہ بستر پر بیہوش ہو کر گر گیا ——— اور چند منٹ کے بعد ایک ہچکی اس کی روح کو لیکر آسمان کی بلندیوں میں غائب ہو گئی :۔

موت کے فرشتے نے اپنا کام کر لیا تھا۔

کمرہ میں طوفان مچا ہوا تھا۔

امین حزیں

# ایک منظر

از جناب پروفیسر فیض محمد صاحب فیض ایم۔ اے

بام و در خامشی کے بوجھ سے چور    آسمانوں سے جوئے درد رواں
چاند کا دکھ بھرا فسانہ نور    شاہراہوں کی خاک میں غلطاں
خواب گاہوں میں نیم تاریکی
مضمحل لے ربابِ ہستی کی
ہلکے ہلکے سروں میں نوحہ کناں

# پٹواری محکمۂ نہر

از جناب ملک منظور احمد صاحب [illegible]

حضرت کی شان ملاحظہ ہو۔ صبح صبح گھر سے نکلے۔ بزرگوں سے سنتے آئے ہیں۔ پنڈت جی کی ہیلی مولوی صاحب کا گھوڑا۔ مگر پٹواری جی کی گھوڑی۔ زین پر خورجین۔ بغل میں خسرہ فتراک سے ڈوری بندھی ہے۔ اس کے نیچے دوات۔ لوگوں کے ہاتھ میں قلم ہوتا ہے۔ ان کے کان کے اوپر رہتا ہے یہ چاروں چیزیں ان کے ہتھیار ہیں۔ یہ ہر وقت ان سے مسلح رہتے ہیں۔ جیسے میدان جنگ میں جا رہے ہیں۔ جہاں ذرا موقع دیکھا یہ اپنے تیر۔ بندوق۔ تلوار کا استعمال شروع کر دیتے ہیں۔ کہیں سے فصلانہ لیگا۔ تو خورجین میں بھر لیگا۔ کہیں آبپاشی دیکھے گا تو جھٹ قلم دوات نکال خسرہ میں اندراج کریگا۔ شیطان فرشتوں کے استاد مشہور ہیں۔ مگر آپ اتنے ہوشیار ہیں کہ حضرت ابلیس بھی ان کی شاگردی کرتے نظر آتے ہیں۔ یہہ انہیں باتوں سے ہمیشہ اچھا بونس BONUS پاتا ہے۔ اور زمینداروں پر قابو رکھتا ہے۔ اس کے فصلانہ وصول کرنے کے ہزاروں طریقے ہیں۔ جو شریفانہ طور پر منشی جی کا حق ان کے گھر پہنچا دیتے ہیں۔ یہ ان سے کسی قسم کی باز پرسی نہیں کرتا۔ اگر وہ مخلوط اجناس بھی کاشت کریں۔ تو ہمیشہ ادنیٰ جنس لکھکر اعلیٰ سے چشم پوشی کرتا ہے۔ خرابہ لرمجھکر کر خوب دلاتا ہے۔ آبضائعہ ہو۔ تو پوچھتا تک نہیں۔ اچھے کاشتکار ایسی باتیں خوب سمجھتے ہیں۔ اور اس کا حق نہیں رکھتے۔ سرکار کا مطالبہ تو خوشی ہی ادا کرتے ہیں۔ لیکن ان کا حساب مہینے کے مہینے چکاتے رہتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کی خدمت جتنی کی جائے تھوڑی ہے۔ سرکاری دفتر تو کہیں دور ہے۔ مگر یہ ہر وقت سر پر سوار ہیں۔

نٹ کھٹ زمیندار جو خدمت نہیں کرتے ہیں۔ ہر روز ناجائز آبپاشی آبضائعہ۔ نہری دباؤنی اور دیگر کئی قسم کے عذابوں میں گرفتار نظر آتے ہیں۔ یہ بڑے حساب کتاب کا مالک ہے۔ گاؤں کے مالیہ کا محاسب ہے۔ سرکار کا کار دار ہے اور کاشتکاروں کے لئے تھوڑی متعدی بیماری۔ بیماری تو آتی ہے مگر چلی جاتی ہے۔ یہ ایسی پلیگ ہے کہ ایک دفعہ گھستا ہے اور پھر کبھی نہیں چھوڑتا۔

ان کی عزت سب کو منظور ہے۔ کیوں نہ ہو قلم کے مالک ہیں۔ حضرت پلنگ پر بیٹھے ہیں۔ لوگ نیچے بیٹھکر حقہ پلاتے ہیں۔ کیوں نہ کریں اس کے اختیارات ہیں جن کی کوئی حد نہیں۔ آسمان دنیا پر محیط ہے تو پٹواری زمیندار کے سر پر۔ انہوں نے بزرگوں سے بھی سن رکھا ہے اوپر ذات باری۔ نیچے میاں پٹواری۔

پٹواری میاں سرکار کے ہاں بڑے دخیل ہیں۔ اگر سہو قلمی سے بھی ان سے کوئی خطا ہو جائے۔ تو ہمیشہ ان کی کج فطری کا نتیجہ ٹھہرایا جاتا ہے۔ جواب طلبی ...... سب کچھ ہو مگر یہ ویسے ہی ہیں کوئی حاکم ہو اگر اسے اتنے بھی اختیارات ہیں کہ کھیت میں کھڑا ہو کر یہ دریافت کرلے کہ اس میں کیا کاشت ہے؟ رقبہ کس قدر ہے؟ کس نے کاشت کیا ہے؟ کب کاشت کیا ہے؟ وہ ان کی جان کے لئے وبال ہے۔ جب کوئی افسر ٹرینگ کے لئے جاتا ہے۔ تو لوگ پٹواری کے خلاف اس کے خوب کان بھرتے ہیں۔ وہ خوفزدہ ہو جاتا ہے اور جہاں موقعہ ملتا ہے۔ پٹواری کو ملزم اور مجرم بناتا رہتا ہے۔ مگر حضرت بڑے ہوشیار ہیں بھیگی بلی کی طرح سکڑ سمٹ کر وقت ٹال

دیتے ہیں۔ بعض کو وہ ایسا جھانسہ دیتے ہیں۔ کہ وہ غریب سنبھل نہیں سکتا چاروں شانے چیت منہ کے بل آگے گرتا ہے۔ کھڑے ہونے کو ٹھکانا نہیں رہتا۔ اور ملازمت بھی جاتی رہتی ہے۔

کچھ زمیندار بھی اس بچارے کے جان لیوا ہوتے ہیں۔ ان کا یہ خیال ہے کہ پٹواری کی آواز ہماری درخواست کے مقابلہ میں ان کے محکمہ میں بھی کچھ معنی نہیں رکھتی۔ ہر روز جھوٹ موٹ کی درخواستیں دیتے رہتے ہیں۔ اگر پٹواری بھی ان کے ڈھب پر آ جائیں تو خیر ورنہ تبدیل کرا دیتے ہیں۔ اور اس سے بھی زیادہ تک نوبت آجاتی ہے۔ بعض کو تو بعد میں کسی زمیندار کا مختار کار بننا پڑتا ہے۔ ایسے مختار زمینداروں کے نزدیک بڑا نام پاتے ہیں۔ کیوں نہ ہو کہ یہ تجربہ کار ہوتے ہیں اور یہ وبا ہمارے ملک میں عام ہے۔

غریب پٹواری تو کسی سے لڑتا جھگڑتا نہیں۔ البتہ اسے یہ منظور نہیں کہ کوئی اس کی مرضی کے خلاف اسکے کام میں دخل دے یا اس کا کھال نکالے۔ اور اس کی مملکت میں ناجائز مداخلت کا مرتکب ہو (باقی پھر)

محمد نذیر فاروقی

---

# رُباعیات

(۱)

مستوں میں ہمیں شان نمایاں دیکھ
اس بیخودی میں کون ہے پنہاں دیکھ
ہم رکھتے تو پیالہ ہیں در میخانہ
اے دیکھ یہ میرا حاصل ایماں دیکھ

(۲)

زندوں کی دعا مستجاب ہو جائے
ہر قطرۂ آب شراب ہو جائے
تیری نگہ لطف کا صدقہ ساقی
ہر ذرہ دل آفتاب ہو جائے

(۳)

یہ داغ گناہ دھو لینے دے
جی کھول کے مجھکو رو لینے دے
ممکن ہے کہ کل آئے نہ آئے ہمدم
ہونا ہے جو آج ہو لینے دے

اسیر انور ضیائی ساکن ادارہ ادبیہ

# اُردو شاعری پر ایران کی امرد پرستی کا اثر

از جناب عبدالرحمٰن صاحب ضیا آزاد

پروفیسر ڈاکٹر عندلیب شادانی صاحب کا مضمون بیشک بہت کاوش اور محنت سے لکھا گیا ہے۔ مگر غالباً انہوں نے اس محنت کا مقصود یہی قرار دیا ہے کہ ایک نیا پہلو نکالا جائے اور کوئی نئی بات پیدا کی جائے جس سے لوگوں میں ولولہ پیدا ہو یا یوں معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو مرزا صاحب سے کوئی رقابت یا مخاصمت ہے ممکن ہے کہ ان کی ناکامیٔ عشق کا مضحکہ کسی اور خیال سے اڑا رہے ہوں یہ ہیں مغربی تہذیب کے اثرات۔ وہ معاشرت جس پر موجودہ تہذیب نازاں ہے۔ اکبر مرحوم نے کسی ایسے ہی موقع سے متاثر ہو کر کہا تھا کہ

ہم ایسی کل کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

سنا ہے مولانا مہر نے مرزا صاحب کی سوانح حیات مرتب کی ہے جس میں ہر واقعہ کی تصدیق مرزا صاحب کے اشعار اور خطوط سے کی گئی ہے۔ کتاب مذکور میں غالبؔ کی زندگی کے ہر پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ لیکن غالب کے اشعار کی امداد سے جن حقیقتوں کا انکشاف پروفیسر صاحب نے کیا ہے وہاں تک مہر صاحب کا ذہن رسا بھی نہیں پہونچ سکا۔ مولانا کو پروفیسر صاحب کا شکرگزار ہونا چاہئے کہ غالبؔ کے آئندہ اڈیشن میں ایک مزید باب کا اضافہ کرنے کے لئے نہایت سعی و کاوش سے کافی مواد مہیا کر دیا گیا ہے۔

جہاں تک نفسِ مضمون کا تعلق ہے پروفیسر صاحب نے کوئی نئی بات نہیں کہی وہی فرسودہ خیالات ہیں جو ادب اُردو کا ایک مبتدی بھی غزل گو شعرا کی نسبت ظاہر کر سکتا ہے۔ نیز عہد حاضرہ کے شعرا کا ایک بڑا طبقہ اس کا احساس کرتے ہوئے اپنے کلام کو ان عیوب سے پاک رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ زمانہ کے اختلاف کے ساتھ انسانی طبیعتیں خیالات اور احساسات تبدیل ہوتے رہتے ہیں کسی زمانہ میں "آئے ہے" "جائے ہے" "تئیں" "تک" وغیرہ الفاظ نہایت فصیح سمجھے جاتے تھے چنانچہ عہد سلف کے تمام شعرا کا کلام ان الفاظ میں بھرا پڑا ہے۔ لیکن آج یہ الفاظ متروک ہیں۔ ان کے مترادف دوسرے الفاظ رائج ہو چکے ہیں لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں کہ اب تک ہم جن الفاظ کے زیر بار احسان رہے آج ان میں نقائص نکالنے اور ان کا مضحکہ اڑانے میں مشغول ہو جائیں۔ اسی طرح خیالات اور غزل کی معنوی حیثیت بھی بتدریج تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ جدید نیچرل شاعری کیا ہے؟ کیا اسی فرسودہ غزل گوئی کی ارتقائی صورت نہیں ہے۔ آج زمانے کی تبدیلی سے طبیعتیں بدل گئی ہیں ہمیں اس میں نقائص نظر آ رہے ہیں لیکن کیا مرزا صاحب کے زمانے میں یہی نقائص خوبیوں میں شمار نہیں ہوتے تھے۔ کسی شاعر کے کلام کے معائب اور محاسن پرکھنے کا حق صرف اسی عہد کے ارباب کمال کو حاصل ہے جنکی طبیعتوں کے رجحانات کی پذیرائی کے لئے اس نے خود کو وقف کر دیا ہو۔ شعرا کے تذکرے اٹھا کر دیکھئے۔ غالب کی مشکل پسندی پر عوام نے بار بار اعتراض کئے۔ ان کے اکثر اشعار کو مہمل قرار دیا لیکن کسی کو اس ابتذال کا پہلو نظر نہیں آیا۔ پھر ہمیں یہ حق کس طرح حاصل ہو گیا

# The Mohaqqiq

(A high class literary Monthly)

BAHAWALPUR




عمر خیام ایرانی

کہ ہم کسی عہد کے محبوب رجحانات کا مضحکہ اڑائیں حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کا معیار حسن فہمی ہم سے مختلف تھا۔ وہ حسن حقیقی کے طالب تھے ان کی نگاہوں میں امرد۔ فاختہ یا نیچر کے کسی دلفریب منظر کی تخفیق نہیں تھی وہ اپنا منتہائے مقصود جہاں پاتے تھے بلا تکلف ادھر رجوع ہو جاتے تھے ان کے دل معصوم تھے خیالات پاک اور نگاہیں بے لوث آج ہم تہذیب کے دعویدار بنتے ہیں لیکن حقیقتاً ہماری تہذیب پستی کی عمیق ترین گڑھوں میں گر کر فنا ہو چکی ہے۔ ہمارے خیالات معصوم نہیں رہے۔ ہماری نگاہیں کثافتوں سے ملوث ہو چکی ہیں۔ ہمارے دلوں میں چور ہے یہی سبب ہے کہ آج ہم ان خیالات کا اظہار کرتے ہوئے جھجکتے ہیں کہ مبادا عوام کی باریک بین نگاہیں ہمارے دلوں کے بھید تک پہونچ جائیں۔

میں آخر میں پروفیسر صاحب سے عرض کرونگا کہ بلا تکلف غزل گوئی قابل اصلاح ہے اور دور حاضر کے شعراء اس حقیقت سے آگاہ ہو کر اصلاح کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں آپ لوگوں کے دلوں کو اصلاح کی طرف راغب کیجئے۔ اس ضمن میں مفید مشورے دیکر ان کی رہنمائی کیجئے لیکن خدا کے لئے ماضی کا تقدس پامال کر کے بزرگوں کی پگڑیاں اچھالئے قوم کو ان کی عظمت و عزت آپ کے لیندیا یہ مضامین سے زیادہ عزیز ہے

# لطائف

سارے خاندان کو چائے پر مدعو کیا گیا تھا۔ وقت تنگ ہو گیا۔ اماں جان نے بچی کو کہا بیٹی بھاگو غسلخانے میں جاؤ۔ اپنی گردن اور چہرے کو دھو لو۔ جلدی سے آؤ۔ اور فراک پہنو۔ جان ڈریک کے ہاں آج چائے پر جانا ہے۔ بچی غسلخانے میں گئی تو مگر ایک منٹ ٹھیا کی سوئی۔ واپس آگئی اور کہنے لگی۔ ابھی اماں یہ تو بتاؤ کہ میں نوکدار گلے کی فراک پہنوں گی اپنی گردن کو دھوؤں۔ یا مربع گلے کی فراک کے لئے۔

---

جونسن اپنے وقت کا بڑا عالم تھا۔ اس نے انگریزی کی ایک مستند قاموس لکھی۔ جو غالباً انگریزی زبان کا پہلا مستند فرہنگ کہلانے کی مستحق تھی۔ ایک شام کو کھانے پر مدعو تھا۔ سامنے کی کرسی پر ایک معزز متمول گھرانے کی خاتون بیٹھی تھیں۔ جونسن اپنی سادہ لوحی میں محو گفتگو تھا۔ اتفاق سے کھانے کے لئے ابلے ہوئے آلو بڑے گرم گرم پیش کئے گئے۔ جونسن نے سمجھا کہ اس قدر گرم نہیں۔ منہ اس کا کافی بڑا تھا۔ آلو بغیر کاٹے کے منہ میں اس طرح سے رکھ لیا۔ جیسے بھوکا چوپایہ کھاتا ہے۔ آلو جلتا ہوا کوئلہ۔ وہ خاتون سامنے بیٹھی اس تمام حرکت کو دیکھ رہی تھی۔ جونسن نے جب وہ تاب نہ لاسکا۔ ثابت کا ثابت آلو منہ سے نکالا اور واپس پلیٹ میں رکھ دیا۔ دیدہ دلیری ملاحظہ ہو۔ حضرت فرمانے لگے۔ بیگم صاحبہ اگر کوئی بیوقوف ہوتا۔ تو اس آلو کو کھا جاتا!

---

## (اردو میں) فوٹو گرافی (ترجمہ)

ضخامت ۲۰۰ صفحے جلد سنہری نہایت عمدہ بیشمار ہاف ٹون بلاک۔ لائن بلاک فوٹو گرافی سیکھنے کے لئے بہترین کتاب۔ اس کتاب سے آدمی فوٹو گرافی کے تمام شعبوں پر حاوی ہو جاتا ہے قیمت ۸ روپے

ملنے کا پتہ محقق پبلشنگ کمپنی بہاولپور۔

# کاشت کپاس

ریاست بہاولپور کی زمین۔ آب و ہوا۔ وو سائل آبپاشی ماسوائے چند ریگستانی رقبوں کے، کاشت جنس کپاس کے لئے نہایت موزوں ہے خلیج وپی پر وجکٹ کی منتقل اور غیر منتقل انہار سے اب وسائل آبپاشی یقینی ہو گئے ہیں۔ پانی وقت پر آجاتا ہے جس سے کپاس جیسی قیمتی فصل نہایت کامیابی سے کاشت ہو سکتی ہے۔ محکمۂ زراعت کی تبلیغی سرگرمیوں نے سابقہ چند سال میں مالکان اور کاشتکاران کو اس فصل کی کاشت کے ابتدائی اصول خوب ذہن نشین کرا دیئے ہیں۔ چنانچہ اب زمینداروں نے اس فصل کو خوب کاشت کرنا شروع کر دیا ہے۔ اور دن بدن رقبہ زیر کاشت بڑھ رہا ہے۔ جو کہ مندرجہ ذیل اعداد شمار سے ظاہر ہوتا ہے۔

| سال | کپاس دیسی | کپاس امریکن | میزان | |
|---|---|---|---|---|
| ۱۹۲۴ | ۱۰۹۲۵۳ | ۸۴۱۲۷ | ۱۹۳۴۹۰ | ایکڑ |
| ۱۹۲۵ | ۱۳۵۰۳۰ | ۲۱۵۰۲۲ | ۲۵۰۰۵۲ | ″ |
| ۱۹۲۶ | ۱۳۱۷۲۱ | ۲۶۸۳۲۲ | ۴۰۰۰۴۴ | ″ |

فصل کپاس کا زیادہ رقبہ ہونے کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ پیداوار فی ایکڑ کو بڑھایا جائے۔ ہندوستان میں کپاس کی پیداوار فی ایکڑ دیگر ممالک کے مقابلہ بہت کم ہے۔ اگر مصر میں ۱۳½ من فی ایکڑ اوسط ہوتی ہے۔ تو روس میں ۸ من امریکہ میں ۶½ من اور ہندوستان میں ۳ من فی ایکڑ ہوتی ہے پیداوار میں اس وقت تک اضافہ ناممکن ہے جب تک ہم ترقی یافتہ طریقہ کاشت کو اختیار نہ کریں۔ اگر ان طریق ہائے کاشت کے اختیار کرنے سے کم از کم آدھ من فی ایکڑ پیداوار پہلے سے زیادہ ہو جاوے۔ تو ہمیں تمام ریاست کے چار لاکھ ایکڑ رقبہ کاشت سے ۲ لاکھ من کپاس جس کا کہ روپیہ کئی لاکھ سے زیادہ حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ رقم فصل کپاس کا تقریباً نصف مالیہ سرکار ادا کرنے کے لئے کافی ہوگی۔

## تیاری زمین

سب سے پہلی ضروری بات یہ ہے کہ زمین کو بونے کے لئے کیسے تیار کیا جائے۔ عموماً کاشتکاران زمین کی بہت کم جوتائی کرتے ہیں۔ صرف بیج کا چھٹا بکھیر اوپر سے ہل چلا دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کپاس کے پودے کو مناسب خوراک نہیں ملتی۔ کیونکہ اس کی جڑیں اتنی گہری جاتی ہیں۔ کہ انہیں وہاں کھیت کی ناقص جوتائی کی وجہ سے کم خوراک ملتی ہے۔ اول کھیت میں سے تمام چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں اور بوٹیاں کاٹ کر اس کو ہموار کرنا چاہئے۔ کیونکہ ناہموار کھیت میں پانی کسی جگہ زیادہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور کہیں کھیت بالکل سوکھا رہ جاتا ہے۔ ہموار کرنے کے بعد کھیت میں ایک دفعہ راجہ ہندوستانی یا ہل چلانا چاہئے۔ اس کے بعد تین دفعہ دیسی ہل یا لوکل ہلوں سے جوتائی کر کے سہاگا دیا جائے۔

## طریقہ کاشت

تیاری زمین کے بعد راونی کا پانی دیا جاوے اور ایک دفعہ ہل اور سہاگہ چلا کر فصل کو بجائے چھٹا کے لائنوں میں بونا چاہئے۔ ایسا کرنے سے یہ فوائد ہونگے۔

اول۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ کاشتکاران کپاس کو گوڈی بالکل نہیں دیتے۔ جو ایک نہایت ضروری چیز ہے۔ ہاتھ سے گوڈی دینے میں بہت محنت اور وقت صرف ہوتا ہے۔ اس طریقہ سے بونے میں گوڈی بیلوں سے دیسی ہل و لوکل ہلوں سے کئی دفعہ دی جا سکتی ہے:-

دوم جس جگہ بیج اگا ہوا نہ ہو۔ وہ فوراً معلوم ہو جاتی ہے اور وہاں دوبارہ بیج بویا جا سکتا ہے۔

سوم۔ پیداوار پہلے کی نسبت بڑھ جاتی ہے :

لائنوں کا درمیانی فاصلہ دیسی کپاس کے واسطے ۲ فٹ اور امریکن کے واسطے ۳ فٹ ہونا چاہیئے۔ لائنوں میں بونے کے لئے نئے آلات تیار کئے گئے ہیں۔ جو محکمہ زراعت بہاولپور سے مل سکتے ہیں ان سے ایک جوڑی بیل تمام دن میں تین چار ایکڑ بو سکتی ہے اور لائنوں کے درمیان گوڈی کرنے کے لئے بھی ترقی یافتہ آلات مثلاً لوکل ہو اور پنجہ وغیرہ تیار کئے گئے ہیں۔ ان سے جوڑی بیل تین ایکڑ فصل کی گوڈی کر سکتی ہے :

**اقسام** طریق کاشت جاننے کے بعد کاشتکار کو یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ وہ کونسی قسم کپاس اپنی زمین پر کاشت کرے۔ مختلف قسم کی زمینوں کے واسطے کپاس کی موزوں اقسام تیار کی گئیں ہیں۔ کاشتکار کو چاہیئے۔ کہ وہ اپنے حالات کے مطابق خود قسم کپاس پسند کرے۔ صادقیہ ڈیزرٹ برانچ انہار کی کمزور زمینوں میں ۳۹ مالی سوئی اور اچھی زمینوں پر ۴ الیف۔ اور ۴ الیف امریکن کاشت کرنی چاہیئے۔ فورڈواہ۔ احمدپور برانچ اور قائم انہار پر صرف ۴ الیف اور ۴۳ الیف اچھی رہینگی۔ عباسیہ اور پنجند انہار پر ۴ الیف۔ ۲۸۹ الیف۔ ۴۳ الیف K-T ۲۰۵ اور L.S.S. وغیرہ تمام کامیابی سے بوئی جا سکتی ہیں۔ لیکن F ۲۸۹ اور K-T-۲۰۵ خاص طور پر صرف زرخیز زمینوں میں کاشت کرنی چاہئیں۔ ان تمام اقسام کا بیج محکمہ زراعت کی ایجنسیوں سے مل سکتا ہے جو کہ اب تقریباً ہر شہر میں قائم کر دی گئی ہیں۔

**شرح بیج** ہمیشہ صاف ستھرا اور ایک ہی قسم کا بونا چاہیئے عام طور پر کاشتکار بازاری بیج ایکڑ بو دیتے ہیں جس میں بہت سی اقسام ملی ہوئی ہوتی ہیں۔ ایسے بیج کی طاقت روئیدگی کم ہونے کی وجہ سے کھیت میں فصل بہت چھدری رہ جاتی ہے اور پیداوار کم ہوتی ہے۔ نیز دیسی اور نرمہ مخلوط ہونے کے باعث اس کی قیمت بہت تھوڑی ملتی ہے۔ اس لئے بیج ہمیشہ محکمہ زراعت سے خرید کر بونا چاہیئے۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ کاشتکاران کپاس کا بیج فی ایکڑ بہت کم ڈالتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پودوں کی تعداد بہت کم رہ جاتی ہے۔ بعض جگہیں بہت بالکل خالی پڑی رہتی ہیں۔ اس لئے ہمیں کوشش کرنی چاہیئے کہ کھیت میں پودوں کی مناسب تعداد ضرور ہو۔ یہ صرف زیادہ بیج ڈالنے اور جن جگہوں میں بیج نہ اگے دوبارہ بونے ہی سے ہو سکتا ہے۔

دیسی کپاس و ۴ الیف نرمہ کا بیج چھ سیر سے آٹھ سیر اور ۴۳ الیف۔ ۲۸۹ الیف کے۔ ٹی ۲۰۵ کا آٹھ سیر سے دس سیر فی ایکڑ ڈالنا چاہیئے۔ مصر میں عام طور پر پندرہ سیر فی ایکڑ بیج ڈالا جاتا ہے۔ بعض دفعہ ایک من تک بھی ڈالا جاتا ہے۔ یہ ضرور ہوگا کہ زیادہ بیج ڈالنے سے پودے ضرورت سے زیادہ اگ آئینگے لیکن بعد میں اکھاڑے جا سکتے ہیں۔

**وقت کاشت** انہار صادقیہ و ڈیزرٹ برانچ پر ایسی جگہوں میں جہاں آندھیوں کی وجہ سے اگتی ہوئی فصل خراب ہونے کا اندیشہ ہو وہاں شروع اپریل ہی سے بجائی شروع کر دینی چاہیئے۔ دیگر علاقوں میں ۵ مئی سے ۱۰ جون تک کاشت کا نہایت موزوں وقت ہے۔

**آبپاشی** فصل کپاس کی آبپاشی کا مسئلہ نہایت اہم ہے کیونکہ اگر اس کو مناسب اوقات پر پانی نہ دیا جائے تو اس کے ناکام رہنے کا بڑا اندیشہ ہوتا ہے۔ پہلا پانی بونے سے تین

ہفتہ یا ایک ماہ بعد ضرور دیدینا چاہئے۔ بعدازاں اگر ہو سکے تو ہر چودہ روز کے بعد پانی دیدیا جائے۔ اگر ایسا ممکن نہ ہو تو شروع ماہ جولائی سے ماہ ستمبر تک کم از کم تین دفعہ پانی ضرور دیدیا جائے۔ اس کے بعد اخیر اکتوبر تک جس قدر پانی دیا جائے مفید ہوگا اگر اس عرصہ میں پانی کی کمی ہوگئی تو ٹینڈے اچھی طرح نہیں کھلینگے اور پیداوار بہت کم اور ناقص ہوگی۔ کاشتکاران عموماً نوریا و دیگر اجناس فصل ربیع کی کاشت کے واسطے پانی صرف کردیتے ہیں اور کپاس کو نہیں دیتے۔ چونکہ یہ پودوں کے پھول اور پھل بنانے کا موسم ہوتا ہے۔ اسلئے پانی کی بہت ضرورت ہوتی ہے جو کہ ہر حال پوری کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ ورنہ فصل تباہ ہو جائیگی (باقی آئندہ)

عزالدین سپرنٹنڈنٹ اگریکلچر

# ننھا افسانہ گو

**نوری** سے جب بھی کہانی کہنے کو کہا جاتا وہ ہر بار یہی ایک کہانی کہتی،

نظریں نیچی کئے لجالجا کر کہنا شروع کیا۔

دور ایک جزیرے کے گھنے جنگل میں شہزادی رہتی تھی۔ اس کی آواز ندی کے گیت کی سی تھی، جوانی کی اٹھان چڑھتے سورج کی سی۔ دور دور کے شہزادے کوسوں منزل مار اسے دیکھنے آتے یہ انہیں دیکھتی اور مسکرادیتی۔ وہ اسے "سورج مکھی" کہتے۔

اس کے پڑوس میں ایک شہزادہ رہتا تھا۔ الماس۔ اس کے حسن اور بہادری کی داستانیں دور دور تک پہنچ چکی تھیں۔ سورج مکھی نے اس کا من موہ لیا۔ کئی بار اس کے حضور آیا اور شادی کی التجا کی لیکن وہ ہر بار جواب دیتی "جا دنیا کی کتاب میں اپنے کارنامے درج کرا۔ اور میرے پاس آ۔"

"الماس" نے پورب پچھم کی خاک چھانی۔ طرح طرح کے نکتے چھنے اور بارگاہ میں پہنچا۔

"شہزادی نے کہا" جو مجھے سورج مکھی کہیں میرے دشمن ہیں۔ ان سے انتقام لو۔"

"وہ گیا اور جس جس نے اسے "سورج مکھی" کہا تھا تیغ کے گھاٹ اتارا لوٹا تو شہزادی نے کہا

"اپنے میں ہرن کی تیزی۔ مچھلی کی پھرتی۔ عقاب کی نظر پاؤ تو پھر آؤ۔"

کئی سال گذر گئے۔ شہزادہ پھر اس جزیرہ کو لوٹا۔ جہاں سورج مکھی رہتی تھی۔ پہاڑ کی چوٹیاں برف سے اٹ رہی تھیں۔ سورج مکھی نے بغیر نظریں اٹھائے اس سے کہا" شہزادہ بہادر ہے۔ اس نے ہر بات مانی لیکن میرا دل لینا آسان نہیں۔ برف کی چٹانوں کو بہار سے بدل دو۔ سورج مکھی تمہاری ہے۔"

شہزادہ نے آسمان کو دیکھتے ہوئے کہا۔" کاش یہ میرے بس میں ہو۔"

دور سے آواز آئی جیسے چٹانوں نے جواب دیا "شہزادہ قول کا دھنی ہے۔ دانا ہے۔ وقت نہ کھوئیے۔ واپس لوٹ جائیے۔"

"وہ پکارا۔ سر جائے۔ آن نہ جائے۔ قول ہارنا بہادر کا شیوہ نہیں۔ کاش میں برف یہاں سے سرکا کہیں اور بھیج سکتا"

"طوفان بڑھ چلا۔ برف سے کڑکڑے کی آواز آئی۔ سرد ہوا تیزی سے چلنے لگی۔ باد و باران کی روح اڑتی دکھائی دی۔ اڈے ہوئے بادل سے گرم گرم بوندیں ٹپکیں۔ برف پگھل چکی تھی اور بہار کی دیوی خراماں خراماں اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ادھر ادھر دیکھا سورج مکھی نظر نہ آئی"۔

"وہ پہاڑ کی چوٹی پر اس کا انتظار کرتا رہا۔ برسوں راہ دیکھا کیا۔ سورج مکھی نہ آئی۔ اسی حال میں پتھر کا ہو گیا۔ آج بھی وہیں ہے۔ وہ پتھر بنتے وقت کی داستان کہہ رہا ہے"۔

نوزی کہانی کہتے کہتے اونگھنے لگی۔ آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔ چونک کر جلدی جلدی کہنا شروع کیا۔ "کل رات ہم نے خواب دیکھا ایک اونچے پہاڑ کی چوٹی ہے۔ ایک بت رکھا ہے آس پاس سورج مکھی کے پودے اگ رہے ہیں۔ چاندنی رات ہے جنگل کی ہوا سائیں سائیں کرتی ان پودوں میں سے گزرتی ہے۔ سورج مکھی کے پھول ہوا کے جھونکوں میں لہرا لہرا کر پتھر کے بت سے لپٹ جاتے ہیں۔ نوزی کہانی کہتے کہتے سو گئی۔

(نذیر بیرزادہ بر لاس بی۔ اے (آنرز) سرپرست دائرہ ادبیہ

---

# چھوٹے پتّے آؤ

چھوٹے پتّے آؤ۔ ہوا نے ایکدن کہا۔
میرے ساتھ مرغزاروں میں آؤ اور کھیلو۔
اپنے سرخ اور سنہری لباس پہنو۔
کیونکہ موسم گرما بیت گئی ہے۔ اور خنکی ہاتھ پاؤں نکال رہی ہے۔

جونہی پتوں نے ہوا کا بلند سندیسہ سنا۔ وہ نیچے پھڑ پھڑا کر آ رہے۔

ایک نے دوسرے کا ہاتھ دیا۔ بھورے کھیتوں پہ رقص شروع کر دیا۔ اور اڑنے لگے، اپنا ملائم راگ چھیڑا۔

"جھینگر، خدا حافظ۔ ہم اتنے عرصہ آپ کے دوستدار رہے ہیں۔ اب خدا حافظ۔

چھوٹی ندی۔ اب ہمیں اپنے رخصتی راگ سے خبردار کرو۔ اور ہمیں یقین دلاؤ۔ کہ تم ہماری جدائی سے غمناک ہو۔

آج کے بعد پھر ملاقات ہرگز نہیں ہوگی

پیارے چھوٹے مینہ۔ اب تمہاری ماں تمہیں سردی اور مصائب سے محفوظ رکھیگی۔

کس ناز برداری سے ہم نے تمہاری حفاظت مرغزاروں اور گھاٹیوں میں کی ہے۔

ہمیں بتاؤ۔ کیا ہماری یاد تمہارے دل میں باقی رہیگی

رقص کرتے ہوئے اور چکر کھاتے ہوئے چھوٹے پتے چلے۔ وہ اپنی قسمت پر رضامند تھے۔

جلدی وہ اپنے خاکی بستروں پہ گہری نیند میں سو گئے اور برف نے اپنی چادر ان کو اوڑھا دی۔

(کرسٹینا رسیٹی) "معمر"

---

خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری ضرور لکھیں

ایک مختصر افسانہ ← **بیوہ** ← از قلم جناب حیات ترین صاحب

اس کی انگلیاں تھک کر چور ۔ اس کے پپوٹے بھاری اور لال اور اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے ۔ وہ غریب ۔ بیوہ تھی لیکن پھر بھی مصروف تن سینے میں مصروف تھی ۔ اور غمگین اور درد ناک آواز سے گا رہی تھی ۔

مرغ سحر کی بانگ سے کام شروع کرتی ہوں ۔ جب تک ٹوٹی ہوئی چھت میں سے ستارے چمکتے ہوئے دکھائی نہیں دیتے میں کام کو نہیں چھوڑتی ۔ اے آزادی کے دعویدارو ! کیا تم نے عورتوں کو بھی آزادی دی ہے ۔

میرا سر چکرانے لگتا ہے ۔ میری آنکھیں بھاری ہو جاتی ہیں میری نظر تھک جاتی ہے لیکن میں کام کرتی رہتی ہوں ۔ آخر کار میں اونگھ جاتی ہوں لیکن خواب میں بھی کپڑے سیتی ہوں ۔ اے دنیا کے لوگو ! اگر تمہاری عزیز بہنیں ہیں ۔ اگر تم ماں کے لاڈلے بچے ہو اگر تمہاری بیویاں ہیں ۔ تو تم سمجھ سکو گے کہ تم کپڑے نہیں پہن رہے بلکہ مجھ بدنصیب عورتوں کی زندگیاں ختم کر رہے ہو ۔ کیونکہ ہم غریبی اور تنگدستی میں اس قدر کام کر کے تمہارے کپڑے نہیں سی رہیں ۔ بلکہ اپنے کفن تیار کر رہی ہیں ۔

لیکن موت کا ذکر کیوں کرتی ہوں ؟ اے موت ! میں تجھ سے نہیں ڈرتی ۔ کیا ان فاقوں نے میری شکل تجھ سی ڈراؤنی نہیں کر دی ؟ اے خدا ! کیا یہ انصاف ہے ؟ کہ روٹی اس قدر مہنگی اور انسانی خون اور پسینہ اس قدر سستا ۔

میں اس قدر کام کرتی ہوں ۔ لیکن مجھے اس کی اجرت کیا ملتی ہے ؟ گھاس پھوس کا بستر سونے کے لئے ۔ روٹی کا ٹکڑا کھانے کو پہننے کے لئے چیتھڑے ۔ وہ ٹوٹی ہوئی چھت یہ گیلا فرش اور وہ مٹی کے برتن ۔ میرے کمرے کی دیواریں مکھیوں کے بیٹھنے اور گرد پڑنے سے اس قدر سیاہ ہو گئی ہیں ۔ کہ بعض دفعہ مجھے یہ شک گذرتا ہے ۔ کہ ان پر میرا سایہ پڑا ہوا ہے ۔

اے دسمبر کی برفانی ہوا تو مجھے نہ ستا ۔ اے بہار کے خوشگوار موسم ! تو مجھ خون آرزو کو پر بہار کرانے کی کوشش نہ کر ۔ اے ہرے بھرے درختوں کے پھل ! پھولوں سے لدی ہوئی ڈالیوں میں جھولا جھولنے والے پرندو ! تم مجھے نہ للچاؤ ۔ کیونکہ مجھے کام کرنا ہے ۔

میرا دل اکتا جاتا ہے ۔ میرا دماغ تھک جاتا ہے ۔ میرے ہاتھ جواب دے دیتے ہیں ۔ لیکن میں کام میں لگی رہتی ہوں ۔ میرا دل چاہتا ہے ۔ کہ میں باغ کی سیر کو جاؤں ۔ میرے سر پر نیلا نیلا آسمان ہو ۔ میرے پاؤں تلے ہری ہری گھاس ہو ۔ میرے آس پاس خوشبودار پھول ہوں ۔ میں پھر وہی خوشی محسوس کروں جو میں پہلے کرتی تھی ۔ جب میں دنیا کی مصائب سے ناواقف تھی ۔ لیکن میں جانتی ہوں ۔ کہ یہ خیال خام ہے ۔ اب دنیا میں میرے لئے کوئی خوشی نہیں ۔

کہتے ہیں ۔ رونے سے دل کو تسکین ہوتی ہے ۔ لیکن میں نہیں روتی ۔ کیونکہ میرا ہر ایک آنسو میرے کام میں مخل ہوتا ہے

کاش میری آواز ان لوگوں تک پہنچ سکے جو اونچے محلوں میں رہتے اور پلنگوں پر سوتے ہیں ::

حیات ترین

———:———

# منشیات کا بے پناہ سیلاب

(از جنابہ محترمہ ص۔ ب صاحبہ منپشنر محکمہ ڈاکٹری)

یہ امر اب کسی تشریح کا محتاج نہیں رہا۔ کہ اپنے ہندوستان کی اقتصادی بدحالی اور اخلاقی بے مائیگی کا موجب منشیات کا غیر ضروری استعمال ہے۔ بجائے اس کے کہ ان منشیات (نشے والی اشیا) کو ادویات کے طور پر یا ادویات کے اجزا کی حیثیت سے کام میں لایا جاتا۔ بطور تفریح استعمال کرنا شروع کر دیا۔ کسی ملک میں شراب ہوگی۔ یا تمباکو ہوگا۔ مگر ہندوستان میں:۔

(۱) شراب ہے وہ بھی دیسی اور ولائیتی

(۲) افیون ہے۔ جو رفتہ رفتہ انسان کے ہوش و حواس کو زائل کر دیتی ہے۔

(۳) بھنگ ہے۔ جس سے انسان کاہل و سست ہو جاتا ہے

(۴) چرس ہے۔ جو دل جگر کو جلا کر خاک سیاہ کر دیتی ہے

(۵) چانڈو ہے۔ جو انسانی زندگی کو تلف کر دیتا ہے

(۶) گانجا ہے۔ جس کا استعمال تباہی کا موجب ہے

(۷) تاڑی ہے۔ جو دشمن جان ہے۔

(۸) تمباکو ہے۔ جو حقہ میں استعمال ہے۔ سگریٹ۔ بیڑی سگار وغیرہ کی صورت میں پیا جاتا ہے۔ پان میں کھایا جاتا ہے۔ اور نسوار بنا کر برتا جاتا ہے۔ ایک ہندوستان اور اتنے نشے؟ گویا ع

ننھی سی ایک جان مصیبت ہزار ہے

چالیس پینتالیس سال سے حامیان ٹمپرنس ان کے انسداد کے درپے ہیں۔ مگر کامیابی کے لحاظ سے ہنوز روز اول ہے بیسیوں سوسائٹیاں بنیں۔ لاکھوں لیکچر ہوئے۔ ہزاروں پمفلٹ اور ٹریکٹ بانٹے گئے۔ بائسکوپ اور میجک لینٹرن کی نمائشیں ہوئیں مگر نشوں کی ترقی اور روز افزونی میں فرق نہ آیا۔

اس کی وجہ؟ اس کے سوا اور کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ کہ ان کے سدباب کے لئے جس متحدہ آواز اور مشترکہ جد و جہد کی ضرورت تھی وہ کام میں نہیں لائی جاتی۔ عوام میں غفلت اور بے پرواہی کی وجہ سے نشوں کے استعمال میں روز افزوں ترقی ہوتی گئی۔ اور مقتدر رہنمایان ملک نے منشیات کے مسئلہ کو ایک ضمنی مسئلہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کی اقتصادی اور اخلاقی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ لیکن ابھی تک وہی بے حسی اور بے پرواہی :۔

ہندوستان کو مختلف ضروریات کے لئے جو مصارف ادا کرنے پڑتے ہیں۔ ان کی مجموعی رقم پونے تین ارب روپیہ ہے۔ اور اس سے تقریباً ۲/۵ حصہ یعنی ایک ارب ایک کروڑ روپیہ شراب اور نشوں پر برباد ہوتا ہے۔ اس کی اقتصادی اور اخلاقی مشکلات میں مبتلا ہونا ایک معمولی بات ہے۔ مگر افسوس باوجود ان بیّن حقائق اور مصدقہ اعداد و شمار کے رہنمایان ملک کو "اختر شناسی" کا سا خلل دماغ لاحق ہے۔ ان سے آسمان کی پوچھتے ہیں۔ تو وہ زمین کی بتاتے ہیں۔ ان سے کہا جاتا ہے۔ کہ نشوں کے انسداد کی طرف

نون کرو یہ تو وہ معمول آزادی کا۔ شعار کرنے کا پیغام دیتے ہیں — خاطر سے زندگی بسر کی جا سکتی ہے؟ ۵

کیا یہ صبح آزما امید پوری ہونی ہے؟ اور اس امید موہوم پہ کون — تو کار زمین را نکو ساختی — کہ با آسمان نیز پرداختی

ص۔ ب

---

# ماہ ساون

ساون کی ان برساتوں میں
لطیف پیاری راتوں میں
ہوں محو گذشتہ باتوں میں
وہ یاد زمانے آتے ہیں — وہ یاد فسانے آتے ہیں

جب ساون کے دن ہوتے تھے
ہم ہوتا تھا تم ہوتے تھے
یہ فرق فراق نہ ہوتے تھے
سب دور بلائیں ہوتی تھیں — سب دور جفائیں ہوتی تھیں

جب بادل گھر کر آتے تھے
اور ساون مینہ برساتے تھے
تم سینے سے لگ جاتے تھے
اب یاد وہ باتیں آتی ہیں — اب یاد وہ راتیں آتی ہیں

تم آؤ ساون آیا ہے
وہ کالے بادل لایا ہے
مینہ برس دھند کا چھایا ہے
اب تیری یاد میں روتا ہے — اور منہ آنسوؤں سے دھوتا ہے

اک دنیا باغ کو جاتی ہے
اور میٹھے آم بھی کھاتی ہے
ہنس کھیل کے جی بہلاتی ہے
میں آس تمہاری کرتا ہوں — اور آہیں شب بھر بھرتا ہوں

ممتاز

# بچوں کی دُنیا

## آئینہ جہاں نما

ملک چین کا ایک بادشاہ تھا۔ اس کی سلطنت بہت وسیع اور زرخیز تھی۔ رعایا بھی خوش حال تھی۔ اور اپنے بادشاہ کو پیار کرتی تھی۔ قرب وجوار کے تمام بادشاہ چین کے بادشاہ سے بہت ڈرتے اور اس کا ادب کرتے تھے۔ اس بادشاہ کے پاس ایک شیشہ تھا۔ جس کو وہ بہت عزیز رکھتا تھا۔ اور ہر صبح اٹھکر پہلے اس شیشے کو دیکھتا۔ اور اس کے بعد اپنے کاروبارِ سلطنت میں مصروف ہوتا۔ اس شیشے کا یہ وصف تھا۔ کہ اس میں سب ہونے والے واقعات پہلے ہی سے نظر آجاتے تھے۔ اور اس لئے بادشاہ آئندہ پیش آنے والی باتوں کی تیاری کر لیا کرتا تھا۔ اس کو خدا نے تین بیٹے بھی عطا کئے تھے جن سے وہ جان سے زیادہ محبت کرتا تھا۔

ایک روز حسب معمول اپنے بستر استراحت سے اٹھا۔ مگر آئینہ دیکھنا بھول گیا۔ اور اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ شام کو جب اس کو اپنی اس غلطی کا خیال آیا۔ تو دل میں بہت ڈرا۔ کہ نہ معلوم کیا مصیبت نازل ہو۔ فوراً اپنے کمرے میں گیا وہاں جاکر دیکھتا ہے تو آئینہ غائب۔ سارے محل میں شور مچ گیا۔ چاروں طرف تلاش ہونے لگی۔ مگر آئینہ کا کچھ پتہ نہ چلا۔ بادشاہ

رنج و غم سے بیمار ہو گیا۔ دور دور سے علاج کے لئے حکیم آئے۔ مگر کچھ افاقہ نہ ہوا۔

ایک روز تینوں شہزادے جمع ہو کر باپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور ہاتھ باندھکر بولے۔ کہ جہاں پناہ ہم کو اجازت دیں کہ ہم آئینہ کی تلاش میں جائیں۔ اور جہاں سے بھی مل سکے آئینہ ڈھونڈ کر لائیں۔ یہ سنکر بادشاہ کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا۔ اور فوراً اجازت دیدی تینوں شہزادوں نے سفر کی تیاری کی۔ اور اسی روز چل کھڑے ہوئے۔ کئی دن تک سفر کرنے کے بعد وہ ایک جگہ پہونچے۔ وہاں پر ایک بڑا سا پتھر نصب تھا۔ وہاں سے تین راستے نکلتے تھے۔ پتھر پر لکھا تھا۔ کہ پہلی سڑک جاپان کو جاتی ہے۔ دوسری سائبیریا کو جاتی ہے اور تیسری ایک ایسے نامعلوم ملک کو جاتی ہے۔ جہاں سے جاکر کبھی کوئی واپس نہیں آیا۔ پہلا شہزادہ پہلی سڑک پر روانہ ہو گیا۔ دوسرا دوسری سڑک پر۔ اب تیسرے شہزادے کے لئے وہی تیسری سڑک رہ گئی تھی۔ پہلے تو اس کے دل میں کچھ خوف سا پیدا ہوا۔ مگر پھر کمر ہمت باندھی اور خدا کا نام لیکر روانہ ہو گیا۔ ہم پہلے دونوں شہزادوں کو تو ان کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں۔ اور سب سے چھوٹے شیر دل شہزادے کا قصہ آپ کو سناتے ہیں:۔

راستہ بہت مشکل تھا۔ ہر ہر قدم پر ایک نئی تکلیف پیش آتی تھی۔ اسی طرح تین دن راستہ طے کرنے کے بعد شہزادہ ایک پہاڑی کے اوپر پہنچ گیا۔ وہاں ایک بوڑھی عورت بیٹھی چرخہ کات رہی تھی۔ اس کی شکل بہت ڈراونی تھی۔ مگر بہادر شہزادہ بالکل نہ ڈرا۔ اور پاس جاکر بولا نانی اماں سلام۔ بوڑھی عورت نے جواب دیا۔ جیتے رہو بیٹا۔ تم بڑے باادب لڑکے ہو۔ اگر تم مجھے نانی اماں کہہ کر سلام نہ کرتے۔ تو میں تم کو کھا جاتی۔ مگر اب میں تم کو

کوئی نقصان نہ پہونچاؤنگی ۔ تم کو کیا اپنی جان پیاری نہیں ۔ جو تم اس جگہ آئے ہو ۔ یہ ایک ایسا ملک ہے ۔ جہاں سے جان سلامت لیکر کوئی واپس نہیں گیا ۔ میں تم کو نصیحت کرتی ہوں ۔ تم اُلٹے قدم واپس چلے جاؤ ۔ شہزادے نے اس کو اول سے آخیر تک کا سب حال سنایا ۔ اور بولا ۔ جب تک آئینہ نہ ملیگا ۔ میں واپس نہ جاؤں گا ۔ چاہے ۔ اس میں میری جان ہی جاتی رہے ۔ عورت کو بڑا رحم آیا ۔ کہنے لگی ۔ مجھے تمہاری لیاقت، شرافت اور بہادری دیکھ کر تم سے محبت اور ہمدردی ہوگئی ہے ۔ اس لئے تم کو بتاتی ہوں ۔ کہ وہ آئینہ پریاں لے گئی ہیں ۔ یہاں سے سات سو میل کے فاصلہ پر ایک باغ ہے ۔ اس میں پریاں رہتی ہیں ۔ تم موقعہ پاکر چھپ جانا ۔ اس میں بارہ دری ہے ۔ وہیں پر سامنے وہ آئینہ لٹک رہا ہوگا ۔ ہر در پر حفاظت کے لئے ایک ایک پری مقرر ہے ۔ جب ان پریوں کی آنکھیں بند ہوتی ہیں ۔ اس وقت وہ اصل میں جاگتی ہوئی ہیں ۔ اور جس وقت آنکھیں کھلی ہوئی ہوتی ہیں ۔ اس وقت وہ سوئی ہوئی ہوتی ہیں ۔ تم جس وقت بھی ان کی آنکھیں کھلی دیکھو ۔ بالکل نہ ڈرنا ۔ فوراً آئینہ اٹھالینا ۔ اور واپس آجانا ۔ وہاں پر سونے چاندی اور ہیرے جواہرات لگے درخت ہیں ۔ دیکھو لالچ میں پڑ کر وہاں سے کوئی چیز توڑنے کی کوشش مت کرنا ۔ ورنہ پریاں فوراً جاگ جائیں گی ۔ اور تم ان کے ہاتھ میں گرفتار ہو جاؤ گے ۔ شہزادے نے اس کا بہت شکریہ ادا کیا ۔ اور سلام کر کے روانہ ہو گیا ۔

شہزادہ سوا دو مہینے کی مسافت کے بعد اسی مقام پر پہونچ گیا ۔ موقع پاکر باغ میں چھپ رہا ۔ جب پریوں کی آنکھیں کھلی ہوئی نظر آئیں ۔ آہستہ سے بارہ دری میں داخل ہوا ۔ اور آئینہ

اٹھالیا۔ اور وہاں سے بھاگا۔ بھاگتے بھاگتے دل میں کہنے لگا۔ کیسے کیسے نایاب سونے چاندی کے جڑاؤ درخت ہیں۔ اگر میں ایک شاخ توڑ لوں تو کسی کو کیا معلوم ہوگا۔ پریاں تو غافل سو رہی ہیں۔ مگر جیسے ہی شہزادہ نے شاخ کو پکڑا۔ اسی لحہ پریوں نے آکر گرفتار کر لیا۔ تین مہینے تک گرفتار رہا۔ ہزاروں خوشامدیں کرتا۔ مگر پریوں پر کچھ اثر نہ ہوتا۔ آخر انہوں نے اس شرط پر رہا کیا۔ کہ ہم کو جس طرح بھی ہو سکے۔ سفید دیو کے سرہانے جو گلاب کا درخت لگا ہوا ہے۔ اس کا پھول توڑ کر لا دے شہزادے نے پھول توڑ کر لادینے کا اقرار کیا اور رہا کر دیا گیا۔ دل میں اپنی بیوقوفی پر بہت پشیمان تھا۔ کہ اس ضعیف عورت کی نصیحت پر عمل نہ کیا۔ اور لالچ میں پڑ کر اپنی جان مصیبت میں پھنسا دی۔ مگر اب پچھتائے کیا ہو وت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ پھر سوا دو مہینے سفر کرنے کے بعد اسی پہاڑی پر ضعیفہ کے پاس جا پہنچا۔ اور اپنا سب حال سنایا۔ وہ سنکر بہت خفا ہوئی اور کہنے لگی اب تم اپنے ملک کو واپس چلے جاؤ۔ میں تم کو کچھ نہیں بتاؤنگی۔ شہزادہ گردن نیچی کر کے شرمندگی سے بولا۔ قصور تو میرا بہت ہے۔ کہ تمہارے کہنے پر عمل نہ کیا۔ لیکن اب پھر ایسا کبھی نہ کروں گا۔ اس دفعہ معاف کر دو۔ اور میری رہنمائی کرو۔ ضعیفہ کو ترس آگیا۔ اور بولی یہاں سے مغرب کی طرف تین مہینے کی راہ پر سفید دیو کا محل ہے۔ محل کے پھاٹک پر داہنی طرف ایک شیر اور بائیں طرف ایک بکرا بیٹھا رہتا ہے۔ شیر کے سامنے گوشت اور بکرے کے سامنے گھاس پڑی رہتی ہے۔ تم جاتے ہی شیر کے سامنے گھاس اور بکرے کے سامنے گوشت ڈال دینا۔ اور محل کے اندر داخل ہو جانا۔ سامنے ایک بڑا عالیشان سنگِ مرمر کا بنا ہوا کمرہ نظر آئے گا۔ جس کے دو دروازے ہیں ایک دروازہ بند ہوگا۔ ایک کھلا ہوا۔ تم کھلے ہوئے دروازے کو بند کر دینا۔ اور بند کو کھول کر

اندر جانا۔ اسی کمرے میں سفید دیو سوتا ہے۔ تم بہت آہستگی کے ساتھ داخل ہو کر اس کے سرہانے جو پودا ہے اور جس میں ایک ہی گلاب لگا ہوا ہے۔ اس کو توڑ لینا اور واپس آجانا۔ راستے میں پھول کو بالکل نہ سونگھنا۔ ورنہ فوراً دیو سفید آکر پکڑ لیگا۔ اور پھر ایک نئی مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔ شہزادے نے ضعیفہ کی تمام مہربانی کا تہ دل سے شکریہ ادا کیا۔ اور پھر روانہ ہو گیا۔ تین مہینے تک سفر کرنے کے بعد



آخر دیو سفید کے محل کے پاس جا پہنچا۔ پھاٹک پر ایک شیر اور بکرا بیٹھا تھا۔ شیر کے سامنے گوشت بکرے کے سامنے گھاس پڑی ہوئی تھی۔ شہزادے نے ضعیفہ کی ہدایت کے مطابق گوشت بکرے کے آگے اور گھاس شیر کے آگے رکھدی اور محل میں داخل ہو گیا۔ سامنے ایک بڑا عالیشان خوبصورت سنگ مرمر کا کمرہ نظر پڑا جس کا ایک دروازہ کھلا اور دوسرا بند تھا۔ شہزادے نے کھلے ہوئے دروازے کو بند کیا۔ اور بند دروازے کو کھولکر کمرے کے اندر چلا گیا اور نہایت آہستگی سے سفید دیو کے سرہانے سے گلاب کا پھول توڑ لیا اور سر پر پاؤں رکھکر بھاگا

جب محل سے بہت دور نکل آیا۔ تو پھر دل میں خیال ہوا۔ اب تو محل سے کوسوں دور نکل آیا ہوں۔ سفید دیو کو کیا معلوم ہو گا۔ اگر پھول سونگھ لوں۔ یہ سوچتے ہی پھول سونگھ لیا۔ جیسے پھول ناک کے قریب لایا۔ فوراً دیو موجود ہوا۔ شہزادے فوراً تلوار میاں سے نکالکر اس سے لڑنیکی کوشش کی۔ مگر مقابلہ بے سود تھا۔ کہاں انسان کہاں دیو۔ آخر کار دیو اسکو اپنی ہاتھوں میں دبوچ کر لے گیا۔ اور ہر روز

صبح پہلے اس کی اچھی طرح پر گوشمالی کرتا پھر اس کو تمام دن اپنے قالب سے کسی دوسرے قالب میں آنے کی جا ہے وہ انسان ہو حیوان ہو یا پرندہ تعلیم دیتا۔ اور پھر شام کو اس کی خوب مرمت کرتا۔ اور کہتا کہ جو کچھ میں نے تجھکو پڑھایا ہے۔ اس کو بالکل بھلا دے۔ پھر مارتے مارتے شہزادے کو نیم جان کر دیتا۔ اور اس سے اقرار کرا لیتا۔ کہ ہاں جو کچھ میں نے پڑھا ہے میں سب کچھ بھول گیا ہوں تو اس کو چھوڑ دیتا۔ اسی طرح ایک مہینہ بسر ہوا۔ اب سفید دیو نے شہزادے کو رہا کر دیا۔ مگر اس شرط پر کہ وہ اس کو جنوں کے بادشاہ کی بیٹی زرنگار کو لادے شہزادہ سخت پریشان اور بیوقوفیوں پر شرمندہ تھا۔ دل میں کہتا تھا۔ اگر میں ضعیفہ کی ہدایت پر عمل کرتا۔ تو کیوں ان مصیبتوں میں گرفتار ہوتا۔ اب تک تو آئینہ لیکر کبھی کا اپنے ملک میں پہنچ چکا ہوتا۔ معلوم نہیں۔ میرے والد کا کیا حال ہو گا۔ اس نے اپنے دل میں پکا عہد کیا کہ آئندہ اپنے بزرگوں کا ضرور کہنا مانے گا۔ اور کبھی حکم عدولی نہ کرے گا۔ (باقی آئندہ)

---

## محقق کے متعلق رائے

رسالہ اسم با مسمیٰ ہے۔ حصۂ نظم بھی خوب ہے۔ ترتیب و تدوین بھی اچھی ہے دعا ہے کہ اللہ تعالےٰ اسے ہر طرح ایک کامیاب جریدہ ثابت کرے۔ کتابت خاطر خواہ نہیں۔ شاید بہاولپور میں اس کے لئے آسانیاں نہیں ؛

سید مظہر گیلانی
ناظم دائرہ ادبیہ

# سورج کس چیز کا بنا ہوا ہے

سورج روشنی کا ایک چمکدار کرہ ہے جس کی شعاعیں اس قدر روشن ہیں کہ ہم دیر تک اس کے دیکھنے کی تاب نہیں لا سکتے تاوقتیکہ بادل اس کے گرد محیط نہ ہوں یا کسی دھندلے شیشے میں سے اسے نہ دیکھا جائے۔ اس وقت تک یہ ایک سرخ کرہ معلوم ہوتا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ سورج بھی زمین کی مانند ہوائی طبقات سے گھرا ہوا ہے۔ لیکن ان طبقات میں آکسیجن اور نائیٹروجن گیس نہیں پائی جاتی۔ جو کرہ ہوائی میں موجود ہیں۔ سورج کے گرد ہائیڈروجن، ہیلیم اور ایسی بہت سی گیسوں کا غلاف ہے اس میں بہت سی دھاتوں کے بخارات بھی شامل ہیں۔ منجملہ چھیاسٹھ مختلف دھاتیں سورج کی ذات میں معلوم ہوئی ہیں سورج کا حجم بہت بڑا ہے۔ سورج کی سطح سے کچھ گیسیں تو پانچ سو میل کی بلندی تک ہیں۔ مگر ہائیڈروجن ہیلیم اور کیلسیم نو ہزار میل کے فاصلے تک پائی جاتی ہیں۔

سورج بہت گرم ہے۔ چھ ہزار درجہ حرارت جو ہمیں یہاں پر بہت زیادہ محسوس ہوتا ہے۔ یہ سورج کا سب سے کم درجہ ہے۔ اور سورج کے وسط میں درجۂ حرارت تیس اور ساٹھ لاکھ کے درمیان بیان کیا جاتا ہے۔ حرارت کے نشر کرنے میں سورج کی کچھ قوت صرف ہو جاتی ہے اور اس لئے سورج سے باہر نکل جاتی ہے اور اس کا وزن کم ہو جاتا ہے۔ اس طرح سے ہر ثانیہ میں سورج میں چالیس لاکھ ٹن وزن کم ہو جاتا ہے۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ سورج اس قدر بڑا ہے کہ اگر دس لاکھ سال تک بھی اس میں یہ کمی ہوتی رہے تو ہمیں اس کی حرارت میں نمایاں فرق معلوم نہیں ہوگا

یہ معلوم کیا گیا ہے کہ سورج زمین کی طرح اپنے محور کے گرد گردش کرتا ہے۔ چونکہ یہ ایک بہت بڑا نیم سیال جسم ہے اس لئے محور کے گرد گھومتے وقت اس کی ہر جگہ ایک ہی رفتار سے گردش نہیں کرتی۔ خط استوا کے مقام پر ۲۴½ دن میں اور دوسرے مقامات پر ۲۵½ دن میں اپنا چکر پورا کرتا ہے

سورج نظام شمسی کا مرکز ہے۔ زمین سے اس کا فاصلہ ۹۳۰۰۰ ہزار میل ہے اس کا قطر ۸۶۵۰۰۰ ہزار میل ہے۔ اس کا وزن مخصوص زمین کی نسبت ۳۳۲۰۰۰ ہزار گنا ہے۔

یہ محور پر بھی گردش کرتا ہے اور اس کے علاوہ تمام نظام شمسی کے ساتھ ایک اور بڑے ستارے کے گرد گھومتا ہے اس جسامت کا اندازہ شاید اس بات سے لگایا جا سکے کہ سورج کے داغوں میں بعض کا قطر ۳۰۰۰۰ ہزار میل ہے اگر سارا کرۂ ارض ان میں سے ایک داغ کے اندر چلا جائے (جو اصل میں ایک گہرا کنواں ہے) تو ہماری زمین کا پتہ بھی نہ چلے۔ چونکہ زمین کا قطر ۷۹۰۰ ہزار میل ہے۔ سورج کے ایک مربع میٹر میں سے فی منٹ اتنی گرمی نکلتی ہے کہ دو سو پانی کے ۱۰۰۰ ہزار کلوگرام کو برف سے لیکر کھولانے کے درجۂ حرارت تک پہنچانے کے لئے کافی ہے۔

(ادارہ)

# غزل

از جناب ماسٹر عبد الرحمٰن صاحب آزاد

دشمن سمجھ کے دیکھ یا بیگانہ وار دیکھ — جس طرح دیکھ دیکھ سوئے بیقرار دیکھ
دردِ فراق اور غمِ انتظار دیکھ — میرے دلِ غریب پہ دو طرفہ مار دیکھ
آغازِ کار دیکھ کے انجامِ کار دیکھ — وہ بھی بہار دیکھی تھی یہ بھی بہار دیکھ
واعظ تیری نظر کا سراسر قصور ہے — ظالم میری نگاہ سے رنگِ بہار دیکھ
اے دل یہیں کیا کرو جو ہوا حال کس طرح — کس نے کہا تھا تجھ سے سوئے طرحدار دیکھ
دیکھا کوئی حباب تو دل کہہ اٹھا مرا — یہ ہے بساطِ ہستیِ ناپائدار دیکھ
آجا کبھی تو نیند کے ہمراہ آنکھ میں — کب سے پڑا ہے بند درِ انتظار دیکھ
سمجھا دے کوئی چشمِ حقیقت شناس کو — جب فصلِ گل نہ ہو تو خزاں کی بہار دیکھ
دل ڈھونڈھتا ہے پھر تری پہلی نگاہ کو — ہاں پھر اُسی ادا سے مجھے ایکبار دیکھ
خورشید سرفرازِ سعادت نہیں سہی — تو ذرہ ہی سمجھ کے سوئے خاکسار دیکھ
اے دل پیامِ عیش ہیں جن کی ہر اک ادا — وہ سامنے کھڑے ہیں مجسم بہار دیکھ
اصرارِ شوقِ دید پہ شوخی تو دیکھئے — منہ پھیر کر وہ کہتے ہیں ہاں بار بار دیکھ

آزاد جیتنا ہے اگر عرصۂ حیات
دل کو قمار خانۂ الفت میں ہار دیکھ

آزاد عفی عنہ

(یہ غزل جناب آزاد صاحب نے عباسیہ لٹریری لیگ کے اس مشاعرہ میں پڑھی جس کا ذکر شذرات میں کیا گیا ہے۔

# سقراط اور اس کا فلسفہ

(از جناب ع ح جمیل علوی ایم۔ اے ممبر برٹش سیکولاجیکل سوسائیٹی)

افلاطون نے سقراط کی زندگی کو دو حصوں میں منقسم کیا ہے زندگی کے پہلے حصے میں وہ ایک مذہبی آدمی ہے جو علوم مروجہ کی تحقیقات میں مشغول ہے۔ زندگی کے دوسرے حصے میں وہ اہل ایتھنز میں اس تعلیم کی تبلیغ کرتا پھرتا ہے۔ اور انہیں نیکی کی ترغیب دلاتا پھرتا ہے۔ ارسطفنی (APISTOPHNES) نے سحاب ۴۲۳ ق م میں لکھکر سقراط کی زندگی کے پہلے حصے پر کچھ روشنی ڈالی ہے۔ اس وقت سقراط محض ۴۷ سال کا تھا۔ اور زینوفن اور افلاطون محض بچے ہی تھے۔ جس قسم کی تصویر ارسطفنی نے سحاب میں کھینچی ہے۔ اس کو دلچسپ بنانے کے لئے بہت سی من گھڑت باتیں زائد کرنی پڑتی ہیں۔ ہاں تصویر کی بنیاد حقیقت پر مبنی ضرور ہوتی ہے۔ سحاب پر غور کرنے کے لئے ہمیں یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ کیا نوجوانی کی حالت میں سقراط ایسا تھا؟ شروع شروع میں سقراط کو قدرتی علوم حاصل کرنے کا خاص شوق تھا۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ "سحاب" کی تحریر کے مطابق وہ فی الواقع آسمان اور زمین کی چیزیں دریافت کرنے میں کوشاں ہوگا۔ ارسطفنی سحاب لکھنے سے قبل اس بات سے واقف تھا۔ کہ وہ اپنے شاگردوں کو اکثر کہا کرتا ہے کہ کمزور دلائل کو مناسب اور اچھے پیرائے میں پیش کرنا چاہیئے۔ بس اسی حقیقت کی بنیاد پر ارسطفنی نے سقراط کا مذاق اڑایا اور اسے دوستوں کے طبقہ میں بدنام کیا۔

زینوفن کا جب سقراط کے ساتھ تعارف ہوا۔ تو سقراط اس وقت بالکل بوڑھا ہو چکا تھا۔ اور سقراط کو زہر دینے سے تین سال قبل وہ ایتھنز کو ہمیشہ کے لئے الوداع کہہ چکا تھا۔

"یادگار سقراط" میں سقراط کو بے گناہ ثابت کرنے کے لئے اس نے ان باتوں کے ماننے سے انکار کردیا ہے جس کی رو سے سقراط نوجوانی کی حالت میں قدرتی اشیا کی حقیقت دریافت کرنے میں کوشاں رہتا تھا۔ زینوفن نے یہ بھی لکھا ہے۔ کہ وہ اوروں کو بھی اس علم کے حاصل کرنے سے منع کیا کرتا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ سقراط ان علوم سے بے بہرہ نہیں تھا معلوم ہوتا ہے کہ زینوفن نے "مکالمات افلاطون" کی مدد سے بھی یادگار سقراط لکھی ہے۔ ورنہ اس کے لئے سقراط کی تعلیم کے متعلق لکھنا امر محال تھا۔ کیونکہ وہ خود سپاہی تھا۔ اور ان علوم سے ناواقف۔ دوسرے سقراط کے ساتھ اس کے تعلقات بھی کچھ اچھے نہ تھے۔ لیکن پروفیسر لینڈزے کے قول کے مطابق اگر "یادگار" کو تاریخی کتاب فرض کرلیا جائے۔ تو معلوم ہوگا کہ سقراط کی اس نے وہ تصویر کھینچی ہے۔ جس کو صرف سقراط کا ایک بڑا مداح ہی کھینچ سکتا ہے۔ نیز زینوفن کا "اعتذار" نہایت ہی مؤثر پیرائے میں لکھا گیا ہے۔ اگر حقیقت میں سقراط ایسا ہوتا۔ تو یقیناً سزائے موت سے بچ جاتا۔

ہم مندرجہ بالا تقسیم سے اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ کہ اگر ہمارے لئے زینوفن اور ارسطفنی کے سقراط کو ایک ہی خیال کرنا مشکل ہے۔ تو اس بات کے ماننے میں ہمیں کوئی دقت نہیں اٹھانی

پڑتی۔ کہ دراصل انہوں نے افلاطون کی سقراط کے تصویر کے دو مختلف پہلو دکھائے ہیں۔ افلاطون نے اپنے مقالات میں صرف چشم دید واقعات پر ہی اکتفا کی ہے۔ اس لئے سقراط کی صحیح صحیح تعلیم معلوم کرنے کے لئے بعض مقامات افلاطون کو ہی دیکھنا پڑتا ہے۔ ہم انہیں سے واضح صحیح حالات اخذ کر سکتے ہیں۔ حالات سے ہمیں سقراط کے ساتھیوں دوستوں کا پتہ اچھی طرح چل سکتا ہے فیڈو میں اس کے تیرہ رفقا کے نام درج کئے گئے ہیں۔ جو اس کی موت کے وقت وہاں موجود تھے۔ اس فہرست میں ہمیں اس کے راوی فیڈن کا نام بھی اضافہ کرنا پڑتا ہے جس نے بعد میں ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی۔ ان رفقا میں سے نو ایتھنز کے رہنے والے تھے۔ یعنی "اپولوڈورس" APPOLODORAS قریطوبولس CRITOBOLUS اور اس کا باپ قریطن ہرموجنیس (HERMOGENES) ہقانیقاس (HAKANIKAS) "انٹی تھنیس" "ایشینس" "انیط تھنیس" "قطیسیفاس" اور "مینکسینس" زینوفن نے اپنی فہرست میں "جیرافون" کے نام کا اضافہ کیا ہے لیکن "اعتذار" سے ہمیں پتہ چلتا ہے۔ کہ وہ اس وقت سے کچھ عرصہ پہلے وفات پا چکا تھا۔ ان رفقا کی فہرست میں کچھ اطالوی مدرسہ سے تعلق رکھنے والے بھی موجود ہیں۔ اور جو ایتھنز صرف اس لئے آئے تھے۔ کہ سقراط کی شہادت کا وقت ملاحظہ کریں۔ یہ فیثا غورث کے ماننے والے اور فلالاس PHILOLAOS کے مرید تھے۔ ان کے نام یہ ہیں۔ "تھیبانس" THEBANS "سمیاس" SIMMIAS "قیباس" CABAS اور فیدنداس PHAIDONDAS قریطو سے پتہ چلتا ہے۔ کہ سمیاس ایک معقول رقم سقراط کے رہا کرنے کے لئے اپنے ساتھ لایا۔ زینوفن نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ افلاطون نے لکھا ہے کہ فیثاغورث کے معتقد سقراط کو اپنے سے برتر تسلیم کر چکے تھے۔ اور اکثر اس سے قدیم مسائل کے متعلق پوچھا کرتے تھے۔ اور بعض وقت بذریعہ سقراط کی تشریح کو ثبت بھی کر لیا کرتے تھے۔ فلالاس کے جلاوطن ہونے کے بعد سقراط فیثاغورثیوں کا صدر تسلیم کیا گیا۔ سقراط کی تعلیم کا ذکر کرنے سے پہلے اس کے مختلف رفقا کا کچھ نہ کچھ ذکر کرنا ضروری تھا۔ اب ہم سقراط کی تعلیم کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

سقراط کی ضروری تعلیم "اخلاقیات" ہے۔ وہ اس بات پر مصر ہے۔ کہ نیکی حاصل نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا۔ تو ایتھنز کے بہترین سیاست دان اپنے بیٹوں کو اس نیکی کی تعلیم دینے میں کامیاب ہو جاتے۔ لیکن حالات بالکل برعکس ہیں۔ یہ کہنا بھی نامناسب ہے کہ "سوفسطائی" اس کی تعلیم دیتے ہیں۔ کیونکہ اگر ایسا ممکن ہوتا۔ تو سیاست دان اصحاب اپنے بچوں کو سوفسطائیوں سے نیکی کی تعلیم دلوا سکتے جس طرح کہ وہ انہیں موسیقی اور سواری کی تعلیم دلواتے ہیں۔ اصل میں نیکی محض اتفاق سے آتی ہے۔ یا صرف خدا کی عنایت سے۔ یہ نعمت غیر مترقبہ کسی کو دی جاتی ہے۔ اور کسی کو اس سے محروم رکھا جاتا ہے جن کے پاس یہ ہے۔ وہ اس کی اصلیت سے ناآشنا ہیں۔ اور اس لئے اس کے ظاہر کرنے سے بالکل قاصر ہیں۔ ان کی مثال شعرا جیسی ہے۔ جو ایک خاص کیفیت میں آکر ایسی ایسی نظمیں لکھتے ہیں۔ کہ بعد میں خود بھی ان کا مطلب سمجھنے سے عاجز آجاتے ہیں۔ اس کا ذکر سقراط نے "اعتذار" میں بھی کیا ہے۔ افلاطون اس سے متفق نہیں۔ اس کے نکتہ نظر سے نیکی حاصل کی جا سکتی ہے سقراط کے زمانہ میں نیکی اور اس کی تعلیم کا بہت چرچا تھا۔ لوگ

اسباب کو مانتے تھے۔ کہ نیکی تعلیم کے ذریعے ممکن ہے سو وہ کہتے تھے چونکہ نیکی اور علم دونوں لازم ملزوم ہیں۔ اس لئے نیکی کی تعلیم ممکن ہے سوفسطائی اس خیال میں۔ کہ نیکی کی تعلیم مندرجہ بالا معنوں میں ممکن ہے۔ غلط نہ تھے۔ لیکن اسباب میں وہ ضرور غلطی پر تھے۔ کہ نیکی جس کی وہ تعلیم دیتے تھے۔ علم کے ساتھ متعلق نہ رکھتے تھے۔ نیز وہ کہتے تھے کہ نیکی کی تعلیم ان کے سوا ناممکنات سے ہے۔ سقراط اس بات پر مصر ہے۔ کہ عدالت، عقل اور شجاعت ایک ہی نیکیاں ہیں۔ لیکن اکثر اسباب سے منکر تھے۔ اور وہ یہ نہیں مانتے تھے۔ کہ ان میں سے کوئی بھی قدرت سے خود بخود آسکتی ہے۔

ایسقراط نے علم اور اعتقاد میں فرق رکھا ہے۔ اس کا قول ہے۔ کہ مفید چیزوں کے متعلق اعتقاد رکھنا فضول چیزوں کے علم سے بہتر ہے۔

"ایسقراط"[1] نے جو افلاطون سے عمر میں بڑا تھا۔ سوفسطائیوں کے خلاف ایک رسالہ لکھا جس میں یہ تحریر کیا ہے۔ کہ سوفسطائی اپنا اکثر وقت تنازعوں میں گزار دیتے ہیں۔ اور ظاہر یہ کرتے ہیں۔ کہ یہ نوجوانوں کو ان کے فرائض منصبی کی تعلیم دیتے ہیں نیز یہ کہ خوشی کس طرح حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس رسالے کے اخیر میں اس نے بھی سقراط کی طرح سوفسطائیوں کے قول کا انکار کر دیا ہے۔ کہ صدق اخلاقیات کی تعلیم ممکن ہے۔ یہ رسالہ اس نے ۳۹۰ ق م میں ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالنے کے بعد تحریر کیا۔ یہ رسالہ فالیقراط (سوفسطائی) کے رسالہ کا جواب تھا۔ جو اس نے سقراط کے خلاف لکھ کر یہ ظاہر کیا تھا کہ سقراط کو موت کے گھاٹ اتارنا نہایت ضروری تھا کیونکہ نوجوانوں پر اس کی تعلیم کا بہت برا اثر پڑ رہا تھا۔ اس جواب رسالہ میں ایسقراط نے علم اور اعتقاد میں فرق کیا ہے۔ لیکن ہم اس تفاوت کو سقراط کی تعلیم کے ساتھ ہی موسوم کریں گے۔ نیز یہ اصول کہ تمام نیکیاں ایک ہی ہیں۔ اور ان کا علم بھی ایک ہی ہے:۔

"نیکی" سے اس زمانے میں جو مراد لی جاتی تھی۔ وہ ہم اچھی طرح معلوم کر سکتے ہیں۔ "سوفسطائی" اپنے تئیں یہ ظاہر کیا کرتے تھے۔ کہ وہ اپنے شاگردوں کو انسانی اور شہری نیکی کی تعلیم دیتے ہیں۔ یونانی نیکی سے ہمیشہ کچھ مثبت ہی مراد لیتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ نیکی نفس کی ایک ایسی عادت ہے۔ جو مالک کو کچھ کرنے پر مائل کرتی ہے۔ کہ وہ عادت کسی برے کام کرنے سے منع کرے یعنی نیکی ہمیشہ "امر" کا حکم رکھتی ہے۔ ان کے خیال میں نیک وہ ہوتا تھا جو کسی کام کے لئے نیک ہو۔ اور جو کچھ کرتا بھی ہو۔ محض یہی نہیں۔ کہ وہ چند مخصوص کام کرنے کا عادی نہ ہو۔ یہاں تک نہ تو سقراط۔ نہ ہی افلاطون اور نہ ارسطو کو کوئی اعتراض ہے۔ "نیکی" جو سقراط نے علم کے ساتھ مخصوص کی ہے کسی قسم کی تھی لیکن اس نے عملی کاموں کے لئے صحیح اعتقاد کی ضرورت کو تسلیم کیا ہے "میتو" (۹۷) میں اس نے کہا ہے کہ اگر تم لاریسا جانا چاہتے ہو۔ تو راستے کے علم اور اس کے صحیح اعتقاد کی وجہ سے تم با آسانی وہاں تک پہنچ جاؤ گے۔ اس کے اس مسئلہ تعلیم کے ماننے میں کوئی چیز بھی مانع نہیں۔ وہ معمولی تجربوں کی ضرورت کا منکر نہیں تھا۔ ان کا اور تعلیم کا مقصد ایک ہی ہے۔ اگرچہ یہ منتشر اور نامکمل

[1] ISOCRATES افلاطون کا ہمعصر "سقراط" فیڈرس (۲۷۹) میں اس کے متعلق کہتا ہے۔ "ایسقراط ابھی نوجوان ہے لیکن میں اس کے متعلق پیشینگوئی کرتا ہوں۔ اس کی تقریر "لائسیس" سے زیادہ دلکش ہے۔ اور یہ اخلاق حمیدہ کا مالک ہے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی اگر وہ بڑا ہو کر نہایت مؤثر تقریریں کرے۔ اور سب سے بازی لے جائے:۔

ہیں اس کے کہنے کا یہ مدعا ہرگز نہیں تھا کہ بڑے بڑے سیاست دان کوئی بھی نیکی نہیں کر سکتے۔ سقراط نہ ہی شعرا کے کلام کا منکر تھا۔ اگر زمانہ اول کے سیاست دانوں نے کوئی بھی نیکی نہیں کی۔ تو یہ کوئی حیرانی کی بات نہیں۔ کہ وہ اپنے بیٹوں کو اس نیکی سے مطلع نہ کر سکے۔ اس مسئلہ میں کمزوری یہ ہے۔ کہ یہ عقلی دلائل پر مبنی ہے۔ اور بعض وجوہات کے سبب اس کو یقین تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ سقراط نیکی کے متعلق آگے جا کر کہتا ہے کہ نیکی بھی علم ہے لیکن اسے فن کہنا غلطی ہے یعنی کوئی آدمی اس کو اکتساب کر کے اپنی مرضی کے مطابق تصرف میں نہیں لا سکتا۔ جمہوریہ میں افلاطون نے سقراط کی زبان ایں لکھا ہے۔ کہ اگر نیکی فن ہے۔ تو ایماندار آدمی مکمل چور ہے جس طرح سے ایک حکیم نہایت ہی کامیابی سے قاتل بن سکتا ہے۔ جو آدمی کسی فن کو اچھے کام کے لئے استعمال کر سکتا ہے وہ اس کو برے کام میں بھی برت سکتا ہے۔ اس لئے نیکی "فن" نہیں ہو سکتی۔ سوفسطائیوں کا یہ خیال تھا۔ کہ نیکی کی ایک شاخ حاصل کرنے سے یہ ضروری نہیں۔ کہ دوسری میں آ جائے مثلاً شجاعت بغیر ایمانداری کے سیکھی جا سکتی ہے۔ اور اس کے برعکس ایمانداری بغیر شجاعت کے۔

تو کونسا علم ایسا ہے جس کے ساتھ نیکی کو خاص کیا جائے؟ سقراط نے اس مسئلہ پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ اس کے خیال میں سب سے مقدم یہ ہے کہ انسان کو نفس کی نیکی کا علم ہو۔ فیثا غورثیوں نے نفس کی صحت کو جسم کی صحت کے لئے لازم قرار دیا ہے۔ "غورغیات" مکالمہ میں سقراط نے کہا ہے۔ کہ نیکی نفس کی باقاعدگی کی وجہ سے ہے۔ اور علم سے ہی اسے جانا جا سکتا ہے۔ نہ کہ تجربات سے "جمہوریہ" میں اس مسئلہ کو بہت اچھی طرح نبھایا گیا ہے۔ سقراط کہتا ہے۔ کہ نفس کے تین حصے ہیں پہلا عارفانہ۔ دوسرا مزاج کا مسکن۔ اور تیسرا خواہشات کا گھر۔ ان کی مخصوص نیکیاں عقل۔ شجاعت اور تقویٰ (اعتدال) ہیں لیکن عدالت ایک ایسا قانون ہے۔ جو ان تمام کو ایمانداری سے کام کرنے کی ترغیب دلاتا رہتا ہے۔ یہ مختلف نیکیاں مختلف جماعتوں سے بھی وابستہ ہیں۔ والیان ریاست کے لئے عقل مقدم ہے۔ سپاہیوں کے لئے شجاعت اور عام کاروباری آدمیوں کے لئے تقویٰ (اعتدال) ضروری ہے ہر ایک انسان میں بھی یہ ترتیب ہونی ضروری ہے۔ یعنی عقل کو احکام صادر کرنے چاہئیں۔ شجاعت کو احکام کی بجا آوری میں مدد دینی چاہئے۔ اور تمام اقسام کی خواہشات کو تقویٰ (اعتدال) سے دبانا چاہئے۔ (باقی دارد)

---

(بقیہ مضمون بزم جہاں صفحہ ۲ سے آگے)

تاکہ وہ جنگ کے ہنگام یہ خدمت سرانجام دے سکیں۔ فوج میں موٹر کاروں کا زیادہ استعمال ہوگا۔ ایک اور زیر تعمیلی تحریک جرمنی کی سرحد تک بنائی جائیگی ہوائی بیڑے کو اور بڑا کیا جائیگا جو اس وقت بھی دنیا کی طاقتوں میں صرف روس سے دوسرے درجے پر ہے۔ ان سب کاموں کیلئے فرانس کے چیمبر آف ڈیپوٹیز نے ۰۰ ۱۴ لاکھ پونڈ کی رقم معین کی ہے۔ جو آئندہ تین سال میں خرچ کی جائیگی۔ ان تمام امور سے آپ فی الحال کچھ نتیجہ نکالیں مگر فقدان سکون قلب کا نظارہ ہے۔

جاپان میں جو تغیر پیدا ہوا تھا وہ بھی آخر اس مقام پر آ کر ختم ہوا ہے جنرل ہجورد ہیشی نے ایک نئی کیبنٹ مرتب کی ہے اور وہ خود وزیر اعظم بن گیا ہے۔ اور زیادہ تر فوج کے ...

امریکہ کے پریزیڈنٹ روزویلٹ نے ایک تجویز پیش کی ہے کہ سپریم کورٹ علاوہ کے اختیارات میں نمایاں تبدیلی کر دی جائے۔ اس کا مقصود ہے کہ پریزیڈنٹ کو آئندہ اختیارات حاصل ہوں کہ وہ کورٹ کے پانچ جج اپنی طرف سے مقرر کر سکے۔ اس سے امریکہ کے قدامت پسندوں میں ہیجان پیدا ہو گیا ہے۔

# سوالات

اس عنوان کے ماتحت "محقق" فنی، علمی، ادبی، صنعتی۔ ان تمام سوالات کا جواب پیش کیا کرے گا۔ جو اس کے حلقۂ اقتدار میں ہوں خریدار حضرات اپنے خریداری نمبر کا حوالہ دے کر کوئی سوال پوچھ سکتے ہیں:۔

## سوال

اے آب رود گنگا وہ دن ہیں یاد تجھ کو۔ اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

وہ کونسا کاروان تھا۔ وہ کب آیا اور وہ گنگا کے کنارے کیوں اترا

(ع ح۔ ش۔ ساہوالا)

(ج)

علامہ اقبال کا یہ شعر اس کے ترانہ ہندی میں ہے۔ صفحہ ۸۲۔ بانگ درا کریمی پریس لاہور۔

ظاہر ہے کہ جب کاروان ہند کے متعلق ہے تو قدیم آریوں کا ہی ہونا چاہئے۔ قدیم آریہ ویدک عہد میں شمالی دروں سے وارد ہوئے اور پنجاب کے راستے گنگا تک پہنچے۔ گنگا کے پانی کی خوبی اور ملک کی خوشحالی سے متاثر ہو کر انہوں نے اسے وطن بنایا اور گنگا کو پوتر مانا کہ شوجی کے جٹوں میں سے نکلتی ہے اور کیلاش سے نیچے آتی ہے۔ یہی آریوں کا قافلہ تھا جو گنگا پر اترا اور پھر یہ کنار رود گنگا کی تہذیب آریوں کے ساتھ تمام ہندوستان میں پھیل گئی۔

**سوال**۔ ہوا کیا چیز ہے ہمیشہ دکھائی کیوں نہیں دیتی (ح۔ اخ گرداسپور)

ہوا ایک قسم کا مادہ ہے۔ مگر اس کے سالمات کے درمیان فاصلہ اس قدر زیادہ ہے کہ انسان ان کے بیچ میں سے آسانی سے گزر سکتا ہے۔ اس میں اور بھی کئی اجزا ہیں مگر وہ زیادہ تر آکسیجن ایک حصہ اور نائٹروجن چار حصے ہے۔ نارمل درجۂ حرارت اور فشار پر اس کا وزن مخصوص ۰۰۱۲۹۳ ہے یعنی اس حساب سے ہوا کے ایک لیٹر (ایک ہزار مکعب سنٹی میٹر) کا وزن ۱،۲۹۳ گرام ہوا، ہوا کے سالمات بہت چھوٹے ہوتے ہیں اور بکھرے ہوئے ہیں اس لئے ہوا ہمیں نظر نہیں آتی۔ البتہ جب تیز چلتی ہے تو ہمیں محسوس ہوتی ہے

**سوال**۔ چوٹ لگتی ہے تو ہمیں درد کیوں محسوس ہوتا ہے (و۔ ع۔ ش ملتان)

درد کا سبب اصل میں ہمارے اعصاب ہیں۔ (NERVOUS SYSTEM) اگر کسی کے اعصاب کا حصہ کسی عضو بدنی میں سے مر جائے اس کا احساس جاتا رہتا ہے۔ فالج کی بیماری میں یہی ہوتا ہے۔ جب چوٹ لگتی ہے اور عصب کا وہ حصہ دب جاتا ہے یا اس پر ضرب لگتی ہے اور وہ اپنی درست حالت پر واپس آنے کے لئے چلاتا ہے۔ یہی ہماری درد کا احساس ہے:۔

---

# تبصرے

**ہیلتھ میسج** ماہوار رسالہ زیر سرپرستی و ادارت حکیم ڈاکٹر قاضی محمد عظیم اللہ کامل طب و جراحت، پروفیسر تشخیص حفظان صحت طبیہ کالج متعلقہ پنجاب یونیورسٹی لاہور۔ سالانہ چندہ آٹھ آنے ضخامت ۲۰ صفحے۔ مقام اشاعت ڈیپو ہیلتھ ہوم فلمنگ روڈ میوہ منڈی لاہور۔

طبی ماہوار رسالہ فاضل حکیم و ڈاکٹر جناب قاضی محمد عظیم اللہ صاحب کامل طب و جراحت کے زیر ادارت لاہور سے شائع ہوا ہے۔ حکیم صاحب موصوف اعلیٰ پایہ کے مصنف اور تجربہ کار طبیب ہیں۔ جن کی شہرت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اس پرچہ میں انسانی امراض کی تعریف و ماہیت، علامات، تشخیصی رموز و نکات کے علاوہ مجرب اور سہل الحصول ڈاکٹری و یونانی آزمودہ نسخے درج کئے جاتے ہیں۔ جس کے مطالعہ سے علم طب سے بے بہرہ انسان بھی پورا فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔

**رسالہ تنویر** ماہوار رسالہ زیر سرپرستی و ادارت جناب مولانا افسر صدیقی امروہوی صاحب ضخامت ۴۴ صفحے۔ مقام اشاعت رام سوامی کوارٹرز کراچی۔

جس طرح کراچی تجارت کی ایک بڑی منڈی ہے ویسے ہی آہستہ آہستہ حضرت مولانا افسر صدیقی امروہی صاحب کی کاوش و کوشش سے علم و ادب کا مرکز بھی بنتا چلا جا رہا ہے۔ مولانا کی ذات والا صفات ادبی حلقوں میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ انہیں کی نگرانی میں رسالہ تنویر باقاعدہ طور پر ہر ماہ کی تیدی تاریخوں میں شائع ہوتا ہے۔ یہ علمی، ادبی، اخلاقی اور تاریخی مضامین کا خزینہ ہے۔ وقتاً فوقتاً اس کے خاص نمبر نہایت آب و تاب سے شائع ہوتے رہتے ہیں جن کے سرورق خوشنما و خوبصورت اور لکھائی چھپائی عمدہ ہوتی ہے:

**ملنے کا پتہ:** مینجر رسالہ تنویر رام سوامی کوارٹرز کراچی

# ضروری گزارش

عرصہ سے رسالہ محقق صدہا کی تعداد میں معززین اور قارئین کرام کی خدمت میں بلا طلب و معاوضہ اس لئے روانہ کیا جا رہا ہے۔ کہ وہ اسے علم و ادب کا ایک ادنیٰ خدمتگار سمجھکر اس کی درمے۔ قلمے۔ قدمے ہر طرح سے اعانت فرمائینگے گر اب بھی یہ مزید امید پر حامی ہو رہا ہے۔ مگر وہ مہربان جن سے ہماری زیادہ توقعات وابستہ ہیں وہی ہنوز بے طلب ہیں۔ لہذا وہ حضرات جن کی خدمت میں رسالہ نمونہ کے طور پر بھیجا جائے اپنی خریداری اور عدم خریداری سے اطلاع دیدیا کریں اور اپنا چندہ بذریعہ منی آرڈر بھجوا کر دفتر کو شکریہ کا موقع دیں یا لکھیں کہ ان کے نام رسالہ وی۔ پی کر دیا جائے

"ایڈیٹر"

# محقق کا خاص نمبر

دفتر کا ارادہ ہے۔ کہ محقق کا ایک خاص نمبر بہت جلد شائع کیا جائے۔ اس میں بلند پایہ افسانے۔ مضمون۔ غزلیں نظمیں وغیرہ ہونگی۔ تحقیق اور علمی مضامین کو خاص جگہ دیجائیگی موجودہ زندگی کی ضروریات جن کا تعلق سائینس سے ہے ان کو اہمیت دیجائیگی۔

مضامین نگار حضرات سے استدعا ہے۔ کہ وہ قلمی اعانت سے ہمیں مشکور فرمائیں۔ ان کے کرم ہم پر پہلے بہت زیادہ ہیں۔ رسالے کی زندگی کا انحصار انہیں کا دست شفقت ہے۔ ہم امید رکھتے ہیں کہ آپ اپنے شاہکاروں میں سے بہت جلد منتخب کر کے بھجوا دینگے تاکہ انکو مناسب جگہ دیجا سکے

اس خاص نمبر میں تصاویر ذی روح کے علاوہ دیگر بھی ہونگے جن حضرات کے پاس ایسی تصاویر وغیرہ ہوں۔ یا وہ مضمون کا مصور بنانے کے لئے سامان بھجوانا چاہیں کرم ہوگا اگر وہ دفتر میں بہت جلد بھجوا دیں تاکہ ملاک ... ہیں

Reg. No. L. 3972

# Modern Laboratories Bahawalpur

*Specialize in the manufacture of approved and effica[illegible]*
*Try them once to test the validity of our sta[illegible]*
*Once tried always used.*



**Iksire Maida (Stomach Remedy)** It is an infallible remedy for all stomach troubles, indigestion, bad liver etc. It improves the working of the stomach if taken constantly. In case of bad digestion it should be used every half hour.

*Price Rupee One only (Re. 1/-) per bottle.*

**Dental Powder (The Scientific Dental Powder)** It is the best remedy for pyorrhoea, bleeding gums, spongy gums, coloured teeth, offensive smell in the mouth, etc. It has been specially prepared for the purpose and is not an ordinary dental powder. Try it once to see the results.

*Price annas (As /8/-) per bottle.*

**Spermotene (for Spermatorrhoea)** Most of us suffer from Spermatorrhoea but we are not aware of it. The emission occurs involuntarily when asleep or awake. The energies of the whole system are sapped away. Try a bottle of SPERMOTENE to see how much you improve in health, strength and mental powers. You must try it to see its miraculous effects. It is specially recommended to young men, students, teachers and all those persons whose occupations are sedantry.

*Price Rupees two only (Rs. 2/-) per bottle.*

## Modern Laboratories Bahawalpur

*The Home of Efficacious Medicines*

باہتمام برکت علی پرنٹر آرٹ پریس ہسپتال روڈ لاہور میں چھپ کر دفتر تحفہ بہاولپور سے ایف ایم شجاع منیجر و پبلشر نے شائع کیا

# THE MOHAQQIQ

BAHAWALPUR

A High Class Literary Monthly.

# محقق

(٦)

بہاولپور

ڈائرکٹر۔ خواجہ شجاع منعمی

ایڈیٹر۔ رازی عرفانی

فنی - علمی - ادبی - صنعتی - وغیرہ

ماہوار رسالہ

# محقق

جولائی سنہ ۱۹۳۷ء

چندہ
والیان ریاست سے یکصد روپیہ
امراء سے دس روپے (عــہ)
فی پرچہ چار آنہ (۴)

چندہ
سالانہ تین روپے (عــہ)
طلباء سے دو روپے (عــہ)
ممالک غیر سے دس شلنگ

## ادارۂ تحریر

ڈائریکٹر :- خواجہ شجاع نعمی ایم - اے (علیگ) ایم - ایس - سی - ایم - اے (پنجاب) پروفیسر

ایڈیٹر :- رازی عرفانی -

مہتمم شعبۂ نسواں :- بیگم - ح - ش - رفعت دہلوی - بی - اے -

نگران عربیات :- مولوی حافظ عبد الرحمٰن علامہ مولوی فاضل -

نگران سنسکرتات :- پنڈت مدن سنگھ شاستری - ودیا بھاسکر

مذاکرہ علمیہ :- پروفیسر ایم - ایف - قریشی - ایم - ایس - سی - افسانہ ایمن حزیں بہاولپور

مقام اشاعت :- دفتر رسالہ محقق - بہاولپور

| جلد ۱ | فہرست مضامین ماہ جولائی ۱۹۲۷ء | نمبر ۷ |



## آپکے یاد رکھنے کے قابل

ستمبر کا نمبر خاص نمبر ہوگا۔ اس میں بہت سی تصاویر - بلاک وغیرہ ہونگے۔ بلند پایہ اہل قلم کے مضامین، سبق آموز افسانے حقائق سے لبریز علم فطرت پر تحریریں۔ اس کی الگ قیمت ایک روپیہ ہوگی - اگر آپ آج ہی خریدار بن جائیں تو آپ سے تمام سال کا چندہ معہ اس سالانہ نمبر کے صرف تین روپے وصول کیا جائے گا۔

ہمارے کرمفرما مضمون نگار حضرات بہت جلد مضامین بھجوا دیں - تو ان کی مہربانیوں میں اضافہ ہوگا۔

# شذرات

ہمارا دورِ حاضرہ کئی مصیبتوں کی بھول بھلیاں ہے۔ اقتصادی۔ معاشرتی۔ سماجی۔ تعلیمی ہر طرح کی تکالیف کا سمندر چاروں طرف لہریں مار رہا ہے حقیقت میں یہ (TRANSITION PERIOD) ہے۔ یعنی دورِ مابین ایک مستقل عہد اور دوسرے مستقل عہد کے درمیان کا زمانہ۔ ایک گزشتہ دور سے مستقبل کے دور میں تبدیلی۔ گزشتہ دور معین منظم مرتب ہر ایک کو حدود معلوم۔ اپنے حقوق اور دوسروں کے حقوق ہر وقت پیش نظر۔ اُن حالات میں جہاں نقص سامنے نظر آتی ہوں۔ انسان خواہ مخواہ دوسرے کے حلقے میں دخل در معقولات نہیں بننا چاہتا۔ ایک بنی بنائی عمارت سامنے نظر آتی ہو تو اسکو گرا کر بنانا ایک مشکل کام دکھائی دیتا ہے۔

آج زمانے نے طرح نو اختیار کرلی ہے۔ گویا قدیم عمارت کو گرادیا۔ اسکی شکل کو بگاڑ دیا ہے۔ مگر ابھی تک نیا حلیہ مرتب نہیں ہوا۔ اس نیم سیال حالت میں جبکہ مواد جم کر ٹھوس نہیں بنا ہے۔ سالمات کی کشمکش لازمی ہے۔ ہر کوئی اپنی طرف کھینچنا چاہتا ہے۔

یہی سبب ہے۔ کہ ہماری سماج کی تنظیم بگڑ گئی ہے۔ ہر کوئی دوسرے کا حق چھیننے کو تیار ہے۔ دھرتی آکاش سے زیادہ زیادہ کی صدائیں سنائی دیتی ہیں۔ ان حالات میں کچھ عجیب نہیں کہ اگر دنیا کے ہوس بندے اخلاقی، مذہبی تعلیم اور مروجہ رسوم کو بھی بالائے طاق رکھدیں۔ ادبی دنیا میں بھی آج یہی کیفیت نمایاں ہے۔

بیسیوں رسائل و جرائد دنوں میں معرض وجود میں آتے ہیں۔ ہر کوئی دوسرے پر سبقت لے جانے کے ذرائع تلاش کرتا ہے۔ نیک ذرائع تو آپ جانتے ہیں۔ بڑی محنت طلب بات ہے۔ مجبوراً یہ کیا جاتا ہے۔ کہ مخرب الاخلاق قصے، نیم عریاں تصویریں اخلاق سوز افسانے، اور برباد کن نظمیں رسالے میں بڑھادی جاتی ہیں۔ جس سے نام نہاد تہذیب یافتہ، جدید روشنی زدہ نوجوان ایسے رسائل کی طرف متوجہ ہوجاتے ہیں۔ بکری تو انکی ہوجاتی ہے۔ مگر اس تھوڑی سی خود غرضی کے عوض میں جو نقصان انہوں نے قوم اور ملت کو پہونچایا وہ آپکو معلوم ہے۔ یہ ایسا زہر ہے۔ کہ نسلوں تک خون سے خارج نہیں ہوتا۔ اور دماغی فساد موجود رہتا ہے۔

محقق ان سب سے بالاتر ہے۔ اسکا مقصد قوم کے سامنے ادب کا صحیح نظریہ پیش کرنا ہے۔ محقق کو یہ منظور ہے کہ آپکے بچوں کے آپکے عزیزوں کے علم اور ادب میں اضافہ ہو۔ آپکا اخلاق بہتر ہوجائے۔ اور پڑھنے کے بعد آپکو اس سے کچھ حاصل ہو۔ تمام مضامین ان امور کو پیش نظر رکھکر منتخب کئے جاتے ہیں۔ محقق کا ادارہ آپسے یہ توقع رکھتا ہے کہ آپ اس کار خیر میں انکی امداد فرمائینگے۔ تاکہ یہ مفید رسالہ

آپکی خدمت کر رہا ہے۔ ان احباب کا خاص طور پر شکریہ ادا کیا جائیگا جو اسکے لئے خریدار بہم پہنچائیں اور مفید مطلب مضامین لکھکر بھیجیں۔

بہاولپور میں ایک ہمارے کرمفرما شیخ غلام یسین صاحب رہتے ہیں۔ مرنجاں مرنج وسیع اخلاق شگفتہ پیشانی ان کی علم دوستی کا محقق مشکور ہے۔ امید ہے کہ ان کی توجہ محقق کے مدارج طے ہونے کے ساتھ بڑھتی جائیگی۔

**تصویر** جون کے پرچے میں کیوپڈ ( Cupid ) کی جو چاپی ہے یوں کہئے عشق کا دیوتا۔ کام دیو کہنا تو شاید غلط ہو۔ یہ انگریزی تصویر ہے ایک حسین کمسن لڑکا تیر و کمان لئے موجود ہے اپنے تیروں سے دلکو گھائل کر رہا ہے۔ گویا تیر دونوں طرف لگتے ہیں عشق اول در دل معشوق پیدا می شود۔ اس تصویر کے نیچے یہ شعر درج ہے ؎ پیکان ترا بجان خریدار ✱ من مرہم دیگران نخواہم

اس مہینے یعنی جولائی کے پرچے میں عمر خیام کی ایک رباعی کا انگریزی تخیل کاغذ پہ بنایا گیا ہے۔ یہ تصویر یوں سمجھ لیجئے۔

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے ✱ پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

وہ بات یوں ہے کہ صبح کا وقت ہے حضرت مست قلندر گھر سے نکلے ہیں کہ چلیں کچھ پی لیں کہ جام صبوحی سے دن کی ابتدا کریں اور رات کا خمار بھی کم ہو۔ میخانے کے دروازے پر پہنچے ہیں۔ کھٹکھٹایا ہے اندر سے ایک پری چہرہ پری وش۔ پری ادا دروازہ کھول درشن دیتی ہے صبح کا وقت ہے بھلا پیالہ و ساغر کہاں کہنے لگے اچھا لائیے۔ ہم اوک سے ہی پی لیتے ہیں۔ غرض تو مے گلفام سے ہے نہ کہ پیالے سے بس دھن دریغانہ پرہم مانند ساقی نے رند مست کو پلادی کہ یہ بھی کار ثواب ہے۔ انتظار کیوں کیا جائے۔ خیام کی رباعی یہ ہو سکتی ہے:-

ہنگام صبوح است و خروش اے ساقی ✱ ما و مے و کوئے میفروش اے ساقی

چہ جائے صلاحست و خموش اے ساقی ✱ بگذر ز حدیث و درد نوش اے ساقی

فرز جیرلڈ نے اس کا ترجمہ انگریزی میں یوں کیا ہے

And, as the cock crew, those who stood before
The Tavern shouted — "Open then the Door!
"You know how little while we have to stay, "And once departed, may return no more."

یہ انگریزی ترجمہ اس انگریزی کتاب سے لیا گیا ہے جو فرز جیرلڈ کے اصلی مسودہ سے مقابلہ کرنیکے بعد چھپی ہے مصنف ایڈورڈ ہیرن ایلن

لندن۔ ۱۸۹۹ء۔ صفحہ ۶ ✱

# بزم جہان

ملک معظم شاہ انگلستان و شاہنشاہ ہندوستان کی تاجپوشی کی رسم ۱۲ مئی ۱۹۳۷ء کو لندن میں ادا کی گئی۔ یہ برٹش امپائر کی سب سے بڑی رسم ہے اور اسلئے زیادہ سے زیادہ مرغوب و پر تکلف بنائی گئی۔ بقول ڈاکٹر پرسیول پیر بادشاہ کبھی اذیت کا باعث نہیں بن سکتا وہ امپائر میں اتحاد کی نشانی ہے۔ اور برٹش حکومت کا سردار ہے۔ وہ اپنے وزرا کو اپنی منشا سے مقرر کر سکتا ہے یا انہیں ہٹا سکتا ہے۔ جتنے بل دونوں ہوسز میں پاس ہوتے ہیں انکو مسترد کر سکتا مگر عملاً یہ فعل متروک ہے۔ اب سب سے اعلیٰ قانونی قدرت پارلیمنٹ کے ہاتھ میں ہے۔ اور حکومت کے سب سے بڑے حکم کی قدرت

بقیہ بر صفحہ ۱۶

# اسلامی علم التواریخ کی تاریخ

## مسعودی

گذشتہ سے پیوستہ

اِسکے ذہن میں یہ بھی خیال تھا۔ کہ زیادہ سے زیادہ تاریخی واقفیت جمع کی جائے ۔ اور مواد کی ضخامت بڑھائی جائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس لئے بعض حکایات و روایات کو شدید تحقیق کے بغیر ہی اس نے درج کر دیا۔ عوام سے سنی سنائی باتوں کو بھی تاریخ میں جگہ دیدی۔ یہ تاریخ ابتدائے آفرینش سے شروع ہوتی ہے ۔ اور عباسی خلیفہ مطیع کی خلافت ۹۴۷ء پر ختم ہو جاتی ہے ۔

تاہم اس کی کتاب بہت قابل قدر ہے اس سے ہماری تاریخی واقفیت بہت بڑھگئی ہے اور اس عہد میں تمام دنیا میں جتنی تاریخیں وجود میں آئیں۔ ان سب سے زیادہ مسعودی کی کتاب میں حقیقی تاریخی ذوق اور معاملات کو جمع کرنے کی قابلیت نظر آتی ہے ۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مسعودی کس قدر قابل آدمی تھا۔ وہ کتنے علوم پر حاوی تھا۔ اور اس کا علم کس قدر وسیع تھا۔ یہ کتاب صرف تاریخ ہی نہیں۔ بلکہ مختلف علوم و فنون کا مجموعہ ہے ۔

مسعودی مذہبی معاملات کا نقاد اور مبصر تھا۔ اس موضوع پر اس نے کئی کتابیں لکھیں اسلام کے مختلف فرقوں پر نصرانیوں۔ مجوسیوں۔ اور صابیوں پر مصر کے قبطیوں پر مروج الذھب میں بحث موجود ہے ۔ اس میں خانگی زندگی رسمی کاروبار اور حکومت کے معاملات سب پر بحث موجود ہے۔ سماج کی تاریخ اور ادبی تاریخ بھی پیش نظر رکھی گئی ہے ۔

مسعودی کی تاریخ کے پہلے چھ ابواب میں ابتدائے آفرینش سے لے کر رسول عربی کی پیدائش تک کے حالات درج ہیں ۔ عبرانی کتابوں۔ اور روائتوں۔ اور تمام مشرقی دنیا کے ماخذوں کو استعمال کیا گیا ۔ قرآن کریم سے بھی واقفیت حاصل کی گئی یہ تاریخ اگرچہ بظاہر روایات معلوم ہوتی ہیں۔ اور بعض جگہ بعید از فہم بھی ہیں۔ تاہم تمام اسلامی کتابوں میں اسی واقفیت پر اس عہد کی تاریخ کی بنا رکھی گئی ہے ۔ ساتویں باب میں ہندوؤں کا تذکرہ ہے ۔ ان کے سائنس کے علوم ۔ مذہبی خیالات سیاسی نظام اور حکومت کی طرز سب پر بحث کی گئی ہے ۔ مگر ہندوؤں کی قدیم تاریخ کا تذکرہ نہیں ہے ۔

آٹھویں باب سے لیکر چودھویں باب تک طبعی

جغرافیہ ہے۔ یا تاریخی جغرافیہ۔ قدیم زمانے کے شہر انکے نام۔ مختلف راستے وغیرہ سب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اگرچہ مضمون خشک سا ہے۔ مگر مسعودی نے اس میں کچھ زائد مواد جمع کر دیا ہے۔ کئی عجیب اور نفیس حکایتیں لکھی ہیں۔ جس سے دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔ باب پندرہ چین کے متعلق ہے۔ اس ملک کے اخلاق، مذہب، سیاست وغیرہ سب پر بحث ہے۔ اگرچہ چین کی قدیم تاریخ محض روائتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اس کے بعد کے باب میں بہت سی مختلف چیزوں پر بحث کی گئی۔ مثلاً ابحار، جزائر، ملک اندلس، دیگر ممالک عطریات وغیرہ اس کے بعد کے باب میں کاکیشیا کے باشندوں کا ذکر ہے۔ اور پتہ نہیں کیوں اسی میں لنگوروں بندروں۔ عقابوں کا ذکر بھی ہے۔ ابواب اٹھارہ تا چوبیس ایرانی اور سوری بادشاہوں سے متعلق ہیں۔ اگرچہ حالات کو بہت تحقیق کے بعد نہیں لکھا گیا۔ اس کے بعد کے تین ابواب میں تاریخ یونان، سکندر کی فتح ہندوستان، اور سکندر کے بعد کے یونانی حکمران کا ذکر ہے۔ ان کے بعد کے تین ابواب میں رومی تاریخ کا ذکر ہے۔ پہلے میں رومی تاریخ قبل از عیسائیت جبکہ رومیوں کا مذہب انکا اپنا قدیم مذہب تھا۔ دوسرا باب مشرقی روم یعنی قسطنطنیہ کے قیصروں کے متعلق قبل از اسلام۔ تیسرے باب میں ظہورِ اسلام کے بعد سے لیکر مسعودی کے زمانے تک کے قیصروں کے حالات ہیں۔

باب اکتیس اور تیس میں مصر اور اسکندریہ کا ذکر ہے ان کے بعد کے تین بابوں میں سوڈانی، سلوانی، فرانس اور لمبارڈی کی اقوام کا ذکر ہے۔ باب ۲۷ میں عاد ۲۸ میں ثمود کا تذکرہ ہے۔ ۲۹ میں مکہ اور کعبہ کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ ۴۰ میں کرۂ ارض کے مختلف ملکوں اور محبتِ وطن پر ایک عالمانہ بحث ہے۔ بعد کے پانچ ابواب میں یمن کی تاریخ ہے۔ اس کے بعد کے چھ ابواب میں عربوں کے متعلق بسیط اور احاطہ کن حالات درج کئے گئے ہیں ان کے رسم و رواج توہمات اور روایات سب پر بحث ہے۔ سیل العرم کا ذکر ۵۳ باب میں ہے۔ پھر عربوں قبطیوں۔ سوریوں، پارسیوں کے مہینوں پر ایک مضمون ہے چاند سورج کی گردش پر بحث کی گئی ہے۔ اور انکے اثرات کے متعلق مختلف لوگوں کی رائے نقل کی گئی ہے۔ ۶۳ سے ۶۸ باب تک ہندوؤں، یونانیوں، رومیوں، سالوون اور زندیقوں کے مقدس مقامات اور عبادت گاہوں کا ذکر ہے۔ باب ۶۹ گویا ایک تلخیص ہے۔ سلسلہ وار اور سنین کے ساتھ۔ ان تمام ضروری واقعات کو جو ابتدائے تاریخ سے رسولِ عربی کی پیدائش تک ظہور پذیر ہوئے اس کے بعد کے پانچ ابواب پیغمبر اسلام کے متعلق ہیں۔ ظہور، بڑے بڑے واقعات، آپکی رسالت، اسلام کے اصول اور اسلام کے ابتدائی حالات سب پر بحث کی گئی ہے۔ آخری باب ۶۷ خلافت کی تاریخ پر ہے۔ اور یہ تاریخ نویں صدی عیسوی کے انجام پر ختم ہوتی ہے۔

مسعودی نے جو تاریخ سب سے آخر میں لکھی اس کا نام کتاب "التنبیہ والاشراف" ہے (اشراف کے معنی نیک ہونا۔ آمادہ ہونا) اس کے لکھنے سے مقصود یہ تھا۔ وہ اس تمام مضمون پر جس پر وہ ازیں قبل مفصل

بحث کر چکا تھا۔ اب ایک طائرانہ نظر ڈالے۔ اور پھر یہ کہ اگر کہیں کچھ واقفیت اور معلومات نامکمل رہ گئی ہوں۔ تو ان کی تکمیل کر دے۔

مسعودی کی تصنیفات کا قلیل سا حصہ ہمیں پہنچا ہے۔ باقی زمانے کے دستبرد سے تلف ہو چکا ہے۔ اس سے مسعودی کے علمی تجربے اور وسیع معلومات کا پتہ چلتا ہے اس نے نہ صرف کتابوں سے علم جمع کیا۔ بلکہ خود تقریباً تمام ایشیا میں سفر کرنے کے بعد معلومات حاصل کیں اور پھر انہیں قلمبند کیا۔

مسعودی کی وفات کے بعد عربی علم التواریخ کیطرف لوگوں نے بہت توجہ کی بڑی محنت اور کاوش سے بڑی بڑی تاریخیں لکھی گئیں۔ جب دیگر اسلامی علوم زوال پذیر ہوئے۔ تو اس علم میں بھی انحطاط کا واقع ہونا ضروری تھا۔ چونکہ اس سے عوام کی بہت دلچسپی ہے۔ اور زمانے کی تبدیلیاں ہی اس کا مضمون ہے۔ اس لئے زمانے کے غیر مساعد حالات کے ساتھ بھی یہ مضمون چلتا رہا فروغ نہ سہی۔ مگر دوسرے علوم کے مقابلہ میں مٹ نہیں گیا تاریخ نویسوں نے عالم کی تاریخیں لکھیں طبری کے نمونے پر اسکے علاوہ جغرافیہ، مادی علوم، اور علم التواریخ کے لئے مسعودی کا تتبع کیا گیا۔ ان وسیع اور عالمگیر تاریخ نویسوں کے علاوہ چند ایسے مصنف پیدا ہوئے جنہوں نے مخصوص مضامین پر قلم اٹھایا۔ مثلاً البیرونی (متوفی ۱۰۳۸ء) نے ہندوستان کی بصیرت اور استقصا کے ساتھ ایک تاریخ لکھی۔ عبداللطیف (متوفی ۱۲۳۱ء) نے مصر کے حالات پر ایک کتاب لکھی۔ اس کا طرز بیان بہت سادہ اور زود فہم ہے۔ حالات مکمل اور صحت کیساتھ درج کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ شہروں کی تاریخیں وجود میں آئیں۔ مثلاً بغداد، دمشق اصفہان وغیرہ پر بصیرت افروز اور مبسوط کتابیں لکھی گئیں

سیرت پر بھی بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ جس میں مختلف لوگوں کی زندگی کے حالات درج ہوتے تھے۔ اس پر ہی اکتفا نہیں کی گئی۔ ایسی کتابیں بھی معرض وجود میں آئیں۔ جن میں مشہور مشہور کئی لوگوں کا ذکر ہوتا تھا۔ گویا ان کو قاموس مشاہیر عالم کہہ سکتے ہیں۔ ان میں بعض اس عہد کے معروف آدمیوں کے متعلق تھیں کسی بادشاہ کا ذکر۔ یا کسی شاہی خاندان کا تذکرہ۔ کسی ایک شہر کے مشہور مشہور لوگوں کے حالات۔ یا کسی فن یا طبقے کے بڑے بڑے لوگوں کی سوانح عمریاں مثلاً حدیث اور فقہ کے عالم، فلسفی، طبیب یا شاعر وغیرہ۔ اس کے علاوہ پیغمبر اسلام اور ان کے صحابہ کے متعلق بھی سوانح عمریاں لکھی گئیں۔ ان میں ان لوگوں کا ذکر بھی تھا۔ جن کا تذکرہ حدیث میں کہیں کہیں آیا ہے۔

## دیگر تاریخ نویس

بعض صغیر تاریخ نویسوں کا یہاں پر تذکرہ کرنا ضروری ہے۔

سلطان محمود غزنوی کی تاریخ "کتاب الیمینی" عتبی (متوفی ۱۰۳۸ء) نے لکھی۔ بغداد کے مشاہیر کا تذکرہ خطیب بغدادی (متوفی ۱۰۷۱ء) نے لکھا۔ صلاح الدین کی تاریخ عماد الدین اصفہانی (متوفی ۱۲۰۱ء) نے لکھی شمالی مصر میں ایک شہر قفط ہے۔ مصر کا ایک معروف مصنف جس نے فلسفیوں، سائنسدانوں اور عالموں کی زندگی کے حالات لکھے ہیں۔ وہ اس شہر میں پیدا ہوا تھا۔ ابن القفطی (متوفی

۱۲۴۰ء) نے اپنی تاریخ لکھی جو وسیع پیمانہ پر اور مفصل تھی۔ مگر اب اس کا صرف خلاصہ موجود ہے۔ اور اس کا نام "تاریخ الملک" ہے۔ ابن الجوزی (متوفی ۱۲۰۰ء) نے ادب کے ہر شعبے پر قلم اٹھایا ہے۔ اسکی تحریریں بہت سود مند اور مفید مطلب ہیں۔ اسکے پوتے یوسف (متوفی ۱۲۵۷ء) نے جو سبط ابن الجوزی کے نام سے مشہور ہے۔ کتاب مراۃ الزمان لکھی۔ ابن ابی اصیبعہ ایک اور مشہور مصنف ہے جس نے طبیبوں اور حکیموں کے سوانح لکھے ہیں۔ (متوفی ۱۲۷۰ء) اس کتاب کا نام عیون الانبا ہے۔ مُلر (MULLER) نے اسے مقابلہ کے بعد ۱۸۸۴ میں چھاپا تھا۔ جرجیس المکین (متوفی ۱۲۷۳ء) نصرانی تھا۔ اس نے ایک دنیا کی تاریخ لکھی۔ اور اسکا نام مجموعہ المبارک رکھا۔ اسکے دوسرے حصے کا ترجمہ جو رسول عربی کے عہد سے لے کر انتقامِ دورِ بنو عباس تک ہے۔ اربی نی اس (ERPENIUS) نے لاطینی زبان میں کیا تھا۔ (۱۶۲۵ء) ابوالفرج (متوفی ۱۲۸۶ء) نے ایک تاریخ عالم لکھی ابن خلدون کا ہمعصر مقریزی تھا۔ یہ مصر کی تاریخ کا مصنف ہے۔ جو اب بھی اس ملک کی بہترین تاریخ سمجھی جاتی ہے۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ تاریخ عالم پر ایک مبسوط کتاب اسی جلدوں میں لکھے۔ جس کا ایک حصہ یہ کتاب ہو مصر کا ایک اور باشندہ احمد النویری (متوفی ۱۳۲۱) ہے اس نے ایک کتاب "نہایت العرب فی فنون الادب" لکھی۔ جو تیس جلدوں میں تھی۔ اس میں ہیئتِ جغرافیہ علم حیوانات و نباتات اور تاریخ سب مضامین پر بحث ہے۔ حماۃ کا بادشاہ ابوالفدا (متوفی ۱۳۳۱) بہادر اور جغرافیہ دان مشہور ہے۔ مگر اسکی شہرت بحیثیت تاریخ نویس بھی ہے۔ اس نے بنی آدم کی ایک تاریخ لکھی جو مشرق کے حالات اور واقعات پر کافی روشنی ڈالتی ہے۔ کتب الرجال میں حاجی خلیفہ (متوفی ۱۶۵۸) کی "کشف الظنون عن اسامی الکتب و الفنون" بہت قابل قدر ہے۔ اسمیں اٹھارہ ہزار پانسو مختلف تصانیف ان کے مصنفین وغیرہ کے حالات اور سوانح درج ہیں۔

ابن خلیکان (متوفی ۱۲۸۲) کی قاموسِ مشاہیر عالم بہت کامیاب کتاب ہے۔ اسکا ترجمہ ساچو نے (SACHAU) انگریزی میں کیا ہے۔ اور وہ لندن سے ۱۸۴۲ میں شائع ہوا تھا۔ سر ولیم جونز کہتا ہے۔ کہ سیرت کے لکھنے کا وہ سب سے بڑا ماہر ہے۔ اس کے بعد شہرستانی (متوفی ۱۱۵۳ء) کا نمبر آتا ہے۔ اسکی کتاب میں مذہبی اور فلسفی فرقوں کا تذکرہ ہے۔ اسکا متن کرٹن (CURETON) نے لندن سے ۱۸۴۶ میں چھاپا تھا۔ اور اس کا ترجمہ ہاربرکر (HARRBRUCKER) نے جرمن زبان میں کیا اور حالے (HALLE) کی فرم نے ۱۸۵۱-۱۸۵۰ میں اسے شائع کیا۔

ادارہ (ڈائرکٹر)

(باقی آئندہ)

نوٹ

"محقق" مضمون چھاپتا ہے۔ جو معیار ادب پر پورے اتریں۔ جو مضمون بھیجے جائیں وہ کاغذ کی صرف ایک طرف لکھے ہوئے ہوں۔ اور کاغذ فلسکیپ سائز کا ہو

(ایڈیٹر)

# نذرِ خلوص

## غزل

جناب پنڈت رگھوپتی سہائے صاحب فراق (گورکھپوری) ایم-اے- الہ آباد یونیورسٹی......

وابستہ ہیں تجھی سے سب ارمانِ دوستی
تو جانِ دوستی ہے تو ایمانِ دوستی

کچھ احتیاط بھی ہے ضرور اے دلِ حزیں
یہ کم نگاہیاں ہیں نگہبانِ دوستی

کچھ عشق بے قرار بھی شرمندہ ہو چلا
اٹھتی چلی وہ نرگسِ حیرانِ دوستی

کن مشکلوں میں شکوۂ بیجا ہے عشق کا
پیدا ہے جورِ حسن سے بھی شانِ دوستی

اٹھتی ہے پھر نگاہِ کرم مدتوں کے بعد
لے کر ہزار ہا سروسامانِ دوستی

باغِ جہاں میں تیری ہی اے نوبہارِ ناز
پھیلی ہوئی ہے بوئے پریشانِ دوستی

اس شوخیِ نہاں سے پناہ اے خدائے عشق
بدلے ہی جا رہا ہے وہ عنوانِ دوستی

کھلتا نہیں ہے صاف پیامِ نگاہِ یار
اک تیر نیمکش ہے یہ پیمانِ دوستی

اتنا بھی رشکِ قسمتِ اغیار کیا کریں
یہ بھی ہیں کوئی دن ترے مہمانِ دوستی

اللہ رے تغافلِ جاناں کی شوخیاں
فرصت نہ دشمنی کی نہ امکانِ دوستی

یاد نگاہِ یار پھر آئی لئے ہوئے
سامان صد جراحتِ پیکانِ دوستی

ہم باغِ خلد کو بھی نہ لائیں خیال میں
ہاتھ آئے گر ترا سرِ دامانِ دوستی

اب اور کیا کہیں کہ ہم اہلِ رضا سے بھی
آخر نہ اٹھ سکے ترے احسانِ دوستی

برقِ نگاہِ ناز میں پنہاں ہیں اے فراق
صدہا فریبِ مشکل و آسانِ دوستی

# اردو شاعری پر ایک لمحۂ فکریہ

(از جناب سید ضیاء جعفری صاحب صدر دائرہ ادبیہ)

ہمارے ملک میں اکثر یہ مشاہدہ میں آیا ہے کہ لوگ عام طور پر شعر دماغی تفریح ذہنی تعیش اور جذباتی تلذذ کی بنا پر کہتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک شاعری محض الفاظ کی دل خوش کن ترتیب محض حواس کی لذت اندوزی اور نغمہ آرائی ہے یہی مردہ ادبیت ہے۔ جو ایک غلام قوم کی ذہنیت اور دماغیت کا عکس ہے کسی قوم کا لٹریچر ہی اس قوم کے تمدن اور معاشرت کا آئینہ ہے۔

مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہم میں آج ایسے شعراء کی کثرت ہے اور یہ بیماری روز افزوں ترقی کر رہی ہے۔ نامور ناثر اور ناظم مفقود ہیں جو قوم کی صحیح طریقے پر راہنمائی کر سکیں۔ سچ تو یہ ہے کہ کام کرنے والی قومیں ایسی شعریت اور ایسے شاعروں سے بیزار ہیں میرا مطلب اس سے شاعری جیسے فن شریف اور شاعر کی خدانخواستہ توہین مراد نہیں صرف ایک ایسا راستہ تلاش کرنا مقصود ہے۔ جسکے ذریعے ذوق شعری کو ہم صحیح اسلوب پر لاسکیں اور اغیار کی زبان درازی سے محفوظ رہیں آپ اگر غور سے ملاحظہ فرمائیں تو معلوم ہوگا کہ اردو شعراء کا سب سے زیادہ زور غزل گوئی میں صرف ہوا آج سے کچھ عرصہ پہلے قصیدہ گوئی کیطرف زیادہ اور مثنوی کی طرف کسی قدر کم توجہ تھی لیکن رزمیہ شاعری سے اردو کا دامن آجتک خالی رہا ابھی اردو گہوارہ طفلی ہی میں تھی کہ زوال سلطنت کے آثار نمایاں ہوئے اور شعراء خوشامد پسند اور عیاش ممدوح کو خوش کرنے کے لئے عشقیہ حکایات سے لبریز غزلیں اور مبالغہ آمیز قصائد لکھنے پر مجبور رہے اردو زبان کی اٹھان ہی قدرتی طور پر نثر کی بجائے نظم سے ہوئی اگر اس دور میں سلطنت کا عروج اور فتح و ظفر کا سلسلہ جاری رہتا تو کیا وجہ ہوسکتی تھی کہ جو قوم انیس اور دبیر جیسے مرثیہ گو پیدا کر سکتی ہے فردوسی اور نظامی کی طرح رزمیہ نگار شاعر پیدا نہ کر سکتی۔

دور حاضرہ میں اردو اور فارسی ادبیات کے اندر بنیادی اور اساسی انقلاب کا آغاز حضرت علامہ اقبال کی ذات گرامی سے ہوا۔ جن کے کلام میں اصناف شعر میں مکمل یکسری کے بعد شعر میں تعلیمی اور افادی پہلو کو داعیانہ حثیت سے پیش کیا گیا ہے یہی زندہ ادبیت ہے جو سخت کوشش۔ جفاکشی عالی حوصلگی۔ استقامت اور پختگی عزم کی تعلیمات پر مبنی ہے۔ اس کے پردے میں بھی عشق ہی کا جذبہ زندگی کارفرما ہے۔ مگر یہ عشق (عشق نام ہے)، جو انسانوں کو بلاؤں کے طوفان نازلات

کے ہجوم اور مصیبتوں کی فراوانی میں سراسیمہ اور پریشان نہیں ہونے دیتا۔ یہی ہمت اور ایثار کا سبق ہے اسی جذبے سے قوموں میں صحیح کیریکٹر پیدا ہو سکتا ہے۔ اور اسی سے افراد اور جماعتوں کا مستقبل زندہ اور پائندہ تر بن سکتا ہے بقول نظیری ؎

گریزد از صف ما ہر کہ مرد غوغا نیست
کہ ہر کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست

مگر بایں ہمہ میں گل و بلبل کی شاعری کا بھی قائل ہوں میں صرف ارتقائے ذوق چاہتا ہوں اور تذلیل فکر کے گڑھے سے نکل کر خواہ وہ گل و بلبل کا ہی پردہ کیوں نہ ہو شاہدِ حقیقی کے لئے دام بچھانا مقصود ہے بقول علامہ اقبال ؎

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بہ کمند آور اے ہمت مردانہ

دشت جنوں وہی ہے مگر کمند انداز کا معیار بلند ہے۔

داغ اور امیر کا دور ختم ہوتے ہی مغربی خیالات کی رو سے متاثر ہونے والے تجدید پسند حضرات نے قدیم موضوعات کی طرح اردو شاعری کو بھی از سرِ نو تربیت دینا چاہا اور قدیم اردو اساتذہ کا جھگڑا ہی ختم کر دیا۔ مغربی خیالات کو نظم کرتے رہے انکی بنیا۔ صرف وطنیت و سیاست اور ملی منظومات تک محدود رہے۔ لیکن کیا ہم ان سرستان تہذیب فرنگ کی خدمت میں التماس کر سکتے ہیں کہ وہ شعر و شاعری کو صرف اس دائرے تک محدود رکھنے کا جرم کس حد تک روا رکھتے ہیں۔ یہاں تک تو میں ضرور قائل ہوں کہ اصنافِ سخن میں سیاسی۔ قومی۔ وطنی منظومات کا شامل کرنا لٹریچر میں خاطر خواہ اضافہ اور مشترکہ قومیت کے لئے بہترین نسخہ ہے۔ مگر وہ خصوصیت شعری جو نثر سے بدرجہا برتر اور اعلٰے ہے اسے تلاش کرنا چاہئیے کہ وہ کیا چیز ہے میرے خیال میں وہ صرف اذواق۔ لطائف و وجدانیات ہیں جنکا محل دماغ کی بجائے دل ہے۔ اور دل ہی صرف سرچشمہ انوار الٰہیہ ہے۔ ذرا تھوڑی دیر کیلئے صاحبِ دل حضرات ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ اگر جذبۂ عشق جو دل کی حرکتِ ذوقی ہے اس عالم میں کار فرما نہ ہوتا تو زندگی جو ہم مشرقیوں کو بطور سزا عطا ہوئی ہے ایک لمحے کے لئے بھی اس قابل تھی کہ عزیز سمجھی جاتی۔ پھر تو یہ حیات ارضی ایک مسلسل بے کیفی کا نوحہ کرتی اور جینے کی اوسط بہت کم اور حقیر رہ جاتی شعر دراصل دل کی اس حرکت ذوقی کا نتیجہ ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

شعر کیا ہیں کچھ حسیں جلوے ہیں شرمائے ہوئے
چند نغمے دل سے لب تک لوٹ کر آئے ہوئے

رابندر ناتھ ٹیگور جسے آج دنیائے مشرق و مغرب کا مسلمہ شاعر مانا جاتا ہے۔ کیا اس کی پسندیدگی کا راز قومی شاعری اور سیاسی منظومات ہیں۔ لیکن اگر آج اسکی شاعری سے اسی جذبۂ شوق کو جسے میں نے دل کی حرکت ذوقی سے تعبیر کیا ہے حذف کر دیا جائے تو وہ سوائے ایک مجذوب کی بڑ کے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔

غرض شاعری میں معیار قائم کرنے کیلئے ہنگامی ضروریات اور جذبات پر بضد ہو کر اصرار کرنا وضع شے

غیر محل کے مترادف ہے۔ شاعر اذواق و لطائف کو علوم معارفہ کی طرف منصہ شہود پر لاتا ہے۔ وہ افق کے ہر گوشے سے آنکھیں لڑاتا ہوا ایک ہی رعنائی ایک ہی شوخی پاتا ہے ہر حباب سے ایک ہی شوخی کو مسکراتے ہوئے دیکھتا ہے۔ ہر ذرے سے ایک ہی ساز سنتا ہے اس لئے وہ وحدت الوجود کا معتقد ہو کر ذوق و حال کی زبان سے پکارتا ہے ؎

ہے تجلی تیری سامان وجود
ذرہ بے پرتو خورشید نہیں

مجھے ہندوستان کی قومی سیاسی اور نیچرل شاعری سے تعرض نہیں لیکن آخر اس کورانہ تقلید کی کوئی حد بھی معین ہونی چاہیئے۔ مشرق کی خدا پرست اقوام مغرب کے مادہ پرستوں سے اپنی اذواق و احساسات کی بھیک کیسے مانگ سکتے ہیں۔ سوا اسکے کہ ایک مشرقی دہریت اور فلسفیت کے عقاید میں اپنی روحانیت کا بھی خاتمہ کردے بلکہ حقیقی شاعری اور صحیح تغزل کی روح تو صرف واردات اور جذبات ہیں جو کیفیت حقیقتاً شاعر پر طاری ہو صرف اسی کا نظم کرنا اور ماحول سے تاثرات اور مشاہدات ہی شعر کا اصلی موضوع ہیں۔ تاثیر صرف اُس شعر میں پیدا ہو سکتی ہے۔ جو شاعر کی دلی جذبات اور قلبی واردات کا ترجمان ہو جبتک کہنے والا اپنے کلام سے خود متاثر نہ ہو اور اپنے دل اور دماغ پر ایک خاص اثر محسوس نہ کر سکے وہ دوسروں کی سماعت کو متاثر نہیں کر سکتا بقول سیماب اکبرآبادی رہیں محسوس شاعری کی ضرورت ہے معروضہ خیالات کے اظہار کی ضرورت نہیں اسی کے ساتھ طرز پر اثر۔ پیرایہ متین بندش چست مضمون اچھوتا۔ اسلوب نیا۔ زبان نہ مولویانہ نہ بازاری محاورات اور روزمرہ درست اور برمحل۔

غرض جس نے دنیا میں شاعر بن کر جینا اور مرنا ہے وہ تو ان حدود مستحسنہ سے متجاوز کر ہی نہیں سکتا باقی رہے وہ برخورداران وطن جو صرف نام نمود کے لئے ریماً شعر کہتے ہیں انہیں راہ پر لانے کے لئے اخلاقی جرأت کی ضرورت ہے۔ یہ فرض کسی جماعت یا انجمن کے علاوہ بہت حدتک والدین کے ذمے ہے۔ کہ جب وہ اچھی طرح سے معلوم کرلیں کہ بچے کا طبعی رجحان حقیقی معنوں میں شعر کی طرف نہیں تو اُسے جبراً اور حکماً منع کریں علامہ اقبال نے بہت حدتک یہ پیغام سوچ سمجھ کر دیا ہے ؎

میرے مخزن سے کوئی اقبال جاکے میرا پیام کہدے
جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں انہیں مذاق سخن نہیں ہے

(سید ضیا جعفری صدر دائرہ ادبیہ)

# نوائے خلوت

(از جناب پروفیسر غلام محی الدین صاحب خلوت ایم۔ اے۔ گورنمنٹ ڈگری کالج)

داغہائے سینۂ من چوں نمایاں مے شود  انچہ لالہ بزیرِ خاک پنہاں مے شود
گر کنی آزاد دِل را از غم و رنج و ملال  زود بینی کارِ دشوارِ تو آساں مے شود
قطرۂ ناچیز کے از ابرِ نیسانِ بہار  لولوئے لالا زِ لطف و مہر یزداں مے شود
حالِ زارم در شبِ فرقت مپرس اے ہمنشیں  از سرشکِ خوں نگاہم گل بداماں مے شود
باز شاید حلقہ درمے زند دستِ جنوں  ہر کفِ پا آتشۂ خارِ بیاباں مے شود
چوں بیاید در چمن با قامتِ رعنائے خویش  سرخوش صہبائے حسنش سرو ریحاں مے شود
بامداداں از ترانہ ریزیٔ مرغِ سحر
بوئے گل از خلوتِ غنچہ پریشاں مے شود (خلوت)

# مراجعتِ وطن

شعر:-

خانہ برباد چمن برسوں قفس میں ہمصفیر
آشیاں سے چھٹ کے خوابِ آشیاں دیکھا کئے

**جزیرہ سینٹ ہلینا سے مشہور محب وطن اور محبوب عام شہنشاہ نپولین اعظم کے جسد خاکی کی اپنے وطن سرزمین فرانس کیطرف واپسی کا دردناک تاریخی افسانہ**

عام انسانوں کے واقعات زندگی ان کی موت پر ختم ہوجاتے ہیں لیکن دنیاوی انسانوں میں نپولین اس کلیہ سے مستثنےٰ ہے۔ اس کی غیر المعقول اور تعجب انگیز داستان زندگی اسکی موت پر ختم نہیں ہوئی۔ بلکہ گوشۂ قبر کی خاموش تنہائی میں بھی یہ داستاں جاری رہی سینٹ ہلینا میں دفن ہوئے بھی اسے نو برس گزر گئے تھے لیکن اس نو برس کے مکمل عرصہ میں ایک دن کے لئے بھی دنیا اُسے فراموش نہیں کرسکتی!

ماہ جولائی ۱۸۳۰ء کے مشہور تین دن تاریخ فرانس میں ہمیشہ کے لئے یادگار رہیں گے۔ ان تین دنوں میں اہل فرانس ایک دفعہ پھر باہم متحد ہوکر اُٹھ کھڑے ہوئے اور خاندان بربن کو تیسری دفعہ تخت شاہی چھوڑنے پر مجبور کر دیا!

اس دفعہ تاج شاہی۔ خود نپولین کی پیش گوئی کے مطابق شہزادہ لوئی فلپ ڈیوک آف آرلینز کے سر پر رکھا گیا۔ اس واقعہ کو مشکل سے ہی دو مہینے گذرے ہونگے جب مجلس ملیہ میں تمام قوم کی طرف سے یہ درخواست پیش ہوئی۔ کہ نپولین اعظم کے جسد خاکی کو برطانیہ سے واپس لیا جاکر فرانس کے حوالے کیا جائے۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ شہنشاہ نپولین نے اپنی وصیت میں خود اپنی قلم سے یہ الفاظ تحریر کئے تھے:-

"میری خواہش ہے۔ کہ میرے جسد خاکی کو دریائے سین کے کنارے پر سرزمین فرانس اور فرانسیسی لوگوں کے درمیان سپرد خاک کیا جائے۔ جنسے مجھے اس قدر محبت تھی۔"

فرانسیسی جن سے اتحادیوں نے انکے محبوب عام رہنما کو بنوک سنگین جدا کردیا تھا۔ اب متفق اللفظ ہوکر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور دریائے رائن سے لیکر کوہ پری نیز تک کی تمام آبادی اس مطالبہ میں یکساں شریک تھی۔ چنانچہ ۵ مئی ۱۸۴۰ء کو نپولین کی وفات کی سالگرہ کے دن

ایم گوئزٹ وزیر فرانس نے وزرائے برطانیہ عظمیٰ کی خدمت میں ان الفاظ پر مشتمل ایک سرکاری مراسلہ تحریر کیا :-

"کمترین نمایندہ غیر معمولی اور وزیر حضرت بادشاہ فرانس حکومت فرانس کے زیر ہدایات وزرائے عظام برطانیہ عظمیٰ کی خدمت میں ملتمس ہے۔ کہ نپولین اعظم کا جسد خاکی اہل فرانس کے حوالے کیا جائے۔ تاکہ مقدس امانت کو اسکی اس محبوب سرزمین میں سپرد کیا جائے۔ جس کی کہ وہ نہ صرف شہرت کا ہی باعث ہوا۔ بلکہ عمر بھر جس کی اُسنے مدافعت کی اور جو اس کے ہزار ہا ہم قوم نبرد آزما بہادروں کی مقدس خاک کو بڑے فخر کے ساتھ اپنے سینہ سے لگائے ہوئے ہے۔ مجھے یقین ہے کہ برطانیہ عظمیٰ کی مجلس وزرا ضرور ایسے احکام صادر کرے گی جو ہر قسم کی مشکلات کو اگر ایسی کوئی مشکلات موجود ہوں جو اس قومی امانت کے جزیرہ سینٹ ہلینا سے اٹھائے جانے اور سرزمین فرانس میں واپس لے آنے میں مانع ہوں۔ دور کر دیں گے"

۹ مئی کو لارڈ پامرسٹن کی طرف سے مندرجہ ذیل جواب موصول ہوا۔

"ملکہ معظمہ کی حکومت امید کرتی ہے۔ کہ جس تعجیل سے یہ جواب دیا جا رہا ہے۔ ہماری طرف سے اہل فرانس کے لئے وہ اسبات کا شافی ثبوت ہوگی۔ کہ ہم اس منافرت قومی کو جو شہنشاہ کی زندگی میں مسلح انگلستان اور ہتھیار بند فرانس کے درمیان پیدا ہو چکی تھی۔ مٹانے کے لئے کتنے مضطرب ہیں۔ ملکہ معظمہ کی حکومت کو یقین ہے۔ کہ اگر ایسے جذبات اب بھی کہیں موجود ہوں تو ان کو شہنشاہ کے جسد خاکی کے ساتھ ہی قبر میں دفنا دیا جائیگا۔

۸- اکتوبر کو دو فرانسیسی جہاز سینٹ ہلینا پہنچ گئے

۱۵- اکتوبر وہ یادگار زمانہ تاریخ تھی۔ جسدن یہ گرفتار بلا شہنشاہ اس بنجر اور بے آب و گیاہ۔ خشک جزیرہ میں وارد ہوا تھا۔ اس لئے یہی دن اس کی قبر کو کھودنے کے لئے مقرر کیا گیا۔ ٹھیک نصف شب کے وقت برطانوی شاہی انجنیروں نے گورنر سینٹ ہلینا کے زیر ہدایت اور فرانسیسی نو وارد رہنماؤں کی موجودگی میں اپنے کام کو شروع کیا۔ نو گھنٹے کی لگاتار اور مسلسل محنت کے بعد بیرونی پختہ تعمیر کو ہٹا دیا گیا۔ پھر وہ بھاری پتھر جو سنگیں تابوت کے اوپر ڈھکا ہوا تھا۔ بذریعہ آلات جر اثقال اٹھا کر ایک طرف رکھدیا گیا۔ نیچے سے جب اصل تابوت برآمد ہوا تو تمام حاضرین نے گھٹنوں کے بل جھک کر نماز جنازہ ادا کی۔ جس کے بعد تابوت کو نہایت احتیاط اور آہستہ سے اٹھا کر اس خیمہ میں لایا گیا۔ جو اس مقصد کے لئے خاص طور پر پیشتر ہی سے نصب کیا گیا تھا۔ اس خیمہ میں آکر انتہائی خوف و ہراس اور مذہبی عقیدت کے ساتھ تین مختلف تابوتوں کو جو مہاگنی۔ لوہے اور ٹین کے بنے ہوئے تھے۔ یکے بعد دیگرے کھولا گیا۔ پھر نہایت ہی احتیاط اور آہستہ سے سفید ساٹن کے کپڑے کو اٹھایا گیا تو شہنشاہ کا جسم نظر پڑا۔ شہنشاہ کے جسد خاکی پر رطوبت اور فضائی اثرات کا کوئی نشان بھی نظر نہیں آتا تھا۔ بلکہ اس حد تک محفوظ تھا۔ کہ تمام حاضرین دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اسکے چہرے کے نقش و نگار میں ذرہ برابر بھی

نزدیک نہیں آیا تھا۔ یہاں تک کہ حاضرین میں سے جن لوگوں نے زندگی میں اسے دیکھا ہوا تھا۔ وہ فوراً پہچان گئے۔ اس کے فوجی لباس کا رنگ ضرور کچھ یوں ہی سا مدہم پڑ گیا تھا۔ اور وہ خود اس طرح اطمینان و سکون سے لیٹا ہوا تھا۔ کہ گویا سو رہا ہے۔ اس وقت کے جذبات کی کیفیت اس حد تک ناقابل بیان ہے۔ کہ اسکو الفاظ کا جامہ نہیں پہنایا جا سکتا۔ بہت سے حاضرین کی آنکھوں سے تو آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ آیا۔ لیکن یہ منظر دو منٹ سے بھی کم میں ہی ختم کر دیا گیا۔ اور فوراً اس قومی امانت کو تابوت میں رکھ کر ڈھکنا بند کر دیا گیا۔ اور اس تابوت کو اس مضبوط آبنوسی صندوق میں رکھ کر محفوظ کر دیا گیا۔ جو اس کے ہموطن فرانس سے اپنے ہمراہ لائے تھے اس اثنا میں آسمان پر ابر محیط ہو گیا۔ لمحہ بھر میں اس زور سے بارش ہونی شروع ہوئی کہ گویا آج برس کر پھر کبھی نہیں برسے گی۔

گھرکے بادل جزیرہ پر چھا گئے۔ اور ہر چیز کو ڈھانپ لیا۔ ساتھ ہی ایک خوفناک طوفان سیاہ چٹانوں پر برپا ہو گیا۔ بادل کی گرج اور بجلی کی کڑک ایسی خوفناک تھی کہ ہنگامۂ محشر کا نمونہ بن گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ خود فطرت ماتم اور سینہ کوبی میں مصروف ہے۔ بندرگاہ اور جہازوں سے خطرہ کی توپیں چھوڑی جا رہی تھیں جن کا خوفناک دھماکا اس بحری و فضائی ماتم میں اور بھی اضافہ کا باعث ہو رہا ہے۔

یہ سب کچھ تھا۔ لیکن جزیرہ بھر کے تمام باشندے تابوت کے ہمراہ ایک جلوس کی شکل میں رواں تھے۔ جو قبر سے شروع ہو کر جہازوں کی طرف جا رہا تھا۔ جس گاڑی میں تابوت رکھا ہوا تھا۔ اس میں چار گھوڑے جتے ہوئے تھے۔ ہر ایک کی پشت پر ایک ایک کوچوان سوار تھا۔ اور آٹھ اعلےٰ افسران گاڑی کے دو طرفہ پیدل ساتھ ساتھ رواں تھے۔ تمام فوجی۔ بحری۔ بری اور سول حکام عقب میں آ رہے تھے۔ تمام شرفائے جزیرہ کو گورنر کی طرف سے ماتمی جلوس میں شامل ہونے کے لئے ہدایات کر دی گئی تھیں۔ جزیرہ سینٹ ہلینا کی تمام افواج باقاعدہ اور بے قاعدہ دو رویہ پیدل چل رہی تھی۔ جس وقت یہ عظیم الشان جلوس آہستہ آہستہ چٹانوں کے بیچ میں سے گذر کر ساحل سمندر کی طرف بڑھا۔ تو اس وقت فوجی بینڈ نہایت دردناک ماتمی ترانہ گا رہا تھا۔ جس کی غمناک آواز بحری اور فضائی طوفان اور توپوں کے دھماکوں کے باوجود قلب کی عمیق ترین گہرائیوں تک اثر کر رہی تھی تمام قلعوں اور جہازوں کے جھنڈے سرنگوں کر دیئے گئے۔ جونہی۔۔ کہ یہ گاڑی جہازوں کے پلیٹ فارم کے نزدیک پہنچی تمام فرانسیسی افسران اور شہزادہ ولی عہد ننگے سر خاموش کھڑے ہو گئے۔ گاڑی ان سے چند قدم کے فاصلہ پر ٹھہر گئی۔ گورنر سینٹ ہلینا چند قدم آگے بڑھا۔ اور برطانیہ عظمےٰ کے نمائندہ کی حیثیت سے نپولین کے تابوت کو نمائندگان فرانس کے حوالہ کیا۔ اہلیان فرانس نے آگے بڑھ کر تابوت شاہی کو فرانسیسی جھنڈے کی تہوں میں لپیٹ لیا۔ اسوقت ان کے سینہ جن جذبات سے معمور تھے۔ انکو کسی طرح بھی بیان نہیں کیا جا سکتا!

اس وقت سے ان تمام رسومات کی ادائیگی پھر شروع ہو گئی - جو شہنشاہ کی زندگی میں عمل میں آتی تھیں - تمام فرانسیسی جھنڈے کھول دیئے گئے - سلامی کی توپوں کے فائر شروع ہو گئے - جس وقت کہ تابوت کو کمرہ جہاز میں رکھا گیا - تو ساٹھ جانباز بنرد آزما بہادروں کی ایک گارد نے شہنشاہ کے ایک وفادار نمک خوار لفٹنٹ کی کمان میں شاہی سلامی اتاری - اور پھر دونو جہاز واپس فرانس کی طرف روانہ ہوئے -

۲ ردسمبر کو یہ جہاز فرانس کی ایک بندرگاہ میں داخل ہوئے - وہاں چند اور جہاز جو ان کے انتظار میں ہی تھے ان کے ساتھ ہو کر آگے کیطرف روانہ ہوئے - اور یہاں سے سین کا دریائی راستہ اختیار کیا - جس وقت جہازوں کا یہ جلوس شہروں کے قریب پہنچا - تو وہاں پہلے ہی اس کی آمد کی اطلاع پہنچ چکی تھی - شہر کے میر نے تمام آبادی کو مخاطب کر کے کہا -

رفیقو ! آج پورے پچیس سال کی جلا وطنی کے بعد آخر کار ہمارا محبوب شہنشاہ ! نپولین اعظم ہمارے درمیان واپس آیا ہے - آؤ آج ہم اسکا آخری دیدار کریں -

ملحقہ علاقہ جات سے دو لاکھ سے زیادہ باشندے شہروں میں آ گئے تھے - دریا کے دونو کناروں پر شاہانہ ٹھاٹھ سے آرائش و زیبائش کی گئی تھی - ہر طرف ریشمی کپڑے کی لمبی لمبی گیلریاں بنائی گئیں تھیں تاکہ زائرین کو کوئی تکلیف نہ ہو - اہرام کی شکل کے بہت سے مینار بنائے گئے تھے - جو سرخ ساٹن سے مڑے ہوئے تھے - جن پر بے شمار زر خالص کے بنے ہوئے پھول پتے نہایت ہی خوشنما معلوم ہوتے تھے - ان میناروں کی بنیادوں پر شہنشاہ مرحوم کی تقریباً تمام اہم اور بڑی جنگوں کے نام تحریر تھے -

راستہ میں ایک عالیشان دروازہ بنایا گیا - جو تمام و کمال ریشم سے بنا ہوا تھا - اور جس پر زر خالص سے بنی ہوئی تیتریاں اور شہد کی مکھیاں اڑتی ہوئی دکھائی گئی تھیں - بیس گز ریشم اس دروازے پر صرف ہوا تھا - اور چھتیس ہزار طلائی تیتریاں اور شہد کی مکھیاں اس پر اڑتی ہوئی نظر آ رہی تھیں -

دو جنگی جہاز جنگی آرائش و زیبائش میں خاص طور پر بہت ہی اہتمام کیا گیا تھا - اور جن پر تمام اقوام عالم کے جھنڈے موجود تھے - اس طرح کھڑے تھے - کہ ماتمی جہازوں کا جلوس ان کے درمیان سے ہو کر گذرے -

دوپہر سے پہلے شہر کے تمام باشندے ملحقہ علاقہ جات کی تمام مخلوق جو جمع ہو گئی تھی - تمام ججان اور وکلاء تمام پادری - نیشنل گارڈ کے سب ممبران - طلبائے مدارس خطاب یافتگان اور تمام پرانے سپاہی اور پندرہ سو کے قریب صرف وہ افسران جو شہنشاہ مرحوم کی زندگی میں اسکے ساتھ جنگوں میں شامل ہو کر زخمی ہو چکے تھے - سب کے سب اپنی اپنی مقررہ جگہوں پر آ کر کھڑے ہو گئے -

جس وقت اولڈ گارڈ کے یہ جنگ آزما بہادر شکستہ زخمی اور بوڑھے سپاہی ایک لمبی جنگی صف میں ہو کر گلی میں سے گذرے تو اُس جوش و خروش - گرم جوشی اور محبت سے انکا استقبال کیا گیا - کہ ایسا نظارہ اس سے پیشتر چشم فلک نے بھی کبھی نہیں دیکھا ہوگا - ان تمام بوڑھے مگر بہادر فرزندان وطن کے ہاتھوں میں پھولوں سے بنے ہوئے تاج تھے - جو وہ آج اپنے محبوب شہنشاہ

کے تابوت پر چڑھانے کے لئے لائے تھے۔ سب نے اپنے ہتھیاروں کو سرنگوں کیا ہوا تھا۔ اور آنسوؤں کا ایک سیلاب نکلی آنکھوں سے جاری تھا۔ یہ سب نپولین کی آنکھوں کے تارے تھے۔ یہ اسکے بچے اور اسکی اولاد تھے ان میں سے شاید ایک بھی ایسا نہیں تھا۔ جو برضا و رغبت بخوشی خود اسپر اپنی جان قربان کرنے کو تیار نہیں تھا۔

ٹھیک دوپہر کیوقت ماتمی جہازوں کا جلوس آہستہ آہستہ اور ایک شان کیساتھ آتا ہوا دکھائی دیا۔ تمام جہازوں۔ تمام دمدموں اور نیشنل گارڈ نے تمام مراکز سے سلامی کی توپوں کے فائر ایک ساتھ ہونے شروع ہوئے۔ جن سے آسمانی بجلی کی کڑک سے زیادہ پر زور آواز میں اعلان ہوا کہ شہنشاہ کی سواری قریب آگئی ہے۔ مخلوق خدا کے سینوں کے اندر جو حشر جذبات برپا تھا۔ اس کو جن الفاظ میں بھی بیان کیا جائے مبالغہ کا شائبہ نہیں ہوگا۔ شہنشاہ اس کا جسد بےروح ہی سہی۔ محبت وعظمت کے ساتھ اپنی سلطنت کی حدود میں داخل ہو رہا تھا۔ فرانس کی عظمت وعزت کی پیشانی پر سے کلنک کا ٹیکہ اتر چکا تھا۔ کیونکہ اب اس کا محبوب ترین شہنشاہ شجاع ترین قائد اور عظیم الشان ترین فرزند ایک قیدی کی حیثیت سے دشمنوں کی سرزمین میں محو خواب نہیں تھا۔

جہازوں کی رفتار اور بھی کم کردی گئی تاکہ مخلوق خدا اچھی طرح سے سیر ہوکر جلوس کو دیکھ سکے۔ پل کے قریب پہنچ کر جس پر قوس قزح کی مانند نپولین کے فاتحانہ داخلہ کے استقبال کے لئے نہایت ہی نفیس اور خوبصورت دروازہ بنا ہوا تھا۔ شاہی کشتی تھوڑی دیر کے لئے ٹھہر گئی جہاں اس کی اولڈ گارڈ کے بوڑھے بہادر سپاہیوں نے جنگی صفوف میں قائم ہوکر پھولوں کے تاجوں سے تابوت کو ڈھانپ دیا۔ اور اپنی لڑکھڑاتی ہوئی زبان اور غم واندوہ سے کانپتی ہوئی آوازوں کے ساتھ آخری دفعہ شہنشاہ زندہ باد کا فلک بوس نعرہ لگایا۔ وہ نعرہ جسنے زندگی میں ہزاروں لاکھوں دفعہ شہنشاہ کے قلب پر گہرا اثر کیا تھا۔ اب موت کی سی خاموشی میں گم ہوگیا۔ تابوت سے اُس کے جواب میں کوئی آواز برآمد نہیں ہوئی۔

کیا نپولین عالم ارواح سے اِس منظر کو دیکھ رہا تھا؟ اور اپنی اس آخری فتح پر خوش تھا؟ یہ فطرت کا ایک راز ہے۔ جس کے چہرہ سے کوئی شخص بھی پردہ نہیں اُٹھا سکتا!

یہاں سے جلوس آگے کی طرف روانہ ہوا۔ اس ماہ کی ۱۴ تاریخ کو چار بجے کے قریب ماتمی جہازوں کا یہ جلوس ایک بستی کے قریب جو دارالخلافہ شہر پیرس سے صرف چار کوس کے فاصلہ پر ہے۔ سارا شہر یہاں اُمنڈ آیا تھا۔ اسجگہ شہنشاہ کی محبوب بیگم ملکہ جوزفائن کا مجسمہ نصب تھا۔ وہ گویا وہاں اپنے فاتحانہ واپس آنے والے خاوند کے استقبال کے لئے موجود تھی۔ اسجگہ ایک بڑا بلند مینار تعمیر کیا گیا تھا۔ جس کی بلندی ۱۵۰ فٹ کے قریب تھی اس کی چوٹی پر ایک گول کمرہ جس کا قطر چھ فٹ تھا رکھا ہوا تھا۔ جس پر زرخالص کا بنا ہوا ایک عقاب پر تولے اُڑنے کے لئے تیار بیٹھا تھا۔ اس مینار کی بنیاد پر تحریر تھا۔

"میری یہ خواہش ہے۔ کہ میرا جسد خاکی دریائے سین کے

کنارے سرزمین فرانس اور میرے ہموطن فرانسیسی کے درمیان سپرد خاک کیا جائے۔ جن سے مجھے اتنی محبت تھی"۔
بندرگاہ کے کنارے پلیٹ فارم کے نزدیک ایک مندر نما مینار ایک صد فٹ اونچا تعمیر کیا گیا تھا جس میں نپولین کے تابوت کو عارضی طور پر اسوقت رکھا گیا جبتک کہ شاہی گاڑی میں رکھنے کی نوبت آئے۔ بہترین آرائش و زیبائش سے مزین چھوٹے چھوٹے بیس[20] فٹ اونچے ریشمی پرچوں سے ہر طرف عود عنبر اور خوشبوؤں کے دھوؤں کے بادل نکل رہے تھے۔ اسجگہ سارجنٹ ہوبرٹ وفاداری اور فداکاری کا مجسمہ جس نے تن تنہا پورے انیس[19] سال تک شہنشاہ مرحوم کی قبر کی نگرانی اور خبر گیری کی تھی۔ اور جو ماں باپ۔ بیوی بچوں۔ وطن اور خاندان کی محبت کو خیرباد کہہ کر تن تنہا انیس سال تک اس مقدس قومی امانت کا محافظ بنا بیٹھا رہا تھا۔ جہاز سے اترا تمام مارشل اور جرنیل اس کے گرد اکٹھے ہوگئے۔ اور ہر ایک باری باری اس سے ہم آغوش ہوا۔ مخلوق جو وہاں جمع تھی۔ اس کے قلوب جذبات تشکر و احسان مندی سے اسکے سامنے جھک گئے۔
رات بھر تمام جہازوں میں مومی شمعیں روشن رہیں۔ صبح ہوئی آفتاب عالمتاب کی زریں شعاعیں فضا میں پھیلنی شروع ہوئیں۔ مطلع صاف تھا۔ اور مہر عالمتاب پورے شباب پر چمک رہا تھا۔ ہزاروں زبانوں پر یہ الفاظ تھے۔
"یہ آج آئیرلینڈ کا سورج درخشاں ہے"۔
پورے ایک ہفتہ میں نہ صرف باشندگانِ فرانس ہی مختلف شہر و دیار سے اس عدیم النظیر اور عظیم الشان منظر کو دیکھنے کے لئے آتے رہے۔ بلکہ مختلف ممالک یورپ سے آنے والے لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ گئے تھے دس دس میل تک سڑکوں اور عام گذرگاہوں پر انسانی سروں کے سوا اور کوئی چیز نظر نہیں آتی تھی۔ جب جنازہ اٹھایا گیا۔ تو پیرس کی نیشنل گارڈ سب سے آگے آگے روانہ ہوئی۔ باشندگان پولینڈ نے جن میں بڑے بڑے معزز رہنما اور عہدہ دار موجود تھے۔ اہل فرانس کی خدمت میں ایک وفد اس استدعا کے ساتھ روانہ کیا۔ کہ انکو بھی جنازہ میں شمولیت کی اجازت دی جائے تاکہ وہ اس شہنشاہ کے جنازہ کو کندھا دے سکیں۔ جس نے ان کی مصیبت میں حمایت کی تھی۔ لوئی فلپ شاہ فرانس خاندان شاہی ارکان مجلس عالیہ ملیہ اور ارکان مجلس اعلےٰ تمام کے تمام ون دے لیڈز کے گرجا کے طلائی گنبد کے نیچے جمع تھے۔ تاکہ شہنشاہ مرحوم کی واپسی پر اس کے شایانِ شان خیر مقدم کرسکیں۔ شہنشاہ کا ایک بہت بڑا مجسمہ ایک برج پر نصب تھا۔ جو گویا خود اپنے فاتحانہ داخلہ پیرس کو سنجیدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ یہ مجسمہ ان جھنڈوں اور نشانوں سے مزین تھا۔ جو اس کی فتوحات کی لازوال شہرت کے ساتھ ہی زندہ جاوید ہوگئے تھے۔
شاہی گاڑی جس میں شہنشاہ کا تابوت رکھا ہوا تھا۔ پانچ حصوں پر مشتمل تھی۔ سب سے نچلا حصہ چار پہیوں پر رکھا ہوا تھا۔ جن پر سنہری گلٹ کیا گیا تھا۔ یہ حصہ چوبیس[24] فٹ لمبا اور چھ فٹ اونچا تھا۔ جس پر تمام و کمال سونے کا پانی پھرا ہوا تھا۔
اس سے اوپر کا حصہ جو زمین سے تیرہ[13] فٹ بلند

تھا۔ عجیب کاریگری اور صنعت کا نمونہ تھا۔ اور تمام دیبا و حریر سے ڈھنپا ہوا تھا۔ اور اس کے ریشمی پردے زمین تک لٹک رہے تھے۔ یہ پردے بھی مطلا کشیدہ کاری کی صنعت کے نادر نمونے تھے۔

اس سے اوپر تیسرے حصہ میں چودہ قد آدم مجسمے سیدھے کھڑے تھے۔ جو تمام و کمال سونے کے پترں سے مڑھے ہوئے تھے۔ ان کے سروں اور ہاتھوں پر خالص سونے کی بنی ہوئی ایک بہت بڑی ڈھال رکھی ہوئی تھی۔ یہ زر خالص کی بنی ہوئی ڈھال تکونی شکل کی تھی۔ اٹھارہ فٹ لمبی اور زر و جواہرات سے مرصع۔ اس ڈھال کے اوپر زمین سے تقریباً پچاس فٹ کی بلندی پر ایک اور تابوت تھا۔ جو شہنشاہ کے اصلی تابوت کے ہوبہو نقل بنایا گیا تھا۔ تابوت تھوڑا سا ارغوانی رنگ کے ریشم سے ڈھکا ہوا تھا۔ اور اس ریشمی پردہ پر طلائی پھول اور مکھیاں بنی ہوئی تھیں۔ اس نئے تابوت کے اوپر ریشمی گدیلوں اور تکیوں کے سہارے عصائے سلطنت۔ سیف العدل اور تاج شاہی جو زر و جواہرات کی فراوانی سے جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا۔ رکھے ہوئے تھے۔ خالص سونے سے بنی ہوئی اور ریشم سے ڈھنپی ہوئی اس شاہی گاڑی میں جو اس قدر دلا تعداد مخلوق خدا کی آنکھوں میں چکاچوند کا عالم پیدا کر رہی تھی۔ سولہ سیاہ آبنوس رنگ کے گھوڑے جتے ہوئے تھے۔ اور یہ سولہ کے سولہ گھوڑے زرکار۔ مُطلا۔ ریشمی جھولوں سے اس قدر ڈھکے ہوئے تھے۔ کہ ان کے سُم بمشکل نظر آتے تھے۔ اور ان کی ایال اور سروں کو تمغا کے پھندوں سے مزین کیا گیا تھا۔ سولہ کوچوان شاہی وردی میں ملبوس گھوڑوں کو سنبھالے ہوئے تھے۔

علی الصباح ٹھیک ساڑھے نو بجے نماز اور دعا سے فارغ ہو کر چوبیس فرانسیسی ملاحوں نے جنازہ کو اپنے کندھوں پر رکھا۔ اور جہاز سے اٹھا کر اس عارضی برج کے نیچے لے آئے۔ جہاں مذہبی رہنما پھر دعا و عبادت میں مشغول ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ملاحوں نے اس قومی امانت کے بوجھ کو پھر اپنے کندھوں پر اٹھایا۔ اور لاکر شاہی گاڑی میں رکھ دیا۔

اصلی تابوت کو گاڑی کے اندر رکھا گیا۔ کیونکہ اوپر کی طرف وہ نقلی تابوت رکھا ہوا تھا جس پر نشانات سلطنت عوام الناس کے دیکھنے کے لئے رکھ دئیے گئے تھے۔ گھوڑوں کو آہستہ سے اشارہ کیا گیا۔ اور یہ عظیم الشان والا انتہا جلوس روانہ ہوا۔ شہنشاہ کی واپسی پر اس کے خیر مقدم کے لئے پانچ لاکھ سے زیادہ نفوس دو رویہ کھڑے تھے شہر پیرس کے تمام گرجاؤں کے گھنٹے بج رہے تھے۔ لا تعداد فوجی بینڈ ماتمی ترانہ گا رہے تھے۔ مختلف دمدموں سے سلامی کی توپیں سر ہو رہی تھیں۔ تمام مخلوق خدا کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا تھا۔

ون دے لیڈز کا گرجا جہاں کے اس محبوب عام شہنشاہ کو سپرد خاک کیا جانا تھا۔ دُلہن کی طرح آراستہ تھا۔ دیواروں پر دیباؤ حریر کے پردے آویزاں تھے جو طلائی ستاروں اور سنہری حاشیوں سے آنکھوں کو خیرہ کر رہے تھے۔ گرجا کے آٹھوں سنگین ستون سرخ مخمل

سے مڑھے ہوئے اور طلائی نقش ونگار سے چمک رہے تھے اس گنبد کے نیچے نپولین اعظم کا وہ یادگار زمانہ مزار بنایا گیا جو سالہا سال کی محنت اور لاکھوں روپے کے خرچ کے بعد تیار ہوا۔

تابوت کو شاہی گاڑی سے نپولین کے تیس جانبازہ فداکاروں نے جو اس کی اولڈ گارڈ کے سپاہی رہ چکے تھے۔ اپنے کندھوں پر اتارا۔ اور شہزادہ ولی عہد نے مندرجہ الفاظ کے ساتھ تابوت کو اپنے باپ۔ شاہ فرانس کے حوالے کیا:۔

"جناب عالی میں شہنشاہ نپولین کا تابوت۔ حضور کے حوالہ کرتا ہوں۔"

"میں بحیثیت نمایندہ فرانس اپنی اس امانت کو واپس دیتا ہوں" بادشاہ نے جواب دیا۔ بادشاہ فرانس نے مارشل ساؤلٹ کے ہاتھ سے نپولین اعظم کی تلوار لے کر جرنیل برٹرینڈ کے ہاتھ میں دی اور کہا۔

"جرنیل برٹرینڈا! یہ لیجئے۔ یہ عدیم النظیر شمشیر اور اسے نپولین اعظم کے تابوت پر رکھ دیجئے۔"

اس کے بعد شاہ فرانس۔ ملکہ۔ شہزادوں۔ اور شاہی خاندان کی معیت میں ایک طرف ہٹ کر بیٹھ گیا۔ وزرا۔ فوجی افسران۔ آرچ بشپ آف پیرس اس کے نائب اور دیگر پادری صاحبان سول اور فوجی احکام کا مجمع تابوت کے گرد ہو گیا۔

اس طرح نپولین اعظم کی آخری خواہش پوری ہو گئی!

اور موت کے دروازہ سے گذر کر آخرکار نپولین اپنے تمام دشمنوں کے مقابلہ میں کامیاب ہو گیا۔

(ماخوذ)

حافظ سراج الدین خاں محمود بی۔ اے
بی۔ ٹی

# جواب الجواب شکوہ

## میٹرک کی زبانی

اے خداوند۔ اے خلاقِ جہاں۔ اے معبود! ایکہ ہر سمت ترا نورِ تجلّی موجود!!
تیری صنعت تیری قدرت ہے ہر اک جا مشہود تیری رحمت کا وسیع دائرہ ہے لا محدود
گردشِ دہر کی اک تازہ حکایت سُن لے
میٹرک پاس سے تھوڑی سی شکایت سُن لے

تیرا فرمان ہے کہ علم کی تحصیل کرو بزمِ ہستی کی اسی رمز سے تشکیل کرو
روشِ دہر کو تدریس سے تبدیل کرو اشرف الخلق کے اخلاق کی تکمیل کرو
تیرے محبوبؐ کی تلقین تھی "لوگو! جاؤ!!
چین تک جا کے بھی یہ نورِ معارف پاؤ"

اک زمانہ رہا محدود میں اسکولوں میں اور استادوں کے شاگردوں میں مقبولوں میں
کچھ زمانہ رہا مجہولوں میں مبذولوں میں اور ہوں خیر سے اب فرسٹ ایرفولوں میں
قیدِ اسکول سے فطرت ہوئی آزاد میری
سیر و تفریح کی دنیا ہوئی آباد میری

اب تلک بحرِ حوادث میں بہا جاتا رہا رہروِ دشت کی مانند، چلا جاتا رہا
فارمولوں سے۔ سچائیوں سے دبا جاتا رہا اور اک رنگ نیا۔ چرخ دکھا جاتا رہا
اک زمانے نے ابھی پیس کے چھوڑا ہے مجھے
دس برس! دیوِ تشدد نے جھنجھوڑا ہے مجھے

فکر رزق سے آزاد نہیں کوئی بشر میٹرک پاس ہوا، پہلے یہی آیا نظر
ہاتھ پاؤں کہیں ماروں میں جہاں میں جاکر اس تجسس میں بسر ہو گئے کچھ روز مگر
کچھ نہ ہاتھ آیا، کہیں سے مجھے سروس نہ ملی!

ہر طرف سے یہی آواز ہے "نو ویکینسی"

دل سے اک ہوک اٹھی درد ہُوا صد افسوس　　راس آتی نہیں دنیا کی ہوا صد افسوس
میں کہاں جاؤں بھلا، میرے خدا! صد افسوس　　میٹرک پاس کیا کچھ نہ ملا، صد افسوس
گر نہ سروس ملی یارب! میں کدھر جاؤں گا
فقر و فاقہ سے یونہی جان سے گذر جاؤں گا

گر تجارت کروں؟ مشکل ہے کہ نادار ہوں میں　　صنعت و حرفتِ امروز سے بیزار ہوں میں
پڑھا، لکھا ہوا، کھیتی کروں، لاچار ہوں میں　　خالقِ ارض و سما! کیا کروں؟ بیکار ہوں میں
خودکشی کر لوں؟ نہیں دُنیا بُرا جانے گی
اسی حالت میں جیوُں اس سے سوا جانے گی

اک تصوّر ہے کہ کالج کی ہوا کھانے چلوں　　عہدِ اسلاف کی تہذیب کو جھٹلانے چلوں
نئی تعلیم کے کچھ فائدے ہی پانے چلوں　　نہ سہی ڈگریٔ امروز ہی لکھوانے چلوں
یہ بھی ممکن ہے، کسی طرح سے بی۔ اے۔ ہو جاؤں
اور بتدریج: مدارِج سے ترقی پاؤں..!!

آکے کالج میں بس اک اور ہی دنیا دیکھی　　جس کی جو چیز تھی۔ سرمستِ تماشا دیکھی
دہر میں شکل تمسخر کی سراپا دیکھی　　چپ رہ، شبیرؔ کہ حالت وہاں کیا کیا دیکھی
فرسٹ ایئر فول بنے، ذلت و بدنامی ہوئی
کامیابی میں بھی کیا خوب یہ ناکامی ہوئی

ہائے اب دہر میں توحید کے شیدائی کہاں؟　　اسوۂ پاکِ محمدؐ کے وہ سودائی کہاں؟
پیٔے تعلیم و عمل۔ بادیہ پیمائی کہاں؟　　اس تمرّد میں بھلا نقشِ مسیحائی کہاں؟
ہر طرف فہم و فراست کیلئے چشمے رواں
اب وہ تفہیم، وہ تدریس، وہ تعلیم کہاں

اپنی توحید کی سینے میں ضیاء دے یارب　　نیک رستے پہ چلا، راہ دکھا دے یارب
دل میں تعلیم حقیقی کی جلا دے یارب　　مجھ کو تہذیب کی اس رو سے بچا دے یارب
میں بھٹکتا نہ رہوں، عشق مجازی میں کہیں
فرق آئے نہ تری بندہ نوازی میں کہیں　　(شبیر عفی عنہ)

# پُجارن

ملتان کی زمیں پر گرمی ہے کس بلا کی! تن من جلا رہی ہے شوخی ہے وہ ہوا کی
تپتی ہوئی زمیں سے شعلے نکل رہے ہیں دریا تپے ہوئے ہیں چشمے ابل رہے ہیں
بادِ سموم اپنی شوخی دکھا رہی ہے گویا قدم قدم پر محشر جگا رہی ہے

آرام کی ہوس میں ہر جی ہے تلملاتا!
گرمی سے جس کو دیکھو ہے پیچ و تاب کھاتا

ملتاں میں چار سو ہے اک آگ سی برستی گرمی سے پھک رہی ہے پر آہ لاڈلی یہ بستی
اس وقت ایک گھر میں مزدور سو رہا ہے گرمی سے دوپہر کی بے ہوش ہو رہا ہے
تاریک سا مکاں ہے اور جون کا مہینہ جی گھٹ رہا ہے اس کا گرمی ہے اور پسینہ

لیکن چراغِ الفت سینے میں جل رہا ہے
اِک شعلۂ محبت دل سے نکل رہا ہے

شوہر پرست دیوی پنکھا ہلا رہی ہے سوئے ہوئے پتی پر قربان جا رہی ہے
دل میں ہے جوشِ الفت منہ میں زباں نہیں ہے خدمت کی دھن میں فکرِ سود و زیاں نہیں ہے

کہتی ہے دل ہی دل میں قرباں میرے پیارے
الفت کے آسماں کے او؟ دلربا ستارے

کیونکر نہ تیری پوجا مجھ پہ روا ہو سوامی بخشی ہے ایشور نے مجھ کو تری غلامی
ممتاز ہوں پجارن سیوا کرونگی تیری داسی ہوں میں ازل سے ارداس ہے یہ میری

ممتاز

# تمباکو

جنوبی امریکہ کے اصلی باشندے تو مدتوں سے تمباکو استعمال کرتے تھے۔ لیکن ۱۴۹۲ء میں جب کلمبس کے جہاز بنام کوبا میں پہنچے۔ تو اس نے دو ملاحوں کو اس جزیرے کے حالات دریافت کرنے کے لئے بھیجا۔ واپسی پر انہوں نے دیگر عجائبات کے درمیان۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ بات بھی بتلائی کہ انہوں نے وہاں کے باشندوں کو ناک اور منہ سے دھواں نکالتے ہوئے دیکھا ہے۔ بعد ازاں دیگر سیاحوں کو بھی نئی دنیا یعنی امریکہ کے مختلف مقامات کے باشندوں کی یہ خاص عادت دیکھکر تعجب ہوتا رہا۔ لیکن اسوقت سے ایک صدی بعد تک بھی تمباکو پرانی دنیا (ایشیا۔ یورپ۔ افریقہ وغیرہ) میں نہیں لایا گیا تھا۔ اگرچہ ٹھیک تاریخ تو معلوم نہیں مگر غالباً پندرھویں صدی عیسوی میں انگلستان میں پہلے پہل سر والٹر ایلے نے پائپ (تمباکو پینے کا چھوٹا حقہ) پیا تھا۔ چنانچہ یہ بات مشہور ہے کہ جب سر والٹر ایلے کے ایک نوکر نے ان کے منہ سے دھواں نکلتا دیکھا۔ تو یہ خیال کر کے کہ شاید انہیں آگ لگ گئی ہے۔ انپر پانی کی بالٹی ڈال دی لیکن مصر اور براعظم ایشیا کے ممالک ترکستان اور ایران و ہندوستان وغیرہ میں تمباکو سترھویں صدی میں لایا گیا تھا۔ ہندوستان میں تمباکو پرتگالی لوگ اکبر اعظم کے آخری عہد میں لائے تھے۔ اور ایران میں یہ شاہ عباس ثانی کے عہد میں پہنچا تھا۔ شروع میں تو تمباکو نوشی کی سخت مخالفت کی گئی

چنانچہ یورپ میں مسلمان اور عیسائی اور دیگر بادشاہوں نے اسکی ترقی کے روکنے کے لئے متفقہ کوششیں کیں۔ انگلستان کی ملکہ الزبتھ نے تمباکو نوشی پر ایک تحریری حکم نافذ کیا۔ اس کے بعد شاہ جیمس نے تمباکو نوشی پر سخت جرمانہ مقرر فرمایا۔ اور اس کے جانشین شاہ چارلس نے اس حکم کو بحال رکھا۔ اور ہندوستان میں بھی جیسا کہ خلاصۃ التواریخ میں مندرج ہے کہ جہانگیر بادشاہ نے اپنی سلطنت کے چودھویں سال میں جبکہ وہ لاہور میں تھا۔ تمباکو نوشی کی سخت ممانعت کردی تھی اور حکم دیا تھا کہ جو کوئی تمباکو پیئے گا اسکے ہونٹ کاٹ دیئے جائیں گے۔ چنانچہ اکثر اشخاص کو جنہوں نے اس حکم کی خلاف ورزی کی تھی نشر کیا گیا۔ یعنے انکا منہ کالا کر کے اور گدھے پر سوار کرا کر شہر کے چاروں طرف پھرایا گیا۔ مگر باوجود اس مخالفت کے تمباکو کے رواج کو روز بروز ترقی ہی ہوتی گئی۔ حتٰے کہ یورپ اور ایشیا کے ممالک میں اسکا رواج ہو گیا۔

بلاڈونا۔ دھتورہ۔ اجوائن خراسانی کی طرح تمباکو بھی ایک نباتی دوا ہے جس کا اطبا اور ڈاکٹر مدتوں استعمال کرتے رہے ہیں اور اب وہ قریب قریب متروک ہوگئی ہے لیکن پھر بھی بوقت ضرورت طبیب یا ڈاکٹر کی ہدایت کے موافق اسکا دوا استعمال کرنا کچھ بیجا نہیں مگر خود بخود یا دیکھا دیکھی شوقیہ طور پر اس کا استعمال کرنا بھی خالی از مضرت نہیں۔ یہی سبب ہے کہ جب کوئی شخص پہلی دفعہ تمباکو پیتا یا تمباکو کھاتا

ہے۔ تو اس کا جی متلانا، سر چکرانا اور چکر آتا ہے۔ کمزوری معلوم ہوتی ہے جسم پر پسینہ آتا ہے اور دل ڈوبا جاتا ہے گویا یہ سب طبعی نقصانات ہوتے ہیں جو اس مضر چیز کی عادت سے روکتے ہیں۔ مگر وہ شخص اپنے دیگر ہم جنسوں کو ذوق و شوق سے تمباکو نوشی کا عادی دیکھ کر خیال کرتا ہے کہ یہ کوئی اچھی چیز ہے جو اکثر لوگ اس کے عادی پائے جاتے ہیں پس وہ بیچارہ ان مذکورہ بالا طبعی مزاحمات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بار بار تمباکو نوشی کی کوشش کرتا ہے یہاں تک کہ وہ پکا تمباکو نوش بن جاتا ہے۔ اور پھر بقول "العادت الطبعیت الثانیۃ" اس کی عادت بھی طبیعت ثانی ہی ہو جاتی ہے۔ جس کا ترک کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ انگلستان کے مشہور شعرا ملٹن اور ٹینی سن اور مشہور حکما کارلائل اور سپنسر اور امریکہ کے مشہور عالم پادری ہال صاحب تمباکو نوشی کی عادت سے ایسے مغلوب ہوئے کہ مدت العمر اسے ترک نہ کر سکے چنانچہ ٹینی سن کی نسبت یہ حکایت مشہور ہے کہ ایک شام کو انہوں نے تمباکو نوشی کے ترک کرنے کا عزم بالجزم کر لیا اور اپنا پائپ پھینک دیا۔ مگر دوسری صبح کو بے چارہ اپنے اس باغ میں جو گھر کی پچھلی طرف واقع تھا اپنے اسی پرانے پائپ کی تلاش کر رہا تھا۔

ایسے ہی پادری ہال صاحب کی نسبت جو ایک بہت بڑے عالم تھے۔ مذکور ہے کہ وہ بیچارے تمباکو نوشی کے ایسے گرویدہ ہوئے۔ کہ آخر اس کے غلام ہی بن گئے۔ اور کسی طرح سے اس بات پر غالب نہ آسکتے تھے۔ کہ تمباکو اعتدال سے پئیں۔ ایک دفعہ ان کے ایک دوست کلارک صاحب کا ایک رسالہ جو اس نے تمباکو کی برائیوں پر لکھا تھا۔ انہیں بھیجا۔ پادری صاحب موصوف نے اسے پڑھکر اپنے دوست کو شکریہ میں جواباً لکھا کہ ڈاکٹر صاحب کے دلائل تمباکو کی برائیوں کی نسبت واقعی بہت صحیح اور درست ہیں۔ مگر افسوس کہ میں اس عادت کو ترک نہیں کر سکتا۔

اطباء نے تمباکو کے افعال و خواص بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ تمباکو کا استعمال دل و دماغ کیلئے مضر ہے۔ اس سے سر چکراتا ہے۔ دل دھڑکتا ہے حواس مکدر ہو جاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ یورپ اور امریکہ کے بعض مشہور اور لائق ڈاکٹروں نے تمباکو کے زہریلے اجزاء کی نسبت جو تحقیقات کی ہیں انکا اختصار آپکی اطلاعات کے لئے ذیل میں درج کرتا ہوں۔

معمولی طور پر تمباکو کا عرق نکال لینے سے اس میں نکوٹین جوہر جو ایک سم قاتل ہے تھوڑی مقدار میں پایا جاتا ہے اور اس میں ایک قسم کا روغن بھی ہوتا ہے جسے نکوٹے نین کہتے ہیں ان میں سے ہر ایک کا ایک قطرہ خصوصاً نکوٹین کا ایک قطرہ معمولی کتے کو ہلاک کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے اور دو قطروں سے بڑے سے بڑا کتا بھی ہلاک ہو جاتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے پرندے تو محض اس کی بو سے ہی مر جاتے ہیں۔ اگر تیز حرارت پر عرق کشید کیا جائے تو ایک اور قسم کا بودار روغن حاصل ہوتا ہے۔ اس روغن کے بھی ایک دو قطروں سے بلی کتا وغیرہ ہلاک ہو جاتے ہیں۔

مسٹر بیرڈ ایک افریقی سیاح فرماتے ہیں کہ افریقہ کے باشندے سانپ ہلاک کرنے میں تمباکو کا استعمال کرتے ہیں چنانچہ وہ اپنے حقہ کی نے کا ذرا سا میل سانپ کے منہ میں

ڈال دیتے ہیں۔ جس سے سانپ آناً فاناً مرجاتا ہے۔ اور غالباً یہ عمل ہندوستان اور پنجاب کے بعض مقامات پر معمول ہے۔

چونکہ تمباکو مسترخی عضلات ہے۔ یعنی یہ گوشت کو سست اور ڈھیلا کر دیتا ہے اس لئے کچلے کے زہر اور مرض تشنج میں کہ جس میں عضلات سخت ہو جاتے ہیں اس کا استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن بقول ڈاکٹر مستی صاحب ۲۰ یا ۳۰ گرین (ماشہ یا ڈیڑھ ماشہ) تمباکو کا جوشاندہ رفع تشنج کے لئے دو بارہ سہ بارہ اپنے سے کئی مریض تلف ہو گئے ہیں۔ اگرچہ بعض بعض اشخاص میں (خاصکر بلغمی مزاج۔ مولف) تمباکو کے نقصانات چنداں محسوس نہیں ہوتے۔ لیکن انہیں یہ یاد رہے۔ کہ رفتہ رفتہ اس کا مضر اثر ضرور محسوس ہوگا۔ بوڑھوں کی نسبت جوانوں میں اور جوانوں کی نسبت نوجوانوں میں اسکے نقصانات زیادہ محسوس ہوتے ہیں۔

خاصکر دماغی محنت کرنے والے اور طالب علموں میں کیونکہ تمباکو نوشی وغیرہ سے خون رقیق اور کم ہو جاتا ہے۔ اسی سبب سے فی زمانہ ۸۰ یا ۹۰ فیصدی جو کہ تمباکو نوشی کرتے ہیں۔ امراض جریان اور نامردی وغیرہ میں مبتلا پائے جاتے ہیں۔ اور باوجود علاج کرنے سے تندرست نہیں ہوتے۔ اس کا خاص باعث کثرت تمباکو نوشی ہے۔ مگر افسوس کہ کوئی حکیم یا ڈاکٹر اس بدعادت کے نقائص ان پر منکشف نہیں کرتا اور نہ ہی تمباکو کے زہر کی کوئی نادر دوا تجویز کرتا ہے (مولف) اس لئے امریکہ اور یورپ کے اکثر ممالک میں نوجوان اور خاصکر طالب علموں کیلئے تمباکو نوشی قانوناً ممنوع ہے جس کی تقلید میں گورنمنٹ جاپان نے اپنے ملک میں ایسے ہی امتناعی احکامات نافذ فرمائے ہیں۔ اور خوشی کا مقام ہے کہ حکام اعلیٰ سررشتہ تعلیم پنجاب نے بھی تمام مدارس پنجاب میں تمباکو نوشی کی ممانعت کر دی ہے۔

بقول امریکہ کے ڈاکٹر رش صاحب و ڈاکٹر ڈرواٹر صاحب و پروفیسر سلمان صاحب و پروفیسر پانڈ صاحب اور انگلستان کے ڈاکٹر نکلسن صاحب ڈاکٹر ریچرڈسن صاحب وغیرہ تمباکو کے کثرت استعمال سے بلکہ بعض اوقات اسکے اوسط استعمال سے بھی اکثر دماغی امراض مثلاً درد سر۔ سر چکرانا۔ ضعف حافظہ سکتہ۔ مراق۔ فالج۔ بے خوابی۔ دیوانگی۔ ضعف بصارت نابینائی۔ آواز کا بھاری ہو جانا۔ کھانسی۔ سل۔ کمزوری دل دھڑکنا۔ جریان۔ ضعف باہ۔ نامردی وغیرہ وغیرہ ہو جاتے ہیں۔

کچھ عرصہ ہوا کہ ملک فرانس کی طبی مجلس کے ایک سرگرم ممبر نے وہاں کے ایک نہایت مقبول عام اخبار میں تمباکو کے مضرات کی نسبت محققانہ طور پر یہ مضمون شایع کیا تھا۔ کہ تمباکو نوشی کی کثرت سے اس ملک میں سرطان۔ دیوانگی۔ اور فالج وغیرہ کی امراض کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔ ایسے ہی انگلستان۔ امریکہ اور فرانس کے بڑے بڑے ڈاکٹروں کا یقینی خیال ہے کہ شراب و تمباکو نوشی کی کثرت سے ان ممالک میں عصبی امراض خصوصاً مرض فالج کی بہت زیادتی ہو گئی ہے۔ اور ملک جرمن کے ڈاکٹر صاحبان فرماتے ہیں۔ کہ ان کے ملک میں ۱۸ سے ۳۰ برس کی عمر کے جو لوگ مرتے ہیں۔ انمیں سے نصف محض تمباکو نوشی سے ہلاک ہوتے ہیں۔ اگرچہ ہندوستان میں بھی کثرت تمباکو نوشی سے بلا شک وشبہ ہزاروں جانیں تلف ہوتی ہیں۔ مگر چونکہ یہاں اس امر کی کوئی تصدیق نہیں کرتا۔ اس لئے کسی کو کچھ خبر نہیں۔ دل

دماغ ۔ معدہ ۔ اور پھیپھڑوں پر تمباکو کا بہت برا اثر پڑتا ہے۔

چنانچہ تمباکو نوشی سے دل دھڑکنے لگ جاتا ہے ۔ اور کمزور ہو جاتا ہے ۔ جب تمباکو کا زہریلا اثر شدت سے ہو جاتا ہے ۔ تو دل کی حرکت بند ہو کر موت واقع ہو جاتی ہے [illegible] قلب کے سو مریضوں میں سے ۹۰ ضرور ایسے ہونگے ۔ جن میں اس مرض کا سبب صرف تمباکو نوشی ہوگی ۔

اسی طرح سے امراض دماغی جیسا دردسر ۔ دوران سر ۔ بے خوابی ۔ ضعف حافظہ ۔ ضعف بصارت کے مریض تو بہت دیکھے گئے ہیں ۔ "ضعف بصارت" تمباکو کو ڈاکٹری میں " ٹباکو ایمبلی اوپیا" کہتے ہیں ۔ امراض شُش میں سے پرانی کھانسی اکثر تمباکو نوشی کے سبب سے ہوتی ہے اور جو لوگ تمباکو کھاتے ہیں انکا معدہ ضعیف ہو کر ہضمہ خراب ہو جاتا ہے ۔ اور بہ سبب آنتوں کے عضلاتی ریشوں کے ڈھیلا ہو جانے کے انہیں اکثر مرض کی شکایت رہتی ہے ۔ چونکہ دماغ کی طرح حرام مغز پر بھی تمباکو کا اثر مضعف ہوتا ہے اسلئے کثرت تمباکو نوشی سے ضعف باہ کی شکایت بھی عام ہوتی ہے ۔ جس کو اکثر اشخاص نہیں سمجھتے اور باوجود مقوی ادویات کے کھانے کے انکا کچھ فائدہ محسوس نہیں ہوتا ۔ کیونکہ وہ تمباکو نوشی کو کم یا ترک نہیں کر دیتے ۔

مجھے اس بات کا سخت افسوس آتا ہے ۔ کہ ہندوستان میں تمباکو کا استعمال روزافزوں ترقی پر ہے ۔ سگرٹ نوشی تو گویا آجکل کا فیشن ہے ۔ اور اکثر نوجوان اس فیشن کے دلدادہ ہیں ۔ مگر افسوس کہ وہ اسکے بد نتائج کو نہیں جانتے ۔ اور شاید وہ یہ بھی نہ جانتے کہ ڈاکٹری کتب میں (بلکہ طب مشرقی میں بھی ۔ مولف) زہریلی ادویات مثلاً بِس ۔ دھتورہ ۔ کچلہ ۔ افیون سنکھ وغیرہ کی فہرست میں تمباکو بھی شامل ہے ۔

یورپ اور امریکہ کے تمباکو کے کارخانوں میں یہ بھی مشاہدہ کیا گیا ہے ۔ کہ ایسے کارخانوں میں کام کرنیوالے لوگ کمزور اور زرد رنگ کے ہوتے ہیں ۔ اور ان میں سے بہت کم ایسے ہوتے ہیں جن کی عمر لمبی ہوتی ہو ۔ اور مزارعین کا بھی یہی بیان ہے کہ تمباکو جس زمین میں بویا جاتا ہے وہ زمین بہت کمزور ہو جاتی ہے ۔

تمباکو چار طریق سے استعمال ہوتا ہے ۔

(۱) ناک کے ذریعے یعنی اس کی نسوار لینے سے ۔
(۲) نسوار یا تمباکو یا زردہ منہ میں رکھکر اس کا رس چوستے ہیں ۔
(۳) سگار یا سگرٹ کے طور پر پیتے ہیں ۔
(۴) حقہ یا سٹک کے ذریعے استعمال کرتے ہیں ۔

غرضیکہ تمباکو تقریباً ۹۰ فیصدی ہر ایک انسان کیلئے کسی نہ کسی ترکیب سے وبال جان بنا ہوا ہے ۔ جن میں سے سٹک یا پیچواں حقے کے ذریعے تمباکو پینا نسبتاً کم مضر ہے ۔ کیونکہ اول تو اس کا دھواں حقے کے پانی میں سے گذرتا ہے جس میں اس کا زہریلا اثر کسی قدر جذب ہو جاتا ہے دوئم حقے کی نے کے لمبا ہونے کی وجہ سے دھوئیں کی گرمی کم ہو جاتی ہے ۔ مگر بہت سے زیادہ مضر طریقہ تمباکو کا کھانا ہے ۔ بہرکیف تمباکو خواہ کسی طریق سے استعمال کیا جائے اس کے نقصانات اس کے جزوی فوائد کی نسبت بدرجہا زیادہ ہیں ۔ اور اگر آپ میری نصیحت مانیں تو تمباکو ہرگز استعمال نہ کریں ۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو تمباکو نہیں پیتے (خوش قسمت ہیں وہ اشخاص جن کو تمباکو پینے ۔ نسوار لینے ۔ اور تمباکو کھانے کی کسی قسم کی کوئی بھی عادت نہیں ۔ مولف)

اب میں اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے محض ان لوگوں کی خاطر جو مثل پادری ہال صاحب کے کسی طرح سے تمباکو کو چھوڑ ہی نہیں سکتے تمباکو نوشی کے متعلق چند ہدایات تحریر کرتا ہوں۔ جن کی پابندی سے تمباکو کا مضر اثر کچھ نہ کچھ ضرور کم ہوگا۔

(۱) علی الصباح ناشتہ کرنے سے پہلے ہرگز تمباکو نہ پینا چاہئیے۔ (۲) کوئی زور کا کام یا ورزش کرنے مثلاً اچھلنے کودنے دوڑنے۔ درخت پر چڑھنے یا پہاڑ پر چڑھنے اترنے وغیرہ کے بعد فوراً ہرگز تمباکو نہ پینا چاہئیے۔ (۳) تمباکو پیتے وقت دھواں ناک سے نہیں نکالنا چاہئیے۔ نیز آنکھوں کو دھوئیں سے محفوظ رکھنا چاہئیے۔ اس لئے حقے کی نے جس قدر لمبی ہو اسی قدر اچھی ہے۔ (۴) سگار اور سگرٹ کی نسبت پائپ اچھا ہوتا ہے۔ اور اس سے اچھا حقہ اور سب سے اچھا پیچوان ہے۔ (۵) جب سگار یا سگرٹ ¾ جل چکے۔ تو اسے پھینک دینا چاہئیے۔ (۶) ہر ایک تمباکو نوش کو چاہئیے کہ رات کو سوتے وقت ایک گلاس پانی میں ذرا سا نمک ڈال کر اس سے خوب کلی اور غرغرہ کر کے منہ اور دانتوں کو صاف کر لیا کرے۔ (۷) بند کمرے میں سگار۔ سگرٹ۔ یا حقہ وغیرہ ہرگز نہ پینا چاہئیے۔ ورنہ اس کا مضر اثر اور زیادہ ہوگا۔ (ماخوذ)

حکیم شہزادہ محمد صابر ابدالی

## اعلان

ستمبر کا پرچہ جیسا کہ اعلان ہو چکا ہے خاص نمبر ہوگا۔ ستمبر اور اکتوبر کیلئے یہ پرچہ مشترکہ نمبر ہوگا۔ اس کا یہ مطلب ہوا۔ کہ اکتوبر کا پرچہ شائع نہیں ہوگا۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہ خاص نمبر ڈاک میں، ستمبر کی بجائے اکتوبر ۱ کو ڈالا جائیگا۔

# فوارہ

(جناب تصدق حسین خالد صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (لنڈن) ایف آر ایس بار ایٹ لا)

کھیلتا ہے چمن میں فوارہ
پتیاں گر رہی ہیں گرداگرد
زرد، اودھی، سفید، نیلی، سرخ
رنگ ان کا وہ گیروانہ سا
پتھروں سے چمٹتا جاتا ہے
زندگانی کا منہ چڑاتا ہے

(خالد)

# "لمعات"

(مصور جذبات حضرت ضیاء جعفری صدر دائرہ ادبیہ)

دزدیدہ بباغ آئی از ذوق تماشا ست
بابوئے گل آمیزی چوں نشہ بہ صہباست

از عشوۂ آں ساقی از گردش آں صہبا
ہر ذرہ بہ مینا ست ہر لالہ بہ صحرا ست

فوجِ گل و موج مل ہنگامِ سیہ مستی!
خم ست و صراحی ست ابرِ چمن آرا ست

از ذوقِ جمالِ اُو شوریست بہ قلزمہا
ہر قطرہ بہ دریا ست ہر لولوئے لالا ست

چوں نشہ بہ صہبائیم چوں قطرہ بہ دریا ایم!
درمیکدۂ لا ایم از ساغرِ الا ست

(ضیاء جعفری)

# بچوں کی دنیا

## شاہی انگوٹھی

بہت عرصہ گزرا۔ ملکِ مصر کا ایک بادشاہ تھا۔ جس کو سیر و سیاحت کا بہت ہی شوق تھا ایک روز اس نے اپنے وزیر کو حضور میں طلب کر کے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔ کہ وہ ایک لمبے سفر پر روانہ ہونا چاہتا ہے۔ مگر یہ روانگی اخفا میں رہنی چاہئے۔ تاکہ بادشاہ کی عدم موجودگی کا کسی کو علم نہ ہو۔ اور کاروبارِ سلطنت بھی احسن طریق پر انجام پاتے رہیں۔ اسکے لئے ضروری تھا کہ کوئی شخص محض نام نہاد طور پر بادشاہ کی جگہ بٹھا دیا جائے۔ مگر اس تبدیلی کا کسی کو علم نہ ہو۔ آخر یہ قرار پایا۔ کہ کوئی شخص بادشاہ کا ہم شکل اس کام کے لئے تلاش کیا جائے۔ الغرض رات کے وقت سلطان اور اسکا وزیر اسی جستجو میں بھیس بدل کر نکلے تمام شہر کا گشت لگاتے ایک قہوہ خانہ میں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک شخص جو صورت شکل سے بہت کچھ سلطان سے ملتا جلتا تھا۔ بیٹھا ہوا شراب نوشی میں مشغول ہے۔ سلطان کے ایما سے وزیر نے ہوٹل کے ملازم کو بلا کر کچھ روپے اسکو دیئے اور تاکید کی کہ اس شخص کو اس قدر شراب پلاؤ کہ مدہوش ہو جائے اور جب اس کو بالکل تن بدن کا ہوش نہ رہے تو اٹھا کر سڑک پر ڈال دو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ وزیر نے اس مدہوش شخص کو اٹھا لیا۔ اور سلطان کے ساتھ چور دروازے سے محل میں داخل ہو کر اس شخص کو بادشاہ کی شب خوابی کا لباس پہنا کر شاہی سونے کے مرصع چھپر کھٹ پر لٹا دیا۔

آپ ذرا سوچیئے تو اس شخص کی نیند سے جاگنے کے بعد حیرت و استعجاب سے کیا حالت ہوئی ہوگی۔

بادشاہ تو اپنے وزیر کی معیت میں اسیوقت سیر و سیاحت پر روانہ ہوگیا۔ اب آپ ذرا نقلی بادشاہ کا حال سنیئے۔ جب وہ نیند سے بیدار ہوا۔ تو شاہی کمرے کی سجاوٹ سونے چاندی کے جھاڑ فانوس، ریشمی پردے، قیمتی قالین اور غالیچے، سنگ مرمر کی جالیاں۔ سنگ سرخ کی دیواریں دیکھکر سمجھا کہ میں کوئی شیریں خواب دیکھ رہا ہوں۔ آنکھیں بند کرکے لیٹا رہا۔ مگر جب غلام زرق برق لباس میں ملبوس ہاتھ میں سونے کا لوٹا اور چاندی کی چلمچی لئے کمرے میں منہ ہاتھ دھلوانے داخل ہوا تو اس کو کچھ کچھ یقین آیا۔ چیزوں کو ہاتھ سے چھوکر دبا دبا کر دیکھنے لگا۔ کہ جادو کی بنی ہوئی تو نہیں ہیں۔ ناشتہ سے فارغ ہوا تو داروغہ محل حاضر ہوا۔ اور ہاتھ باندھ کر عرض کیا جہاں پناہ کا دولت و اقبال زیادہ، دشمن پائمال۔ آج جمعۂ مبارک ہے۔ نماز جمعہ کونسی مسجد میں ہوگی۔ تو اسکو اپنے محلہ کا خیال آیا۔ جھٹ اس کا نام لے دیا۔

قاہرہ کا دستور تھا۔ کہ بادشاہِ وقت باری باری شہر کی ہر ایک مسجد میں نماز جمعہ ادا کرتا۔ اور نماز کے بعد اس محلہ کی رعایا کو اجازت ہوتی کہ وہ اپنی اپنی شکایات عرضیوں میں لکھ کر پیش کریں۔ تاکہ ان کی دلدہی کی جائے۔ چنانچہ اس دن بھی ایسا ہی ہؤا۔ اور نقلی بادشاہ کے سامنے خود اس کی اپنی بیوی کی عرضی پیش ہوئی۔ جس میں درج تھا کہ میرا شوہر بڑا لاپرواہ اور فضول خرچ ہے۔ تمام کمائی شراب خوری میں ضائع کرتا ہے۔ اور کل سے بالکل لاپتہ ہے میں پردہ نشین شریف عورت ہوں۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ ہماری پرورش کا انتظام فرمایا جائے۔ نقلی بادشاہ نے فوراً افسر خزانہ کو حکم دیا۔ کہ اس عورت کا پانچسو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کردیا جائے۔ ہم نقلی بادشاہ کو اس کی خوشی اور رنگ رلیوں میں چھوڑ کر اصلی بادشاہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

سلطان اور وزیر اسیطرح ایک عرصہ تک سفر و سیاحت کرتے کرتے ایک روز ایک مرغزار میں ندی کے کنارے پہونچے۔ ندی کے قریب ہی ایک بڑا عالیشان باغ تھا۔ یہ دونوں یہیں اتر پڑے اپنے گھوڑوں کو درخت سے باندھ دیا۔ اور بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر میں ہوا کے جھونکے کے ساتھ باغ میں سے ایک سیب درخت سے ٹوٹ کر باہر گر پڑا۔ وزیر نے اٹھاکر بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔ بادشاہ نے باتوں باتوں میں اسے کھانا شروع کر دیا۔ ختم کر چکا تو خیال آیا کہ مالک کی بغیر اجازت سیب کھا لیا یہ تو بہت برا ہوا۔ فوراً اٹھکر باغ میں مالک باغ سے معافی مانگنے گیا وہاں جاکر معلوم ہوا کہ باغ تو ایک عورت کی ملکیت ہے۔ جو خود اسی باغ میں رہتی تھی نوکر و لیا کے ذریعہ سب بات کی اطلاع کراکر اپنے قصور کی معافی چاہی۔ تو معلوم ہوا کہ معافی اس حالت میں مل سکتی ہے کہ جب تم مالکہ باغ سے شادی کرنے کا اقرار کرو۔ بادشاہ نے فوراً اقرار کر لیا۔ تو اندر سے اطلاع ملی کہ یہ واضح رہے کہ خاتونِ باغ سخت بدشکل اور کریہہ منظر عورت ہے۔ بادشاہ نے جواب دیا۔ خیر کچھ مذائقہ نہیں۔ اب تو میں نے اقرار کر لیا ہے۔ اور قول مرداں جان دارد۔ الغرض بادشاہ کی شادی اسی روز ہو گئی۔ اور شادی کے بعد بادشاہ کو معلوم ہوا کہ اسکی دلہن تو بہت حسین اور ماہ جبین عورت ہے۔ اور صرف یہ آزمانے کیلئے کہ یہ اجنبی شخص اپنے قول کا پکا اور بات کا پورا ہے یا نہیں عورت کو بدشکل بتایا گیا تھا۔

سلطان شادی کرنے کے بعد چالیس دن تک اپنی دلہن کے پاس رہا۔ اور جب پھر اپنے سفر پر جانے لگا تو اپنی دلہن کو ایک انگوٹھی دی۔ اور کہا کہ تمہارے جو لڑکا پیدا ہوگا۔ جب وہ اٹھارہ سال کا ہوجائے تو اسکو یہ انگوٹھی دیکر قاہرہ روانہ کر دینا۔ جب وہ وہاں پہونچکر انگوٹھی لوگوں کو دکھائے گا۔ وہ میرا پتہ بتادیں گے۔

ایک عرصہ دراز کے بعد بادشاہ سیر و سیاحت کا شوق پورا کرکے آخر کار پھر اپنے پایۂ تخت قاہرہ میں پہنچا۔ اور پھر اسی طرح رات کے وقت وزیر نے نقلی بادشاہ کو شراب کی بیہوشی کی حالت میں

لیجاکر اسی سڑک کے کنارے سے جہاں سے اٹھا کر لائے تھے ڈال دیا۔ جب اسکی آنکھ کھلی۔ تو اس سامان عیش و عشرت کو نہ پایا تمام نقشہ برہم ہوگیا۔ دل میں بہت سوچا کہ اصلی حقیقت کیا ہے۔ مگر کچھ سمجھ نہ آیا۔ آخر کار صبر کر لیا۔

”خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا“

ٹھکے گھر پہونچا تو بیوی پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ گئی۔ کہ اتنے دن سے کہاں غائب تھے اب وہ لاکھ قسمیں کھاتا اور یقین دلاتا ہے۔ کہ میں بادشاہ بن گیا تھا۔ اور میں نے تمہارا ۵۰۰ روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر کیا تھا جو تم کو شاہی خزانہ سے ملتا ہے۔ مگر کون سنتا ہے فغانِ درویش، سب اس کو پاگل خبطی سمجھنے لگے۔ مگر ایک فائدہ ضرور ہوا۔ وہ یہ کہ ۵۰۰ روپے کا وظیفہ تمام عمر اسکے خاندان کو ملتا رہا۔

اب بادشاہ کی دلہن کا حال سنئے۔ اسکے ہاں لڑکا پیدا ہوا۔ اور جب وہ لڑکا اٹھارہ برس کا ہوا تو اس نے شوہر کی ہدایت کے مطابق اسکو انگوٹھی دیکر قاہرہ روانہ کر دیا۔ راستہ میں ایک اور نوجوان لڑکا جو شہزادے ہی کا ہم عمر تھا اور قاہرہ جا رہا تھا اس کا ہم سفر بن گیا۔ دو چار روز میں دونوں میں بے تکلفی کی دوستی ہوگئی۔ اور شہزادے نے اسکو انگوٹھی دکھا کر اپنے تمام واقعات بتا دیئے وہ انگوٹھی دیکھکر پہچان گیا۔ کہ یہ تو بادشاہ کی انگوٹھی ہے۔ اب اسکی نیت بدل گئی۔ لالچ اور طمع نے اسکو اندھا بنا دیا۔ اور شہزادے کی جان لینے کی تدبیریں سوچنے لگا۔ ایکدن دونوں راستہ طے کرتے کرتے ایک چٹیل میدان میں پہونچے کوسوں تک کہیں پانی کا نام و نشان نہ تھا۔ شدت پیاس سے دونوں بیتاب ہو رہے تھے۔ وہ تمام دن اسیطرح گذرا۔ آخر کار خدا خدا کرکے دوسرے دن ایک ایسے مقام پر پہونچے۔ جہاں ایک گہرا کنواں تھا۔ شہزادہ فوراً اسمیں جھانک کر دیکھنے لگا۔ کہ پانی ہے یا نہیں۔ اس کے ساتھی کو یہ موقعہ غنیمت معلوم ہوا اس نے شہزادے کو پیچھے سے زور کا دھکا دیکر کوئیں میں گرا دیا۔ مگر انگوٹھی شہزادے کے پاس تھی۔ اور اسکا مقصد شہزادے کی جان لینا نہ تھا۔ بلکہ انگوٹھی حاصل کرنا تھا لہذا اس نے شہزادے

سے کہا۔ کہ اگر تم انگوٹھی میرے حوالے کرنیکا اقرار کرو۔ تو میں تمکو کوئیں سے باہر نکال لیتا ہوں۔ شہزادے نے اقرار کیا۔ چنانچہ اس شخص نے ایک مضبوط ڈوری کے ذریعہ شہزادے کو باہر کھینچ لیا۔ شہزادے نے قول کے مطابق انگشتری اپنے ساتھی کے حوالے کی۔

جب قاہرہ پہونچے تو شہزادے کے ساتھی نے جس کا نام منصور تھا۔ انگوٹھی دکھا کر بارگاہِ سلطانی میں رسائی حاصل کر لی۔ بادشاہ تو اصل حقیقت سے ناآشنا تھا۔ اسنے منصور ہی کو اپنا اصلی بیٹا اور شہزادہ سمجھا۔ اب منصور کی سفارش سے اصلی شہزادے کو بھی وہیں دربار میں ایک عہدہ مل گیا۔ شہزادہ آخر شہزادہ تھا۔ اسکی رگوں میں شاہی خون اس کی ہمت میں بلندی، اور اس کی عقل میں تیزی تھی۔ اس نے اپنی قابلیت اور خدمات سے بادشاہ کی نظروں میں تھوڑے ہی عرصہ میں بڑی وقعت حاصل کر لی۔ اسی زمانہ میں ایکدن بادشاہ شیر کے شکار کو گیا۔ نقلی شہزادہ یعنی منصور بھی ساتھ تھا۔ بہت سے دوسرے افسران اور اصلی شہزادہ بھی ہمرکاب تھے۔ سب لوگ ہاتھیوں پر سوار تھے۔ جنگل میں پہنچکر ہزار دو ہزار پیادے پانچ پانچ چھ چھ گز کے فاصلہ پر حلقہ میں کھڑے کر دیئے گئے۔ ان سب کے ہاتھوں میں ڈھول مشعلیں نیزے اور بھالے وغیرہ تھے ایک طرف بادشاہ سلامت خود معہ اپنے افسران وغیرہ کے ہاتھیوں پر سوار کھڑے تھے۔ اب لوگوں نے ہلہ کر کے حلقہ کو چھوٹا کرنا شروع کر دیا۔ شیر مشعلوں کی آگ اور ڈھول کی آواز سے ڈر کر دیوانہ وار اسطرف دوڑا جدھر بادشاہ سلامت وغیرہ کھڑے تھے۔ شیر نے آتے ہی ایک جست کی اور جس ہاتھی پر بادشاہ سلامت تشریف فرما تھے اس کی داہنی ٹانگ کو بے طرح زخمی کر دیا۔ ہاتھی شدتِ تکلیف سے جھک گیا۔ اس سے پہلے کہ بادشاہ سنبھل سکیں وہ ہودے سے نیچے زمین پر آرہے۔ شیر اپنے شکار کو اس قدر قریب دیکھ کر خوشی سے دہاڑا۔ سب لوگ خوفزدہ تھے اور کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ قریب جا کر بادشاہ کی جان بچائے مگر بلند ہمت شیر دل شہزادہ فوراً اپنے ہاتھی سے کود پڑا۔ اور میرے ابا جان کہتا ہوا۔ شیر کے اور بادشاہ کے درمیان آگیا۔ اپنی تلوار نکالی اور اسپر حملہ کر دیا۔ شیر زخم کاری کھا کر گرا۔ اب تو چاروں طرف سے لوگ دوڑ پڑے اور شیر کا بالکل قیمہ کر دیا۔ مگر بادشاہ کی جان بچانے کا سہرا نوجوان شہزادے ہی

کے سر پر رہا۔

بادشاہ نے خود اپنے کانوں سے شہزادے کے الفاظ سن لئے تھے۔ وہ شک میں پڑ گیا کہ اس نے ابا جان کیوں کہا۔ بادشاہ نے چپکے چپکے شہزادے کے حسب نسب ماں باپ اور پیدائش کے متعلق تحقیقات شروع کر دی آخر کار سب کچھ پتہ لگ گیا مگر بادشاہ حیران تھا۔ کہ انگوٹھی منصور کے ہاتھ کیونکر لگی۔ وزیر کے مشورے سے ایکدن دونوں کو سامنے طلب کر کے اصلی بات دریافت کی شہزادہ تو خاموش رہا۔ منصور نے جب دیکھا کہ ساری قلعی کھل گئی۔ تو بادشاہ کے قدموں پر گر کر جان کی امان چاہی۔ بادشاہ نے اس کا قصور اس شرط پر بخشنے کا وعدہ کیا۔ کہ اصلی راز حرف بحرف بتا دے۔ اس نے سب احوال بتا دیا۔ بادشاہ نے اپنے اصلی بیٹے اور وارث تخت و تاج کو گلے سے لگایا۔ اسکے صادق القول ہونے کی اور مستقل مزاجی اور بہادری کی خوب تعریف کی۔ تمام سلطنت میں اس خوشی پر تین دن کی چھٹی منائی گئی۔ قیدی آزاد کئے گئے۔ اور سات روز تک شاہی جشن اور دعوت عام رہی۔ آپنے دیکھا کہ سچائی کا بول ہمیشہ بالا رہتا ہے اور گناہ سات پردوں میں چھپ کر بھی کیا جائے تو بھی ایک دن ظاہر ہو کر رہتا ہے۔

# پتے خزاں میں اپنے رنگ کیوں بدلتے ہیں

پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے۔ کہ پتوں کا رنگ سبز کیوں ہے۔ پتوں کے اندر ایک مادہ ہوتا ہے۔ جسے کلوروفل (CHLOROPHYLL) کہتے ہیں۔ اس کا رنگ سبز ہے۔ یہی پتے کی اصلی جان ہے۔ اور سورج کی روشنی میں یہی ہوا سے کاربن ڈائے اوک سائڈ (CORBON DIOXIDE) اخذ کر لیتا ہے اور وہ درخت کی جزو بدن بنتی ہے۔ جس سے درخت بڑھتا اور پھولتا ہے۔ جب گرمی کا موسم ہوتا ہے تو جتنی جلدی کلوروفل خراب ہوتا ہے اتنی ہی جلدی درخت اسے نئے سرے سے تیار کرتا رہتا ہے۔ چونکہ اس زمانے میں گرمی کے سبب درخت کو کاربن ڈائے اوک سائڈ جذب کرنے کی ضرورت ہے۔

جب سردی آتی ہے۔ تو درخت یہ کام کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ گویا وہ آرام کرنا چاہتا ہے اب جو کلوروفل دھوپ میں بہت عرصے تک رہنے سے خراب ہو جاتی ہے۔ اس کو اب وہ درست نہیں کرتا۔ بلکہ ایسے ہی رہنے دیتا ہے۔ اس سے پتوں کا رنگ زرد یا سرخی مائل ہو جاتا ہے۔ اور وہ گرنے شروع ہو جاتے ہیں۔

خزاں میں پتوں کا رنگ یا تو زرد ہو جاتا ہے۔ یا سرخ۔ زرد مادہ تو کلوروفل کے ساتھ پتوں میں پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ مگر چونکہ کلوروفل کی رنگت بہت گہری ہوتی ہے۔ اور اسکی مقدار بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اسلئے یہ زرد مادہ ہمیں دکھائی نہیں دیتا۔ جب کلوروفل نابود ہو جاتا ہے تو اس کا زرد رنگ نظر آنے لگتا ہے۔ سرخ رنگ ایک اور طرح پیدا ہوتا ہے۔ پتے کے خانوں میں ایک لیسدار مادہ ہوتا ہے۔ جو سرخ رنگ پیدا کرتا ہے۔ جب کلوروفل ضائع ہو جاتا ہے تو یہ اسکی جگہ ظاہر ہونے لگتا ہے۔

ان تبدیلیوں کا سبب کچھ تو خزاں ہے۔ جو موسم سرما کی آمد کا اعلان ہے۔ اسوقت درخت زمستان کے لئے تیاری شروع کرتا ہے۔ وہ اپنی قوتوں کو ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ وہ جانتا ہے کہ اس موسم میں مجھے اچھی خوراک نہ مل سکیگی۔ اسلئے ضرورت سے زائد تمام چیزوں کو علیحدہ کر دیتا ہے۔

ہر درخت میں کچھ میٹھے مادے یعنی چینی اور اسیطرح کا خوراک کا اور سامان موجود ہوتا ہے۔ آپکو یہ سنکر حیرت

ہو گی۔ کہ جب پتوں کے گرنے کا موسم آتا ہے تو درخت اسطرح کا انتظام کرتا ہے۔ کہ ان خوراک کی تمام چیزوں کو پتوں میں سے نکال لیتا ہے۔ یا تو انہیں اپنے تنے اور جڑوں کے محفوظ مقامات میں جمع کر لیتا ہے۔ یا پھر اپنے پھلوں کے پکنے کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اور وہ پھل میں جمع ہو جاتی ہے۔ اسطرح سے جب خشک پتہ درخت پر سے جھڑتا ہے۔ تو اس میں بیکار مادے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

بعض ایسے درخت ہیں۔ جو فطرتاً سدا بہار ہیں۔ ان کو پتے گرانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ گویا ان میں اتنی قدرت موجود ہے۔ کہ وہ سردی گرمی دونوں موسموں میں اپنی خوراک اور آسائش کا انتظام کر سکیں ؎

# ایک پتی (۱)

رلیشم کی سرسراہٹ اب ختم ہو چکی ہے
صحن چمن میں ہر سُو اک دھول اڑ رہی ہے
آواز پا نہیں ہے، رنگِ نوا نہیں ہے
پتے بکھر بکھر کر اک ڈھیر بن چکے ہیں
خاموش پڑ رہے ہیں۔
اور وہ کہ جس سے دل کو حاصل تھی اک مسرت
نیچے پڑی ہوئی ہے۔
دہلیز کے کنارے بھیگی سی ایک پتی !!

(خالد)

# تجدیدِ اُلفت

(از جناب طالب جعفری صاحب)

آپ اسے قسمت کی یاوری خیال کریں یا ہنر مندی کا کرشمہ ٹھہرائیں بہرحال رشید اس گئے گذرے زمانے میں بھی محنت و جانفشانی سے اسقدر ضرور کما لیتا کہ گھر کا گذارہ ہونے کے علاوہ بُرے بھلے وقت کے لئے کچھ پس انداز بھی کیا جا سکے اسوقت ضروریات زندگی محدود تھیں لوگ آرائش و زیبائش کے اسقدر دلدادہ نہ تھے نیز وہ رہتا بھی تو شہر کے قریب ایک گاؤں میں تھا۔ اسلئے خرچ اخراجات میں زیادہ روپیہ نہ اٹھتا تھا۔ اس کا والد متمول اور سن رسیدہ ہونے کی وجہ سے زمانے کے گرم و سرد شیریں و تلخ اور نشیب و فراز سے بخوبی آگاہ تھا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ بحرِ الفت کی بدولت مفلسی کی مسموم ترین فضا بھی جرعہ جات کو مکدّر نہیں کرنے پاتی برعکس اس کے قلبی منافرت کتاب زندگی کے ابواب کو سخت بدمزہ اور بے کیف بنا دیتی ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو سنگدل سے سنگدل بشر بھی تنگ آ کر خودکشی پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ ورنہ دولت تو شاید بازاری کے صندوق میں بھی بہ نسبت عوام کے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے نسبت ٹھہراتے وقت دوسری باتوں کے علاوہ شرافت کو بھی خاص طور پر ملحوظ رکھا تھا۔ مگر فطرت اور تقدیر اس کی آرزوں کے خلاف برسرِ پیکار تھی چنانچہ وہ شادی سے قبل ہی حسرت دامان بھیٹتا ہوا داعئی اجل کو لبیک کہہ گیا۔ کچھ عرصہ بعد لڑکی والوں کیطرف سے تقاضا ہونے لگا رشیدہ کی والدہ نے پہلے تو التوا کی التجا کی لیکن چند یوم بعد خود ہی رضامندی کی چٹھی لکھ دی۔ بس پھر کیا تھا شادی کی تیاری کی گئی رشتے ناطے والے تشریف لائے شادی ہوئی اور وقت و ماحول کے لحاظ سے خاصی بازنق ہوئی۔

رشید صبح کو ناشتہ کر کے شہر چلا جاتا تمام دن وہاں کام کاج کرتا اور شام کا دھندلکا ہونے تک گھر واپس پہنچ جاتا مہینے کے اختتام پر کارخانہ سے تنخواہ ملتی تو ماہ رواں کے لئے شہر ہی سے سامان خورد و نوش خرید لاتا جو کچھ بچتا ماں کے حضور پیش کر دیتا۔

---

رشید ازدواجی زندگی کی نعمتِ عظمےٰ سے زیادہ عرصہ لطف اندوز نہ ہو سکا کیونکہ ابتدا میں تو ساس نے بہو کی تعریفوں کے پُل باندھنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا لیکن کچھ عرصہ بعد عایشہ کی بدتمیزی کی شکایت رشید کے گوش گزار کرنے لگی۔ رشید بھی کان میں لقمہ ڈالنے والا تو تھا نہیں وہ خود عملی طور پر ہر ایک بات کا تجربہ کر چکا تھا۔ کہ عائشہ انتظام خانہ داری۔ رواجی علم۔ ادب گفتگو علم سلیقہ غرضیکہ ہر نوع میں قابلِ قدر بہرہ یاب تھی۔ اور ہر لحاظ سے

ایک قابل بیوی اور بہو کہلانے کی مستحق تھی۔ محلہ پڑوس کے لوگ بھی اس کی عادات و خصائل سے گرویدہ ہونے کی وجہ سے تعریفیں کرتے دیوانے ہوئے جاتے تھے۔ اس لئے یہ بھی ہوں ہاں کہکر ٹال دیتا۔ عورت کی ہٹ دھرمی چار دانگ عالم میں عرصہ کی ضرب المثل کی سند حاصل کر چکی ہے۔ رشید کی والدہ اس فطری جذبہ سے کیونکر مستثنٰی رہ سکتی تھی۔ اپنی ضد پر قائم رہی اور دل کا غبار نکالنے کیلئے کسی بہترین موقع کی منتظر رہی۔

نرم و نازک چیز کی پیہم رگڑ سے تو پتھر دل میں بھی گڑھے رونما ہو جاتے ہیں یہاں تو بھلا معاملہ ہی دل سے تھا۔ اور وہ بھی رشید جیسے سعادتمند نیک بخت لخت جگر کا دل۔ ماں کی باتوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا دلپر تربیت اور بیوی کی محبت پر مادری الفت غالب آگئی۔ مجبوراً بیوی کو برا بھلا کہنا شروع کیا۔ رشید کی والدہ اپنی کامیابی و عقلمندی پر دل ہی دل میں نہ صرف شاداں و فرحاں بلکہ نازاں بھی تھی۔ لیکن اس کی آتشِ انتقام ہنوز سرد نہ ہوئی۔ کیونکہ وہ اس سے بہت زیادہ کی متمنی تھی۔

ہزار آفرین ایسی وفا شعار بیوی پر۔ سینکڑوں بہوئیں قربان ہوں ایسی اطاعت گذار بہو پر کہ باوجود بے قصور بیگناہ اور معصوم ہونے کے بھی خاوند کی جھڑکیاں سہتی ساس کی بے نقط سنتی لیکن زبان پر حرف شکایت لانا تو کجا دل میں خیال کرنا بھی ناقابلِ معافی گناہ سمجھتی۔ میکے کئی دفعہ گئی لیکن کیا مجال کہ والد یا والدہ سے سسرال والوں کے اس حسن سلوک کا عشر عشیر تو کیا اشارہ و کنایہ میں بھی ذکر کیا ہو۔ آس پاس کی پڑوسنیں ساس کی ایذا رسانی اور خاوند کی سرد مہری کا تذکرہ کرکے اسے ہمنوا بنانے میں ہمیشہ ناکام رہیں۔ ہاں البتہ یہ خود متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ بہارِ حسن خزاں سے مبتدل ہونے لگی آفتابِ شباب اوجِ فلک پر پہنچنے سے قبل ہی تحت الثریٰ کا رخ کرنے لگا۔ جوانی کے تاثرات قلب خواب معلوم ہونے لگے مسرت کا احساس لوحِ دل سے حرفِ غلط کی طرح مٹ گیا۔ بارہا دل کو بہلانے کی بے سود کوشش کرتی قسمت پر شاکر رہ کر بھلے دن دیکھنے کی دعا اور دعا کی قبولیت کا یقین کرتی لیکن اِن حالات میں حزن و ملال سے ہمکنار ہونا عین تقاضائے فطرت تھا۔ اور فطرت کو ٹالنا انسانی دست برد سے قطعی بعید ہے۔ لہٰذا اسکی قلبی ہیجان و اضطراب میں سکون ہونا بھی دشوار بلکہ ناممکن تھا۔ اس پر مستزاد یہ کی شادی کے تین سال بعد تک اس کے بطن سے کوئی بچہ بھی پیدا نہ ہوا کہ ان کی توجہ منقسم ہو سکتی۔ بلکہ یہ محرومی اس کے طوفانِ مصائب و آلام میں اضافہ کا باعث ہوئی خاوند کے دل میں قدرے لیکن ساس کے دل میں کہیں زیادہ احساس جاگزیں تھا۔ بلکہ اس کے کہنے سننے نے بیٹے کے احساس کو بھی اسی مرتبہ پر پہنچا دیا۔ لیکن یہ اس بیچاری قسمت کی ماری کے بس کی بات نہیں تھی۔

---

والدہ نے رشید کو دلائل و براہین سے قائل کرکے دوسری شادی کرنے پر آمادہ کر ہی لیا۔ سرگرمی سے رشتہ کی جستجو کی گئی۔ جو نزدیک یا دور کی برادری میں سے کسی سے آرزو کی تکمیل کے لئے درخواست کی گئی۔ انہوں نے کتخدا بلکہ پہلی بیوی موجود ہونے کا اعتراض کیا۔ انہیں مطمئن کرنے غرض سے انواع و اقسام کے سبز باغ دکھائے گئے۔ بلکہ عا کو طلاق دینے کا وعدہ بھی کر دیا۔ آخر کامیابی نے مسرت کا سنایا یعنی وہ رضامند ہو گئے۔ اب کسر ہی کیا تھی جھٹ

پٹ بیاہ۔ طرفین سے شادی کی تیاری ارتقائی منازل طے کرنے لگی۔ عائشہ کو عضو معطل گردانتے ہوئے اس سے تمام معاملہ صیغۂ راز میں رکھا گیا۔ صلاح مشورہ لیتے تو کیا کہتے کہ ہم تجھ پر سوکن لانے والے ہیں۔ عورت ذات کی تو اس خیال کے تصور سے بھی روح قبض ہونے لگتی ہے۔ تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ لیکن آخر وہ بھی تو اسی ماتم کدہ میں رہتی تھی۔ اسلئے ان پر اسرار حالات سے قریبًا قریبًا کُلی طور پر واقف تھی۔ مگر قہر درویش برجان درویش لبوں پر مہر سکوت لگائے تمام دن کام کاج میں مصروف رہتی فطرت اور تقدیر کو اپنے خلاف آمادہ بغاوت پاکر خاموش رہتی مسلسل غم واندوہ کے باعث اداسی کے عالم میں گہری سرد سانس لینا اس کا شیوہ ہو چکا تھا۔ شرم وحیا کی پتلی جب کبھی آئندہ کا منظر تصور یا تخیل کی آنکھ سے مشاہدہ کرتی تو اس کی روح تھرتھرا اٹھتی۔ لیکن کیا کرتی مجبور تھی اور محض مجبور بارہا خاوند سے صورت حالات بیان کرنے کا مصمم ارادہ کیا۔ لیکن عملی جامہ پہنانے میں ہمیشہ ناکام رہی۔

---

دن گزرتے دیر نہیں لگتی۔ گھر والوں کے یوم سعید اور اس کے لئے یوم دعبید سے پہلے بھرتا آ ہی پہنچا۔ ابتدائی مراسم کل اور باقی آج ادا کی جارہی ہیں۔ قدرتی طور پر مہمانوں اور میزبانوں کے بشروں پر مسرت وشادمانی ناچ رہی ہے گھر میں خوب چہل پہل نظر آتی ہے۔ سہرے باندھنے کا جل لگانے اور گھوڑی پر چڑھنے وغیرہ کی رسمیں ادا کی جارہی ہیں کبھی کبھی مبارک سلامت کی صدا بھی سنائی دیتی ہے مستورات سہاگ کے گیت گانے میں مشغول ہیں۔ رشید کی والدہ باغ باغ ادھر ادھر مصروف کام ہے لیکن حرماں نصیب عائشہ بے بسی کے عالم میں عام نظروں سے اوجھل خون جگر کو جواہرات اشک میں منتقل کرنے میں مشغول ہے۔ برات تیار ہو کر باہر میدان میں پہنچ گئی۔ الوداعی رسمیں ادا کی جانے لگیں۔ گھر بھر میں ہُو کا عالم طاری ہو گیا۔ عائشہ نے موقعہ کو غنیمت جانا۔ اٹھی سویر کا پکا ہوا نسدہ یخنی اور خمیری روٹی سیر ہو کر کھائی۔ اپنے آپ میں تاب وتواں محسوس کرتی ہوئی کوٹھے پر چڑھ گئی۔ اور یکدم شور مچانا شروع کر دیا لوگ اس غیر متوقع منظر پر انگشت بدنداں ہو رہے تھے۔ کہ خاوند تو نئی دلہن بیاہنے جارہا ہے۔ اور بیاہتا بیوی عین الوداع کے وقت کمال بیتابی سے نعرہ ہائے مسرت بلند کرنے لگی ہے۔ راز کی تہ کو نہ پہنچتے ہوئے استفسار تک نوبت پہنچی۔ لیکن وہ کسی بات کا جواب دئیے بغیر بار بار بارگاہ ایزدی میں نہایت عجز وانکساری اور صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتی رہی لوگوں کی حیرت واستعجاب میں اضافہ ہوتا گیا۔ اور وہ انتہائی کوشش کے باوجود بھی اس معمہ کو حل کرنے سے قاصر رہے۔

چشم زدن میں یہ بات دولہا میاں کے کان تک بھی پہنچ گئی۔ رشید سہروں والی پگڑی گھوڑی کی کاٹھی پر رکھتے ہوئے گھر کی طرف لوٹنے لگا تو گھر بار والوں نے دریافت کیا کہ کہاں جارہے ہو جو کام ہو ہم سے کہو ہم کئے دیتے ہیں۔ لیکن وہ ان کی باتیں سنی ان سنی ایک کرتا ہوا ورطۂ حیرت واستعجاب میں غرق ابھی آیا کہتا ہوا چلا ہی آیا۔ لوگ سرگوشیاں کرنے لگے کوئی کچھ کہتا کوئی کچھ جتنے منہ اتنی باتیں۔ رشید نے گھر پہنچ کر بیوی سے حقیقت حال دریافت کی بہت حیل وحجت کے بعد وہ یوں گویا ہوئی۔

"اپنے منہ سے میاں مٹھو بننا ناجائز سہی لیکن ایسی صورت میں صحیح حالات کو پردۂ اخفا میں رکھنا دروغ گوئی کے

مترادف ہے۔ لہٰذا چند واقعات مرچ مسالہ اور مبالغہ کی چاشنی دیئے بغیر بے کم و کاست مختصر الفاظ میں بیان کرنے کی کوشش کرونگی میری بچپن کی بہاریں ایسے پرلطف ماحول اور نفیس گہوارۂ تربیت میں بسر ہوئیں کہ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں۔ جس سلیقہ شعاری اور ہنرمندی سے میری تربیت معرض عمل میں لائی گئی وہ کچھ میرے والدین ہی کا حصہ تھا۔ ہر ضروری نوع ہنر اور لازم طرز روش سے مجھے آشنا کیا گیا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ یہاں اور میکے کے آس پڑوس والے لوگ آج تک میری تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہیں۔ بلکہ اگر میں غلطی نہیں کرتی تو آپکے دل و دماغ پر بھی میری عادات و خصائل اور ہنرمندی کے نقوش ضرور مرتسم ہیں۔ اس عالم آب و گل میں سوائے آپ کی والدہ کے کبھی کسی کو حرف شکایت زبان پر لانے کا موقعہ نہیں ملا۔ انسان سہو و خطا کا پتلا ہے۔ میں کیا اور میری بساط کیا۔ عجب نہیں کہ میری کوئی نازیبا حرکت اُن کے لئے باعث ملال بنی ہو لیکن جو سفاکانہ سلوک انہوں نے مجھ سے روا رکھا اس کا تصور بھی اہل دل حضرات کیلئے سوہان روح بن جاتا ہے۔ مشتے نمونہ از خروارے۔

آپ کے ہاں عام طور پر بچت کے خیال سے چاول پکائے جاتے تھے۔ مجھے جس پلیٹ میں کھانے کو دیئے جاتے وہ ظاہر طور پر تو پُر معلوم ہوتی تھی۔ لیکن . . . . . . . . . آہ! آگے کیا کہوں کس زبان سے بیان کروں وہ باتیں جو تین سال صرف مجھ تک محدود رہنے کی وجہ سے راز کہلانے کی مستحق ہیں۔ منکشف کرنی کیسطرح گوارا کرلوں۔ اس کی ہچکی بندھ گئی۔ اور زار و قطار رونے لگ گئی خاوند کے دلمیں غضب کا طوفان اضطراب امڈ رہا تھا۔ اصرار کرنے پر وہ پھر کہنے لگی۔

ہاں تو تھالی میں ایک بیڈول اور صاف پتھر رکھ کر اسکو چاولوں سے ڈھانپ کر مجھے زہر مار کرنے کو دیا جاتا چاولوں کی مقدار صرف رمق کو باقی رکھنے کیلئے کتنی ہو سکتی تھی۔ میں کمال خاموشی سے چاولوں کے دانے نگل کر پتھر اور پلیٹ دھوکر واپس کر دیتی۔ جب کبھی روٹی پکتی تو بھی سیر ہو کر کھانا نصیب نہ ہوتا۔ نتیجہ معلوم۔ جسمانی تاب و تواں میں زوال آتا گیا۔ یبوست اور حرارت طبیعت میں گھر کر گئی۔ اولاد کا ہے کو ہوتی۔ اب تو شب و روز طعنوں کی وہ بوچھاڑ ہونے لگی کہ توبہ ہی بھلی۔ اکثر اوقات میں ہی کھانا پکاتی آپ کی والدہ نظر بچا کر ہنڈیا میں اور نمک ڈال دیتی۔ کھاتے وقت نمک کی زیادتی کا بار مجھ پر ڈال دیا جاتا۔ غرضیکہ انہوں نے مطلب براری کے ہر ممکن طریقہ اور موقعہ سے فائدہ اٹھایا آج میں گھر میں تنہا رہ گئی تھی۔ موقعہ غنیمت جانا کھایا اور پیٹ بھر کر کھایا۔ فرط انبساط نے دم بھر کے لئے سوکن کے خیال سے بھی رہائی دلادی اور میں اظہار مسرت کیلئے مجبور ہو گئی کبھی نے آپ سے بھی جا کہا ہوگا"۔

رشید اپنی عدم واقفیت پر کف افسوس ملتے ہوئے چوٹی سے ایڑی تک عرق ندامت میں شرابور ہو رہا تھا۔ جور و استبداد کی روح فرسا داستان گوش گزار ہونے پر تھر تھر کانپنے لگا حواس کو مجتمع کرتا ہوا اٹھا اور مہر و وفا کی دیوی عائشہ کو آغوش میں لے کر خوب دل کھول کر رو دیا۔ اسکے خشک لبوں کا جن پر اب تازگی رونما ہو رہی تھی طویل بوسہ لیا۔ سابقہ گناہوں اور فرو گزاشتوں کی معافی چاہی اور آئندہ کے لئے از سر نو پیمان وفا باندھا۔ عائشہ کیا کہتی سب جانتے ہیں۔

جب گلے سے لگ گئے سارا گلہ جاتا رہا۔

رشید نے برائیوں کو واپس بلاکر دوسری شادی کرنے سے صاف انکار کردیا۔ لوگ حیران تھے۔ کہ عجیب معاملہ ہے دریافت کیا گیا تو اس نے متین لہجہ میں یہ کہکر کہ "یہ میرا ذاتی معاملہ ہے" سب کے لبوں پر مہر سکوت لگادی۔ ماں نے اپنا فیصلہ بدلنے کے لئے بار بار درخواست کی مگر اسوقت انکار کرنے کا سبب پوچھا اصرار کیا بلکہ اپنے مخصوص آخری حربہ گریہ وزاری سے بھی کام لیا لیکن بیٹے نے ایک نہ مانی اور ماں کے دلپر صاف الفاظ میں منقش کردیا کہ سبب قطعاً نہیں بتایا جائے گا۔ اور فیصلہ کسی صورت میں تبدیل نہیں ہوسکتا۔ اسیدن ماہوار خرچ دینے کے وعدہ پر ماں کو علیحدہ مکان میں منتقل کردیا۔ اور خود بیوی سمیت اسی مکان میں رہائش پذیر رہا۔ وہی زندگی جو اس سے قبل دوزخ کا نمونہ بنی ہوئی تھی جنت کی پر لطف بہاروں میں مبدل ہوگئی کچھ عرصہ بعد یہ کنبہ رشید۔ عائشہ۔ محمد اکبر۔ محمد صفدر۔ اور ننھی فاطمہ پر مشتمل ہوگیا۔

(طالب جعفری)

---

# سوالات

(۱) کیا انسان ہمیشہ جوان رہ سکتا ہے؟ (ص - ب - ل)

ہر جاندار دنیا میں ایک خاص عمر لے کر آتا ہے۔ وہ پیدا ہوتا ہے۔ جوان ہوتا ہے۔ بوڑھا ہو جاتا ہے۔ مر جاتا ہے۔ اس لحاظ سے گویا انسان کی زندگی میں جوانی کا زمانہ مخصوص ہے کوئی ۱۵ سال سے لیکر ۴۰ یا ۵۰ سال تک سمجھ لو۔ انسان اگر حفظانِ صحت کے اصولوں کو پیش نظر رکھے تو صحت اور جوانی عرصے تک برقرار رہ سکتی ہے۔ مگر اسے دوام نہیں۔ آجکل تجدید شباب کے بہت سے عمل یا نسخے ایجاد ہو گئے ہیں مگر کوئی بھی ایسا نہیں جس سے جوانی ہمیشہ برقرار رہے دو چار سال کی بہار لوٹ کے آگئی پھر بڑھاپے کی طرف رجوع۔ آخر دریا پیچھے کی طرف ہی بہتا چلا جائیگا +

(۲) غالب اردو شاعری میں کیوں سب سے بڑا غزل گو شاعر مانا جاتا ہے۔ (ع - ح - س)

اس بات کا جواب چند الفاظ میں دینا بڑا مشکل ہے۔ شاعر کی عظمت اور وقار کا معیار پہلے تو جانچنا چاہیئے کہ ہم اچھا شعر کسے کہتے ہیں۔ اس کے بعد یہ کہ آیا غالب اس معیار کے لحاظ سے باقی تمام شاعروں سے بلند تھے یا نہیں پرواز۔ تخیل۔ حسن الفاظ۔ محاورات وغیرہ وغیرہ اور شعر کی دنیا پر حاوی ہونا۔ غالب اس لحاظ سے بہت بلند پایہ شاعر ہے۔

(۳) کہتے ہیں ہندوستان اور انگلستان میں وقت ایک نہیں ہوتا۔ اس کا کیا مطلب ہے (م - د - ب)

کسی شہر کے وقت کا انحصار اس کے سورج سے نسبتی تعلق پر ہے جب یہ سورج کے عین سامنے ہوتا ہے۔ یعنی سورج اس مقام پر عین سر کے اوپر ہوتا ہے۔ تو یہاں بارہ بجتے ہیں۔ اس سے پہلے قبل از دوپہر۔ اس کے بعد۔ بعد از دوپہر کہلاتا ہے۔ اب زمین گول ہے اور گھوم رہی ہے۔ اسلئے جب سورج ہندوستان کے سامنے آتا ہے تو یہاں دوپہر ہوتی ہے۔ ہندوستان بہت بڑا ملک ہے اس لئے ہر شہر کا وقت الگ الگ ہونا چاہیئے۔ ہندوستان سٹینڈرڈ ٹائم یعنی ریل وغیرہ کا وقت مدراس شہر کا وقت ہے۔ اسی طرح سے ملک انگلستان کا وقت شہر گرینچ کا وقت ان دونوں وقتوں میں ساڑھے پانچ گھنٹے کا فرق ہے۔ ہندوستان پہلے ہے چونکہ زمین مشرق کیطرف گھوم رہی ہے۔ یعنی جب ہندوستان سٹینڈرڈ ٹائم کے بارہ بجتے ہیں تو انگلستان میں ساڑھے چھ صبح کے بجتے ہیں۔ اسیطرح سے یہاں رات ہو جاتی ہے تو وہاں پر ابھی بعد دوپہر کا وقت ہوتا ہے +

(بقیہ مضمون بزم جہاں صفحہ ۱۷)

کیبنیٹ کے ہاتھ میں۔ جو پارلیمنٹ کے سامنے اپنے کاموں کی ذمہ دار ہے حکومت کے اداروں کی یہ تشکیل تدریجاً ہوئی ہے۔ زمانہ امید کرتا ہے کہ نیا دور امن اور آسائش کا دور ہوگا۔ تہذیب و تمدن کے راستے پر دنیا بہت سی منزلیں زود زود طے کر لے گی۔

## رُوس کا نیا نظام

سٹالن (Stalin) روس کا ڈکٹیٹر ہے۔ اس نے ملک کے قوانین کو رد و بدل کر کے جدید پیرایہ پر مرتب کیا ہے۔ اس کا یہ دعوٰے ہے کہ روس کے اس نئے ضابطے کی رو سے قانون کی وہ تمام برائیاں رفع ہو جاتی ہیں۔ جو دوسرے ممالک کی نام نہاد ڈیموکریٹک سلطنتوں میں مروج ہیں یعنی ان کے ہاں یہ خوبیاں نہیں جو روس میں مروج کی گئی ہیں۔ یعنی ہر فرد اپنے حقوق میں دوسرے کے برابر ہے۔ دولت۔ قوم۔ عورت مرد کی تمیز تمام کو بالائے طاق رکھدیا گیا ہے۔ کسی شخص کا احترام اس سرکاری عہدے سے ہماری نظروں میں قائم نہیں ہوتا۔ جسپر وہ فائز ہو بلکہ اس کی ذاتی قابلیت اور ہنر پر سماج میں اس کی منزلت اس کام پر منحصر ہے جو وہ خود سرانجام دیتا ہے۔

بات کہنے کو تو آسان ہے مگر عمل میں بہت مشکل ہے۔ یہ ان کے ضابطہ کے باب ۱۰ میں درج ہے۔

## انگریزی کیبنٹ کی تنخواہیں

لندن میں دارالعوام میں مسٹر بالڈون وزیراعظم سلطنت برطانیہ نے شاہی وزرا کی تنخواہوں و متعلقہ امور کا بل پیش کیا۔ اس میں درج تھا کہ وزیراعظم کی تنخواہ بڑھا کر ۱۰۰۰۰ پونڈ سالانہ کر دی جائے۔ حالانکہ اسوقت ۵۰۰۰ پونڈ ہے۔

اس کیبنٹ کے ممبران کی تنخواہیں مختلف ہیں نصف کے قریب تو ۵۰۰۰ پونڈ سالانہ پاتے ہیں۔ باقیوں کی ۲۰۰۰ اور ۴۵۰۰ کے درمیان ہیں۔ اب اس بل میں یہ تجویز ہے کہ سب کی تنخواہوں کو برابر کر دیا جائے۔ ۵۰۰۰ پونڈ سالانہ لارڈ چانسلر کی تنخواہ اس سے زیادہ ہوگی۔ پرائم منسٹر کو ۲۰۰۰ پنشن بھی ملتی ہے۔

یہ تنخواہوں میں تفاوت حکومت کے لئے بڑا تکلیف دہ ثابت ہوا ہے۔ بعض دفعہ کوئی ایک ممبر کسی خاص شعبۂ سلطنت کے لئے اپنی مخصوص قابلیت کے سبب بہت موزوں ہوتا ہے۔ مگر تنخواہ میں فرق ہونے کے سبب وزیراعظم اسے تبدیل نہیں کر سکتا ہے۔ اسلئے یہی بہتر سمجھا گیا ہے کہ تنخواہیں برابر کر دی جائیں۔

## حبش میں قتل عام

مغرب کے تہذیب یافتہ جو دن رات تہذیب تہذیب کے نام کا ڈھنڈورہ پیٹتے رہتے ہیں۔ آئیں اور دیکھیں کہ ان کی تہذیب کن عناصر کی بنی ہوئی ہے۔ خود غرضی۔ خونریزی کمزوروں پر قبضہ۔ انصاف، حقوق بالائے طاق۔

ایڈیس ابے با کے سات سو حبشیوں نے امریکہ کے قونصل خانے میں جا کر پناہ لی۔ اٹلی والوں نے انہیں کامل یقین دلا دیا کہ ان کی جانیں محفوظ ہیں۔ اور ان حبشیوں کو اٹلی والوں کے حوالے کیا گیا۔ ابھی وہ قونصل کے احاطے سے باہر نکلے ہی تھے کہ اٹلی کے سپاہیوں نے انپر بے پناہ حملہ شروع کر دیا۔ اور ایک ایک کو بھیڑوں کی طرح سے قتل کر ڈالا۔

اس موقعہ پر مشہور انگریزی سیاست دان مسٹر لائڈ جارج نے دارالعوام میں ایک دل ہلا دینے والی تقریر کی۔ اس نے کہا کہ انگلستان سو رہا ہے۔ یہ گذشتہ پچاس سالوں میں مہیب ترین قتل عام کا واقعہ ہے اور انگلستان نے اس کے خلاف اپنی صدا بلند نہیں کی۔ اس ڈیسٹا اپنے وطن کے لئے ہتھیار اٹھاتا ہے۔ اسے شکار کی طرح سے بھون دیا جاتا ہے۔ اور یورپ کے تمام ملک خاموش ہیں۔ کوئی زبان تک نہیں ہلاتا۔ نہ ہی لیگ آف نیشنز ٹس سے مس ہوتی ہے۔ جب ارمنستان میں اسی قسم کا ہنگامہ ہوا تو یورپ نے آسمان سر پہ اٹھا لیا تھا مگر آج یورپ کی اپنی باری ہے تو خود غرضی نے انکو اندھا کر دیا ہے۔

مسٹر لائڈ جارج نے یہ بھی کہا کہ اہل اٹلی انگلستان سے بہت ناراض ہیں۔ مگر میں انکی ناراضگی برداشت کر سکونگا۔ مگر ان حقارت اور نفرت کے جذبات کو گوارا نہیں کر سکتا۔ جو بعد میں پیدا ہونگے۔ ایک وقت آئے گا۔ جب کہ ہم اٹلی کیساتھ روبرو ... بدو اور بغیر بل فریب کے گفتگو کریں گے +

Reg. No L. 3972



باہتمام برکت علی پرنٹر آزادی پریس ہسپتال روڈ لاہور میں چھپکر دفتر محقق بہاولپور سے ایف ایم شجاع منعمی پبلشر نے شائع کیا

AUGUST 1947

# THE MOHAQQIQ

BAHAWALPUR

A High Class Literary Monthly



# محقق

بہاولپور

ڈائرکٹر۔ خواجہ شجاع منعمی

ایڈیٹر۔ رازی عرفانی

فنی۔ علمی۔ ادبی۔ صنعتی۔ وغیرہ

ماهوار رسالہ

# محقق

اگست ۱۹۲۷ء

چندہ

والیان ریاست سے یکصد روپیہ

امرا سے دس روپے ۱۰

فی پرچہ چار آنے ۴

سالانہ تین روپے ۳

طلبا سے دو روپے ۲

ممالک خارجہ سے دس شلنگ



## ادارۂ تحریر



مقام اشاعت

دفتر رسالہ محقق بہاولپور

جلد ۱ | نمبر ۶

# فہرست مضامین بابت ماہ اگست سنہ ۱۹۳۷ء

# شذرات

**کاغذ کا قحط** ہسپانیہ کی جنگ نے طول کھینچا ہے۔ دنیا کی باقی قومیں بھی اب اس میں کسی نہ کسی شکل میں حصہ لے رہی ہیں۔ ہر کوئی مدمقابل کے خوف سے ہراساں ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ طاقتیں باقی اشغال سے ہٹ کر جنگی تیاریوں میں مصروف ہوگئی ہیں۔ یعنی یورپ میں کاغذ بننا کم ہوگیا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ ہندوستان کاغذ سے محروم ہوگیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور مصیبت شامل ہوگئی ہے۔ بنگال میں جو کاغذ بنانے کے کارخانے ہیں وہاں کے مزدوروں نے ہڑتال کردی ہے۔ اور ملکی کاغذ بھی اب دستیاب نہیں ہوتا۔ اس سے نہ صرف کاغذ مہنگا ہوگیا ہے۔ بلکہ یہ کہ بازار میں کمیاب ہے۔ اس لئے جسطرح کا کاغذ بھی ملتا ہے۔ رسائل اور جرائد اسی کو استعمال کرنے پر مجبور ہیں۔ امید ہے کہ محقق کے قرّاء بھی اس امر کو ملحوظ رکھیں گے۔ اور حالات کے بہتر صورت اختیار کرنے تک ہمارے ساتھ صبر سے کام لیں گے ؛

**ڈاک کے ڈاکو** دفتر میں متعدد اطلاعیں موصول ہوئی ہیں کہ خریداروں کو رسالہ نہیں ملتا اور دفتر کو ان کے پاس دوبارہ بھجوانا پڑتا ہے۔ محقق کا سالانہ چندہ اسی لئے کم رکھا گیا ہے کہ ہر صاحبِ ذوق اس سے استفادہ کرسکے (یعنی تین روپے سالانہ۔ طلباء سے دو روپے) شوق ہو تو خود۔ خریدار بن جائیے۔ اگر آپ زکوٰۃ فنڈ سے شکم پری کے عادی ہیں تو دفتر کو لکھ دیجئے۔ وہ آپ کو بطور نمونہ وہی نمبر بھجوا دے گا جو آپ کو بہت مرغوب ہے ؛

---

# بزمِ جہاں

**لاسلکی اور موسم** - یورپ میں اس بہار کے موسم میں خصوصاً اور نصف کرۂ شمالی میں عموماً بہت زیادہ بارش ہوئی ہے۔ عوام اور بعض سائنس دانوں کا خیال ہوا کہ اس کا سبب لاسلکی برقی لہریں ہیں۔ جو گذشتہ چند سالوں سے بنی نوع انسان نے بہت زیادہ استعمال کرنی شروع کردی ہیں۔ یعنی لاسلکی لہروں کے اثر سے بارش زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن حوادث الجویہ کے محققین نے اس کو غلط ثابت کیا ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں۔ کہ

جہاں تک مغربی یورپ کا تعلق ہے اس علاقے کی آب وہوا میں گزشتہ ایک ہزار سال سے کوئی قابلِ اعتنا تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ رطوبت اور بارش کے دور ہیں جو ایک دوسرے کے بعد واقع ہوتے ہیں۔ موجودہ شدید بارش کا سبب موسم کا فطری دور ہے جو ۱۹۳۵ء میں شروع ہوا ہے اور ۱۹۵۲ء میں جاکر ختم ہوگا۔ یعنی ان سالوں میں قدرتی طور پر بارش زیادہ ہوگی۔ اس کا نام مرطوب دور ہوا۔ اس کے بعد خشک ایام کا ایک طویل دور شروع ہوگا۔

## امریکہ کا سب سے بڑا کروڑ پتی

جان ڈی راک فیلر نے معمولی حالات سے ابتدا کی مگر دولت اس کی طرف یوں کھچی چلی آتی تھی جیسے دریاؤں کا پانی سمندر کی طرف۔ وہ "تیل کا بادشاہ" مشہور تھا چونکہ اس کا کاروبار مٹی کے تیل کا تھا۔ اس کی وفات ۹۷ سال کی عمر میں اب ہوئی ہے۔

اس کی دولت کا کچھ حساب نہ تھا۔ کوئی تیس سال ہوئے جب وہ عملی طور پر اپنے کاروبار میں حصہ لینے سے دست کش ہوا تو اس کی جائداد کا اندازہ ۲۰۰۰ اور ۴۰۰۰ لاکھ پونڈ کے درمیان کیا جاتا تھا۔ خیال یہ تھا کہ تاریخ عالم اتنے امیر شہری کی اور کوئی مثال پیش نہیں کرسکتی۔ مگر جس سرعت سے اس نے کمایا اسی فراخ دلی کے ساتھ نیک کاموں میں خرچ کیا۔ رفاہ عام پر ۱۲۰۰ لاکھ پونڈ سے کہیں زیادہ رقم اس نے خرچ کردی ہے۔

اس قدر دولتمند اور سخی ہونے کے ساتھ راک فیلر بڑی سادی زندگی بسر کرتا تھا۔ اس کی زندگی امراء کے لئے ہمیشہ مثال کا کام دیگی۔ اور اس کا بنا کردہ راک فیلر فونڈیشن رہتی دنیا تک زندہ رہے گا۔

## بلجیم کی آزادی

لڑائی (۱۹۱۴-۱۹۱۸) کے بعد لوکارنو میں ایک معاہدہ ہوا تھا۔ جس کی رو سے انگلستان اور فرانس نے بلجیم پر چند پابندیاں عاید کی تھیں۔ اب ان دونوں حکومتوں نے تمام پابندیاں ہٹادی ہیں۔ مگر وہ وعدہ قائم رکھا ہے۔ کہ وقتِ ضرورت وہ بلجیم کی پوری امداد کریں گی۔

بلجیم نے بھی اپنی طرف سے اس وقت وعدہ کیا تھا اور اب اس وعدے کی تجدید کی ہے کہ وہ اپنے ملک کو جنگ کے موقعہ پر جنگی محاذ بننے کی اجازت نہ دے گا۔ بلجیم اپنی سرحدوں کی شدید حفاظت کریگا۔ اور وہ اپنے عساکر کو اس غرض کیلئے بہترین صورت میں تنظیم کرے گا۔

بلجیم نے اپنے اس وعدے کا بھی پھر سے یقین دلایا ہے۔ کہ وہ لیگ آف نیشنز کا وفادار رہے گا اور اسکے اراکین کے ساتھ تعاون کا اظہار کرے گا۔ اعلان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بلجیم کو یہ آزادی دینے سے فرانس اور انگلستان کے تعلقات پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔

## وسطی یورپ کی تنظیم

جرمنی کے چانسلر شسنگ اور اٹلی کے ڈکٹیٹر میسولینی کے درمیان وینس میں طویل گفتگو ہوئی یہ طے پایا کہ دریائے ڈینیوب کی وادی کو نئے سرے سے تنظیم کیا جائے اس

[illegible]

# اسلامی علم التواریخ کی تاریخ

(گزشتہ سے پیوستہ)

**ابن الاثیر** عربی تاریخ نویسوں کا طرزِ تحریر موجودہ تاریخ نویسوں سے مختلف تھا۔ وہ واقعات بیان کیا کرتے تھے لیکن فلسفیانہ دلائل سے نتائج اخذ نہیں کرتے تھے بیانات اور واقعات موجود ہیں لیکن فلسفہ نہیں۔ ابن الاثیر (سنین ۱۱۶۰ سے ۱۲۳۴ء) تک ایک تاریخ عالم کا مصنف ہے۔ جو چودہ جلدوں میں موجود ہے۔ اسکے کچھ حصہ کا ترجمہ ٹرن برگ (Tornberg) نے سویڈن کی زبان میں کیا۔ ابن الاثیر باقی تاریخ نویسوں سے بالاتر ہے۔ وہ محض واقعات ہی کو بیان نہیں کرتا بلکہ انکے اثرات اور وجوہات کو بھی تلاش کرتا ہے۔ اور پھر جو واقعات ان کے بعد ہوئے۔ ان کی کڑی بھی ان سے ملاتا ہے مگر اس سے آگے نہیں بڑھتا۔

عزالدین ابن الاثیر عراق عرب کے شہر موصل کا رہنے والا تھا۔ وہ بغداد میں تعلیم پاتا رہا۔ اور پھر یروشلم اور سوریا تعلیم کی خاطر گیا۔ تکمیل کے بعد اپنے وطن لوٹا۔ اور ساری عمر درس و تدریس اور علمی مشاغل میں گزار دی۔ ابن خلکان جو اسے ذاتی طور پر جانتا تھا۔ ابن الاثیر کی بحیثیت عالم اور انسان بڑی تعریف کرتا ہے اس نے دنیا کی ایک تاریخ لکھی۔ جس کا نام کتاب الکامل فی التاریخ ہے۔ جس میں آغاز عالم سے لیکر ۶۲۸ ہجری (۱۲۳۰-۱۲۳۱) تک بحث کی ہے۔ پہلا حصہ یعنی ۳۰۲ سے قبل کی تاریخ تو زیادہ تر طبری سے لیا گیا ہے۔ کچھ دیگر کتب سے اضافہ کیا ہے زیادہ تر طبری ہی کا اختصار کر دیا ہے۔ پہلی جز میں اس نے قبل از اسلام کے ایام العرب پر مفصل بحث کی ہے۔ جس میں زمانہ جہالت کی لڑائیوں اور جنگوں کا ذکر ہے۔ اگرچہ یہ حصہ طبری کی موجودہ کتاب میں نہیں ہے مگر بعض کا خیال ہے کہ اصل میں تھا اور بعد میں اس حصے کو خارج کر دیا گیا۔ ابن الاثیر حدیث کا بھی بہت بڑا عالم تھا۔ اس کی کتاب اُسد الغابہ میں ۷۵۰۰ صحابہ کی سوانح حیات درج ہیں۔

ابن الاثیر نے یہ کوشش نہیں کی۔ کہ جو واقعات تاریخ میں اہمیت رکھتے ہیں ان کے فلسفۂ ارتقا پر ایک ہمہ گیر نظر ڈالے اور ان سب کے لئے علت و معلول کا سلسلہ تلاش کرے۔ غرض یہ کہ ان اسباب اور عوارض کو بیان کرے۔ جو ملک۔ سیاست اور سماج میں تبدیلیاں پیدا کرنے کا باعث ہیں۔ اور پھر یہ بتائے کہ آنے والی نسلوں پر انکا اثر کیا ہوتا ہے۔ بلکہ صرف واقعات کو بیان کیا ہے۔

**ابن خلدون** اس کا سہرا دنیا کے ایک ذہین ترین فرد کے سر پر ہے۔ جس کا نام ابن خلدون تھا عبدالرحمن ابن خلدون ۱۳۳۲ میں پیدا ہوا۔ اور اس نے ۱۴۰۶ میں وفات پائی۔ عربی تاریخ کو اس نے فلسفہ کی حیثیت بخشی۔ اور مضمون کو زمین

سے اٹھاکر آسمان پر پہونچا دیا۔ گویا عالمیانہ واقفیت سائنس بن گئی اسکی ذہانت اور فطانت کے مقابلے میں تمام عیسائی دنیا کا ایک فرد بھی پیش نہیں کیا جا سکتا۔ یورپ کا عہدِ ادبی دیکھو۔ یا عہدِ متوسط بطور واقعہ نویس وہ عرب تاریخ نویسوں سے بڑھ کر نہ تھا۔ اس کے بیان کئے ہوئے حالات و واقعات اوروں نے بھی دیئے ہیں مگر تاریخی فلسفہ دان ہونے۔ تاریخ کا نظریہ قائم کرنے۔ اور اسکو ایک سائنس کے سانچے میں ڈھالنے میں اسکی کوئی نظیر کسی اور ملک یا عہد میں نہیں ملتی۔ یورپ کا مشہور وائکو (Vico) ۲۰۰ سال کے بعد پیدا ہوا۔ ارسطو۔ افلاطون۔ اور آگسٹن کسی صورت میں بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اور دوسرے تمام تاریخ نویسوں کا تو ابن خلدون کے نام کے ساتھ نام لینا ہی جہالت کی دلیل ہے۔ اسکا دماغ اختراع سوچ بچار۔ فکر و تفکر میں فلک رس تھا۔ وہ تمام معاملات کو پیش نظر رکھ کر ان سے نتائج اخذ کرتا۔ اور ان کو اصول بنا دیتا۔ معاملات کی تہ تک پہونچنے میں اسے بہت شغف حاصل تھا۔

قاعدہ کی بات ہے۔ کہ اسطرح کے دماغ اپنے ماحول سے بہت بالاتر ہوتے ہیں۔ وہ اس دنیا میں رہتے ہیں۔ مگر اس زمانے کی دنیا کے ایک فرد نہیں ہوتے۔ ڈانٹے (Dante) اپنے ماحول سے متاثر نہ ہوا۔ مگر اسکی شاعری قیامت تک زندہ رہیگی۔ گلیلیو (Galalieo) اور راجر بیکن (Roger Bacon) دنیا میں رہتے تھے۔ مگر انکا ماحول انہیں کے ساتھ تھا۔ وہ اسوقت کی دنیا سے بہت بالاتر تھے۔ حافظ شیرازی کی لکھی ہوئی غزلیں یوں معلوم ہوتا ہے کہ کسی ایسے شاعر کا کلام ہے جو ابھی تیس چالیس سال ہوئے فوت ہوا ہو۔ حالانکہ حافظ کو اس دنیا سے سدھارے آٹھ نو سو سال ہو گئے۔ گویا اس کے نکتہ رس دماغ نے صرف انہیں ترکیبوں اور الفاظ کو استعمال کیا۔ جن کو زمانے کی کسوٹی نے دوام بخشا تھا۔ جو متروک ہونے تھے۔ انکو لکھنے کی حافظ کے قلم نے کوشش ہی نہیں کی۔ یہ بھی ایک ادبی معجزہ ہے۔ نہ تو غالب کی قدر دنیا نے زندگی میں کی۔ نہ میر تقی کی سمجھ سکی۔ مگر اس وقت کی دنیا انہیں سمجھ نہ سکی۔ حقیقت میں یہ لوگ آنیوالی نسلوں کے استاد ہوتے ہیں۔ ابن خلدون نے بھی ایسی معرکتہ الآرا کتاب تاریخ پر اور مقدمہ ابن خلدون لکھی ہے۔ کہ جبتک دنیا میں لفظ تاریخ زندہ ہے۔ اسکا نام زندہ رہیگا۔ اس میں شک نہیں کہ اس سے پہلے آنیوالے عربی تاریخ نویسوں نے اس تمام مواد کو جمع کیا تھا۔ جو اس نے استعمال کیا۔ مگر یہ اسی کی ذہانت تھی۔ جو مواد کو استعمال کر سکے۔ بعد میں آنیوالے دنیا کے تمام تاریخ نویس اس کے معنوی شاگرد ہیں۔ اسی کا احسان علم التواریخ پر اس قدر ہے کہ ابن خلدون کا نام تاریخ کی دنیا میں ہمیشہ سنہرا تابندہ بن کر چمکتا رہیگا۔

# اِسلامی تاریخ کے ادوار حملۂ مغل کے بعد

اسلامی تاریخ نے کئی پلٹے کھائے اور کئی دور دیکھے۔ پہلے تو خلفائے راشدین کا زمانہ ہوا۔ پھر ۶۶۱ء میں بنو امیہ نے بادشاہی بنائی جس کا دارالخلافہ دمشق تھا۔ ۷۱۰ء تک اسلام نے اپنے مفتوحہ ممالک کی سب سے بڑی وسعت حاصل کر لی تھی جو ایک بادشاہ کے زیر نگیں کبھی حاصل ہوئی۔ بنو عباس نے ۷۵۰ء میں عنانِ سلطنت اپنے ہاتھ میں لی۔ تو علم و فضل کا دور شروع ہوا ۱۲۵۸ میں ہلاکو نے بغداد کو تباہ کیا تو گویا ممالک اسلامیہ کا شیرازہ بکھر گیا۔ پرانا نظام مٹ گیا۔ اور اسلامی دنیا نے نئی شکل اختیار کر لی۔ خیالات۔ تخیل۔ ادبیات سب کچھ بدل گیا۔ علم و ادب نے بھی ان مختلف ادوار میں مختلف صورتیں اختیار کیں۔

قاعدے کی بات ہے۔ کہ علم و معرفت صرف آسائش

صداقت کے زمانے میں بھی ترقی ہو سکتا ہے جب جنگ و جدال کا ہر جب فساد اور قتال کا بازار گرم ہو جب افعال اور اقوال پر بھروسہ نہ کیا جاسکے تو علم میں اضافہ کس طرح سے ہو سکتا ہے۔ گویا لوگوں کے دماغ ہی اس طرف متوجہ نہیں ہوتے تو ہر دور کی علمی اور تمدنی ترقی کا انحصار اس عہد کی سیاسی حالت پر منحصر ہے۔

اب ہم اسلام کے ایک ایسے دور میں پہنچتے ہیں جبکہ ملتِ اسلامیہ کا شیرازہ بکھر چکا ہے۔ تنظیم مٹ چکی تھی۔ ادھر بیرونی قوتوں نے اسلام کے متعدد دماغوں پر قبضہ حاصل کر لیا تھا۔ ادھر اندرونی قوتوں میں اختراع کا مادہ موجود نہیں رہا تھا۔ ہر ملک اپنی نئی سلطنت قائم کرنے کی فکر میں تھا۔ اس لئے پرانی عمارت بکھری جا رہی تھی۔ اور نئی کی تشکیل نہیں ہوئی تھی۔ گویا قومیں نئے دور کو مرتب کرنے میں مصروف تھیں۔ اور ان کے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ وہ علم و ادب کے میدان میں کوئی مستقل تصنیف معرضِ وجود میں لاسکیں۔

**پہلا دور** بغداد کی تباہی مغلوں کے ہاتھ سے ۱۲۵۸ء میں ہوئی اس کے بعد سے اسلامی دنیا کی سیاسی حالت میں انتشار پیدا ہو گیا اور منظم حکومتوں کی اساس کمزور ہو گئی۔ سپین اور شمالی افریقہ چونکہ دور تھا اس لئے وہاں کم اثر پڑا ہے۔ مصر اور سوریا میں پہلے بحری مملوک (۱۲۵۰-۱۳۹۰) اور پھر برجی مملوک (۱۳۸۲-۱۵۱۷) قابض ہو گئے۔ قسطنطنیہ کے نواحی علاقہ میں ابھی مشرقی رومی سلطنت (بیزنطائن امپائر) زندہ تھی اسے ترکوں نے ۱۵۲۶ میں ختم کیا۔ ایشیائے کوچک میں سلجوقی (۱۰۷۷-۱۳۰۰) حکمران رہے۔ اور پھر ایشیائے کوچک کے امیر سر بر آرائے سلطنت ہوئے۔ ادھر عراق عرب اور ایران پر چنگیزی مغل قابض ہو گئے۔ (۱۲۵۶-۱۳۴۹) اور ایل خاں کہلائے۔ پھر دو چار چھوٹی چھوٹی سلطنتیں قائم ہو گئیں ماوراء النہر اور افغانستان پر چغتائی خاندان نے (۱۲۲۷-۱۳۵۸) قبضہ جمایا۔ پھر ایران اور ان دونوں ملکوں کو تیمور نے تباہ و برباد کیا۔ اور اس کے جانشین (۱۳۶۹-۱۴۹۴) ان پر قابض رہے۔ ہندوستان میں مختلف چھوٹے چھوٹے اسلامی خاندان حکمران رہے۔ خاندان غلاماں (۱۲۰۵-۱۲۸۷) خلجی (۱۲۹۰-۱۳۲۰) تغلق (۱۳۲۰-۱۴۱۴) سید (۱۴۱۴-۱۴۵۱) لودھی (۱۴۵۱-۱۵۲۶) پھر گجرات۔ مالوا۔ جونپور۔ بنگال۔ خاندیش میں الگ الگ سلطان تھے۔ اور دکن میں سب سے پہلے بہمنی (۱۳۴۷-۱۵۲۶) سلطان ہوئے پھر ان کا ملک نظام شاہی۔ عماد شاہی۔ بارد شاہی۔ عادل شاہی۔ قطب شاہی میں منقسم ہو گیا۔ یہ غیر متعدد اور چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کا سلسلہ پندرھویں صدی کے انجام یعنی سولہویں صدی کے آغاز تک چلا گیا۔ اسوقت تک گویا اسلامی دماغ غیر سیال تھا۔ اور اس نے کوئی نئی شکل اختیار نہیں کی تھی۔

**دوسرا دور** اس کے بعد ایک نیا دور آیا جبکہ باوقار۔ زیادہ بزرگ اور زیادہ معتبر سلطنتوں نے ان چھوٹی حکومتوں کی جگہ لے لی۔ گویا اسلامی ممالک زیادہ مستحکم اور مضبوط ہو گئے اور ان کا تخیل پرانے زمانے کو چھوڑ کر ایک نئے سانچے میں ڈھل گیا۔ مگر یہ ان ملکوں کا حال ہے جہاں عربی زبان مادری زبان نہ تھی۔ عربی ممالک میں ذہنی ترقی انحطاط پر رہی عثمانی ترکوں نے مشرقی یورپ پر قبضہ جمایا۔ شمالی افریقہ کا بیشتر حصہ۔ مصر۔ سوریا۔ اپنے قبضے میں کیا۔ اور یورپ میں بڑھتے گئے۔ مشرقی یورپ کا تمام علاقہ وی آنا ملک ہنگری تک ان کے تصرف میں آگیا۔ ایران میں شاہانِ صفوی (۱۵۰۲-۱۷۳۶) نے سلطنت قائم کی۔ یہاں بیچ میں افغان پھر نادر شاہ۔ اور

کریم خان زند آ گئے اور قاجاریوں نے پھر (۱۷۷۹ - ۱۹۲۱) اتنی ہی مستحکم سلطنت قائم کر لی ۔ ماوراء النہر میں تین خاندان وہاں کے خان حکمران کے وجود میں آئے ۔ ہندوستان میں بابر نے سلطنت مغلیہ کی بنیاد ڈالی (۱۵۲۶ - ۱۸۵۷) جس نے ہندوستان کی تاریخ میں ایک نیا باب کھول دیا ۔ یہ اسلامی ممالک کا ایک علیحدہ دور ہے ۔ اگرچہ باقی اسلامی دنیا نے اپنی تنظیم کر لی مگر جتنا ادبی مواد ان ممالک میں پیدا ہوا وہ عربی نہ تھا ۔ عربی بولنے والے ممالک نے ابھی تک اپنی نئی ذہنی تشکیل کی تکمیل نہیں کی ۔

## تیسرا دور

اب ہم اٹھارویں صدی کے وسط میں تقریباً پہنچ جاتے ہیں ۔ اور اسلامی ممالک نے پھر ایک نئی روش اختیار کی ۔ اس کے مختلف اسباب ہوئے ۔ یورپ نے اپنی تنظیم نئے سرے سے کی ۔ چودھویں صدی عیسوی میں مغرب میں تجدید فراست ( Renaissance ) کا ہنگامہ ہوا ۔ دنیا کے ذہنی ارتقاء میں اپنی مثال آپ ہے ۔ گویا ایک فوق العادہ کیفیت کا ظہور ۔ یورپ نے امریکہ دریافت کر لیا اپنی سائنس اور علوم میں ترقی کر لی ۔ جغرافیہ ۔ طب اور ہیئت کے نظریوں کو بدل لیا ۔ اور اب وہ فتوحات کے لئے یورپ سے نکلے ۔ ان قوموں کا اثر اسلامی سلطنتوں پر ہوا ۔ تدریجاً اس نئے تمدن اور فضیلت نے پرانے اسلامی نکتۂ نگاہ کو بدل ڈالا ۔ نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کیا ۔ (۱۷۳۷ - ۱۷۳۸) تو افغانستان میں احمد شاہ درانی نے اپنی سلطنت قائم کی اور اس کے بعد سے افغانستان ہندوستان سے الگ ہو گیا ۔ اور بادشاہ امیر کہلانے لگا ۔ ہندوستان میں ۱۶۳۹ میں انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی نے چھوٹی سی حکومت قائم کی جو ۱۷۶۵ میں زیادہ وسیع ہو گئی ۔ اسی زمانے میں نظام اور مرہٹے پیدا ہو گئے ۔ ترکوں کے ہاتھوں سے ۱۶۹۹ میں ہنگری کا ملک جاتا رہا ۔ آہستہ آہستہ یونان (۱۸۲۸) رومانیا (۱۸۶۴) بلغیریا (۱۸۷۸) الگ الگ سلطنتیں بن گئیں ۔ مصر پر پہلے نپولین نے تاخت کی پھر وہاں خدیو حکمران ہونے لگے ۔ سپین میں تو عیسائی حکومت ۱۴۹۲ سے قائم ہو چکی تھی ۔ اب شمالی افریقہ پر بھی فرانس نے قبضہ جمایا ۔ الجیریا ۔ ۱۸۳۰ ۔ ٹیونس ۱۸۸۱ ۔ ادھر روس نے بخارا (۱۸۶۶) خوقند (۱۸۷۶) اور خیوا (۱۸۷۳) پر قبضہ کر کے ان ممالک کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا ۔ (۱۸۵۴) تک انگریزوں نے ہندوستان کے تمام ممالک فتح کر لئے تھے ۔ مگر ۱۸۵۷ میں ایک نئی تبدیلی ہوئی یعنی ملک ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں سے نکل کر بادشاہ برطانیہ کے قبضے میں چلا گیا ۔

تو اس طرح سے ہلاکو کے حملہ کے بعد عالم اسلام دو ادوار میں سے گزرا اور تیسرے میں داخل ہوا ۔ یہ تیسرا دور جسے اسلامی ممالک پر اردوپائی اثر کا دور کہنا چاہیئے اب تک جاری ہے ۔ یہ اثر اب تک ہو رہا ہے ۔ مسلمان قومیں یورپ کے علوم وفنون سے استفادہ کر رہی ہیں اور ان کی ذہنی اور تمدنی حالت بدل رہی ہے ۔

(باقی آئندہ)

(ادارہ) ڈائرکٹر

# کیونکر بھلائیں

(جناب ممتاز صاحب سکرٹری بزمِ ادب)

ٹھنڈی ہوائیں اِترا کے آئیں!
سوگیت گائیں نغمے سنائیں
کالی گھٹائیں دل کو لبھائیں

پر یاد تیری
کیونکر بھلائیں

حورانِ ارضی! غلمانِ فرشی
ملکوت قدسی! خوبانِ عرشی
پردے اٹھائیں جلوے دکھائیں

پر یاد تیری
کیونکر بھلائیں

یہ چاند تارے اور ماہ پارے
گل پھول سارے دریا کنارے
آنکھیں لڑائیں سو مسکرائیں

پر یاد تیری
کیونکر بھلائیں

گل اور گلستاں وحشت کے ساماں
دریائے رقصاں کوہِ بیاباں
دامن بچھائیں قربان جائیں

پر یاد تیری
کیونکر بھلائیں

پرکیف جلوے پُرلطف جلسے
میٹھے سے دھوکے ایسے انوکھے
بانکی ادائیں
میٹھی جفائیں

پر یاد تیری
کیونکر بھلائیں

(ممتاز دیبدی)

# ہنی بال!

(جناب حافظ سراج الدین صاحب محمود بی-اے-بی-ٹی)

قصے کہانیوں اور افسانوں سے اگر قطع نظر کرلی جائے تو ایسی تاریخی ہستیاں جنکو نامور سپہ سالاران اقوام عالم کے زمرے میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ صرف معدودے چند ہی ہیں۔ اور ہنی بال یقیناً اُن چند ناموروں میں سے ایک ہے جنکو انگلیوں پر شمار کیا جا سکتا ہے۔

ارض شام میں بسنے والے فیتی نسل کے لوگوں نے تجارت میں یہاں تک ترقی کی کہ اُنکے گروہ کے گروہ اپنے تجارتی کاروبار کے سلسلے میں مختلف ممالک تک جا پہنچے۔ ان میں سے ایک گروہ عازم افریقہ ہوا۔ اور جزیرہ سسلی کے بالمقابل ساحل افریقہ پر آکر آباد ہوگیا۔ جس نئے شہر کی انہوں نے یہاں آکر بنیاد ڈالی اسکا نام قرطاجنہ (CARTHAGE) یعنی (کارتھیج) پڑگیا۔ اس شہر کی تجارت نے یہاں تک ترقی کی کہ اس وقت کی تمام معلومہ دنیا میں پھیل گئی۔ یہاں سے اُٹھ کر ان لوگوں نے مختلف اقطار و امصار میں اپنی نوآبادیاں قائم کرنی شروع کردیں۔ یہاں تک کہ تمام بحیرہ روم پر چھا گئے۔ اہل روما چونکہ اسوقت بحیرہ روم پر قابض و متصرف تھے۔ اسلئے اٹلی کے نزدیکی جزائر میں کارتھیج والوں سے انکی مٹھ بھیڑ ہوگئی۔ اہل قرطاجنہ اگرچہ بحیثیت تاجر بہت ہی کامیاب تھے۔ مگر جنگ و پیکار سے کوسوں دور بھاگتے تھے۔ انکے جرنیل البتہ اس قابل تھے کہ دیگر ممالک کے جنگجو باشندوں کو اپنی افواج میں بھرتی کرکے حریف کے مقابل میں لڑا سکیں۔ قرطاجنہ کی ایک نوآبادی جزیرہ سسلی میں قائم ہوچکی تھی۔ لیکن اہل روما سسلی کو اپنے مقبوضات میں شامل سمجھتے تھے سسلی پر قبضہ کرنے کے لئے دونوں قوموں میں جنگ و پیکار کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوگیا جو پورے تیئیس سال تک برابر جاری رہا۔ چونکہ اسطرح اہل قرطاجنہ کی تمام تجارت برباد ہوگئی تھی اس لئے انہوں نے مصلحت اسی میں سمجھی۔ کہ کسی طرح اس جنگ و جدل کو ختم کردیا جائے۔ چنانچہ ایسی شرائط پر صلح ہوگئی۔ جو سراسر رومیوں کے لئے مفید تھیں جنگ اگرچہ ختم ہوگئی لیکن اہل قرطاجنہ اپنی اس ذلت کو فراموش نہیں کرسکے۔ انکے ایک مدبر سپہ سالار ہملکار نے جو برقہ یعنی برق و رعد کے پُر فخر اور معزز لقب سے مخاطب کیا جاتا تھا قسم کھائی تھی۔ کہ اہل روما سے اس ذلت آمیز شکست کا ضرور انتقام لیکر چھوڑے گا۔ اور یہ خیال کرکے کہ شاید وہ اپنی زندگی میں ایسا کوئی موقعہ حاصل نہ کرسکے اپنے چاروں خورد سال فرزندوں کو اپنے معبود اعظم کے مندر میں لے گیا۔ اور سب سے بڑے بت بعل کے سامنے خود اور ان چار بچوں کو دو زانوں ہوکر حلف اٹھوایا کہ تاعمر اہل روما کے دشمن رہیں گے۔ اور انکو شکست دیکر ذلیل کرنے کا موقع ہاتھ سے نہیں دیں گے۔ چنانچہ وہ فخریہ کہا کرتا تھا کہ میں نے دشمن کو برباد کرنے کے لئے اپنے خون سے چار شیروں کی پرورش کی ہے۔ ہملکار برقہ سپین فتح کرنے کے بعد اس صوبہ میں اپنے

قید دشمنوں سے لڑتا ہوا میدانِ جنگ میں کام آیا۔ اسلئے اس کی زندگی میں تو اسکی یہ دلی مراد برنہ آئی۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ یہ چاروں شیر اہلِ روما کے خون کے پیاسے تھے۔ ہنی بال چاروں بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ اگرچہ بعل کے مندمیں حلف لینے کے وقت اس کی عمر نو سال سے زیادہ نہیں تھی۔ باپ کی وفات کے بعد وہی اب قرطاجنہ کی فوج کا سپہ سالار مقرر ہوا۔

## اہلِ روما سے دوسری جنگ اور ہنی بال کی تجویز

۲۱۹ ق۔م۔ میں ایک معمولی سے بہانے پر دونوں قوموں میں جنگ شروع ہوگئی۔ ہنی بال کی تجویز تھی کہ بجائے بحری جنگ کے سرزمین اٹلی میں داخل ہوکر دشمنوں سے خود انکے ملک میں جنگ کرے اس کے راستہ میں ناقابلِ عبور دشواریاں تھیں کہ پسی نیز سے گذر کر اسے کئی ایک دریاؤں کو عبور کرنا تھا۔ جو بہت ہی تیز رفتار تھے اور جنپر پل وغیرہ بھی قطعاً کہیں بنے ہوئے نہیں تھے۔ پھر جو قبائل راستہ میں آباد تھے وہ بہت ہی شجاع اور جنگجو ہونے کے علاوہ ہنی بال کے خلاف تھے۔ ہنی بال کو اپنے ملک میں سے گذرتا دیکھ کر وہ بھڑوں کے چھتوں کی طرح اٹھ کھڑے ہوئے انکو مرعوب و مقہور کرنا کچھ آسان کام نہیں تھا۔ اسکے علاوہ کوہ ایلپس کی بلندیوں سے اترنے میں اُسے اور اسکی سپاہ کو شدت برف و باراں کا مقابلہ بھی کرنا تھا۔ اور ان پر مستزاد یہ کہ اہلِ روما اسکے مصائب میں ہر ممکن اضافہ کرنے کے لئے مستعد و تیار تھے۔

مگر وہ شیر مرد تن تنہا ان تمام مصائب پر غالب آیا۔ ان تمام تکلیفوں کو جھیل لینے کے بعد اٹلی کے میدان اس کے سامنے تھے۔ اور اب وہ اس خوشنما و زرخیز سواد سرزمین میں داخل ہوگیا

## رومیوں کی شکست

دریائے ٹاس نوس کے کنارے رومیوں سے اسکی پہلی جھڑپ ہوئی۔ جس میں اہلِ روما کو اس نے مکمل طور پر شکست دی۔ یہاں سے فارغ ہوکر ہنی بال مقام پاڈوس کی طرف آگے بڑھا لیکن اس اثنا میں رومیوں کی ایک دوسری زبردست فوج قنصل ٹائی بیریس کے زیرِ قیادت اسکے مقابل کیلئے یہاں آپہنچی۔ ایک چھوٹی سی ندی ٹریبیا دونوں فوجوں کے درمیان حائل تھی۔ ایک دن علی الصبح ہی رومی افواج دریا کو عبور کرکے ہنی بال کے سامنے آکر صفوں میں کھڑی ہوگئی تاہم رومیوں کو یہاں بھی شکست نصیب ہوئی۔ اور ہنی بال نے انکو شمالی اٹلی سے بزورِ شمشیر باہر نکال دیا ہنی بال یہاں سے مع افواج آگے کی طرف روانہ ہؤا۔ راستہ میں اسے سخت شدائد اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ اس سفر میں اسکی ایک آنکھ بھی ضائع ہوگئی کوچ کی دشواریاں اتنی سخت تھیں کہ اس دلدل والی زمین میں سے اس کا ایک ہاتھی جو بائیس ہاتھیوں میں سے بچ رہا تھا اسے بمشکل تمام سلامت نکالکر لاسکا۔ . . . مگر بایں ہمہ اب بھی اسکی شجاعت اور حوصلہ مندی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ کیونکہ دوسرے سال ۲۱۷ ق۔م۔ میں بھی وہ خود روم کی طرف بڑھا۔ رومی قنصل اس کے مقابلہ کو آیا۔ مگر جھیل ٹراسی نوس کے کنارے پر شکست کھائی۔ یہ شکست اتنی سخت تھی کہ اس نے رومیوں کی کمر توڑ دی۔ اور انکے حوصلوں کو پست کردیا اس بے بسی اور لاچاری کی حالت میں انہوں نے ایک نہایت ہی قابل آدمی فیکس می پس کو اپنا ڈکٹیٹر منتخب کیا۔ وہ اس بات سے بخوبی واقف تھا کہ ہنی بال کے مقابل میں جمکر لڑنا صرف مشکل ہی نہیں بلکہ قطعاً ناممکن ہے چنانچہ وہ اپنا لشکر لیئے ہنی بال کے ساتھ ساتھ تو ضرور رہا لیکن

اسے جم کر لڑنے کا کبھی موقعہ نہیں دیا - اس لئے لوگوں نے اس کا نام ہی کنکٹاٹو (دلیر پسند خان) رکھدیا - اور اسے مجبور کیا کہ دشمن سے کھلے میدان میں جنگ لڑے پھر سنہ ۲۱۶ ق م میں دونوں قنصلوں کو ہنی بال کی افواج سے دگنی سپاہ دیکر اس کے مقابلہ پر روانہ کیا لیکن ان تیاریوں کے باوجود بھی ہنی بال نے کانیلے کے مقام پر ایسی شکست فاش دی کہ ستر ہزار ۷۰،۰۰۰ رومن سپاہی کھیت رہے - حالانکہ اس جنگ میں خود اس کی فوج کا نقصان چھ ہزار مقتولین سے زیادہ نہیں ہوا تھا - (قرطاجنہ کی بے عملی اور رومیوں کی حب الوطنی) ہنی بال کا خیال تھا - کہ اس شکست کے بعد دیگر تمام شہر روما کا ساتھ چھوڑنے پر مجبور ہو جائینگے - بعض شہروں نے اس کی اطاعت اختیار کر لی لیکن اکثر شہروں نے مادر وطن کا ساتھ نہ چھوڑا - اب اسے ہر شہر کو محصور کرنے کے لئے مزید فوج کی ضرورت محسوس ہوئی - میدان جنگ میں تو اگرچہ وہ اپنی موجودہ فوج سے ہی رومیوں کو ناکوں سے چنے چبوا سکتا تھا لیکن دشمن کے طرفدار شہروں پر قبضہ کرنے کے لئے بہرحال مزید افواج کی ضرورت ناگزیر تھی - اس کا بھائی ہسڈر دبال اسے اسپین سے کوئی امداد نہیں پہنچا سکتا تھا - کیونکہ وہ خود وہاں رومی افواج سے دست و گریباں ہو رہا تھا - اُدھر قرطاجنہ کے بے حمیت اور حاسد باشندے بھی اسے کمک روانہ کرنے پر رضامند نہ ہوئے - اور اس منطق کی بھول بھلیاں میں پڑے رہے کہ اگر وہ واقعی ہر میدان میں فتحیاب رہا ہے - تو پھر اسکو مزید فوج کی ضرورت ہی کیا ہے -

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہنی بال دن بدن کمزور ہونا شروع ہو گیا - اور اس کے مفتوح دوستوں نے بھی اسے یکے بعد دیگرے چھوڑنا شروع کر دیا - سنہ [illegible] ق م میں اس کا بھائی ہسڈربال جو اسکی امداد کو آ رہا تھا - راستہ میں ہی قنصل نیرو سے شکست کھا کر میدان جنگ میں کام آگیا - نیرو نے ہسڈربال کا سر کاٹ کر ہنی بال کے کیمپ میں پھنکوا دیا - اب گو یہ زمین اٹلی کا ذرہ ذرہ اس کا دشمن ہو رہا تھا - اور وہاں کے تمام در و دیوار اس کے خلاف متحد ہو گئے تھے - مگر وہ اپنے احسان ناشناس ہم وطنوں کی بے وفائیوں اور حاسدین کے حسد کے باوجود بھی وہاں سے نہیں ہٹا - سکپو نے جو اس وقت تمام رومی جرنیلوں میں قابل ترین اور بہترین جرنیل تھا - تجویز کی کہ ہسپانیہ سے ہوتے ہوئے آبنائے جبل الطارق کو عبور کر کے خود دشمن کے ملک افریقہ میں جنگ شروع کر دی جائے - تاکہ مجبور ہو کر ہنی بال کو ادھر متوجہ ہونا پڑے چنانچہ اس کو قنصل منتخب کر لیا گیا - اور وہ سنہ ۲۰۴ ق م میں لاتعداد افواج سمیت ساحل افریقہ پر جا اترا - یہاں اس نے قرطاجنہ کی افواج کو سخت شکست دی - اور ہنی بال کے یہ بے عزت ہموطن خود اپنے ملک میں بھی اس دشمن سے عہدہ برآ نہ ہو سکے - اس نے ان کے خیموں کو اس وقت آگ لگا دی جبکہ یہ بزدل جرنیل میدان جنگ سے فرار ہو رہے تھے - اب اہل قرطاجنہ نے مجبور ہو کر ہنی بال کو اپنی امداد کے لئے بلا لیا -

یہ ان کی دوسری جماعت تھی - ہنی بال اب اپنی جگہ چھوڑ کر حریف کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں تھا - مگر اس نے اس حالت میں بھی اپنے بھائیوں کی امداد کرنے سے انکار نہیں کیا - سنہ ۲۰۲ ق م میں زاما کے مقام پر سکپو سے اس کا سامنا ہوا - یہاں ایک سخت خوفناک اور خونریز جنگ شروع ہوئی - اسکپو کے پاس بہترین رسالہ میدان جنگ میں موجود تھا - جس سے اس نے ہنی بال کے رسالہ کو شکست دیکر عقب سے

اس کی پہلی سپاہ پر دھاوا بول دیا۔ لیکن یا فواج بھی ہلکار یار قہ ا کے فرزند کی قیادت میں لڑتی ہے۔ اس لئے حق کا لقمہ تر ثابت نہیں ہوئیں ایک ایک ان کے کشتوں کے پشتے لگ گئے جبتک ایک سپاہی بھی زندہ رہا اس نے جنگ سے منہ نہیں موڑا اور تمام کے تمام وہاں ہی کھیت رہے۔ اس شکست سے قرطاجنہ والوں کی تمام قوت و عظمت خاک میں مل گئی اور انکو رومیوں سے بہت ہی سخت شرائط پر صلح کرلینی پڑی۔

ہنی بال اسکے بعد کچھ دنوں تک قرطاجنہ میں رہا جہاں تک بنا اپنے ملک کی حالت سنبھالی۔ مگر آخرکار اس کے احسان فراموش اہل وطن ہی نے خود اس پر الزام لگانے شروع کردیئے ان وطن دشمنوں نے اسے یہاں تک مجبور کیا کہ وہ سواد وطن کو خیرباد کہہ کر بھاگا۔ اور ارض شام میں جاکر وہاں کے تاجدار کے دربار میں پناہ لی۔ رومیوں نے اسے وہاں بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیا شام پر چڑھائی کردی۔ اہل شام کو شکست ہوئی۔ اور اس شرط پر رومیوں نے ان سے صلح کرلی کہ ہنی بال کو اپنے ملک سے نکالدیں۔ ہنی بال یہاں سے بھی فرار ہوکر بیثی نیا پہنچا اور شاہ کے دربار میں جاکر پناہ گزیں ہوا۔ تاکہ بڑھاپے کے دن وہاں بھی امن و چین سے گذار دے۔ جب رومیوں کو اس کی خبر ہوئی تو وہ اس کے تعاقب میں وہاں بھی پہنچے اور شاہ سے تقاضا کیا کہ ہنی بال کو ملک بدر کردے۔ رومیوں کی یہ حالت دیکھ کر ہنی بال نے دل شکستگی سے ہر طرف نظر دوڑائی اور سب طرف سے مایوس ہوکر کہا۔

"میں خود ہی رومیوں کو ایک بوڑھے شخص کی دہشت سے آزادگی دلادوں گا۔"

یہ کہکر خود اپنے ہاتھ سے زہر کا پیالہ منہ سے لگاکر پی گیا اور اس طرح اس عظیم الشان محب وطن کی شاندار زندگی کا خاتمہ ہوگیا ؎

کیا نزع کی تکلیفوں کا مزہ جب موت نہ آئے جوانی میں
کیا لطف جنازہ اٹھنے کا ہر گام پہ جب ماتم نہ ہؤا

حافظ سراج الدین محمود۔ بی۔ اے
بی۔ ٹی۔

---

# ترانۂ بیداری

مسلمانو! اگر تم ہوشیار و باخبر ہوتے　　بلاؤں کے تقابل میں نہ کیوں سینہ سپر ہوتے
مٹا دیتے تمہیں سارے جہاں کی قصر بطلانی　　عمل کی راہ پر سب کیلئے نقش خضر ہوتے
راہِ عشقِ الٰہی میں بُتِ خاکی مٹا دیتے
جہاں میں دینِ مصطفوی کو پھر شیدا بنا دیتے

(از حافظ محمد شفیع شیدا)

# عہد فرخ سیر کا ایک فراموش شدہ بادشاہ گر

(از جناب حافظ محمد شفیع صاحب شیدا)

امیر الامراء سید حسین علی خاں کا نام عہد مغلیہ کی تاریخی کتب کے مطالعہ کرنے والوں سے مخفی نہیں ہے آپ اور سید حسن علی خاں الملقب وعبد اللہ خان ہر دو برادران نہایت مشہور سردار گذرے ہیں۔ چنانچہ ہم اسجگہ سید حسین علی خاں مرحوم کے مختصر حالات ہدیۂ ناظرین باتمکین کیا چاہتے ہیں۔ اُمید واثق ہے مضمون ہذا مطالعہ ناظرین جریدہ محقق بہاولپور کی وسعت معلومات کا موجب ہوگا۔

جبکہ جہاندار شاہ - بامدار نواب ذوالفقار خاں بن عمدۃ الملک اسد خاں بسلطنت دہلی کے حاصل کرنے میں کامیاب ہُوا۔ اسوقت یہ ہر دو برادران علاقہ شرقی (بہار) میں برسر ملازمت شاہی تھے۔ جب فرخ سیر نے صوبۂ بنگالہ سے دہلی کا عزم کیا تو یہ فرخ سیر کی امداد کے لیئے آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ جنگ میں فرخ سیر کامیاب ہُوا۔ اور بساط حکومت جہاندار شاہی درہم برہم ہوئی فرخ سیر نے امیر الامراء سید حسین علی خاں کو امام الملک کے نقارہ علم رکھنے کی عزت سے سرفراز فرمایا۔ سید صاحب مذکور اعلےٰ درجہ کے سپہ سالار، علم دوست اور کریم النفس تھے۔ علماً و فضلاء کی نہایت عزت اور توقیر کیا کرتے تھے۔ چنانچہ مولانا آزاد بلگرامی نے اپنی تصنیف لطیف ماثر الکلام میں شرح وبسط سے ذکر کیا ہے۔..

فرخ سیر کے عہد میں فتنۂ اقوام مرہٹہ وخروج راجپوتاں میں نہایت عمدہ کارنامے دکھا کر گرد و غبار شورش آشوب کو نہایت عمدگی سے فرو کیا۔ راجپوتان کے سردار اجیت سنگھ نے تاب مقاومت سے عاجز ہو کر کوہستان دشوار گذار میں پناہ لی اور بذریعہ وکلاء معتمدان خود عفو تقصیرات کا خواہاں ہُوا۔ جن ایام میں کہ حضرت امیر الامراء دکن میں ناظم تھے۔ اُن کے بذل و احسان کا یہ عالم مشہور ہے کہ اس قدر کثرت سے غرباء و مساکین میں طعام تقسیم ہوتا تھا۔ کہ لوگ وہاں سے حاصل کر کے فروخت کرنے لگ گئے تھے۔ چنانچہ ایک پیسہ میں مکلف پلاؤ کا رکاب ملتا تھا۔

آپ کی طبیعت حرص و آز سے منزہ و مبرا تھی چنانچہ ملک التجار عبد الحی ساکن بندر سورت کی وفات پر اس کا ایک کروڑ روپیہ ضبط سرکار ہوا۔ اسکے بیٹے نے زرِ منضبط کی واگذاری کیلئے امیر الامراء کے حضور میں درخواست پیش کی۔ اور پندرہ لاکھ زرمسکوک کے پیش کرنے کا اقرار کیا۔ لہٰذا امیر الامراء نے بعد گذرنے دو یوم بلا وصول نذرانہ کل زر واگذار فرمایا اور ظاہر کیا کہ میری طبیعت نے میرے حرص پر کامیابی حاصل کی ہے۔

عہد فرخ سیر کے خاتمہ پر محمد شاہ بادشاہ دہلی سریر آرائے حکومت ہند ہوئے۔ اور پارٹی بازی کے دور دورہ کا آغاز ہُوا مغل امراء غلبۂ سادات کو ناپسند کرتے تھے۔ چنانچہ محمد شاہ خود ان کے درپئے تخریب تھے۔ جب بادشاہ دہلی بمعیت امیر الامراء مع فوج دکن کی جانب کوچ کر رہے تھے۔ تو آگرہ سے چند منزلوں کے فاصلہ پر جبکہ امیر الامراء بادشاہ کے حضور سے اپنی فرودگاہ مسکن

کی جانب بسواری ہاتھی (پالکی) آرہے تھے تو ایک شخص نے عرضی پیش کی جبکہ آپ عرضی کے ملاحظہ میں مشغول ہوئے تو اس نے خنجر آبدار کے پہلو میں غرق کر دیا جس سے ان کا خاتمہ ہو گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ تمام کارروائی بادشاہ کے اشارہ سے عمل میں لائی گئی۔ امیر الامراء کا جبہ مبارک نہایت عزت و توقیر کے ساتھ بغرض تدفین جوار حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمتہ اللہ علیہ بمقام اجمیر شریف بھیجا گیا۔ مؤرخین نے ان ہر دو برادران کو بادشاہ گر یا (King makers) کے نام سے موسوم کیا ہے۔ ان کی خدمات نظر انداز کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔ جس پر ہم اس وقت اسی قسم کی بحث و تحمیص کرنے سے اجتناب کرتے ہیں۔

ایک عجیب بات امیر الامراء سید حسین علی خاں سے منسوب ہے کہ شہادت سے کچھ عرصہ پہلے عالم رویا میں حضرت امام حسین علیہ السلام کی زیارت نصیب ہوئی۔ اور آپ فرماتے ہیں۔ بلغ وعدک و غلب عدوک جن کے معنے ہیں۔ تیرا وعدہ پہنچ چکا۔ اور دشمن غالب آئے۔

ان کلمات کے عدد از قاعدہ ابجدی حاصل کرنے میں سن شہادت امیر الامراء موصوف پیدا ہوتا ہے۔ دیگر ان کلمات کو منقلب کر دیا جائے تو یہی عبارت بدستور قائم رہے گی۔

وباللہ التوفیق۔ (از حافظ محمد شفیع شیدا)

# نظم!

## نوجوان مسلم سے

(حضرت فسوں صاحب)

اے ہمہ صرفِ تعیش! اے ہمہ محوِ نشاط! اے کہ تونے کرلیا عشرت سے پیدا ارتباط!
اے کہ زیب و زینتِ بزم سماع و رقص تو! خاطرِ عشرت قریں کی خوبصورت آرزو!
اے کہ تیری انتہائے آرزو دیدِ غلیل! تیرے خوابِ زندگی کی شوق تعبیرِ جمیل!
اے کہ تو پیمانہ بردارِ خمستانِ جنوں! ہے کہیں رندوں کا تیرے قیس سے رتبہ فزوں!
اے کہ تو وحشت خرام وادیٔ آزادگاں! پیکرِ آزادگی میں روحِ پابندی رواں!
اے کہ تیری ذات سے غمناک ہے تاکِ شرم! اے کہ تو ہے مرغزارِ غیر میں مصروفِ رم!

موجبِ رسوائی آخرکار تیرا رازداں
نازشِ ہمت تری مصروفِ تعمیرِ زیاں!

اے کہ تو دلدادۂ نظارۂ مغرب ہوا! تو طبیبِ ہند تھا۔ بے چارۂ مغرب ہوا!
ہاں بتا دے اے حریفِ لذتِ چنگ و ایاغ! کون ہے اس سرزمین ہند کا چشم و چراغ؟
پاسخِ بیباک ہے گرچہ تری کم آگہی تا بہ کے قربانگہِ مغرب پہ تیری جاں دہی

گوش کن گر لذتِ سوزِ دروں خواہی کشید
پردہائے سازِ چشم از برائے تو درید!

تو ہی تھا اے بیخبر! اس سرزمیں کا ناز۔ تو اس گلستاں کی تھی باقی تیرے دم سے آبرو
تو ہوا محوِ خودی۔ تاراج نکہت ہو گیا کس قدر تیرا وطن تاریکیوں میں کھو گیا

تو ہی تھا شانِ نزولِ آیتِ حُبِّ وطن
تو ہی تھا ناخن برائے عقدۂ بیم و امن

تجھ سے نخلِ آشنائی و اخوت تھا ہرا
اور تو ہی خرمنِ بیگانگی پہ برق تھا

تو ہی تھا غارتگرِ جنسِ غرورِ ہست و بُود
تجھ سے معمورِ ضیا رتھی محفلِ نام و نمود

تجھ سے وابستہ تھی شانِ رفعتِ ہندوستاں
تجھ سے رکھتی تھی ارادہ عظمتِ ہندوستان

تو ہی تھا بانگِ درائے کاروانِ ارتقاء
اور حُدی خوان تو ہی استقلال کے ناقہ کا تھا

تو ہی تھا کیفِ مدام حکمت و علم و فضل
تجھ سے ہی سرگرم جنبش تھی کہیں نبضِ عمل

تو ہی تھا آتش زنِ خار و خسِ جہل و وہم
تو ہی تھا عقدہ کشائے مسئلہ ہائے اہم

تو فروغِ صبح مانائی و استحکام تھا
شام کی رنگین شفق تھی گر خیالِ خام تھا

تار و پُودِ جامۂ انسانیت تھا کون؟ تو
حاملِ کیفِ تجسس تیری ہمت کا سبُو

تو ہی تھا خونِ رگِ مذہب کی صورت میں عیاں
گلشنِ ادیانِ باطل میں باندازِ خزاں

تو جہانِ حیلہ فن میں عیسوی اعجاز تھا
تیری ہستی پر فریبِ دو جہاں کو ناز تھا

تو خزاں کی فصل میں تھا مایہ دارِ رنگِ گل
اور تو ہی تھا امیں رازہائے جزو و کل

تو ہی تھا آئینہ دارِ ذرۂ صحرا نشاں
قطرۂ بحر آشنا تھی تیری ذاتِ پُر زیاں

کسوتِ غنچہ میں پوشیدہ تھے اسرارِ چمن
دانۂ خرمن نما تھی تیری ہستی بے سخن

سازِ ملت کی نوا ریزی تھی تجھ مضراب سے
تھا خرام آموز اسپِ قوم تیرے داب سے

گوہرِ رنگین تھا تو سلکِ موجودات کا
نغمۂ رنگین تھا تو سازِ مکنونات کا

بے خبر! تو کون تھا؟ کیا تھا؟ تیری ہستی تھی کیا
لیکن اسیر بھی رہا تو ناشناسِ مدعا

بہ ازیں نوشِ حیاتت بُود زہرابِ اجل
استعادہ کردی چوں چیزے کہ نباید صد علل

نیاز مشغول
(افسوں)

# ظالم سماج

(از قلم جناب حیات ترین صاحب)

للیتا نے کرخت لہجہ میں کہا :- "چل ہٹ دور ہو اچھوت کہیں کی"

وہ نہایت ضدی مزاج واقع ہوئی تھی عمر چالیس پنتالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ پرانے رسم ورواج کی دل و جان سے فریفتہ تھی خیالات میں دقیانوسیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ موہن اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ بہو کا نام شانتا تھا۔ اس کی جوانی زندگی کی اٹھارویں منزل میں بیٹھی ہوئی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ موہن اور شانتا زمانۂ حال کے رسم ورواج و خیالات کے دلدادہ تھے۔ اگر موہن کسی بات میں کم تھا تو وہ یہ کہ وہ نہایت سادہ لوح تھا۔ دوسروں کی تاثرات اور دباؤ سے بہت جلد مغلوب ہو جاتا تھا۔ اگر معمولی سی بات پر ماں آنکھیں دکھاتی تو سوائے آنکھیں نیچی کر لینے کے اُسے اور کوئی چارہ کار نظر نہ آتا تھا۔

موہن کے ہر چند منت سماجت کرنے پر للیتا نے شانتا کو ساتھ ساتھ ہوا خوری کی اجازت دے دی تھی گو للیتا کا دلی ارادہ اُسے گھر کی چار دیواری سے باہر نکالنے کا نہ تھا لیکن چونکہ شانتا کی صحت عام طور پر خراب رہتی تھی۔ اس لئے طوعاً وکرہاً سیر وغیرہ کی اجازت دے دی تھی۔

اس دن دفتر میں موہن کے پاس کام بہت تھا وہ حسب معمول پانچ بجے گھر نہ آسکا۔ شانتا نے سوچا کہ میں انہیں راستے ہی میں ملجاؤنگی چنانچہ وہ اسی خیال کو مدنظر رکھ کر اپنے نوکر کے ہمراہ سیر کرنے روانہ ہوگئی۔ راستہ میں ایک دلآویز نظارہ سے اس کا دل لبھا اٹھا اور اُسے واپس گھر آنے میں دیر ہوگئی۔ ساس کا خوف نوجوان بہو کے دل کو چیر رہا تھا۔ ڈرتی کانپتی گھر پہنچی تو للیتا نے تند لہجہ میں کہا۔

"چل ہٹ دور ہو اچھوت کہیں کی" شانتا ٹھٹھک گئی اس کی رگوں میں نہایت تیزی سے خون متحرک ہوگیا۔ بولی۔ ماتا جی! آج ذرا دیر......

بات کاٹ کر ہاتھ نچاتے ہوئے للیتا نے کہا! "میں تیرے تمام کرتوت سن چکی ہوں۔ بڑی نیک پاک بن کر آئی ہے۔"

ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے للیتا کی آنکھیں پلکوں کو چیر کر باہر آجانا چاہتی ہیں۔

شانتا نے منت خیز لہجہ میں کہنا شروع کیا :- ماتا جی اگر میں اُس غریب بچے کو نہ سنبھالتی تو ایشور جانے۔ اس کا کیا حال ہوتا وہ مر.....

اری واہ ری ایشور کی بیٹی! اچھوت کہیں کی۔ بھلا کوئی بھنگی کو بھی چھوتا ہے۔ پنڈت جی جب تیرے یہ ناقابل برداشت کرتوت سنا رہے تھے تو میں شرم کے مارے زمین میں گڑی جا رہی تھی وا س باختہ ہوئے جا رہے تھے۔ سر اٹھانے کو حوصلہ نہ تھا

میں کیا کسی کی شعلے ملی ہوں مگر کیا کروں۔ آج تو نے میری تمام عزت مٹی میں ملا دی۔ لٹیا ڈوب گئی۔ خاندان کی ناک کٹ گئی۔"

لیتا کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ اس کے ہونٹ پھڑک رہے تھے۔

شانتا بت کی طرح بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ درد انگیز لہجہ میں بولی۔ "بیچارے کو سائیکل کا دھکا لگ گیا۔ گر پڑا۔ اور سر سے خون نکل آیا۔ وہ بے ہوش ہوگیا تھا۔ ورنہ میں اُسے کبھی نہ چھوتی۔"

"ہاں ہاں تیرا سگا تھا نہ۔ اچھوت بچوں کے لئے تڑپتی ہے کوئی ہندو کا بچہ ہوتا تو میں بھی جانتی کہ واقعی ہمدرد ہے۔" اچھوت بچے میں کیا رکھا ہے۔ خواہ مخواہ اپنے دھرم کو بٹہ لگا دیا۔ مر رہا تھا تو مرنے دیتی۔ تیرا اُس سے کیا واسطہ۔"

ماں کا یہ شور سن کر موہن بھی آنگن میں آگیا۔ موہن کو دیکھتے ہی لیتا کا خون کھولنے لگا۔ بولی:۔ "تو نے ہی اسے اتنا سر پر چڑھا لیا ہے۔ بچوں کے لئے تڑپتی ہے۔ اور بھنگی چماروں کے لڑکوں کو پیار کرتی ہے۔"

موہن حیران تھا کہ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس رہا ہے۔ وہ شرمندہ ہو کر ایک طرف سر جھکائے کھڑا تھا۔ شانتا نے موہن کے چہرے پر التجا آمیز نگاہیں ڈالیں۔ اُسے سو فیصدی یقین تھا کہ پتی دیو اس کی طرف سے ضرور کچھ نہ کچھ کہیں گے۔ کسی پتی ورتا استری کیلئے پتی کے سوائے اور کیا سہارا ہو سکتا ہے۔ مگر جب اس نے دیکھا کہ پتی دیو بالکل خاموش ہیں۔ تو اسکی آنکھوں میں آنسو اُمنڈ آئے موہن دل ہی دل میں رو رہا تھا۔ وہ ماں سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر اس کے خوفناک غصہ سے زبان سے کچھ نکالنے کا حوصلہ نہ کرتا تھا۔ الفاظ زبان پر آگئے تھے مگر ان کو ادا کرنے کی طاقت مفقود تھی اپنے اس بے بسی کے احساس سے دل ہی دل میں اپنے آپ پر لعنت اور نفرین بھیج رہا تھا اُسے خیال آتا تھا جو میرے دکھ سکھ کی شریک اور غمگسار رہی ہے۔ آج وہی میری کم دلی کی وجہ سے بیجا ظلم کا شکار ہو رہی ہے۔ اور میں چپ چاپ کھڑا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ اس سے تو یہ بہتر ہوتا کہ میں انسان کی بجائے کوئی پتھر ہوتا.....

.....نہیں نہیں... ایسا کبھی نہ ہوگا!۔

اُس نے جوش میں ماں کے منہ کے سامنے آنیکا ارادہ کیا مگر جوں ہی ماں کی ہیبت ناک شکل دکھائی دی۔ تمام آئے ہوئے ہواس گم ہو گئے۔ مُنہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"تو کیا کہتا ہے میں تو اس اچھوت سے پریم کرنے والی کو کبھی اپنے گھر میں نہ رہنے دوں گی۔ اگر تو میری مرضی کے خلاف کام کریگا تو یاد رکھ میں کوئیں میں گر کر جان دے دوں گی۔" یہ کہتی ہوئی لیتا اٹھی اور غصہ سے دونوں کو گھورتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

ان سخت اور کڑیہہ الفاظ نے موہن کو زیادہ پریشان کر دیا اُس کا کلیجہ کانپ اٹھا۔ شانتا کی آنکھوں کے سامنے بھی اندھیرا چھا گیا اُسے ایسا احساس ہوا جیسے تمام دُنیا ابھی ابھی کسی خوفناک تباہی کا شکار ہو جائیگی۔ کانپتے ہوئے گر پڑی۔

موہن سے یہ نہ دیکھا گیا۔ آگے بڑھا لیکن قریب پہنچتے ہی ٹھٹھک گیا۔ جیسے کسی نے اس کے پاؤں زمین میں گاڑ دیئے ہوں۔

## (۲)

موہن نے عاجزانہ لہجے میں کہا "پیاری کچھ دنوں کیلئے اپنے

پتا کے گھر چلی جاؤ۔"

انسانیت کی حیا کرنیوالی تصویر سسکتی، مصیبت کی ماری ہوئی شانتا نے ایک گہرا سانس لیکر دست بستہ جواب دیا۔

"سوامی! کتنی بے انصافی ہے"

"تم ماتاجی کی عادت سے تو بخوبی واقف تھیں۔ تمہیں بھنگی کے بچے کو چھونے کی ضرورت نہ تھی!"

شانتا کے آنسو آنکھوں ہی میں خشک ہوگئے اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ ضد سے بولی:۔ "ناتھ! آپ کے یہ الفاظ آپ کو ہی متہم کرتے ہیں۔ کیا آپ نے مجھے یہ اپدیش نہ دیا تھا۔ کہ دنیا میں اچھوت کوئی نہیں۔ ویدوں میں بھی اس کا کچھ تذکرہ نہیں۔ ایک برہمن اور اچھوت میں کوئی قدرتی تفریق نہیں"!

موہن شرمندہ ہوگیا اپنی بزدلی پر جھنجھلا اٹھا۔ اس کا جی بار بار چاہتا تھا۔ کہ شانتا کو اپنے سینہ سے لگا لوں وہ تو بالکل بے گناہ ہے۔ مگر جب ماں کی خوفناک شکل کا تصور نظروں کے سامنے رونما ہوتا۔ تو وہ بالکل ساکت رہ جاتا کلیجہ برف بن جاتا۔ اس نے پھر شانتا کو تسلی دیتے ہوئے کہا:۔ "پیاری! میری بات مانو دیکھو ماتاجی غصے سے آگ بگولا بن رہی ہیں۔ جب سے کوئیں میں گرنے کا ذکر کیا ہے۔ میرا کلیجہ کانپ اٹھتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تم کچھ دنوں کے لئے اپنے پتا کے گھر چلی جاؤ۔ ایک ہفتہ بعد میں ماتا کو سمجھا لونگا اور تمہیں واپس لے آؤنگا۔

شانتا نے ایک گہرا سانس لیا۔ اور بیجان مورتی کی مانند ٹکٹکی لگائے موہن کے چہرہ کیطرف دیکھتی رہی۔

موہن نے فوراً نوکر کو بلایا۔ اور شانتا کو اسکی ماتا کے گھر پہنچانے کا حکم دیا۔ نوکر تانگہ لایا۔ شانتا کی آنکھیں آنسوؤں سے لدی ہوئی تھیں۔ جیسے قصائی گائے کو لے جانے کے لئے تیار ہے۔ اپنے پتی کی رضا کو مد نظر رکھتے ہوئے وہ تانگے پر سوار ہوئی۔ اور آنکھوں آنکھوں سے پتی دیو کے آخری درشن کئے دکھ اور رنج سے منڈلاتے ہوئے مجبور بادل موہن کے سنگدلی جھونکے سے یکدم برس پڑے جھڑی سی لگ گئی۔ موہن کے دل کو کسی غیبی قوت نے زور سے مسوس دیا۔ تانگہ چل پڑا۔

## (۳)

چار ماہ کا طویل عرصہ گذر گیا۔ موہن نے ماں کو بہت سمجھایا لیکن ماں کے ذہن میں کوئی بات نہ آئی۔ شانتا کے خطوط بھی آئے۔ لیکن موہن نے ایک کا بھی جواب نہ دیا۔ دل پر چوٹ لگنے کی وجہ سے وہ عام طور پر حواس باختہ سا رہنے لگا۔ اس کا بے انصاف دل اندر ہی اندر اسے کھانے لگا۔

ایک دن للیتا نے موہن کو اپنے پاس بٹھا کر شیریں الفاظ میں کہا: "میرا لڑکا میری بات کبھی نہیں ٹالتا" سادہ لوح موہن ماں کی خوشامد سے دل ہی دل میں خوش ہوگیا:

"میں تو اپنے پتر موہن کی اب دوسری شادی کروں گی۔"

جیسے ایک ساتھ ہی سینکڑوں بچھوؤں نے موہن کے جسم پر ڈنگ مار دیئے۔

"بیٹا! تو دن بدن سوکھتا کیوں جاتا ہے۔ اداس کیوں رہتا ہے؟ میں نے تیرے لئے ایک اچھی سی لڑکی تلاش کی ہے۔ چاند کا ٹکڑا ہے۔ دونوں کی بہت اچھی جوڑی رہیگی"

موہن نے آہستہ سے کہا:۔ ماتاجی! میں دوسری شادی نہیں کروں گا۔

للیتا نے کڑک کر کہا۔ "کیوں"؟

جب بہو ملی بیٹے کی شادی کی بات سے بے پناہ غصے سے مغلوب ہوگئی سب دل میں کچھ کہکر خاموش ہوگیا۔

چنانچہ پینترا بدل کر موہن کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے شیریں لہجہ میں دوبارہ کہا۔" دیکھ بیٹا! اسے اپنے گھر لانے سے بلادری والے ناراض ہو جائیں گے۔ ہم برادری کے عتاب کا شکار ہو کر رسوا ہو جائیں گے۔ اس کے سوا وہ بانجھ بھی ہے دوسری شادی ہو جائے گی تو میں نئی دلہن کا منہ دیکھ کر شکر میں رہوں گی۔

موہن بھی سوسائٹی کے عتاب سے خوفزدہ تھا۔ اس کے کمزور دل پر ماں کی باتوں کا اثر ہونے لگا۔ دم بھر کے لئے اس کے دل میں بھی آئندہ نسلوں کے عیش و آرام کا خیال موجزن ہوا۔۔۔ وہ نئی مسرتوں اور عروس نو بہار کی رنگینیوں اور شباب کی آفرین کیفیتوں کے خواب دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے خوشی و مسرت ٹپکنے لگی اس نے کہا۔ اچھا ماتا جی۔

للیتا نے اپنے بھولے موہن کی بلائیں لے لیں۔ *

آج شانتا کا خط آیا جس میں اس کی بیماری کا حال تھا۔ موہن کا دل اس دھکے سے پھر غمگین و ڈانوا ڈول ہوگیا۔ چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ رات کا وقت تھا۔ تارے چھٹکے ہوئے تھے۔ کہکشاں کا جھولا بالائے سرقص میں تھا۔ موہن اپنے پلنگ پر دراز تھا۔ رہ رہ کر اور بھی اسے شانتا کا خیال پریشان کر رہا تھا۔ اس کے پردۂ خیال پر شانتا کا گھر سے نکالا جانا۔ بائیسکوپ کے خاموش منظر کی مانند رقص نما ہو گیا تھا۔ اس نے دیکھا مظلوم، مجبور، مرقع یاس شانتا آنسوؤں سے منہ دھوتی۔ بین و بکا کرتی تانگے میں سوار چلی جا رہی ہے۔ اس سین نے موہن کو بہت بے چین کر دیا۔ اس نے سوچا۔ وہ تو بالکل بے قصور ہے۔ گناہ کا شائبہ تک نہیں۔ پیدائشی اچھوت اور گناہوں کے کیچڑ میں لت پت پاپی بھی شدھ ہو سکتے ہیں۔ بیرونی غلاظت دھو کر غلیظ سے غلیظ انسان بھی پاک و صاف ہو جاتے ہیں۔ جو ذات شریف جو برادری میں سرپنچ بن کر اپنی پرستش کراتے ہیں گنگا سا گنہ ہے۔ جس سے ان کا نامۂ اعمال سیاہ نہیں ہوتا۔ مگر پھر بھی ظاہر پرست اور اندھا سماج انہیں دیوتا سمجھ کر ان کی قدمبوسی میں ہی اپنی نجات تصور کرتا ہے۔ تو غریب شانتا نے کیا قصور کیا ہے۔ وہ بھی گنگا اشنان سے شدھ ہو سکتی تھی۔ میں نے ہی تو اُسے اچھوت ادھار کی تلقین کی تھی۔ اور آج میں خود اس کے خلاف ہو رہا ہوں حتیٰ کہ دوسری شادی کے لئے کمربستہ ہوں۔ کیوں؟ صرف اولاد کے لئے۔ یہ بھی کیا اس کا قصور ہے۔ نہیں نہیں یہ قسمت کا کھیل ہے۔ پھر بھلا میں ماں سے کیوں خوف کروں؟ ماں نے صرف مجھے پال پوس کر بڑا کیا ہے۔ لیکن شانتا نے میرے لئے اپنے ماں باپ کو چھوڑ دیا ہے۔ اور اپنا سب کچھ حتیٰ کہ اپنی روح بھی میرے قدموں میں بھینٹ چڑھا دی۔ پھر کیا میں ہی اس پر یہ ظلم روا رکھوں۔ نہیں نہیں میں صبح ہوتے ہی خود جا کر لے آؤں گا۔

یہی سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی۔ اور وہ نیند سے مدہوش ہو کر عالم رویا کی گہرائیوں میں سو گیا۔

علی الصباح اٹھتے ہی اس نے جلدی جلدی پوجا پاٹ سے فارغ ہو کر کپڑے بدلے۔ اور شانتا کو واپس لانے کی تیاری میں مصروف ہوگیا۔ ماں کو تعجب ہوا بولی۔" بیٹا موہن! کہاں کی تیاری ہے "

موہن نے لاپرواہی سے جواب دیا۔" میں اُسے لینے جا رہا ہوں "

ماں سمجھ گئی۔ پانسہ اُلٹ گیا۔ وہ کبھی نرمی سے او

کبھی غیظ و غضب میں آکر کہنے لگی۔ لیکن موہن اپنی دھن میں مست تھا۔ آج شانتا کی بھی محبت نے موہن کی سادہ لوحی کا خاتمہ کر دیا تھا۔ نوکر موٹر لے آیا۔ سوار ہونے ہی کو تھا۔ کہ اس کے سسر کا تار آیا۔ تار ہاتھ میں لیتے ہی موہن کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ پیشانی پر پسینہ آگیا۔ تار پڑھتے ہی چہرہ فق ہو گیا۔ سر چکرا اٹھا۔ اف وہ فوراً ظالم سماج کہکر فرش خاک پر گر پڑا۔

للیتا بھی سب کچھ سمجھ گئی۔ اس نے بھی درد آلود لہجہ میں ہائے بیٹی شانتا کہکر اپنا سر پیٹ لیا ✦

(حیات ترین)

# غزل

(حضرت شبیر صاحب)

طرح :۔ دونوں طرف سے دستِ تمنا دراز تھا۔

یہ کون میرے قلب میں جلوہ طراز تھا
صحرا کی وسعتوں میں درِ خلد باز تھا

پابوسئِ صنم سے مجھے روکنا نہ تھا
اے بے خبر یہ مشغلہ میری نماز تھا

بدنام ہوکے گردشِ افلاک رہ گئی!
گرچہ ترا کرشمہ یہ اے چشم ناز تھا

کل رات بزم ناز تھی تم تھے رقیب تھا!
پردے میں کوئی اور بھی بندہ نواز تھا

شیدِ وفا بتوں نے نہ کی تم سے عشق میں
ان پتھروں پہ آپکو بے سود ناز تھا!

(شبیر)

# سقراط اور اُس کا فلسفہ

(گذشتہ سے پیوستہ)

میرے خیال میں تم اس بات سے بھی آشنا ہوگے۔ کہ وہ کس مزاج کا آدمی تھا۔ اور کام کرنے میں کتنا سرگرم۔ ایکدفعہ وہ ڈلفی زیارت کو گیا۔ اس نے وہاں پہنچکر اتنی گستاخی کی کہ متکلم غائب سے سوال کیا: صاحب! مجھے معاف رکھنا۔ اور جو کچھ میں کہنے والا ہوں۔ اس میں رخنہ اندازی نہ کرنا۔ اس نے واقعی وہاں پہنچکر یہ سوال کیا۔ کہ کوئی شخص سقراط سے اس وقت زیادہ عقلمند ہے؟ جواب نفی میں ملا۔ ذرا غور کرنا۔ میں یہ دکھانے لگا ہوں کہ میری بدنامی کا باعث کیا ہوا؟"

اس واقعہ کا مفصل ذکر اس مضمون کے پہلے حصے میں کیا جا چکا ہے۔ سقراط سے مشہور مشہور آدمی محض عقلمندی کی حقیقت دریافت کرنے سے بدظن ہوئے۔ سقراط کی شہادت کا اصلی باعث بھی یہی تھا۔ اسی واقع کو سنکر ارسطفنی نے "سحاب" لکھا بس "سحاب" ( Cloud ) لکھنا تھا کہ تمام آدمی سقراط کے دشمن بن گئے۔ اور موقع کی تاک میں لگے رہے "میلتاس" نے یہ حالات ملاحظہ کرکے اپنے رفقا کے ساتھ ملکر دو اور الزام سقراط پر عاید کئے۔ اور اسے مجرم قرار دلوایا! ان دوسرے مدعیوں کے متعلق "اعتذار" میں سقراط کہتا ہے: (اا صـ۲۳)۔

پہلی قسم کے مدعیوں کے جواب میں یہی دلائل کافی ہیں اب میں میلی تس جو اپنے تئیں نیک نہاد اور محب الوطن کہلاتا ہے اور اسکے رفقا کے الزامات کا جواب دیتا ہوں۔ ان کا حلف نامہ جو تقریباً اسی قسم کا ہے۔ یہ ہے۔

"سقراط نوجوانوں کو گمراہ کرتا ہے۔ اور ان دیوتاؤں کی ہستیوں سے انکار کرتا ہے جنہیں اہل یونان مانتے ہیں۔ انکے عوض وہ کسی اور ہی دیوتا کی پرستش کرتا ہے"

سقراط اسکے اس بیان پر جرح کرتا ہے اور جلد ہی میلی تس کو لاجواب کردیتا ہے۔ سقراط اس بات پر زور دیتا ہے۔ کہ اگر وہ فی الواقع نوجوانوں کو گمراہ کرتا ہے تو کیوں نہیں وہ اب جبکہ جوان ہو چکے ہیں۔ اور اپنے برے بھلے میں تمیز کرسکتے ہیں عدالت میں آکر میلیتس کے بیان کی تصدیق کرتے؟ اور اگر وہ ایسا نہیں کرسکتے تو انکے رشتہ دار جنہیں یقیناً میں نے گمراہ نہیں کیا کیوں نہیں آتے؟ یہ صرف اس لئے کہ وہ جانتے ہیں۔ کہ میں دروغ گو نہیں۔ بلکہ میلیتس اور انی تس مجھ پر بہتان لگا رہے ہیں۔

سقراط کی اس تقریر کے بعد ووٹ لینے سے وہ مجرم قرار دیا جاتا ہے۔ "میلیتس" اسکی موت کے متعلق تقریر کرتا ہے اور اسکے بعد سقراط پھر کسی اور سزا تجویز کرنے کی حمایت میں تقریر کرتا ہے۔ (اعتذار حصہ دوم) یہ درست ہے۔ کہ اگر سقراط

فیدیا جلاوطن ہونا منظور کر لیتا۔ اور وہ بھی ایک خاص وقت تک جبکہ وہ فدیہ ادا کر سکتا۔ تو کسی شخص کو بھی کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ تمام حاضرین مطمئن ہو جاتے۔ لیکن سقراط نے ان دونوں باتوں ہی سے انکار کر دیا۔ کیونکہ اسکے نزدیک ایسا کرنا اقرار جرم پر مبنی ہے۔ آخر کار کہنے سننے پر وہ ایک منا (تقریباً ۴ پونڈ۔ اشلنگ اور ۲ پنس) جرمانہ ادا کرنے پر رضامند ہو جاتا ہے۔ اور دوستوں کے کہنے پر ایک منا سے تیس منا تک پہنچ جاتا ہے۔ اور اس رقم کے ادا کرنے کے لئے اس کے دوست ضامن ٹھہرتے ہیں۔ لیکن جج سقراط کے رویے سے ناراض ہو جاتے ہیں۔ اور سزائے موت ہی تجویز کرتے ہیں۔ اعتذار کا تیسرا حصہ اس کی اس تقریر پر مشتمل ہے جو اسنے اپنے ججوں کو مخاطب کرتے ہوئے کی (اعتذار: ۴۰)

"اگر موت ایک قسم کی گہری نیند ہے۔ تو میں کہونگا۔ یہ موت نہایت ہی مبارک ہے۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ اگر کوئی آدمی اس رات کا جس میں اس نے گہری نیند سو کر کوئی بھی خواب دیکھا ہو۔ اپنی گذشتہ زندگی کے تمام ایام اور تمام راتوں کا مقابلہ کرے۔ اور یہ دیکھے کہ ان ایام میں اس نے اس رات سے کتنے دن اچھے گذارے ہیں۔ تو وہ آدمی یہانتک کہ شاہ فارس بھی ایسے دن گنتی ہی کے پائیگا۔ اگر موت کی یہ حقیقت ہے تو میں اس موت کا متمنی ہوں۔ اور اگر موت اس دنیا سے دوسری دنیا میں جہاں تمام مردے موجود ہیں۔ جانے کا نام ہے تو یہ میرے لئے افضل ہے۔ یہ سفر میرے لئے سفر ثابت نہیں ہو سکتا۔...

"لیکن میرے منصفو! تم بھی اپنی موت کا خیال رکھو۔ اور اس بات کو خوب یاد رکھو۔ کہ صالح آدمی کو زندگی میں یا موت میں کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا۔ اور نہ ہی خدا اُسے فراموش کر سکتا ہے۔ جو کچھ مجھ پر پڑتی ہے۔ یہ محض اتفاق ہی نہیں بلکہ مجھے معلوم ہوتا ہے۔ کہ میرے لئے یہی مناسب تھا کہ موت پا کر تمام مصائب سے رہائی حاصل کروں.......

"لیکن اب ہمارے لئے روانگی کا وقت آگیا ہے۔ میرے لئے مرنے کا اور تمہارے لئے زندہ رہنے کا۔ ہم میں سے کون بہتر حالت میں جا رہا ہے؟ اسکا علم محض خدا ہی کو ہے۔ واللہ اعلم بالصواب"

یہ ہے "اعتذار" کا خاتمہ۔

"اعتذار" خواہ سقراط کی تقریر ہے۔ یا نہیں۔ ہم یہ ضرور کہیں گے۔ کہ اسکے پڑھنے سے سقراط کے اخلاق و اطوار کی صحیح صحیح تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ نیز اس میں سقراط کے دلی خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس سے سقراط کی زندگی کے آخری حالات ہی معلوم نہیں ہوتے بلکہ اس کی پہلی زندگی کے نہایت ضروری اور اہم حالات۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سقراط کی ذات کا اصل باعث کیا تھا اور سیاست دان اس سے کیوں ناراض تھے؟ جیل کے دوران اور موت کے وقت کے حالات ہمیں دوسرے مکالمات سے ملتے ہیں۔

سقراط کو فوراً ہی موت کے گھاٹ نہیں اتار دیا گیا تھا اسوقت "اپولو" دیوتا کا تہوار تھا۔ اور وہ جہاز جو یونانی ہر سال "ڈیلاس" بھیجا کرتے تھے۔ تجربہ سے صرف ایک دن پہلے روانہ ہو چکا تھا۔ یہ قانون تھا۔ کہ جب تک وہ مقدس جہاز ڈیلاس سے واپس نہ آجاتا تھا۔ شہر کو قتل و غارت سے محفوظ رکھا کرتے تھے۔ اکثر اوقات جہاز کے واپس آجانے میں ایک ماہ صرف ہوتی تھی۔ سقراط تقریباً ایک ماہ تک جیل میں رہا۔ اور وہاں بھی اپنے دوستوں کے ساتھ مکالمات میں مشغول رہا ان [illegible] میں سے بعض "تہیلاسن" کے دوسرے حصے [illegible]

جھکنے کے لئے کئے ہوئے تھے۔ جیل سے سقراط کا نکل بھاگنا۔ تو نہایت ہی آسانی سے ذریعہ ہو سکتا تھا۔ اور اس کے دوست ہر طرح کی مدد سے پہنچا سکتے تھے۔ لیکن ہم یہ پہلے دیکھ چکے ہیں کہ سقراط قانون کا سختی سے پابند تھا۔ اور وہ قانون کی خلاف ورزی کرنا کسی صورت میں بھی پسند نہ کرتا تھا۔ افلاطون نے فیڈو میں اس کے آخری لمحات کی تصویر کھینچی ہے (فیڈو۔ ۱۱۷):

پھر قریطو نے اپنے غلام کو اشارہ کیا۔ اور وہ باہر چلا گیا اور کچھ عرصہ بعد وہ ایک اور آدمی کے ساتھ واپس آیا جس کے ہاتھ میں زہر کا جام تھا۔ جب سقراط نے اُسے دیکھا۔ تو اس سے استفسار کیا: محترم! تم ان کاموں سے خوب واقف ہو مجھے اب کیا کرنا چاہیئے؟

اُسنے جواب دیا۔ بس تمہیں صرف اسکو نوش کرنا ہے۔ اور پھر چہل قدمی کرنی ہے۔ جب تمہاری ٹانگیں سست ہو جائیں تو لیٹ جانا۔ زہر خود بخود اثر کرے گا پھر اس نے وہ پیالہ سقراط کو دیا۔ جو اس نے نہایت خوشی سے قبول کیا ........

...... اور کہا۔ کہ مجھے اب خدا کے حضور دست بدعا ہونا چاہیئے۔ کہ وہ میرا خاتمہ بخیر کرے۔ اور میرے لئے یہ سفر مبارک کرے۔ آمین۔ بس یہی میری دعا ہے۔ یہ کہتے ہوئے اس نے زہر نہایت ہی خاموشی اور خندہ پیشانی سے نوش کیا۔ اس وقت تک تو ہم سب صبر کئے ہوئے تھے۔ لیکن جب ہم نے دیکھا۔ کہ وہ تمام جام ختم کر چکا ہے۔ تو ہماری صبر کی طاقت ہمیں جواب دے گئی۔ میرے آنسو باوجود میرے روکنے کے بے اختیار نکل پڑے۔ میں نے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ اور زار و قطار رونے لگا۔ یہ رونا اسکے لئے نہیں تھا۔ بلکہ اپنے لئے کیونکہ میں اپنے ایسے دوست سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے ہی قریطو اپنے آنسو نہ روک کر قریطو بھی روتا ہوا باہر جا چکا تھا۔ اور اپولوڈورس جس نے شروع ہی سے رونا بند نہیں کیا تھا۔ زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ اسکے رونے سے ہم سب ہی بے چین ہو گئے۔ سب کا غم آگے سے دگنا ہو گیا۔ لیکن سقراط پر اسکا کچھ اثر نہ ہوا۔ آخرکار ہم سے مخاطب ہوا۔ عزیزو! کیا کرتے ہو؟ میں نے عورت کو (اپنی بیوی) صرف اسلئے باہر بھجوا دیا تھا۔ کہ وہ اپنے رونے سے ہمیں بیتاب نہ کرے۔ کیونکہ میں نے سنا ہوا ہے۔ کہ سکون کی موت افضل ہوتی ہے۔ اس لئے تمہیں صبر کرنا چاہیئے۔ ہم یہ سنکر کچھ نادم سے ہوئے اور خاموش ہو گئے۔ وہ اٹھکر چلنے لگا۔ حتیٰ کہ اس نے کہا کہ اسکی ٹانگیں بوجھل سی معلوم ہو رہی ہیں۔ پھر وہ چت لیٹ گیا۔ جیسا کہ اسے کہا گیا تھا۔ جس آدمی نے اسے زہر دیا تھا۔ وہ بار بار اسکے پاؤں اور ٹانگوں کا معائنہ کر رہا تھا۔ پھر اس نے اسکے پاؤں کو زور سے دبا کر پوچھا کہ اس میں کچھ حس باقی ہے۔ سقراط نے نفی میں جواب دیا۔ پھر وہ ٹانگیں اور جسم کا باقی حصہ دبا کر پوچھنے لگا۔ ہمیں معلوم ہونے لگا کہ وہ سرد اور سخت ہوتا جا رہا ہے۔ سقراط خود بھی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے کہا کہ جب دل تک یہ حالت پہنچ جائیگی۔ تو میرا کام تمام ہو جائیگا اسکی حالت لحظہ بلحظہ گر رہی تھی۔ اور جب اس نے اپنے ڈھانپے ہوئے چہرے کو ننگا کیا۔ تو آخری بار قریطو کو مخاطب کیا: قریطو! میرے ذمے اسکلیپیوس کا ایک مرغ ہے۔ اسکو ادا کرنا بھول نہ جانا قریطو نے جواب دیا:- ایسا ہو جائیگا۔ لیکن تمہاری کوئی اور خواہش بھی ہے؟ اس کا جواب اس نے کچھ نہ دیا۔ تھوڑے وقفے کے بعد اسنے حرکت کی۔ آدمی نے اس سے کپڑا ہٹا لیا۔ معلوم ہوا۔ کہ اسکی آنکھیں گڑی ہوئی ہیں۔ قریطو نے اسکا منہ اور آنکھیں بند کر دیں "اے سقراط! یہ ہے ہمارے دوست کا خاتمہ۔ ایسے آدمی... [illegible] عقلمند اور منصف ترین انسان پایا تھا"۔ (ج-ع [illegible] ۱-۸)

# تمدّن

(جناب ڈاکٹر تصدق حسین خالد صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (لنڈن) ایف۔ آر۔ ایس۔ بار ایٹ لاء)

زندگی پیدا ہوئی
مسکراتی، شوخیاں کرتی ہوئی۔
زندگی،
ظلم، اپنی بربریت کے نشے میں چور،
ظلم
اٹھتا ہے استقبال کو۔
تو محبت ڈھونڈتا ہے اس ستم آباد میں؟
آہ! اس دنیا میں سب کچھ ہے مگر اک دل نہیں،
رنج محنت، عُسرتیں، رسوائیاں، ناداریاں
ناداریوں کی لعنتیں۔

---

عشرتیں، بیباکیاں، حرص و ہوا کی ذلتیں
جلب زر میں اقتصادی حیلہ سازی کے فریب
حکمتِ میکاولی۔ نسلی تکبّر، جوعِ ارض
سوزِ الفت کے دلِ انسان میں ہیں اب جانشیں
یہ تمدن ہے کہ جس پر آج ہم کو ناز ہے

(خالدؔ)

# ڈاکٹر آئن سٹائن

(از قلم میاں الطاف حسین صاحب شوکت بی۔اے)

البرٹ آئن سٹائن ۱۴ مارچ ۱۸۷۹ء کو جرمن کے شہر اُلم میں پیدا ہوا۔ وہ دنیا کے ممتاز سائنسدانوں میں سے ایک ہے۔ سائنس کی تاریخ میں تین یا چار نام ایسے ہیں، جو اس کے مقابلہ میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔ قدرت نے اسے خاص قوتِ تخیلہ عطا کی ہے۔ اس کا شاندار کارنامہ نظریۂ اضافیت سائنس میں ایک خاص اضافہ ہے۔

نظریہ اضافیت پر جو اعتراضات ہوئے وہ اسکی اصلیت کے دلچسپ شاہد ہیں۔ ان میں سے بعض کی بنا غلط فہمی تھی مگر بعض معترضین نے اسے برگشتہ دماغ کی اختراع سمجھ کر اسکے خلاف علم مخالفت بلند کیا۔ آئن سٹائن کے نیچرل طریقہ غور و پرداخت نے ان کو نہ صرف پریشان ہی کر دیا، بلکہ وہ جھنجلا بھی اُٹھے ہیں۔ ایک ماہر کا دلچسپ ثبوت مہیا ہوتا ہے کہ انسان کے خوابیدہ جوش کو بھڑکانے کے لئے صرف اخلاقی اور مذہبی باتیں ہی نہیں ہیں۔ ۱۹۲۲ء میں ماہرین طبیعت، ریاضی دانوں اور فلسفیوں کے ایک گروہ نے جرمن پریس میں ایک بیان شائع کیا "ہم ایسے نظریئے کو جو حد درجہ قابل اعتراض ہے اور بہت انتہائی حالت میں ہے، جرمن سائنس کی شان اور عظمت کے منافی سمجھتے ہیں ......" اس قسم کی مخالفت اب مفقود ہو چکی ہے اور تمام سائنسدان اس نظریہ کے [illegible] کر رہے ہیں۔

[illegible]

بن جاتا ہے۔ یہی حال آئن سٹائن کا تھا۔ وہ بچپن سے ہی خلوت پسند تھا اور سوسائٹی سے کان کتراتا تھا۔ سوسائٹی میں میل ملاپ رکھنا اُس نے بڑی مشکل سے سیکھا۔ بچپن میں اس کے والدین اس کی خلوت نشینی سے اس قدر گھبرائے کہ اسے خالی الذہن تصور کرنے لگے۔ مگر بعد میں انکو اپنا خیال ترک کرنا پڑا اور ان پر ظاہر ہو گیا کہ لڑکا حد سے زیادہ ذہین ہے۔ چھ سال کی عمر میں اسے میونک کے سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ وہاں بھی آئن سٹائن اپنے ہم جماعتوں سے الگ تھلگ تنہائی کی زندگی بسر کرتا تھا۔

انہی دنوں اس کا ایک ہم عمر چچازاد بھائی جینوا سے آیا۔ اس نے اسے اطالیہ کے دلکش مناظر، اس کی خوبصورت بندرگاہوں وغیرہ کے مفصل حالات سنائے نتیجہ یہ ہوا۔ کہ آئن سٹائن کے قدرت سے محبت کے خوابیدہ جذبات بیدار ہو گئے۔ قدرت کے ہر مظہر میں اسے خدا کی شان دکھائی دینے لگی اور وہ مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے لئے بیتاب ہو گیا۔ مگر اس کے باپ نے جو پکا یہودی تھا اور یہودی النسل ہونے پر فخر کیا کرتا تھا کوئی توجہ نہ کی۔ آئن سٹائن سخت مایوس ہو گیا اور خدا کی تعریف میں چھوٹی چھوٹی نظمیں لکھنے لگ گیا۔ ان نظموں کو خود ہی گایا کرتا تھا۔ اس طرح اسے موسیقی کا بھی شوق پیدا ہو گیا۔

ایک دو سال کے بعد اس کا شوق آرٹ کی طرف تبدیل ہوگیا، جو اسے قدرتی مناظر کی محبت سے کسی صورت میں کم دلچسپ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس کا آغاز گوئٹے کی کسی تصنیف پر ایک تقریر سے ہوا۔ جو اس نے سنی۔ نوجوان آئن سٹائن پر اس کا بہت اثر ہوا۔ اور اس کے دل میں اس استاد کی بیحد عزت پیدا ہوگئی جس نے اسے ان نئی دنیا سے روشناس کر دیا۔ بہت عرصہ کے بعد جبکہ وہ اضافیت پر پہلا پرچہ شائع کر چکا تھا۔ وہ اس بوڑھے آدمی سے ملنے گیا۔ مگر وہ آئن سٹائن کو بھول چکا تھا۔ اور اسکی ملاقات کی وجہ نہیں سمجھ سکتا تھا۔

اگرچہ آئن سٹائن قدرت، ادب، موسیقی اور آرٹ کا بیحد شائق تھا۔ مگر قدرت نے اسے ریاضی اور سائنس کے شوق کے لئے پیدا کیا تھا۔ جبکہ وہ بچہ ہی تھا اس نے مسئلہ فیثاغورث خود بخود حل کر لیا انہی دنوں علم ہندسہ کی ایک کتاب اسکے ہاتھ لگ گئی۔ اسے پاکر اسکا دل باغ باغ ہوگیا۔ سکول میں ابھی انہیں علم ہندسہ پڑھانا شروع نہیں کیا تھا مگر اس نے تمام سوالات حل کر دیئے۔ چودہ سال کی عمر میں اس کے استادوں اور ہم جماعتوں کو معلوم ہوگیا کہ وہ ریاضی میں ماہر ہے۔ بلکہ دوسرے مضامین میں بالکل کورا۔ اسی زمانہ میں اس کے مذہب سے متعلق خیالات میں شبہات پیدا ہونے شروع ہو گئے۔

جب اس کا خاندان میلان میں ہجرت کر گیا۔ تو کئی ماہ تک آئن سٹائن کو سکول نصیب نہ ہوا۔ ان حالات میں اطالیہ اسے بہشت معلوم ہوا۔ اس نے گھر پر کئی کتابوں کا مطالعہ کیا آرٹ کے عجائب گھر دیکھے اور لمبی لمبی سیریں کیں۔ انہی دنوں میں اس نے جرمن شہریت ترک کر دی اور اپنے آپ کو یہودی النسل ہونے سے انکار کر دیا۔ شہرت کا کبھی اس نے ارادہ نہ کیا۔ اور کامیابی کا کبھی اسے خیال تک نہ آیا۔ اس کا نصب العین تمام بندشوں سے مکمل آزادی تھا۔ مگر خاندان کی مالی حالت دن بدن گر رہی تھی اور کوئی کام کرنے کے لائق ہونے کے لئے اسے سکول کا کورس مکمل کرنا پڑا۔ اسلئے اسے سوئٹزرلینڈ بھیج دیا گیا۔ اور وہ زیورک اکیڈیمی میں داخل ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ داخلہ کے امتحان میں بری طرح سے ناکام رہا۔ مجبوراً اسے نچلے درجہ کی جماعت میں داخل ہونا پڑا۔ وہاں وہ ہر طرح سے خوش رہا۔ اور تمام عمر سوئٹزرلینڈ کے سکولوں کی تعریف کرتا رہا۔ ایک سال کے بعد اکیڈیمی میں داخل ہوگیا۔

آئن سٹائن میں ایک عجیب تبدیلی پیدا ہوگئی۔ اس نے کتب کا از حد مطالعہ کیا اور طبیعیات اور علم طبقات الارض کے تمام حقائق ازبر کر لئے۔ مشاہدات اور تجربات کو وہ کلید اصلیت مانتا تھا۔ اور ریاضی کے متعلق اسے وہم پیدا ہو گئے۔ کوئی شخص بھی اسے ریاضی لیکچر سننے کی ترغیب نہیں دلا سکتا تھا۔ مگر تین چار سال کے بعد اسے معلوم ہوگیا کہ وہ حقائق اسے "اصلیت" تک نہیں پہنچا سکتے۔ اس بات نے اسے تمام سائنس کے نظام سے بدظن کر دیا اور وہ فلسفہ کے مطالعہ میں مشغول ہوگیا اور تمام مشہور مشہور فلسفیوں کی کتابیں دیکھ ڈالیں۔

اس تمام عرصہ کے دوران میں وہ تنہا زندگی بسر کرتا رہا۔ اور موسیقی سے دل بہلایا کرتا تھا۔ اس کا گذارہ قلیل آمدنی پر تھا۔

اس کے باپ کی خواہش تھی کہ آئن سٹائن انجنیئرنگ میں نام پیدا کرے۔ مگر وہ اس محکمہ سے بیحد خائف تھا۔ اکیڈیمی سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد اس نے ٹیوشن کے اشتہاروں کا جواب دینا شروع کر دیا۔ مگر مایوسی سے دوچار ہونا پڑا۔ آخر ۱۹۰۱ء

جب وہ ۲۳ برس کا تھا۔ اُسے برن کے پیٹنٹ آفس میں ایک چھوٹی سی ملازمت مل گئی۔

آئن سٹائن کا خیال ہے کہ کسی صاحبِ فہم و ادراک کو تجارتی دنیا میں حصہ نہیں لینا چاہیئے مگر نوجوان سائنسدانوں کو "موچی" کا کام ضرور سیکھنا چاہیئے۔ وہ برن کے پیٹنٹ آفس میں نہایت شوق سے کام کرتا رہا اور وہیں اس نے نظریۂ اضافیت کو حل کیا۔

آئن سٹائن نے نظریہ کی بنا درست تجربات پر اسطرح قائم کی۔ کہ کیا وجہ ہے کہ نور کی رفتار خواہ وہ متحرک نظام سے ناپی جائے یا ساکن نظام سے، ایک ہی ہے۔ اسکا حل اسے "ہم وقتی" سوجھا۔

۱۹۰۵ء میں اس نے جو بیان شائع کیا اسے "خاص نظریۂ اضافیت" کہا جاتا ہے۔ اسکا لبِ لباب یہ تھا کہ اصول اضافیت تمام طبیعی مظاہر پر حاوی ہے اور نور کی رفتار بھی ہر ایک ناظر کے لئے معین مستقل ہے۔ جس کا صریح نتیجہ یہ ہے کہ طول اور وقت کا اندازہ اضافی ہے۔ اور مختلف ناظروں کی پیمائش کے مطابق مختلف ہے۔ اسکے علاوہ اس نے "نظریۂ قدر" پر بھی ایک بیان شائع کیا۔

دو سال پیشتر آئن سٹائن نے ایک ہم جماعت طالبہ سے شادی کر لی تھی۔ اور ۱۹۰۴ء میں اس کے ہاں پہلا لڑکا پیدا ہوا خانگی اخراجات بڑھ گئے۔ مگر آئن سٹائن پیٹنٹ آفس کے کام پر ہی قانع رہا۔ مگر ۱۹۰۹ء میں کوئی دوسرا کام کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اور زیورک یونیورسٹی میں پروفیسری کے عہدے پر مامور ہو گیا۔ پروفیسر بن کر وہ پہلے سے زیادہ مصروف رہنے لگا اور اکثر اپنی گذشتہ پُرامن زندگی کو یاد کرتا تھا۔

اب اس کی زندگی میں انقلاب آچکا تھا۔ سائنس کی دنیا میں اسے کافی شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ اور یورپ کے مختلف حصوں سے اسے تقاریر کے لئے دعوتیں موصول ہوئیں ۱۹۱۲ء میں پراگ یونیورسٹی میں پروفیسر بن کر چلا گیا۔ مگر تھوڑا عرصہ کے بعد ہی زیورک میں اعلےٰ پروفیسری پر واپس آگیا۔

اس کی شہرت نے اس کے پاس طلبا کا ایک گروہ جمع کر دیا۔ اس دور میں آئن سٹائن کو بیحد مصروف و منہمک رہنا پڑا پروفیسری وغیرہ کے فرائض کے علاوہ وہ نظریۂ اضافیت پر بہت وقت صرف کیا کرتا تھا۔

اب برلن یونیورسٹی کو بھی اس کی شہرت کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے اور اسے مکمل آزادی سے ریسرچ کیلئے بلایا گیا۔ آئن سٹائن نے اس دعوت کو قبول کر لیا اور ۱۹۱۴ء میں برلن چلا گیا۔ وہاں اسے ماہوار ہزار روپیہ سلطنت تنخواہ ملتی تھی اور اس کا کام صرف یہی تھا کہ گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر غور و تدبر کرتا رہے۔ ایک سال کے بعد اس نے نظریہ پر دوسرا بیان شائع کیا، جسے "وہ عام نظریۂ اضافیت" کہتے ہیں۔

خاص نظریۂ اضافیت میں بتایا گیا تھا کہ کلیاتِ قدرت ناظر کی حرکت پر منحصر نہیں ہیں۔ اس صورت میں کہ حرکت یکساں اور مستقیم ہو۔ سب نے مان لیا تھا کہ یہ بیان کلیاتِ علم الحیل کے لئے بے حد کار آمد ہے۔

مثال کے طور پر بند کھڑکی کی گاڑی میں ہم کسی عملی طریقہ سے بھی محسوس نہ کر سکیں گے، کہ گاڑی چل رہی ہے یا ساکن بشرطیکہ گاڑی یکساں مستقیم حرکت سے جا رہی ہو۔ اور دو گیندوں کا ٹکرانا، پتھروں کا ہوا میں ٹکرانا، کلاک کا ٹک ٹک کرنا اسی طرح وقوع پذیر ہوگا۔ جیسے اس حالت میں کہ گاڑی ساکن ہو۔

نظریۂ عام میں بتایا گیا کہ قدرتی مظاہر کے بیان کے لئے تمام مرتبی نظام یکساں ہیں خواہ انکی حرکت یکساں ہو، خواہ متغیر۔ نیوٹن کے کلیۂ تجاذب کے مطابق زمین اور چیزوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ مگر آئن سٹائن کے قیاس میں ایسی کوئی قوت موجود نہیں ہے۔ ناظر اور اس کے آلات مشاہدہ کی یکساں مستقیم حرکت کا کسی قسم کے طبیعی عمل یا کسی قسم کے تجربہ پر اثر نہیں پڑتا۔ ہم اجسام کی اضافی حرکت معلوم کر سکتے ہیں۔ مگر خارجی اجسام کے حوالہ کے بغیر کسی قسم کی یکساں حرکت معلوم نہیں ہو سکتی۔ اگر مرئی دنیا کی تمام چیزیں مل کر ایک معین سمت میں یکساں مستقیم حرکت کے ساتھ جا رہی ہوں۔ تو اس حرکت کا کبھی بھی احساس نہ ہوگا۔ خواہ وہ کیسی ہی تیز کیوں نہ ہو۔

اصول اضافیت یہ ہے کہ ہم اجسام کی باہمی حرکت کو جانتے ہیں۔ حرکتِ مطلق کے کچھ معنی نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ محسوس ہی نہیں ہو سکتی۔ کسی نظام مرتبی کے اندر خواہ کتنے ہی تجربات یا مشاہدے کیوں نہ کریں ہمیں یہ معلوم نہیں ہو سکتا ہے کہ نظام ساکن ہے یا متحرک۔ اصول استقلال رفتارِ نور یہ ہے کہ ہر ناظر کو نور کی رفتار معین مستقل معلوم ہوتی ہے۔ اور وہ رفتار فضا میں رفتار نور کے برابر ہے۔

ظاہراً نظریۂ خاص اور نظریۂ عام میں زمین و آسمان کا فرق دکھائی دیتا ہے۔ مگر دراصل بات ایک ہے اور آئن سٹائن کا استدلال انسانی دماغ کے معراجِ کمال کا نتیجہ ہے۔

۲۹ مئی ۱۹۱۹ء کو سورج کا کسوفِ کلی واقع ہوا۔ اور آئن سٹائن کے نظریہ کی ایک پیشینگوئی کہ جب کوئی ستارہ آفتاب کے قریب نظر آتا ہو، تو اسکی شعاعیں کسی قدر منحرف ہونی چاہئیں، کی صحت کی آزمائش کا موقع بہم پہنچا۔ اِس کسوف کا پتہ مارچ ہی میں لگ گیا تھا۔ اس لئے سائنسدانوں کی ایک جماعت تجربات کے لئے شمالی برازیل اور مغربی افریقہ میں پہنچ چکی تھی۔ تجربات صحیح ثابت ہونے کے بعد دنیا کے تمام اخباروں میں تہلکہ مچ گیا۔ آئن سٹائن اور اسکے نظریہ پر کتابیں لکھی گئیں اور آج تک لکھی جا رہی ہیں۔ مگر ابھی تک دنیا اس نظریہ سے کما حقہٗ واقف نہیں ہوئی۔

جنگ کے خاتمہ پر آئن سٹائن کو جو شہرت نصیب ہوئی بیان نہیں کی جا سکتی۔ اسے دعوتیں دی گئیں۔ پُرجوش استقبال ہوئے۔ تقاریر ہوئیں۔ ہزاروں لوگ ملاقات کو آئے۔ ہر وقت فوٹوگرافروں اور اخبارات کے نمائندوں کا تانتا بندھا رہا۔ ہزاروں خطوط ہر روز موصول ہوتے تھے۔ اگرچہ آئن سٹائن کو یہ تمام باتیں دل سے نہیں بھاتی تھیں، تاہم وہ ان کے خلاف بھی نہ تھا۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اس جیسے لوگ جنہیں بین الاقوامی شہرت نصیب ہو، آپس میں مخاصمت رکھنے والی اقوام کے درمیان سفیر بنکر پُرسکون اور خاطر خواہ حالات پیدا کر سکتے ہیں وہ پہلا جرمن سائنسدان تھا جو دشمن اقوام کے دارالخلافوں میں گیا۔ ہر جگہ اس کی ازحد عزت و توقیر کی گئی۔ آئن سٹائن امن اور بین الاقوامی اخلاص و ارتباط کا پرجوش مداح ہے۔

۱۹۱۹ء میں سرکردہ یہودیوں کا ایک گروہ تمام قوم کی رہنمائی کے لئے ایک مجلسِ یہود قائم کرنے کیلئے برلن کے ایک رستوران میں جمع ہوا۔ آئن سٹائن نے بھی اس مجلس میں خاموشی سے حصہ لیا، اور ان کے دلائل کو غور سے سُنا۔ اور متاثر ہوا اسکی بیگانگی دور ہو گئی اور اس پر اپنی قوم کی اصلیت کھل گئی اس کے بعد وہ اپنی قوم کی فلاح و بہبودی کے مسائل سوچنے لگا۔

آئن سٹائن کو سیر سیاحت کا بھی شوق ہے۔ یورپ کے علاوہ اس نے شمالی اور جنوبی امریکہ اور جاپان کی سیر بھی کی ہے۔ مشرق کا وہ بہت مداح ہے۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتا ہے:۔

"مشرقیوں کا بنظر غائر مطالعہ کرنے سے یورپین لوگ دماغ سے محو ہو جاتے ہیں"

زمانۂ حال کے سائنسدانوں میں آئن سٹائن کا پایہ سب سے بلند مانا جاتا ہے۔ اس کی شہرت کا باعث صرف سائنس ہی نہیں ہے بلکہ اس کی شخصیت، اُس کی انکساری و فروتنی اور اس کی راستبازی بھی جاذبِ توجہ ہے۔ اسے بے شمار خطوط ہر روز موصول ہوتے ہیں۔ جن میں اس سے صلاح و مشورہ طلب ہوتا ہے۔ کیونکہ ہزاروں لوگ اسے طبیعیات کے پروفیسر کے علاوہ بھی بہت کچھ سمجھتے ہیں۔ ان میں سے بعض خطوط بیہودہ ہوتے ہیں مگر بعض جگردوز، اور بعض دونوں۔ بعض خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے لکھنے والے آئن سٹائن کو پادری اور جادوگر بھی سمجھتے ہیں۔ اِس قسم کی باتوں سے شروع شروع میں آئن سٹائن بہت گھبرایا، مگر اب عادی ہو گیا ہے۔ اخبار نویسوں کے اِس قسم کے سوالات پر کہ وہ چائے غسل سے پہلے پیتا ہے یا بعد۔ محافظ استرہ کے مستقبل کے متعلق اسکا کیا خیال ہے۔ وغیرہ وغیرہ اب اسے تعجب نہیں ہوتا۔ اب اس کے خیالات میں دنیاوی علم کی موجودگی کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے۔

آئن سٹائن عزلت پسند، حلیم، منکسر المزاج اور قدرے ظرافت پسند ہے۔ نئے خیالات اور نئی تجاویز سننے کے لئے وہ ہر وقت تیار رہتا ہے۔ اور سائنس کے علاوہ دیگر علوم و فنون مثلاً علم تمدن علم المعیشت، ادب اور موسیقی میں بھی بحث چھیڑ دیتا ہے۔

ادبی ذوق میں وہ کافی راسخ العقیدہ ہے۔ شیکسپیئر کا بے حد مداح ہے۔ نئے ادب سے اسے شغف نہیں ہے۔ نیٹشے اور اس قسم کے دوسرے حکماء کو وہ پسند نہیں کرتا۔ مصوری سے اسے لگاؤ نہیں ہے۔ موسیقی کا دلی شوق رکھتا ہے۔ ستار بجانے میں ماہر ہے۔ اور ہر روز بلا ناغہ پیانو بجاتا ہے +

# اطلاع

جن قارئین کرام کی خدمت میں رسالہ محقق متواتر دو ماہ سے پہنچ رہا ہے۔ وہ اپنی خریداری اور عدم خریداری سے دفتر کو اطلاع بخشیں۔ ورنہ رضا مندی سمجھ کر آئندہ مہینے کا پرچہ ان کے نام وی۔پی۔ کر دیا جائے گا۔ جس کا وصول کرنا انکا اخلاقی اور ادبی فرض ہوگا۔

(مینجر)

# ہندوستان کی نمائندہ زبان

(از خامہ علامہ ارشد بہاولپوری)

اہالیانِ ہند کی انتہائی بدقسمتی سے آجکل ملک کے ہر ایک گوشہ میں "ہندوستانی زبان" کے متعلق اختلاف کا ایک بے پناہ طوفان اٹھا ہوا ہے۔ اور چونکہ ہندوستانی کائنات کی انسانی زندگی مختلف اور متنوع ہے۔ اور مادرِ ہند کی آغوش میں کوئی ایک مخصوص قوم تربیت نہیں پاتی۔ بلکہ ہندوستان تمام اقوام عالم کا مرقع اور "معجونِ مرکب" ہے۔ اس لئے اس نوعیت کے اختلافات کا پیدا ہونا عین قرینِ قیاس وامکان ہے۔ اربابِ بصیرت کی نگاہ عرش تاز نے حالات کی تیز رفتاری کا جائزہ لیتے ہوئے متفقہ طور پر یہ حکم صادر کیا کہ ہندوستان کی دفتری۔ تمدنی اور معاشرتی زبان ایک ہی ہونی چاہیئے۔ اور اب نظریہ قطعاً وحتماً ہندوستانیوں کی علمی بدحالیوں اور اقتصادی پسماندگیوں کے ازالہ کے لئے مفید ترین نظریہ تھا۔ نیز ہند کی تمدنی ضروریات کے حسب اقتضاء مرتب کردہ لائحۂ العمل تھا۔ اور یہ ایک بے نقاب حقیقت ہے کہ ایک ملک مختلف زبانوں کی نمایندگی قبول نہیں کرسکتا۔ سو اس وقت ہم نے واقعات کے پیش نظر ہندوستان کی نمایندہ زبان کے متعلق عرض کرنا ہے۔

اگر انصاف پسند، منصف مزاج دماغ اپنی مذہبی و ذاتی کاوشوں سے پاک ہو کر ہندوستان کی مروجہ زبانوں کے ارتقائی ماحول کا [illegible] نتیجہ ظاہر ہوگا کہ تعلیم، تنظیم، ترکیب، ترویج، اصلاح، پسندیدگی، خوش بیانی، فصاحت اور بلاغت کی رُو سے صرف اردو ہی ایسی زبان ہے۔ جو مادرِ ہند کی نمایندہ زبان کہلانیکا حق رکھتی ہے۔

بعض عاقبت ناشناس۔ انصاف ناپسند حضرات کے شبانہ روز مساعی اس لئے وقف ہوچکے ہیں کہ ہندوستان کی نمائندہ زبان ہندوستانی نہیں۔ ہندی ہے۔ ان حقائق سے بے نیاز ہو کر فتوے دینے والوں کے پاس تعصب کے بغیر کوئی دلیل موجود نہیں۔ یہ ایک ایسا ناقابل سماع دعوٰے ہے جس کو دلائل کا زور حاصل نہیں۔

ظاہر ہے کہ انکی یہ کوشش دلدادگان علم وادبیت پرست قلوب کے احساسات وجذبات کو مجروح تو کرسکتی ہے مگر ثمر مندہ نتائج نہیں ہوسکتی۔ یہ سعی، سعیِ لاحاصل کے عنوان سے معنون ہوگی۔ اس لئے کہ زبان کی نمایندگی بلند بانگ بے حقیقت دعاوی سے ثابت نہیں ہوتی بلکہ صدہا سال کی فضا کا رائج مہذب تہذیب، شائستگی، جاذبیت ومقبولیت کے زاویۂ نگاہ سے نمایندگی کی سند حاصل کرلی ہے۔ اور یہ دعوٰے ٹھیک اُسیطرح مہمل اور ناقابل قبول ہے۔ جس طرح آج کوئی معروف الدماغ انسان یہ کہدے کہ چونکہ شاہان مغلیہ کے دوران تعنداری فارسی زبان رائج تھی اور تمام دفاتر قدیم کی موجودہ زبان اصلاً یہی

حیوہ ہے اس لئے ہندوستان کی لسانی نمائندگی کا حق فارسی کو حاصل ہے۔ کیا ایسے ہمل دعاوی اپنے اندر کوئی معقولیت آشنا مفہوم رکھتے ہیں؟ کیا کسی کا ادبیت شناس طبع ایسے اقوال سے مطمئن ہو سکتا ہے؟

سرزمینِ ہند کے بلند پرواز شاعروں اور مایۂ ناز ادیبوں کے صدہا سال کے مسلسل متواتر مساعی اور ان تھک کوششوں کے بعد آج ہندوستانی زبان اردو کو یہ شستگی اور مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ غالبؔ و ذوقؔ، سوداؔ و میرؔ، داغؔ و ظفرؔ، اور حالیؔ کا سرمایہ حیات اور تمام زندگی کا اندوختہ اس ادبی خدمت کے سوا اور کیا ہے۔ متقدمین پر ہی کیا بس ہے۔ ہندوستان کے موجودہ شعراء و ادباء کی دماغی کاوش کا نتیجہ اس کے بغیر اور کیا ہے۔ اردو زبان کو ناز ہے کہ اسکے اندر اقبالؔ و حسرتؔ موہانی جیسے نظم نویس، ابوالکلام و نیکش، حسرتؔ و سالکؔ جیسے نثر فکاہیہ نگار انسان پیدا ہوئے۔ کیا کوئی دوسری زبان ایسی نمائندگی کی سند پیش کر سکتی ہے، کیا آج ہندوستان کی کسی اور زبان کو وہ عروج حاصل ہے جو ابوالکلام۔ اور اقبالؔ کی اردو کو میسر آیا؟ یہ اردو کی بہت بڑی کرامت ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ قدرت کی تمام تائیدیں اس کو حاصل ہیں۔ کہ ہندوستانی غیر ملکی اقتدار کے باوجود یہ زبان خوب روز بلکہ ہر آن ہر گھڑی ترقی کر رہی ہے۔ شاہان مغلیہ کے پر شکوہ دورِ حکومت اور دفتری زبان ہونیکے باوجود فارسی زبان کی خدمت کیلئے اس قدر دماغ سرگرم نہ ہوئے جو اردو کی تربیت کیلئے وقف ہو چکے ہیں۔

اتنا بتا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ شخصیت جو ہمارے نزدیک بہت بلند خیال کی جاتی ہے اور جس کا نام سن کر ہم لطف اندوز ہوتے اور اسکی فراخدلی اور ایثار و حسنِ تنظیم کا گیت الاپتے ہیں۔ میری مراد پنڈت جواہر لال نہرو سے ہے وہ بھی تصریح کر رہا ہے کہ ہندوستان کی عام فہم، مروج اور نمائندہ زبان اردو ہی ہے۔ چنانچہ اُس نے گذشتہ کنونشن منعقدہ دہلی میں اپنا خطبہ دیتے ہوئے کہا کہ میں نہایت خوش ہوں کہ آج ہندوستان کی عام فہم زبان اردو میں لکچر دے رہا ہوں کانگریس کے اس بلند قدر بلند خیال صدر نے نہایت ہی بیباکی سے حق کی آواز کو بلند کیا۔ اور تصریح فرما دی کہ اردو کے بغیر عام فہمی اور نمائندگی کا حق دوسری زبان کو حاصل نہیں ہم صاحب ممدوح کے بے لوث تبصرہ پر تحسین آفرین کئے بغیر نہیں رہ سکتے صاحب ممدوح نے نہ صرف اردو کی شان بڑھائی بلکہ اپنی منصف مزاجی اور حقیقت شناسی کا ثبوت دیا۔

اگر توازن و تناسب کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ ایک بیش پا افتادہ حقیقت ہے کہ ہندوستان کی موجودہ آبادی میں بمشکل پانچ فیصدی انسان ایسے ملینگے جو ہندی زبان کے ماہر کہلانیکا حق رکھتے ہوں۔ ہندوستان کی دوسری زبانیں بھی تعداد کے لحاظ سے اردو کی نسبت بہت کم بولی جاتی ہیں تیلگی۔ مرہٹی وغیرہ سب کا حلقہ محدود ہے۔ مگر اردو تمام ہندوستان میں مروج ہے۔

ہمیں کسی خاص مذہب کی مدارات مقصود نہیں بلکہ لاتبصرہ منظور نہیں اگر آج بھی کوئی ایسا رنگین "انقلاب" پیدا ہو جائے کہ اسکی جگہ ہندی یا کوئی اور زبان لے لے۔ اس کے بولنے والوں کی تعداد اردو سے بڑھ جائے اور اس میں وہی جو شگی شستگی، تہذیب، تدوین، ارتقا، بندش، اور صلاحیت حاصل ہو جائے جو آج اردو کو میسر ہے تو یقیناً سب سے

پہلے ہماری آواز بلند ہوگی کہ ہندوستان کی نمائندہ زبان ہندی ہے۔ مگر ایسا ہونا چند لمحات کا کھیل نہیں بلکہ صدہا سال کی مدت کا رہینِ منت ہے۔ زبان کے پودے کی آبیاری جنبشِ قلم پر موقوف نہیں بلکہ یہاں بہت بڑی عرق ریزی، محنت، جانفشانی جفاکشی اور دماغی کاوش کی ضرورت ہے۔

ایک اور قابلِ توجہ پہلو:-

آج تک یہ زبان ترقی کرتی چلی آئی اور صحافتی دنیا شاہد ہے کہ اس زبان کو کس قدر عالمگیر شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ مگر آج ہم دیکھتے ہیں کہ خاص نوجوانوں کے قلب و دماغ ادبیت پرستی کے ذوق سے بے نیاز ہو گئے۔ ہمیں ہر آن یہ خطرہ ہے کہ جو دنیا اور سہل نگاری کے اس بہک سیر مذہب گیر سیلاب سے شبلی کی دلفریب و دیدہ زیب عمارت کو ٹھیس نہ لگے۔ علم نواز حضرات بہت بڑی مستعدی اور امکانی جلدی سے اس کی طرف توجہ کریں اور ادبا و شعراء کی محنت کو ٹھکانے لگائیں۔ تاکہ سودا و میر، غالب و ذوق۔ داغ و ظفر کے ارواح جلیلہ ادبی دنیا کے اِن مساعی سے مسرور و مبتہج ہوں۔

محمد رحمۃ اللہ ارشد "علامہ"

# بلا وجہ عداوت

(جناب طالب جعفری صاحب)

ٹن ٹن ٹن ........ ادہر گیارہ بج گئے۔ مگر مجھے ابھی تک نیند نہیں آتی بلستر پہ کروٹیں لیتے لیتے چاند کہاں سے کہاں آگیا۔ گویا ہر تار بستر خار بستر ہے۔ میں عاشق نہیں حبیب نہیں رقیب نہیں۔ صاحب پھر نیند نہ آنے کا سبب کیا بتاؤں بس ہی پرانی بلا وجہ عداوت جو حضرتِ مچھر اور اولاد آدم میں ابتدا سے چلی آتی ہے مشہور ہے کہ باوا آدم گندم کھانے کی پاداش میں خلد سے جلاوطن کر دیئے گئے جس کی سزا حضرت آدم کے علاوہ تمام بنی آدم کو بھی بھگتنی پڑی۔ ورنہ ما بدولت بھی آج جنت کے باشندے ہوتے تاہم ایک وجہ ٹھہری کہ کیوں اولادِ آدم کو اس دار المحن کا منہ دیکھنا پڑا۔ گویا ہر علت کا ایک معلول ہوتا ہے۔ بنی آدم اور مچھر کی عداوت کے متعلق جہاں تک کہ تاریخ عالم شاہد ہے۔ کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ بلکہ کبھی کوئی بناوٹی واقعہ یا قصہ تک بھی سننے میں نہیں آیا۔ جس سے یہ استنباط کیا جا سکے کہ فلاں بات فلاں نے حضرتِ مچھر کی مرضیٔ مبارک کے خلاف کی تھی جس کی وجہ سے یہ دشمنی نسلاً بعد نسل چلی آتی ہے۔ زمانۂ جاہلیت کے عربوں کی عداوت ضرب المثل ہے۔ لیکن اگر نظر تعمق سے دیکھا جائے تو ظاہر ہوگا۔ کہ اس بلا وجہ عداوت نے اس ریکارڈ کو بھی مات کر دیا ہے۔

میرے قریب ہی ان کی ایک زبردست چھاؤنی (جوہڑ) موجود ہے۔ اس لئے یہ ہر وقت ہر لمحہ ہر لحظہ جب بھی چاہیں بلا حیل و حجت مجھ پر حملہ کر سکتے ہیں۔ حملہ کرنے سے پہلے باقاعدہ اعلان جنگ کیا جاتا ہے۔ للکارا جاتا ہے۔ پکارا جاتا ہے چنانچہ ذوق فرماتے ہیں ؎

پشے سے سیکھے شیوۂ مردانگی کوئی
جب قصدِ خوں کو آئے تو پہلے پکار دے

جس طرح مسولینی کا سرِ رعونت مدبرانِ عالم۔ شاہانِ عالم۔ بلکہ لیگ آف نیشن کے متعلقہ کا ریزولیوشن پاس ہو جانے پر بھی نہیں جھکا۔ اسیطرح حضرتِ مچھر بھی دنیا بھر کی حکومتوں ہر ملک کے ہر محکمے کے سرکاری و غیر سرکاری افسران سقراط بلکہ تمام بنی آدم سے ذرا بھی خوف نہیں کھاتے آخر آپ خوف بھی کیوں کھانے لگے۔ نمرود جیسے زبردست بادشاہ (جس نے خدائی کا دعوے کیا تھا) کو آپ ہی نے راہِ عدم دکھائی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے حوصلے حد سے زیادہ بڑھے ہوئے ہیں۔ وہ تو بیچارے حبشہ والے ہی تھے جو مسولینی کے حملہ کی تاب نہ لا کر مغلوب ہو گئے۔ اگر مسولینی کو اس ننھی سی جان سے واسطہ پڑتا۔ تو چھٹی کا دودھ یاد آجاتا اور مراجعت کرتے ہی بن پڑتی۔

اہلِ عالم کو درسِ تہذیب دینے والو! ظالم مچھر کو لکھا پڑھا کر زیورِ تعلیم و تہذیب سے آراستہ کر کے سوسائٹی کے لئے

---

ہڈ ماشر ایف۔ ایل۔ ہیرن کمشنر دیہات سعار۔

مفید بناؤ۔

قومی معیار کو بلند کرنے والی مجلسوں کے کارکنو! قوم کے افراد کو ان کی پورش سے بچاؤ۔ اسے سمجھاؤ بجھاؤ اور سیدھی راہ پہ آنے کے لئے مجبور کرو۔

ادب اور اخلاق کے علمبردارو! ذرا اسے بھی مؤدب اور بااخلاق بناؤ۔ بنی آدم کی ایسی محبوب ترین مخلوق کو ستانا۔ تباہ و برباد کرنا تعزیرات اخلاق کی کونسی دفعہ کے مطابق جائز ہے۔

مذاہب عالم کے رہنماؤ! دنیا کو نجات دلانے کے اجارہ دارو! اشحق منی جان معصوموں، بچوں جوانوں اور بوڑھوں تک کا ناک میں دم کئے ہوئے ہے۔ کیا اس معاملہ میں تمہارے فتوے اور خداوندی فرمان بے کار محض ہیں۔ اگر واقعی ایسا ہے تو تمہیں جلد از جلد دربار عالی سے اسی مطلب کا ایک جامع و مانع قانون پاس کرا کے رائج کرنا چاہیئے۔ یا اللہ جل شانہٗ سے خاص حکم لے کر گزٹ کرانا چاہیئے۔ ورنہ وہ دن دور نہیں۔ کہ جب سیر مولا کا آباد کیا ہوا جہاں تہ و بالا ہو کر رہ جائیگا۔ ریڈ کراس سوسائٹی و ایمبولینس سوسائٹی کے ممبرو! میں تسلیم کرتا ہوں کہ آپ تمام ممبر ایک ہی نظام کے ماتحت ہیں۔ دنیا بھر کے امیر غریب حاکم محکوم تاجر ملازم مزدور زمیندار غرضیکہ ہر طبقہ اور فرقہ کے لوگ تمہاری مدد کر رہے ہیں۔ اور کرنے کو تیار ہیں۔ تمہاری کوششیں قابلِ ستائش تو ضرور ہیں لیکن جن نتائج کی توقع آپ سے فی الواقع ہے۔ ان سے آپ ہنوز کافی دور ہیں نئے جوش نئے ولولے اور نئی تڑپ سے مسلح ہو کر کمرِ ہمت باندھ لو۔ پورے زور شور سے حضرت مچھر کا مقابلہ کرو اور اس کے لغو پانہ پروگرام کو ملیا میٹ کر دو۔

سکاؤٹنگ کے ماہرو! تجربہ اس بات کا شاہد ہے۔ کہ تمہاری تحریک اس وقت تک تشنۂ مقصود رہیگی جب تک کہ تم یہ نظام ہر ننھی مخلوق میں پیدا نہ کرو گے۔ انہیں بھی سکاؤٹ اور کارکن بناؤ عملی طور پر بنی نوع انسان سے ہمدردی کرنے کی ٹریننگ کے کیمپ مقرر کرو۔ تاکہ یہ بھی جانداروں کو ستانا اخلاقی شرعی اور قانونی جرم خیال کریں۔ تاکہ ہم ان کے مظالم سے بے فکر ہو کر طمانیت کا سانس لے سکیں۔

سائنس کے کرشمہ سازو! تم نے کلوں اور بجلی کی مدد سے وہ وہ کرشمے دکھائے کہ ساکنانِ عالمِ بالا بھی انگشت بدنداں ہیں چنانچہ تذکرہ "تمہاں راچہ بیاں" کے مقولے کو غلط ثابت کرنے کے مترادف ہے۔ لیکن تحقیق اگر آپ سے نہ ہو سکا تو صرف جناب حضور قبلہ مچھر صاحب کا معقول علاج یا شاید آپکو ایسا اہم مسئلہ ابھی تک سوجھا ہی نہیں۔ نہیں نہیں ہرگز نہیں۔ ایسا مسئلہ ہرگز نظر انداز نہیں ہو سکتا آپ کی بے وقعتی عاجزی و درماندگی روز روشن کی طرح عیاں ہے۔

ملک و قوم کے محافظو! تم کس بات کے محافظ ہو۔ جو خود اپنی حفاظت بھی نہیں کر سکتے وہ دوسروں کی حفاظت کیا کرینگے۔ بتاؤ تو بھلا تم میں سے کتنوں کو یہ دعوٰے ہے کہ ہمیں امسال ملیریا نہیں ہوگا۔ بھائی کس برتے پہ تتا پانی اس سوال کا جواب دیتے ہی قلعی کھل گئی ع

او خویشتن گم است کرا رہبری کند

زبانی جمع خرچ کرنے سے سوائے سرداری کے کچھ حاصل نہیں اگر محافظ بننے کا ایسا ہی شوق ہے تو کسی مچھر دانی اور کونین سے مسلح ہو کر مچھروں کی تمام چھاؤنیوں (جوہڑوں) پر حملہ بول دو۔ مچھر دانی اور کونین سے اپنی حفاظت کرو۔ اور کیتی سے تمام جوہڑ پر کر کے مچھر کا زندہ رہنا محال کر دو۔ دشمن کی تباہی اور اپنی حفاظت

یہ ظاہر ہے کہ دو ان سوالات اس مختصر سے مختصر پیراگراف میں یہ بھی دیکھیں گیا
ہوں کہ تم حقیقی محافظ بننے کی کوشش کرو گے؟

اے عظمت خلق کے دعوے دارو! تمہیں تو ڈرنا چاہیے ضرور
ہوتی ہوگی کیونکہ یہ تمہارے لئے خدمت کے مواقع پیدا کرتا ہے
جہاں کہیں غریب نادار مفلس ملیریا کا شکار رہا تم نے ناموری کے
شوق میں یا اخلاقی فرض کے احساس سے اس کو سہارا دینے کی
کوشش کی۔ گویا تم اس بات کے منتظر رہتے ہو کہ کب کوئی بیمار
ہو لیکن یاد رکھو کسی کی بیماری میں مدد کرنا اتنا قابلِ تعریف نہیں
جتنا کہ اسے بیمار ہونے سے بچانا۔ رتی بھر حفظ ماتقدم من بھر
علاج سے بہتر ہوتا ہے۔

سلطنتوں کے جانباز سپاہیو! مجھے سب سے زیادہ شکایت
سب سے زیادہ گلہ تم پر ہے۔ جہاں کہیں کسی باغی نے سر بغاوت
بلند کیا تم نے اُسے جھاگ کی طرح بٹھا کر ہی دم لیا۔ خفیہ سازشوں
کا رازِ طشت از بام کرنا اور انکا قلع قمع کرنا تمہارے بائیں ہاتھ کا
کام ہے۔ خود سروں کو کیفر کردار تک پہنچانا تمہارا معمول۔ مفسدہ
پردازوں سرکشوں اور غداروں کو راہِ راست پر لانا تمہارا فرض منصبی
اور ظالموں کی بیخ کنی کرنا تمہارا مقدس مذہب ہے۔ نہ معلوم پھر
آپ مچھر جیسی سرکش خود سر ظالم موذی اور بداندیش مخلوق سے
.... اس قدر بے اعتنا کیوں ہیں؟

میں انہی خیالات میں غرق تھا کہ ایک مچھر نے کان کے
قریب آکر مبارزت کا چیلنج دیتے ہوئے اس زور سے کانا کہ میں
تلملا ہی تو گیا۔ اور آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ سے ایک دھپڑ اس زور
سے رسید کیا کہ میرا کان اور کان کے قریب کا حصہ گال درد
کرنے لگا۔ اور مچھر صاحب معاً دوسرے کان کو اپنے دلخراش
اور جگر دوز نغمہ سننے کی دعوت دینے لگے۔ تنگ آکر میں نے
اپنے دوسرے رفیق کو جو میرے ساتھ والی چارپائی پر سویا ہوا تھا۔
ماسٹر جی کہکر بلایا۔

"جی"

"ماسٹر جی! آج تو ظالم مچھروں نے ناک میں دم کر رکھا ہے"

"تو پھر تھانے میں اطلاع دو رپٹ لکھواؤ منشی اور تھانیدار
صاحب امید ہے کہ تمہاری دادرسی کرنے کے لئے تفتیش کرکے
مجرم کی گوشمالی کرنے میں ہرگز توقف نہ کریں گے"

"ماسٹر جی! آپ کو تو ہر وقت مذاق ہی سوجھتا ہے۔ بیوقت
کی یہ راگنی اچھی نہیں۔ آپ نے میرے دل پر مرہم رکھنے کی
بجائے نمک پاشی کی جو انسانیت کے سراسر خلاف ہے"

"بھئی ہم دیہاتیوں کے ملجا و ماویٰ یہ سرخ پگڑی والے
ہی تو ہیں۔ ہماری تکالیف انہی کی طفیل دور ہو سکتی ہیں"

"خیر تو اس بحث کو ختم کیجئے۔ اور مجھے کوئی راہ نجات
بتائیے"

"بس بس"

"یہ لیں دیا سلائی چوتھی جماعت والے کمرے
کی الماری کے نچلے خانے میں صابن دانی کے پاس سرسوں کے
تیل والی شیشی پڑی ہے۔ اُس میں مٹی کا تیل ملا کر اپنے جسم
پر مالش کرکے سو جائیے۔ مچھر نزدیک تک نہیں آئیں گے جب
آپ حقے کے لئے آگ سلگا رہے تھے۔ میں نے بھی یہی
دونوں تیل ملا کر مالش کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ میں چین سے
سوتا رہا اور آپ خواہ مخواہ بیزار رہے"

(طالب جعفری)

# سوالات

س۔ ہولڈر (جاداتی) پہلے پہل کس نے تیار کیا؟ (م۔ع۔ل) سیالکوٹ۔

ج۔ برمنگھم کے رہنے والے مسٹر ہاریزن نے ۱۸۷۵ء میں پہلے پہل ہاتھ سے تیار کیا۔ مگر آجکل مشینوں سے کام لیا جاتا ہے۔ دنیا کی سب سے بڑی ہولڈر فیکٹری برمنگھم میں ہی ہے۔ جہاں ایک دن میں ۵ لاکھ ہولڈر تیار ہوتے ہیں۔ اور یہاں کے ہولڈر پختہ اور مضبوط ہوتے ہیں۔ جو ہر ملک کو بھیجے جاتے ہیں۔ لوہا عام طور پر شیفلڈ سے (SHFFFIELD) آتا ہے۔ اور تین ٹن سے زیادہ لوہا روزانہ خرچ ہو جاتا ہے۔

س۔ سونے کے کمرہ میں روشندان کیوں ضروری خیال کئے جاتے ہیں؟ (ش۔ر۔ب) سرگودھا۔

ج۔ روشندان اسلئے ضروری ہیں کہ کمرہ کی غلیظ ہوا خارج ہوتی رہے۔ اور اس کی جگہ تازہ اور صاف ہوا کمرہ میں داخل ہو۔ جس پر ہماری صحت کا دارو مدار ہے۔ جب ہم رات کو سوتے ہیں تو ہمارے منہ سے گرم ہوا خارج ہوتی ہے جسمیں کاربانک ایسڈ گیس ملی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ ہوا گرم ہونے کی وجہ سے چھت کیطرف چڑھتی ہے۔ اور روشندان کے ذریعے باہر چلی جاتی ہے۔ اس کی جگہ ٹھنڈی اور تازہ ہوا باہر سے آتی ہے۔ جس سے ہماری صحت قائم رہتی ہے۔ اگر روشندان نہ ہوں تو گرم ہوا کمرے سے خارج نہیں ہوسکیگی۔ اور آخر ہماری طبیعت پر بہت برا اثر ڈالے گی۔

س۔ سڑکوں کا موجد کون تھا؟ (ح۔م۔ا) دہلی۔

ج۔ کہا جاتا ہے کہ کارتھگینین (CARTHAGINIONS) نے پہلے پہل سڑک بنوائی لیکن جب کبھی مصر میں مینار (PYRAMID) بنے تھے تو اسوقت بھاری بھاری پتھر لانے کے لئے سڑک تیار کی گئی تھی۔ مگر رومن نے بہت پہلے اس کام کو شروع کیا۔ جن کے نشانات آج تک بھی کہیں کہیں پائے جاتے ہیں۔ رومن کی سب سے بڑی سڑک اپیس کلاڈیس (APPIUS CLADIUS) نے ۳۱۲ ق۔م۔ میں بنوائی جو اپیین وے (APPIAN WAY) کہلاتی ہے اب تک بھی اسکے نشانات پائے جاتے ہیں۔ رومن کی تمام سڑکیں بہت مضبوط ہیں۔ جو پتھر سے بنائی گئی ہیں۔ جب رومن نے برطانیہ (BRITIAN) کو چھوڑا تو انہوں نے باشندگان برطانیہ کے کسی ایک باشندے کو بھی یہ فن نہ سکھایا۔ رومن سڑکیں جو وہاں بنی ہوئی تھیں۔ اس قدر مضبوط تھیں کہ ۱۲۰۰ سال انکی مرمت نہ ہوئی +

# بچوں کی دنیا

## شنگھائی کی کہانی

میں امریکہ سے ہندوستان واپس آرہا تھا۔ راستے میں ہمارا جہاز بندرگاہ شنگھائی میں لنگرانداز ہوا۔ شنگھائی چین میں بحر اٹلانٹک کے کنارے پر واقعہ ہے۔ اور انگریزی مقبوضات میں شامل۔ یہاں کا شہر بڑی دلچسپ بستی ہے۔ ایک شہر ہے اور کئی قوموں کے قبضہ میں۔ اس کے کئی حصّے ہیں۔ ایک پر چین کا قبضہ ہے۔ ایک پر انگلستان کا۔ ایک پر جاپان کا۔ ہر حصے کی اپنی پولیس اور اپنے مجسٹریٹ ہیں۔ اگر ایک بستی کا مجرم دوسری بستی میں چلا جائے۔ تو اسکو نہ ہی گرفتار کیا جا سکتا ہے۔ نہ ہی اسکے خلاف مقدمہ چلایا جا سکتا ہے جبتک کہ وہاں کی گورنمنٹ اور پولیس اجازت نہ دے۔ میں نے شنگھائی میں فریب دہی کی نت نئی واردات کے سینکڑوں واقعہ سن رکھے تھے۔ اس لئے میرا ارادہ تھا کہ میں انگریزی بستی کے سوا اور کہیں قدم نہ رکھوں گا۔

میرے ایک رفیق سفر بھی تھے۔ جنکو نئے نئے تجربات حاصل کرنے کا بے اندازہ شوق تھا۔ انہوں نے مجھے اپنے ساتھ لیجانے پر بہت اصرار کیا۔ کہ چلو میاں تم نے دنیا کا کچھ نہ دیکھا تو کیا زندگی ہوئی۔ شنگھائی جیسا دلچسپ مقام اور چینیوں کی بستی یہاں عجیب عجیب کرشمے روزانہ نظر آتے ہیں۔ میرے دل میں شوق تو ضرور تھا۔ مگر ضمیر پر کچھ ایسا ڈر چھایا ہوا تھا کہ طبیعت نے نہ مانا مگر انکے جانے کے بعد میں بھی چھڑی ہاتھ میں لے کر جہاز سے نکلا تھوڑی دیر تو انگریزی بستی

کے بازاروں میں گھومتا رہا۔ کوئی عجیب بات واقع نہ ہوئی۔ اپنے دوست کے خیالات میرے ذہن میں موجود تھے۔ وہ بڑھتے بڑھتے اسقدر میرے دماغ پر چھا گئے کہ ایک نہ معلوم قوت مجھے چینی بستی میں کھینچ کر لے گئی۔

اب میں وہاں کے سب سے بڑے اور صاف ستھرے بازار میں سے گذر رہا تھا۔ میں کیوریو ڈیلرز (curio bealers) کی ایک دکان پر ٹھیرا۔ جس میں پتھر کے تراشیدہ مختلف سائز کے بہت سے مجسمے نہایت خوبصورتی سے سجائے ہوئے تھے۔ اور بھی کئی قسم کے عجائبات موجود تھے اور نقادانہ نظر سے ان کو دیکھنے لگا۔ دکاندار نے مجھے اندر بلا لیا۔ اب میں اندر جا کر ایک ایک مجسمے کو غور سے دیکھنے لگا۔ ان عجائبات میں سے ایک بت مجھے بہت پسند آیا۔ وہ ایک پری پیکر کا حسین مجسمہ تھا۔ جتنا آپ غور سے اس کی طرف دیکھئے۔ اس کی دلفریبی اور حسن بڑھتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ آپ محسوس کرنے لگتے کہ یہ ذی روح ہے۔ اور حرکت کرنے پر قادر۔ میں نے مالک دکان سے اسکی قیمت دریافت کی۔ اس نے دس ہزار پونڈ بتائی۔ مجھے بڑا تعجب ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ مورتی نفاست اور حسنِ کمال کا بہترین نمونہ تھی مگر پھر بھی اس کی یہ قیمت ضرورت سے زیادہ گراں تھی۔ میں نے پھر مالک سے دریافت کیا۔ کہ وہ کیوں بعید از قیاس قیمت بتاتا ہے۔ اس نے جواب دیا کچھ ایسی ہی بات ہے۔ پھر آخر میرے بہت اصرار پر وہ تصویر کی تاریخی داستاں سنانے لگا۔

یہ تصویر کئی پشتوں سے ہمارے خاندان میں چلی آتی ہے۔ اور کوئی ابھی تک اس کا گاہک نہ بنا۔ صرف اس کے بیش قیمت ہونے کی وجہ سے۔ ہمارے خاندان کا مورثِ اعلیٰ بہت باکمال بت ساز گذرا ہے۔ اس کا دور دور شہرہ تھا۔ ایک دن وہ سڑک پر سے گذر رہا تھا۔ کہ ایک بارہ سالہ اجنبی لڑکے نے اسکو مخاطب کر کے کہا۔ کہ میرا مالک بستر مرگ پر پڑا ہے۔ اور تم سے ملنا چاہتا ہے۔ وہ دل میں اگرچہ حیران تھا مگر غیر ساتھ ہو لیا۔ بہت سی پیچدار گلیوں میں سے گذر کر وہ ایک تنگ و تاریک گھر میں داخل ہوئے۔ وہاں اس نے دیکھا کہ ایک بہت ہی ضعیف شخص جس کی پلکیں اور بھویں تک سفید تھیں بستر پر پڑا ہانپ

سانسیں لے رہا تھا۔ آنیوالوں کو دیکھکر اس کی گڑھوں میں دھنسی ہوئی بے نور آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی روشنی پیدا ہوگئی۔ اس نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے کونے کی طرف اشارہ کیا۔ لڑکے نے پردہ ہٹایا۔ تو یہ لعبتِ چین نظر آیا۔ ایسا معلوم ہوا۔ کہ اس بت کو دیکھکر مرنیوالے کے نحیف و زار جسم میں پھر ایک بار نئے سرے سے خون اور حرارت عود کر آئی۔ وہ جوش میں آکر اپنے دونوں کمزور بازوؤں کے سہارے پر ایک دم سے اٹھ بیٹھا اور کہنے لگا۔ جانتے ہو یہ کس کا مجسمہ ہے؟ یہ میری محبوبہ کا بت ہے تمہارے لئے بیجان چیز ہے۔ مگر اس میں زندگی کی رمق اب بھی باقی ہے۔ اور مجھے پختہ یقین ہے۔ کہ ایک دن اسکی کھوئی ہوئی زندگی اسکو پھر واپس مل جائیگی۔ اسی سال کا عرصہ گذرا جب ہم جوان تھے۔ اور زندگی ہمارے لئے خواب سے زیادہ شیریں۔ ہم پیکن میں ندی کے کنارے ایک خوبصورت باغ میں رہا کرتے تھے۔ لوگ کہتے تھے۔ اس میں آسیب کا عمل ہے۔ پریوں کا سایہ ہے۔ میں ہنستا تھا۔ اور مذاق اڑاتا تھا۔ مگر ایک دن.......... آہ وہ خوفناک چودھویں تاریخ کا منحوس دن۔ موت کے بعد بھی اس کی یاد میری روح کو بیقرار رکھے گی۔ میں اور میری محبوبہ باغ میں اس ہشت پہلو سفید چبوترے پر جس کو میری بیوی روز اپنے ہاتھوں سے موتی اور گملوں سے سجاتی تھی بیٹھے چاندنی کا لطف اٹھا رہے تھے ہمارے داہنی طرف ایک بڑا پرانا گنجان سایہ دار بڑ کا درخت تھا۔ کوئی گیارہ کا عمل ہوگا۔ کہ یکایک اس میں سے ایک بڑے سخت دھماکے کی آواز آئی...... جیسے ہزاروں شخص درخت پر سے زمین پر کود رہے ہوں۔ اس کے بعد کسی نے گرج کر کہا۔ کہ اے حقیر آدم زاد تو اپنی بیوی کو میرے حوالے کردے۔ کہ اس کے بغیر مجھ پر راحت و آرام حرام ہو رہا ہے۔ اور وہ اسطرح کہ جب ۱۲ کا گھڑیال بجے تو تو اسکو اس درخت کے نیچے چھوڑ جانا۔ اور خود ہمیشہ کے لئے اس جگہ کو خیرباد کہدینا۔ اور اگر تم نے یہ حکم نہ مانا۔ تو تمہاری بیوی جادو کے اثر سے پتھر کی بن جائے گی۔ اور اس عرصہ دراز تک اس حالت میں رہے گی۔ جب تک کہ ایک لاکھ ننانوے ہزار آدمی اس واقعہ کو نہیں سچا سمجھیں۔ اور اس مورتی کو دیکھکر ہمدردی و افسوس کے آنسو گرائیں۔ اتنا کہنے کے بعد ضعیف شخص نڈھال

ہو کر زمین پر گر پڑا۔ آنکھیں پتھرا گئیں۔ اور دم توڑ دیا۔

اس دن سے آج کے دن تک یہ خوبصورت مجسمہ ہماری خاندانی وراثت میں چلا آتا ہے ہر مہینے کی چودھویں تاریخ کو اگر آدھی رات کو اس بت کو دیکھا جائے۔ تو دلی دہشت و خوف کے آثار اسکے چہرے سے ہویدا ہوتے ہیں۔ اس کی پیشانی اور آنکھوں پر ہاتھ پھیرا جائے۔ تو اس قدر نم ہوتے ہیں کہ چاہے موسم سرما ہی کیوں نہ ہو۔ ہاتھ بالکل سیلا ہو جاتا ہے۔

میں نے یہ تمام واقعہ سُنا۔ بت کی طرف نظر اٹھائی۔ تو آپ یقین کیجئے مجھے اس کی نگاہوں میں جنبش۔ اور لبوں میں حرکت معلوم ہوئی۔ ایسا ظاہر ہوتا تھا۔ کہ اس پتھر کے پہلو میں تو قلب ہے۔ وہ اپنی مصیبت بھری داستان اپنے ہی زبانی سنانے کے لئے سخت بیتاب ہے۔ اب مجھے جائے قیام سے آئے کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔ میں نے سوچا۔ کہ میرا ساتھی کبھی کا میرے انتظار میں ہوگا میں دکان کے مالک سے رخصت ہوا۔ اور واپس آگیا۔ مگر اب بھی اکثر مجھے تنہائی میں اس حسین بت کا خیال آتا ہے۔ دل ہمدردی اور رحم سے بھر جاتا ہے۔ جب میں رات کو پلنگ پر لیٹتا ہوں۔ تو یوں معلوم ہوتا ہے۔ کہ بت کی آنکھیں کھل گئی ہیں۔ ہونٹ جنبش میں آرہے ہیں۔ اور وہ حسین مورتی مجھے کہتی ہے۔ کہ تم مجھے چھوڑ کر یہاں آگئے " میرا پختہ ارادہ ہے۔ کہ میں اپنی جائداد بیچ دوں شنگھائی واپس جاؤں۔ اور اس بت کو خرید کر لے آؤں +

## پہیلی!

وہ کونسے دو مختلف ممالک ہیں جن کے نام کے حروف الٹنے پر دو مختلف جانوروں کے نام ترکیب پاتے ہیں۔ ان جانوروں میں ایک تو دنیا کا نہایت خوبصورت اور دوسرا نہایت بدشکل جانور خیال کیا جاتا ہے۔

جواب کے لئے آئندہ پرچے کا انتظار کریں۔ (مسلمہ احمد)

# چاند کی مختلف شکلیں

چاند بظاہر اپنی شکل کو ہر روز بدلتا رہتا ہے۔ مگر حقیقت میں اس کی شکل و صورت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ چاند خود روشن نہیں ہے۔ وہ سورج سے روشنی لیتا ہے۔ جتنا اس کا حصہ روشن نظر آتا ہے ہمیں وہی اسکی شکل دکھائی دیتی ہے۔ آؤ اب ذرا دیکھیں کہ چاند کی شکل کس طرح سے بدلتی ہے۔

سورج چاند اور زمین ایک سطح میں واقع نہیں ہیں۔ سورج کی روشنی سے چاند کا ایک نصف جو سورج کی طرف ہوتا ہے۔ ہمیشہ روشن رہتا ہے۔ مگر یہ روشن نصف سارا کا سارا ہمیں دکھائی نہیں دیتا۔ جب اماوس ہوتی ہے۔ یعنی مہینے کی سب سے تاریک رات۔ تو زمین کے جس حصہ پر ہم واقع ہوتے ہیں وہاں سے چاند کا روشن نصف ہمارے بالکل خلاف ہوتا ہے۔ گویا اس میں سے کوئی روشنی ہمیں نہیں پہونچتی۔ دوسرے دن چاند حرکت کرکے زمین کے ساتھ ایک مختلف مقام اختیار کر لیتا ہے۔ یہاں سے اس کا تھوڑا سا روشن حصہ ہمیں دکھائی دینے لگتا ہے۔ اسکو ہم نیا چاند یا ہلال کہتے ہیں۔ اسی طرح سے ہٹتے ہٹتے چاند آسمان میں ہمارے بالکل مقابل آجاتا ہے۔ اور سورج کی روشنی سامنے اسپر پڑتی ہے۔ جس سے وہ سارا کا سارا روشن دکھائی دیتا ہے۔ جسے ہم پورا چاند یا بدر کہتے ہیں۔ اس سے آگے بڑھ کر چاند پھر گھٹنا شروع ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ پھر وہی اماوس کا موقع واپس آجاتا ہے۔

اس سے یہ تو ظاہر ہے۔ کہ کرہ ارض کے مختلف مقامات پر چاند کی شکلیں مختلف دکھائی نہیں دیتیں۔ بلکہ بدر ساری دنیا کے لئے بدر ہوتا ہے۔ جسطرح سے رات مشرق سے مغرب کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہے۔ بدر کی روشنی بھی اسیطرح سے ان مقامات پر چھا جاتی ہے۔

سورج زمین اور چاند ایک ہی ہموار سطح میں واقع نہیں۔ اور وہ مختلف راستوں پر گردش کرتے ہیں اگر وہ ایک ہی خط مستقیم میں واقع ہوتے تو ہر مہینے چاند گرہن ہو جایا کرتا۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے۔ کہ ہمیں چاند کی سطح کا ایک ہی حصہ تقریباً ہمیشہ زمین پر سے نظر آتا ہے چاند میں پہاڑ اور وادیاں ہیں جب چاند پر سورج کی روشنی پڑتی ہے تو ہم کہتے ہیں چاند روشن ہے۔ اس میں دھبے نظر آتے ہیں جنکو بعض اوقات لوگ چاند کی ماں کا چرخا کہتے ہیں۔ یا ایسا ہی کوئی اور نام رکھ لیتے ہیں. یہ اصل میں پہاڑ اور وادیاں ہیں۔ آپنے دیکھا ہوگا کہ بیشتر اوقات ان کی شکل ایک ہی جیسی رہتی ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ چاند اپنی سطح کا صرف یہی حصہ ہماری طرف رکھتا ہے۔

وہ بات یوں ہے۔ کہ چاند جتنے عرصہ میں زمین کے گرد اپنے مدار پر ایک چکر کاٹتا ہے۔ تقریباً اتنے ہی عرصہ میں وہ اپنے محور پر ایک پورا چکر گھومتا ہے۔ اسلئے چاند کا وہی چہرہ قمری مہینے کے ان ایام میں ہماری طرف رہتا ہے۔ چاند زمین کے گرد اپنی گردش ۲۹ دن سے کچھ زیادہ عرصہ میں پوری کرتا ہے +

(بقیہ مضمون نمبر ۲ جہاں صفحہ ۴ سے آگے)

غرض کے لئے جرمنی کی مداخلت اور معاونت بہت ضروری ہے۔ اٹلی اور جرمنی دونوں کا تعاون لازمی ہے۔ تاکہ یہ کام خوبی کے ساتھ سرانجام پا سکے۔ یہ بھی طے پایا کہ اٹلی کی مصنوعات کو وسطی یورپ میں فروغ دیا جائے۔ اور آسٹریا کی اشیا کو ان کے عوض میں خریدا جائے۔

## رومانیا کا پرنس نکولس

انگلستان کے شاہنشاہ ایڈورڈ ہشتم کا قصہ تو آپ سن چکے ہیں کہ مسز سمپسن سے شادی کرنے کے لئے کسطرح سے تخت وتاج کو خیرباد کہہ دیا۔ اس سلسلے میں رومانیا کے ولیعہد پرنس نکولس کا اقدام بھی سننے کے قابل ہے۔ پرنس نے ۱۹۲۱ میں حسین میڈم سیورے لو کے ساتھ خفیہ شادی کی جو ایک روسی سیاسی افسر کی مطلقہ بیوی تھی۔

پرنس سے پہلے بھی کہا گیا تھا۔ مگر اس نے بیوی کو جدا کرنے سے انکار کر دیا۔ اب پھر رومانیا کی سلطنت نے اس پہ اصرار کیا تو اس نے جدید انکار کر دیا۔ اس پر ملک کے تمام سیاسی نمائندوں کی ایک کانفرنس ہوئی جس کا صدر شاہ کیرول رومانیا کا بادشاہ اور پرنس کا والد تھا۔ انہوں نے پرنس کو اس کی ولیعہدی کے تمام حقوق سے برطرف کر دیا۔ اور پرنس نے اس بات کو مان لیا خطابات سے دست بردار ہوگیا اور دستخط کر دیئے۔

اب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ پرنس نکولس اپنا وطن چھوڑ دے گا اور ایک عام شہری کی حیثیت میں کسی اور ملک میں جا کر رہے گا۔ دنیا نے اب یہ طرح نو اختیار کی ہے۔ کہ تاج وتخت پہ محبت اور جذبات کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اس مادہ پرستی کے زمانے میں عشق پرستی کے جذبات اب دیکھئے کیا رنگ لاتے ہیں۔

## لیگ اور ابی سینیا

لیگ آف نیشنز کے تازہ اجلاس میں ابی سینیا کے معزول شدہ شاہنشاہ ہیلے سیلسی نے اپنا کوئی نمائندہ نہ بھیجا۔ حالانکہ وہ لیگ کا باقاعدہ ممبر ہے۔ اس کی بجائے ایک پیغام لیگ کے نام پہنچا دیا۔ کہ لیگ کے اجلاس میں شریک ہونے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اس لئے نمائندہ نہیں بھیجا گیا۔

یہ سوچکر اس شاہنشاہ کی حالت پر بہت رحم آتا ہے۔ کہ اس غلط فہمی کی قیمت میں اسے ایک سلطنت ادا کرنی پڑی اگر وہ اہد یائی اقوام کے اس گورکھ دھندے کی اصلیت حیثیت اور قیمت کو پہلے ہی پہنچان لیتا تو یہ نوبت نہ آتی۔

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند ۔۔۔ بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند (اقبال)

مگر ابھی تک معزول شاہ کی غلط فہمی پورے طور پر رفع نہیں ہوئی۔ اس نے مصر کو ایک پیغام مبارکبادی بھیجا ہے کہ مصر نے اپنی مکمل آزادی حاصل کر لی ہے۔ اور یہ بھی کہا ہے کہ مجھے امید ہے ایک دن لیگ آف نیشنز حبش کو بھی مکمل آزادی دلانے میں کامیاب ہو جائے گی۔ یہ وہی بات ہے کوئی مریض سے صحت اور مفلس سے زر جا کر مانگے

مگر پہلے کو بھی بعد میں یہ خیال پیدا ہوا ہے۔

## کانگرس اور مسلمان

نئے آئین ہندوستان کو مل گئے۔ مگر اب کانگرس نے ایک نئی فضا پیدا کر دی ہے بہت سی پیچیدگیاں حکومت کے حلقوں میں گشت کر رہی ہیں۔ کانگرس کو یہ معلوم ہوا ہے کہ مسلمانوں کی امداد کے بغیر کامیابی محال نظر آتی ہے۔ الہ آباد میں مسلمانوں کی ایک کانفرنس ہوئی جو کانگرس کے حق میں ہیں۔ بہت بحث مباحثہ رہا۔ تکالیف اور تصادم پر گفتگو ہوئی آخر یہ طے پایا۔ یہ کانفرنس اس امر کا اظہار کرتی ہے۔ مسلمانوں کے لئے صحیح راستہ یہ ہے کہ وہ کانگرس میں شامل ہو جائیں۔ اور اس آزادی کی کوشش میں حصہ لیں جو کانگرس نے جاری کی ہوئی ہے۔

لکھنؤ میں مسلمانوں کی دو اہم جماعتوں کے اجلاس ہوئے۔ جمعیت العلما۔ اور یو۔پی مسلم پارلیمنٹری بورڈ دونوں نے اس مسئلے پر غور کیا۔ اول الذکر نے کانگرس کی حمایت میں خیالات کا اظہار کیا۔ اور کہا کہ آزادی حاصل کرنے میں ہم ان کے شریک کار ہیں۔ مگر یہ بھی کہا کہ۔ کثیر جماعت کا یہ فرض ہے کہ وہ یقین دلائے کہ ان کا رویہ اقلیتوں کی طرف مناسب اور پر از لطف و کرم ہو گا۔

آخر الذکر جماعت اس پروگرام میں کانگرس کے خلاف ہے کہ حکومت کے نظام کو درہم برہم کیا جائے اور اس بات پر زور دیتی ہے کہ اس کام میں حکومت کے ساتھ اشتراک ہونا چاہیئے۔ وہ یہ بھی کہتی ہے۔ کہ فرقہ وارانہ تقسیم کو قائم رکھنا چاہیئے جبتک کہ کوئی بہتر سمجھوتا نہ ہو جائے۔

گویا ؎ پئے مشورت محفل آراستند نشستند و گفتند و برخاستند

ہندوستان کی سیاسی حالت وہی ہے جو پہلے تھی۔ ابھی اسے بہت سی منزلیں طے کرنی ہیں سیاسی تشکیل وقت اور فراست کی محتاج ہے ✦

---

# ماڈرن لیبارٹریز بہاولپو

## کی چند شہرہ آفاق اور مجرب دوائیاں

**سپرموٹین** یہ ان لوگوں کیلئے بہترین دوا ہے جو اپنی زندگیوں کو بچپن کی غلط کاریوں اور خام کاری عقل و دانش سے تباہ و برباد کر چکے ہیں۔ اور ادویات کے کثیر مصارف کے باوجود ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ یہ آپ کی خوش قسمتی اور زندگی کی راحتوں کا پیش خیمہ ہے۔ کہ آپنے سپرموٹین کا اشتہار پڑھ لیا ہے۔ جس کے استعمال سے جریان جیسا مہلک مرض چند ایام میں رفع ہو جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نامراد مرض کبھی ہوا ہی نہیں تھا۔ یہ دوا نہ سمجھئے بلکہ اکسیر ہے +

---

**ڈینٹول پوڈر** دانت عمل انہضام کی پہلی شاہراہ ہیں کیونکہ جو خوراک ہم کھاتے ہیں۔ پہلے دانت اسکو چباتے ہیں۔ اور پھر وہ معدہ میں جاتی ہے۔ اگر دانت کسی وجہ سے خوراک کو اچھی طرح پیسکر معدہ کے سپرد نہ کریں تو معدہ میں سخت خرابی پیدا ہو جاتی ہے جس سے صحت پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ دانت اسی وقت غذا کو عمدہ باریک کرینگے جب وہ درد مسوڑھوں کی سوجن، پیپ اور ماس خورہ وغیرہ امراض میں گرفتار نہ ہوں۔ کبھی کیڑا لگ جانے یا زخم ہو جانے میل جم جانے سے انسان کھانا کھانے سے عاجز آ جاتا ہے۔ اور کبھی منہ سے اس قدر بدبو آتی ہے کہ دوسرا آدمی متنفر ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ڈینٹول پوڈران تمام بیماریوں کا واحد علاج ہے۔ تندرست آدمی کے استعمال کرنے سے دانت موتی کی طرح آبدار ہو جاتے ہیں +

---

**اکسیر معدہ** یہ خوش ذائقہ اور خوشبودار اکسیر ہے۔ جو معدہ کی کمزوری اور سردی میں مفید ہے۔ معدہ کی زائد رطوبات کو زائل کرتا ہے۔ آلات انہضام کو تقویت بخشتا ہے۔ جن اشخاص کے پیٹ خرابی ہضم کی وجہ سے پھول جاتے ہیں۔ دودھ یا مقوی اشیا کھانے سے طبیعت علیل ہو جاتی ہے۔ کھٹی دکاریں آتی ہوں۔ ان کے لئے یہ اکسیر حکمی علاج ہے۔ سب سے بڑھکر خوبی یہ ہے کہ بڑے تو بڑے بلکہ بچے بھی اسے خوشی سے کھا لیتے ہیں۔ جس سے ان کے فساد ہضم کی اصلاح ہو جاتی ہے +

Reg. No. L. 3972



باہتمام برکت علی پرنٹر آزادی پریس ہسپتال روڈ لاہور میں چھپکر دفتر محقق بہاولپور سے ایف ایم شجاع منشی پبلشر نے شائع کیا

DEC. 1937

# THE MOHAQQIQ

## BAHAWALPUR

A High Class Literary Monthly



# محقق

## بہاولپور

ڈائرکٹر۔ خواجہ شجاع منعمی

ایڈیٹر۔ رازی عرفانی

فنی۔ علمی۔ ادبی۔ صنعتی وغیرہ

# ماہنامہ محقق بہاولپور

ماہ دسمبر ۱۹۳۷ء

**چندہ**

سالانہ تین روپے!

طلباء سے دو روپے

ممالک خارجہ سے دس شلنگ

**چندہ**

والیان ریاست سے یکصد روپیہ

اُمرا سے دس روپے

فی پرچہ چار آنہ

۴ر

ادارہ تحریر

ڈائرکٹر:۔ خواجہ شجاع منعمی۔ ایم۔ اے (علیگ) ایم۔ ایس۔ سی۔ ایم۔ اے۔ (پنجاب) پروفیسر

ایڈیٹر:۔ رازی عرفانی :۔

مہتمم شعبۂ نسواں :۔ بیگم۔ ح۔ش۔ رفعت۔ دہلوی۔ بی۔ اے۔

نگران عربیات :۔ حافظ عبد الرحمٰن علامہ مولوی فاضل۔

نگران سنسکرات :۔ پنڈت مدن سنگھ شاستری ودیا بھاسکر۔

مذاکرہ علمیہ :۔ پروفیسر ایم۔ ایف قریشی۔ ایم۔ ایس۔ سی۔ (افسانہ) (امین حزیں)

مقام اشاعت :۔ دفتر رسالہ محقق بہاولپور

جلد ۱ | نمبر ۲

# فہرست مضامین بابت ماہ دسمبر سنہ ۱۹۳۷ء

# شذرات

ہمارے شکریہ کی بہت سی ہستیاں مستحق ہیں جنہوں نے محقق کی نشر و اشاعت میں حصہ لیا۔ خاص طور پر جناب کپتان ضیاءالدین احمد صاحب ہاشمی جنہوں نے اس طرف خاص طور پر توجہ فرمائی۔ ان کی علم دوستی اور عالی نسبی سے ہر خواندہ آدمی یہی توقع رکھتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ان کی توجہ بیش از پیش ہوگی ؎

وہ اصحاب جن کا چندہ اس مہینے کے پرچہ کے ساتھ ختم ہوتا ہے۔ مہربانی فرمائیں گے اگر اپنا سالانہ چندہ مبلغ تین روپیہ بذریعہ منی آرڈر روانہ فرمادیں۔ اس طرح سے ان کو وی۔ پی۔ کا خرچ بچ جائے گا۔ اور دفتر کو ڈاکخانہ کی زحمت ؎

# بزم جہان

**چین جاپان کی لڑائی** جاپان نے اب اس بات کو اچھی طرح سے سمجھ لیا ہے کہ لڑائی طویل ہوگی حکومت جاپان اس امر کی کوشش کر رہی ہے کہ عام لوگوں کو ایک طویل لڑائی کے لئے تیار کیا جائے۔ جاپانی دو نوں محاذوں پر آگے بڑھ گئے ہیں۔ شینگھائی کی طرف انہوں نے ایک اہم مقام "وُ سنگ" کے پاس فتح کر لیا ہے۔ شمالی چین میں وہ ریل کے ساتھ ساتھ بڑھ رہے ہیں۔ جاپانیوں نے نانکن پر شدید گولہ باری کی ہے۔ ہوائی جہازوں نے علاقہ کے تمام غیر طاقتوں کے کونسل خانوں پر گولے برسائے۔ اور غیر ملکی رعایا کے مکانوں کو نقصان پہنچایا۔ امریکہ نے اس امر کے خلاف سخت صدائے احتجاج بلند کی۔

جاپانی حکومت نے برطانی سفیر کے مکان پر گولہ باری کے متعلق تہ دل سے اظہار افسوس کیا ہے۔ لیگ آف نیشن نے ایک ۲۳ کی کمیٹی چین جاپان کی لڑائی کے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے مقرر کی تھی۔ اس کمیٹی نے جاپان کی اس حرکت پر کہ وہ غیر مسلح دہات پر گولہ باری کرتا ہے۔ اظہار مذمت کیا ہے۔ برطانیہ اور امریکہ میں تحریکات شروع ہوتی ہیں کہ جاپانی مال کا بائیکاٹ کر دیا جائے ؎

## ہٹلر اور جرمنی کی ملاقات

ہٹلر کی ملاقات کو مسولینی جرمنی گیا۔ وہاں پر بہت شان و شوکت کا اظہار کیا گیا۔ دونوں قوموں نے خوشی سے آسمان سر پر اٹھالیا پبلسٹی کے تمام جدید آلات کا استعمال کیا گیا۔ ایسی ملاقاتیں گزشتہ زمانے میں بھی ہوا کرتی تھیں۔ مگر دونوں ڈکٹیٹروں نے اس ملاقات کو فوق العادہ بنانے میں کمال کوشش کی ہے۔

شاہی دعوت کے موقعہ پر ہر ہٹلر نے سینوڑ مسولینی کا خیر مقدم کیا اور کہا۔ "ایسے موقعہ پر جب کہ دنیا اضطراب اور بے چینی میں مبتلا ہے۔ اور جب کہ خوفناک ترین عناصر یورپ کی تہذیب قدیم پر حملہ کرنے اور اسے برباد کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اٹلی اور جرمنی دونوں اپنے آپ کو مخلصانہ دوستی سے پیوست پاتے ہیں۔ ان کا مشترکہ کام اس نصب العین کے لئے ہے کہ دنیا کے امن کو قائم رکھا جائے۔ اور یورپائی تمدن کے اس بلند ترین مظاہرے کو اس لباس میں پیش نہیں کیا جا سکتا کہ یہ دیگر اروپائی اقوام کے خلاف ایک "اتحاد ہے"۔ یورپ ماہر سیاست دانوں کا یہ کہنا ہے کہ اسطرح کی نقلی تشریحیں گزشتہ زمانے میں تو کام دے جاتی تھیں مگر آجکل سب کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔ اور دونوں ڈکٹیٹروں کی ملاقات کا مقصود صاف نظر آ رہا ہے +

## زیگوسلویکیا کے گذشتہ پریذیڈنٹ کی وفات

اروپائی سیاست حاضرہ میں زیگوسلویکیا کے گذشتہ پریذیڈنٹ میرک کی وفات ایک خاص اہمیت رکھتی ہے وہ حقیقتاً اس نئی ریپبلک کا بانی مبانی تھا۔ اور کہا جاتا ہے کہ اپنی قسم کا وہ ایک ہی سیاست دان تھا جسے گذشتہ جنگ عظیم نے پیدا کیا۔ یہ اسی کی محنت اور دور اندیشی کا نتیجہ تھا کہ قوم نے لڑائی کے نازک ترین ایام میں اس قدر ترقی حاصل کرلی۔ اسی کی سیاست کا نتیجہ تھا کہ اس کے ملک کو قائم اور منظم حکومت نصیب ہوئی۔ اور دوسری حکومتیں نظر احترام سے اسے دیکھنے لگیں۔

میرک کی وفات ۸۷ سال کی عمر میں ہوئی جب کہ اس کا اپنا ملک اسے پرستش کی نگاہوں سے دیکھتا تھا اور دوسرے ممالک احترام سے۔

## بحر روم کی کانفرنس

بحر روم کی کانفرنس ... ختم ہو گئی ہے مختلف ممالک نے اپنے اپنے حصے سنبھال لئے ہیں اور اب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ بحری قزاق جہازوں پر چھاپے نہیں ماریں گے۔ برطانیہ اور فرانس اس علاقے کے ذمہ وار ہیں جو جبرالٹر مارسیلز۔ مالٹا اور الجیریا کے درمیان واقع ہے۔ یونان، زیگوسلویکیا، ٹرکی اور یونان مشرقی بحر روم کے ذمہ وار ہیں۔ اور وہ علاقوں کی تقسیم خود کریں گے۔ پہلے اٹلی نے اس میں شرکت کرنے سے انکار کیا تھا مگر بعد میں وہ بھی شامل ہو گیا ہے +

# معجزہ وکرامات

جناب شمس العلماء علامہ محمد امین صاحب عباسی چریاکوٹی (مولوی فاضل) پروفیسر عربی اسلامیہ
انٹرمیڈیٹ کالج ڈھاکہ بنگال

دور حاضرہ میں جب کہ ظاہر پرستی اور مادیت کا غلبہ ہے بیشتر نگاہیں اسباب ظاہری اور مشاہدات سے خوگر ہیں کم تر ایسے افراد ہیں جن کی نگاہیں حقیقت ثابتہ اور امور عقلیہ جنکا مشاہدات سے کوئی علاقہ نہیں متجسس ہوں اس کا سب سے بڑا سبب تعلیم کی غرض کا محدود ہونا ہے۔ آجکل تعلیم تجارتی اصول پر عام ہو رہی ہے۔ وہ علوم جنکا تعلق کسی دنیاوی نفع سے نہیں ہے اس کی طرف بہت کم لوگ مائل ہوتے ہیں لیکن پھر بھی تعلیم کے آثار اعم اس سے کہ وہ کسی نہج کی ہو معقول پر مترتب ہوتی ہیں۔ ذہن میں جودت اور عقل میں تیزی بہم پہنچاتی ہے۔ اس لئے وہ حقائق جنکا تعلق مشاہدات اور تجربات سے نہیں ہے جب سامنے آتے ہیں تو ان کو بھی انہیں مشاہدات پر منطبق کیا جاتا ہے۔ اور ایک عامیانہ رائے قائم کی جاتی ہے۔ چونکہ عقل خلاق معانی ہے کبھی صحیح ہوتی ہے اور کبھی بلکہ بیشتر غلط ہوتی ہے۔ عام اس سے کہ وہ رائے صحیح ہو یا غلط اس سے دماغی سکون ضرور حاصل ہوتا ہے۔ اور لاعلمی سے جو الجھن پیدا ہوا کرتی ہے دفع ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ سکون دماغی جو غلط رائے سے ہوا ہے۔ بہت سی بے چینیوں کا سبب ہوتا ہے۔ اور یہ سلسلہ اتنا دراز ہوتا ہے کہ اخیر میں جہل مرکب پر ختم ہوتا ہے۔ اور حقیقت سے بہت دور جا پڑتا ہے اور عقل کا دائرہ تنگ ہوتے ہوتے مشاہدات پر محدود ہو جاتا ہے۔ چونکہ مادیات کا قیاس غیر مادی پر قیاس مع الفارق ہے اس لئے دھوکا ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ عام طور سے لوگ آجکل معجزہ اور کرامات سے انکار کرتے ہیں۔ چونکہ مادیات اور محسوسات میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی جس سے مادہ پرست اور ظاہر بین نگاہوں کو الجھن ہوتی ہے۔ اور ان کا دماغی سکون اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ اس سے قطعی انکار کیا جائے۔

دوسرا سبب یہ بھی ہے کہ عموماً انسان کو جن چیزوں کی عادت ہوتی ہے۔ ان کو طبیعت بہت جلد قبول کرتی ہے۔ اور اس سے اس کو ایک گونہ لگاؤ ہوتا ہے۔ اور دماغ کو سکون ہوتا ہے۔ اور عقل پر کسی قسم کا بار نہیں پڑتا

لیکن جب خلاف عادت کوئی چیز سامنے آتی ہے تو اس سے دماغ کو بے چینی ہوتی ہے۔ اور ایک کیفیت اضطرابی پیدا ہوتی ہے۔ طبیعت اس کو قبول نہیں کرتی اور اسباب خارجیہ کے زیر اثر اسکو بجبر قبول کرنے پر مائل کیا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر اسباب خارجیہ قوی ہیں۔ مثلاً خوف یا لالچ دنیا۔ تو انسان عقل کو معطل کر کے اس کو مان لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ جس طرح ایک مریض دوا کی تلخی کو مرض کی تکلیف یا موت کے خوف سے گوارا کر لیتا ہے۔ اور امید صحت کی لذت خیالی یا اعصاب دماغی پر اتنا اثر ہوتا ہے کہ اس کی کیفیت تلخی بدل کر خوشگواری پیدا کرتی ہے۔ اور نفرت رغبت کی طرف مستحیل ہو جاتی ہے یہی کیفیت جو خلاف عادت امور کے سننے یا دیکھنے سے ایک الجھن سی پیدا ہوتی ہے اسی کو استعجاب کہتے ہیں اگر اسباب خارجیہ ضعیف ہیں تو انسان اس سے انکار کر دیتا ہے۔ جس سے اس کے دماغ کو راحت ہو جاتی ہے مثلاً آگ کا خاصہ جلا دینا ہے۔ اور یہ عادت مستمرہ ہے کہ جو چیز آگ میں ڈالنے سے ہمیشہ جل جاتی ہے نہ جلے تو استعجاب اور حیرت پیدا ہوگی۔ اور اس کی وجہ دریافت کرنے میں دماغ میں ہیجان پیدا ہوگا۔ اور انسان کی کوشش ہوگی کہ امور عادیہ سے ہی اس کی وجہ دریافت کرے اسی سلسلہ میں مختلف توجیہات کرے گا اور یہی سمجھے گا کہ کوئی امر عادی ایسا ہے جس کو ہم نہیں جانتے اور وہ پوشیدہ ہے۔ کوئی غیر عادی چیز اس کی وجہ سے نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ اس سے وہ واقف نہیں ہے۔ البتہ اس صورت میں کہ ایک شخص جس سے وہ ڈرتا ہے یا اس کے علمی تفوق سے متاثر ہے وہ کہتا ہے کہ اس کی وجہ میرے ہاتھوں کی تاثیر ہے۔ میں جس چیز کو چھو کر آگ میں ڈالتا ہوں وہ چیز نہیں جلتی تو مجبوراً اس کو مان لینا پڑے گا۔ اگرچہ اس کے دماغ کی بے چینی قائم رہے اور عقل اپنے کام سے معطل رہے۔ پھر اس کی کثرت اور ایسے واقعات کے بار بار ہونے سے جن میں اس کو اپنی عقل معطل کرنی پڑے اور کسی دباؤ سے اس کو مان لینے پر مجبور ہوتا ہے۔ تو اس کی عادت ہو جاتی ہے اور اس قسم کے ہر واقعہ میں جس کی وجہ اس کے ذہن میں نہیں آتی وہ ایسی ہی صورتوں میں سے کسی صورت کو اس کی وجہ قرار دیتا ہے اور عقل کو معطل کر دینے کا عادی ہو جاتا ہے۔ پھر یہ حالت جب بہت ترقی کرتی ہے۔ تو اگر بے خوفی کا غلبہ ہے اور ذہنی آزادی کا زور ہے تو شرک اور کفر تک پہنچتا ہے۔ اور اگر ذہنی آزادی یا بے خوفی و لالچ وغیرہ کا غلبہ نہیں ہے تو بھی شرک اور کفر تک پہنچتا ہے۔ لہٰذا اس امر کی ضرورت ہے کہ اس قسم کے امور غیر عادیہ کے اصول کو واضح کر دیا جائے۔ تاکہ دونوں جانب میں شرک اور کفر کے خطرات سے حفاظت ہو جائے اور امور غیر عادیہ میں صحیح رائے قائم کرنا سہل ہو جائے۔

جاننا چاہیئے کہ اصول معجزات اور کرامات تین قسموں میں محدود ہیں۔ اول یہ ہے کہ اجسام اور تمام مواد عنصریہ آگ پانی۔ مٹی ہوا نفس کے تابع ہے۔ نفس ان مواد عنصریہ اور ان مواد سے بنے ہوئے اجسام میں

وہ ہر طرح کا تصرف کر سکتی ہے - ایک جسم عنصری کو دوسرے جسم عنصری میں تبدیل کر سکتی ہے ۔ ایک مادہ عنصری کو دوسرے مادہ عنصری سے بدل سکتی ہے - آگ کو پانی کر دے یا پانی کو ہوا کر دے ایسی صورت ممکن ہے اس لئے کہ اولاً ایسا ہوا کرتا ہے - کہ پانی کچھ دنوں کے بعد ہوا ہو جاتا ہے - یا اس کو آگ پر رکھ دیا جائے تو وہ انجروں کی صورت میں بدل جاتا ہے - ثانیاً علوم الہیہ میں یہ امر ثابت ہو چکا ہے کہ جوہر ادنیٰ جیسے ہیولیٰ یا مادہ جوہر اعلیٰ جیسے عقل و نفس کے تابع ہوتا ہے اور وجود اشرف علت وجود احسن ہے جیسے آگ کا وجود جو اشرف ہے - دھوئیں کے وجود کی جو ادنیٰ و اخس ہے علت ہے ۔ یہ امر واضح ہے کہ نفوس ان بدن پر کیفیت ملکوتی طاری ہوا کرتی ہے ۔ اور نفس اپنے اجسام میں ہر قسم کے تصرفات کر سکتی ہے - اور یہی روح ان مواد عنصریہ اور اجسام میں حرکت پیدا کر کے اپنے بس اور اختیار میں کر لیتی ہے - اور تصرفات طبیعیہ اور ارادیہ سے ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل کرتی ہے روح کو جب کمال حاصل ہو جاتا ہے - اور وہ اپنی سے بلند تر قوت سے جس کو عقل فعال کہتے ہیں مشابہہ ہو جاتی ہے تو اس سے وہ افعال صادر ہوتے ہیں جو عقل فعال سے صادر ہوا کرتے ہیں جیسے لوہا جب گرم ہو کر سرخ ہو جاتا ہے اور حرارت اس پر غالب ہو جاتی ہے - تو اس سے آگ کے افعال ہونے لگتے ہیں - آگ کی طرح روشن ہو جاتا ہے ۔۔ دوسری چیزوں کو جلاتا ہے - اس وقت آگ کے جو خواص ہیں وہ سب اس میں پائے جاتے ہیں کبھی بعض نفوس کا اثر متعدی ہوتا ہے - جس سے دوسرے پر اس کا اثر ہوتا ہے - جس طرح روح اپنے بدن میں تصرف کرتی ہے - اسی طرح دوسرے ابدان پر بھی اپنا اثر ڈالتی اور دوسرے بدنوں کی روح اس اثر کو دفع کرنے سے عاجز ہو جاتی ہے - جس طرح خارجی آثار یا سوء مزاج سے بدن انسانی مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے اور روح اس کی تدبیر سے عاجز ہو جاتی ہے - اسی طرح ایک روح سی کمال کو پہنچ کر دوسرے اجسام میں اپنا اثر ڈالتی ہے - اگر یہ اثر برا اور وہمانی ہو تو اس سے اس دوسرے بدن کی روح فاسد ہو جاتی ہے - اور ہر ذی روح انسان ہو یا حیوان ہر ایک پر اس کا برا اثر پڑتا ہے - اور کسی نہ کسی مرض میں مبتلا ہو کر ہلاکت تک نوبت پہنچتی ہے. اور اسی کو نظر لگنا بھی کہتے ہیں ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے :-

العین بدخل الرجل فی القبر و الجمل فی القدر -

ترجمہ :- نظر مرد کو قبر میں اور اونٹ کو ہانڈی میں لے جاتی ہے - آپ نے فرمایا ہے - العین حق -

ترجمہ (نظر صحیح بات ہے) اس کے معنے یہ ہیں - کہ نفس میں ایک کیفیت استعجاب پیدا ہوا ہے - زوال کا وہم ہوتا ہے اور یہ وہم نفس کی طاقت کی وجہ سے اتنا سخت ہوتا ہے ۔ کہ اس کے نظام بدنی میں تغیر پیدا کرتا ہے - اور مزاج کو فاسد کر دیتا ہے جس سے ہلاکت ہوتی ہے - یہ متعین ہے کہ وہم کو اصلاح اور افساد میں بہت بڑا دخل ہے - جو بالبداہت ثابت

ہے اور روزمرہ کے تجربات میں ہے مثلاً انسان جب کوئی صورت مکروہ دیکھتا ہے تو اس سے مزاج بدنی میں تغیر واقع ہوتا ہے - اور ایک عجیب رطوبت عروق میں پیدا ہو جاتی ہے - یا جب غصہ یا غلبہ کا وہم پیدا ہوا تو مزاج بدنی میں تغیر واقع ہوتا ہے اور مزاج گرم ہو جاتا ہے جس سے بخار کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور چہرہ سرخ ہو جاتا ہے - اگر کوئی مرغوب شکل سامنے آگئی تو ایک قسم کی حرارت شہوانی پیدا ہوتی ہے - جس سے تحریک مادہ منویہ ہوتی ہے اور انسان میں اس کی استعداد حاصل ہوتی ہے ان تمام حرارت اور رطوبت کا سبب صرف یہی تصورات مذکورہ ہوتے ہیں - ان کے سوا اور کوئی دوسرا سبب نہیں ہوتا یہی تصورات اور اوہام ہیں جن کی تاثیر بدن انسانی پر شدید ہوتی ہے واہمہ کو اسی وجہ سے خلاق کہا جاتا ہے - ان وجوہ سے ثابت ہوا کہ اوہام کا اثر امزجہ پر بہت ہوتا ہے -

یہ تاثیرات یا تو عام اور معمولی اوہام سے یا فطری شدید التاثیر اوہام سے پیدا ہوتے ہیں یا تدریجاً کثرت ریاضت اور اعمال سے یہ تاثیرات پیدا ہوتے ہیں اگر بعض نفوس میں قوت الہیہ ہو تو اس میں ایسی قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ بمنزلہ عالم کی نفس کے ہو جاتے ہیں یعنی اس کی تاثیر بوجہ کمال قوت کے عنصر یعنی آگ پانی - ہوا - مٹی پر اسی طرح ہوتی ہے جس طرح بدن انسانی یا حیوانی پر اور مادہ عالم اس کے زیر اثر ہوتا ہے جیسا کہ نظر کی تاثیر سے ثابت کیا جا چکا ہے - لہذا جب اس صورت میں نفس کا اثر ابدان انسانی اور حیوانی پر ہوتا ہے - تو جس وقت نفس مرتبہ کمال کو پہنچیگی تو اس کا اثر عالم کے ہیولی یا مادہ پر بدرجہ اولیٰ ہوگا - جب محض تصور اور توہم مادہ بدنی میں ان تغیرات کے پیدا ہونے کا سبب ہوتا ہے - صرف اس وجہ سے کہ نفس بدن میں پھیلی ہوئی ہے اس کا تصرف تمام بدن پر ہے - بعض وقت غلبہ وہم اور تصور سے دوسرے اجسام پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے - بالخصوص ایسی صورت میں کہ اس کا تعلق فطری اشتیاق اور جبلی محبت سے دوسرے اجسام کے ساتھ پیدا ہو جس سے روح میں وہم کا غلبہ ہو - چنانچہ اس کا ثبوت تجربہ سے بھی ہے کہ جب ایک شخص کو دوسرے سے عشق ہوتا ہے تو دوسرا بھی اس سے اسی طرح متاثر ہوتا ہے - اور اس پر ویسے ہی آثار مترتب ہوتے ہیں - جیسا کہ پہلا شخص متاثر ہے اور اس پر بھی محبت کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے - لہذا جب روح درجہ کمال کو پہنچ جاتی ہے تو عالم کے مادہ یعنی ہیولی پر اس کا تصرف ہوتا ہے - اور عالم سفلی میں حرارت یا برودت یا حرکت وغیرہ تغیرات پیدا کر سکتی ہے - جس سے فضا میں ویسا ہی تغیر پیدا ہو سکتا ہے جیسا کہ فطری طریقہ سے فضاء خالی ہیں - اسی حرارت یا برودت وغیرہ آثار سے پیدا ہوتے ہیں - جن سے پانی - اولے - بجلی چمکنا - گرج وغیرہ پیدا ہوتے ہیں -

فلسفہ ہنود میں بھی نفس کی قوت اور اس کے اعمال کا ذکر ہے - چنانچہ مہرشی پنجلی نے یوگ درشن میں لکھا ہے

[illegible]

ترجمہ:- جسم، شکل، جوہر، اجزاء لفظی معنی میں [illegible] ان سب پر غالب ہو گیا ہے یعنی باطنی [illegible] ان سب کو اپنے قبضہ میں کر لیتا ہے۔

نوٹ:- عناصر کی پانچ قسمیں ہیں جسم- شکل- جوہر- اجزاء- ترکیبی الفاظ- معنی جمادیت کی تفصیل یہ ہے۔ انفسیات کی پانچ چیزوں سے ترکیب ہے۔ بو- ذائقہ- شکل- جلد- آواز- نباتات کی چار- ذائقہ- شکل- جلد- آواز- نباتات میں بو کا وجود نہیں مانتے- نورانیات میں شکل- جلد- آواز اس میں بو- اور ذائقہ تسلیم نہیں کیا جاتا- ہوا میں صرف جلد اور آواز- اس میں ذائقہ اور آواز نہیں- اور شکل بھی نہیں ہے جمادیات میں صرف آواز ان پانچوں میں ایک دوسرے سے نہیں اجزا کی کمی بیشی سے فرق ہوتا ہے - ان میں سے جمادیات کے یہ آثار ہیں بھاری ہونا- روکھا ہونا- نمکین ہونا- سخت ہونا- قابل گرفت ہونا- نباتات کے یہ آثار ہیں- چکنائی- نرم ہونا- ٹھنڈا ہونا- حیوانات کے یہ آثار ہیں- اوپر جانا- ہضم کرنا- [illegible] ظاہر کرنا (جن سے جیسی نظر آئیں) [illegible] [illegible] کرنا ہوا کے آثار ہیں- حیوانات [illegible]

انباتات [illegible] ایک دوسرے [illegible] روح میں ریاضات سے ایسی طاقت پیدا [illegible] ہے کہ عناصر اس کے [illegible]

عناصر کے اختیار میں اور قبضہ قدرت میں آ جاتے ہیں- اور وہ تمام افعال اس سے صادر ہوتے ہیں جو ان عناصر میں طرحاً فرداً پائے جاتے ہیں- اور ان میں سے اگر کسی ایک عنصر پر بھی قبضہ ہو جاتا ہے تو اس عنصر کے تمام صفات و [illegible] اس میں موجود ہوتے ہیں- اور وہ آثار بھی اس سے ظاہر ہو سکتے ہیں۔

انہیں تاثیرات کو معجزہ یا کرامت کہتے ہیں جس کا امکان دلائل مذکورہ سے ثابت ہوا- اور اس میں کسی استعجاب کی حاجت نہیں ہے- البتہ جن نگاہوں سے یہ چیزیں پوشیدہ ہیں اور جن لوگوں پر یہ حقائق راز سربستہ ہیں ان کے لیے حیرت کی چیز ہے۔

دوسرے خاصیت قوت نظری ہے- اس کا مطلب یہ ہے کہ نفس میں اتنی صفائی پیدا ہو جاتی ہے کہ نفس عقل فعال سے مل جاتی ہے- اور عقل فعال سے اس پر علوم عقلیہ کا فیضان ہوتا ہے- اس پر علوم عقلیہ کھل جاتے ہیں- چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ بعض آدمی فطرتاً ذہین اور ذکی ہوتے ہیں- کہ بغیر تعلیم کے [illegible] معلومات ہوتی ہیں- ان کو ایسی [illegible] ہوتی ہے کہ [illegible] سے [illegible] مسائل [illegible] حل کر سکتے ہیں اس [illegible]

[illegible]

سعی و کوشش کے کچھ نہیں آتا اسی کو درجہ کمال پر قیاس کرنا چاہیئے۔ جس کی درجہ ادنیٰ میں سینکڑوں مثالیں موجود ہیں۔ لہذا جو کیفیت کہ درجہ ادنیٰ میں پائی جاتی ہے اسی پر ہم درجہ اعلیٰ کو اس سے زائد کیوں نہ قیاس کریں۔ اور قیاس کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ظاہر ہے۔ کہ جس طرح نفس کی قوت عملیہ مادہ بدن میں تصرف کرتی ہے اسی طرح نفوس عالیہ مادہ عالم میں تصرف کرتی ہے۔ لہذا بیشتر ایسے اشخاص ہی ہیں جو علوم کو خود حاصل کرتے ہیں۔ بلاکسی تعلیم کے ظاہر ہے۔ کہ یہ علوم جو بلا تعلیم حاصل ہوئے وہ نفوس سے ہی مستنبط ہوئے ہیں۔ اس طرح پر کہ نتیجہ کا خیال دل میں گذرے جس کا تخیل یا علم پیشتر سے نہ تھا یہ القا ہوگا نفس کی جانب سے۔

تیسری خاصیت کمال قوت متخیلہ ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ جب اس قوت کا کمال ہوتا ہے۔ تو حالت بیداری میں عالم غیب سے اتصال پیدا ہوتا ہے جسطرح انسان عام طور پر حالت خواب میں ان حواس ظاہری کے معطل اور بیکار ہو جانے سے عالم ارواح سے معلومات حاصل کرتا ہے۔ اور خواب میں بسا اوقات ان واقعات پر مطلع ہوتا ہے جو آئندہ ٹھیک اسی طرح ہونے والے ہیں یا بخفیف تغیر۔ انسان خواب میں دیکھتا ہے۔ کہ زید آیا ہے دو روز یا تین روز کے بعد اور بعض اوقات اسی دن وہ آتا ہے بعض اشخاص خواب میں دیکھتے ہیں کہ میں نے سانپ کو ہاتھ میں لے لیا ہے۔ اور تھوڑے دنوں کے بعد اس

کو کچھ مال مل جاتا ہے۔ سانپ مال کی صورت مثالی ہے۔ اس لئے کہ جب اس نے سانپ کو لئے ہوئے خواب میں دیکھا ہے تو اس کو مال ملا ہے۔ اس لئے اس تجربہ نے ثابت کر دیا کہ وہ مال کو سانپ کی صورت میں دیکھتا ہے۔

ایک شخص نے امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا کہ میں نے دیکھا ہے کہ سورج میرے جسم پر طلوع ہوا ہے۔ آپنے فرمایا کہ بادشاہ وقت تم کو کوئی مرتبہ دیگا اور ایسا ہی ہوا۔ امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے اپنے بچپن میں جب وہ مکتب میں پڑھ رہے تھے دیکھا کہ میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے قریب آیا ہوں۔ اور اسے کھودا ہے اس خواب کو اپنے استاد سے بیان کیا۔ انہوں نے جواب دیا کہ تم بڑے متبع شریعت نبوی ہوگے۔ اور شریعت کی چھان بین کروگے چنانچہ ایسا ہی ہوا اس سے معلوم ہوا کہ حالت خواب میں کوئی ایسی کیفیت پیدا ہوتی ہے جو بیداری سے بالکل مختلف ہے اس کی تحقیق یہ ہے کہ جب روح ہماری ظاہر سے باطن کی طرف بند ہو جاتی ہے تو خواب نظر آتا ہے۔ یہ معلوم ہے کہ روح ایک جسم لطیف ہے۔ جو مرکب سے قوائے نفسانی اور حیوانی سے جرم سماوی کے مشابہ ہے اور اسی کے ذریعہ سے قوائے حساسہ محرکہ اپنے آلات سے ملتے ہیں۔ اعضائے ظاہری میں اسی کی وجہ سے احساس پیدا ہوتا ہے۔ جب اس کے مجازی میں کوئی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے جن سے اعصاب میں احساس ہوتا ہے تو حس باطل ہو جاتا ہے

اور ایک قسم کا سکون اور فراغت حاصل ہوتی ہے۔ جس طرح کسی آدمی کا ہاتھ مضبوط باندھ دیا جائے تو انگلیاں بے حس ہو جائیں گی۔ اور احساس فوراً باطل ہو جائے گا۔ اور جب چھوڑ دیا جائے تو کچھ دیر کے بعد روح پھر خون کی روانی کے ساتھ لوٹ آئے گی۔ اور حس بدستور قائم ہو جائے گا۔ یہ روح پھڑکنے والی رگوں کے ذریعہ سے تمام بدن میں پھیلتی ہے اور کبھی مختلف اسباب سے اندر کو بند ہو جاتی ہے۔ مثلاً شدت محنت کے بعد آسائش کی طلب ہوتی ہے۔ یا کثرت غور و فکر سے اندرونی تکان پیدا ہوتی ہے۔ جس سے نیند کا غلبہ ہوتا ہے۔ اور کسی امتلاء وغیرہ کے وقت اور کبھی روح حیوانی کی کمی نقصان کی وجہ سے تمام ظاہر اور باطن کے لئے روح کافی نہیں ہوتی۔ جس کے طبی اسباب بہت ہیں تو جب ان اسباب سے حواس بیکار ہو گئے تو نفس کو اور مشاغل سے یکسوئی ہوتی ہے۔ لیکن بیداری میں نفس ان افکار میں مشغول رہتی ہے۔ جنکو حواس ظاہری اور باطنی پیش کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً دیکھنا سننا وغیرہ کہ ان سب کا تعلق روح سے ہے اور یہ اعضا اسکے آلات ہیں۔ اسلئے ہر حاسہ کا تعلق روح سے ہی ہے اس لئے روح حالت بیداری میں خارجی محسوسات کے ادراکات میں مشغول رہتی ہے۔ اور اس کا کام جاری رہتا ہے بخلاف حالت خواب کے کہ جس حالت میں نفس کو یکسوئی ہو جاتی ہے اور ان ظاہری مشاغل کی رکاوٹ جاتی رہتی ہے۔ اس وقت اس میں ایسی استعداد پیدا ہوتی ہے جس سے وہ عالم غیب سے ملتی ہے۔ اور ارواح عالیہ اور جواہر کے نقوش پر اسکو اطلاع ہوتی ہے۔ ان میں سے جو اس کے اغراض کے مناسب ہیں اور اسکے کیفیات اور تخیلات کے لحاظ سے اہمیت رکھتے ہیں اسکو اخذ کر لیتی ہے۔

یہ صورت غیبی نفس پر اسطرح منطبع ہوتی ہے جیسے ایک آئینہ کی صورت دوسرے آئینہ میں نمایاں ہوتی ہے جب دونوں ایک دوسرے کے مقابل ہوں اور انکے درمیان میں کوئی حجاب نہ ہو وہ صورت اگر جزئی ہے اور اسکو قوت حافظہ نے محفوظ رکھا ہے اور قوت متخیلہ مصورہ نے اس میں کوئی تصرف نہیں کیا ہے تو خواب میں بعینہ وہی صورت جزئی نظر آتی ہے اور خواب سچا ہوتا ہے تعبیر کی کوئی حاجت نہیں ہوتی۔ اگر متخیلہ غالب ہوتی ہے یا نفس صورت کا ادراک بضعف کرتی ہے۔ تو متخیلہ فطرتاً اس شے کو جس کو نفس نے ادراک کیا ہے۔ دوسری صورت میں مناسب یا بلا مناسبت تبدیل کر دیتی ہے اور اس خواب کے تعبیر کی حاجت ہوتی ہے۔ اکثر انتقالات خیالی کے باصول نہ ہونے سے اسکی حالت مختلف ہوتی ہے جس سے تعبیر کی صورتیں بہی پیدا نہ ہوتی ہیں۔ اور ملحاظ اشخاص اور حالات اور مشاغل اور موسم کے تعبیر کی حالت مختلف ہوتی ہے کہ جس کو مفسر بلا خوض و غور اور ذکاوت کے سمجھ نہیں سکتا اور اکثر اس میں دھوکا ہوتا ہے۔ اور غلطی واقع ہوتی ہے۔

(باقی آئندہ)

شمس العلما علامہ محمد امین
چڑیا کوٹی

# غزلیں

## از شاعر کیف بارہ

قضا و جبر کے پرزے اڑا دیئے میں نے
مٹا دیئے کبھی ظلمات دہر اور کبھی،
بنائے کار محبت بگاڑ کر سب کچھ
تمام سوز نہاں ہوں فسردگی ہوں تمام
ملے زماں و مکاں کو نہ رازِ دستِ جنوں
کہاں یہ گردش و تابش کہاں یہ سیارے
زمیں پہ اثرِ ضبط اضطراب نہ پوچھ
قصور خلد بریں کی جلا ہوئی جن سے
دیئے ہیں ان میں بھی اہل جہاں کو درسِ حیات
خبر بھی جن کو نہیں گردشِ زمانہ کی
فریب محشر فردا میں اب دھرا کیا ہے
جفا سرشت زمانے میں جن کو کہتے تھے
دلوں کو اب نہیں فردوس گم شدہ کی تلاش
نگاہ یار کی کیفیتیں کھلیں جن پر
دلوں میں تا بہ قیامت اترتے جائیں گے
تڑپ مٹا کے دلوں کی کئے ہیں خون جگر

## حضرت فراق گورکھپوری

حجاب غفلتِ انساں اٹھا دیئے میں نے
چراغ شمس و قمر بھی بجھا دیئے میں نے
نصیب پھوڑ دیئے، دل بڑھا دیئے میں نے
حیات و موت کے اجزا ملا دیئے میں نے
الٹ کے تختۂ ہستی دکھا دیئے میں نے
نصیب خفتۂ دوراں جگا دیئے میں نے
فلک کے کنگرے اکثر ہلا دیئے میں نے
وہ خاک کو اثر کیمیا دیئے میں نے
مُرثیے ہیں جو زمانے گنوا دیئے میں نے
انہیں بھی وقت قیامت نما دیئے میں نے
اسی جہاں میں وہ فتنے اٹھا دیئے میں نے
وہ دل بھی بوئے وفا سے بسا دیئے میں نے
خدنگ عشق کے جوہر دکھا دیئے میں نے
نشاط بھی انہیں غم آشنا دیئے میں نے
وہ نشترِ غم فردا چلا دیئے میں نے
سکوں بھی عشق کو تاب آزما دیئے میں نے

جھلک ہے عشق کی اب جلوہ ہائے حسن میں بھی — حجاب صورت و معنی اٹھا دیئے میں نے
میں وہ نہیں کہ نہ سمجھوں پیام جذب نہاں — ابھرتے داغ محبت مٹا دیئے میں نے
بشر کی عمر دو روزہ کے راز ہائے سکوں — کشاکش ابدی سے ملا دیئے میں نے
نہ اب وہ ہوش کا عالم نہ بیخودی کے وہ رنگ — کہاں کے درد دلوں میں دبا دیئے میں نے
یہ گل کھلے کہ فضاؤں میں پڑ گئے رخنے — کہاں کہاں سے یہ دامن اڑا دیئے میں نے
زمیں سے تا بہ فلک جس لئے زلزلے آئے — اس انقلاب کے ڈنکے بجا دیئے میں نے
نہ پوچھ جلووں کو میرے مری بہار نہ پوچھ — نظارے طور و ارم بھی گرا دیئے میں نے
تمام سوز خلش ہے چمن میں جوش بہار — گلوں کی راہ میں کانٹے بچھا دیئے میں نے

فراق کام مرا پردۂ مجاز میں دیکھ
حقیقتوں کے خزانے لٹا دیئے میں نے

(فراق گورکھپوری)

# افسانے کے عناصر اور اردو کے مختصر افسانے

از خامہ حضرت نسیم رضوانی صاحب!

افسانے سے زیادہ دلچسپ اور افسانے سے زیادہ طویل عمر کی شاید ہی کوئی چیز دنیا میں ہو۔ بچے جوان اور بوڑھے غریب اور امیر زمانہ قدیم سے کسی نہ کسی صورت میں جب سے تمدن انسان سب افسانوں میں دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ اور لیتے رہیں گے فیشن بدل جاتے ہیں رسم و رواج تبدیل ہو جاتے ہیں سلطنتیں زیر و زبر ہو جاتی ہیں۔ اور قوموں کی یاد تک باقی نہیں رہتی لیکن جسطرح آج سے کئی ہزار سال قبل افسانہ گو غاروں میں آگ کے گرد بیٹھ کر لوگوں کے دل بہلایا کرتا تھا۔ اسیطرح آج بھی ہم ہر ایک اچھا افسانہ دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ گہوارے میں بچہ سونے سے قبل چڑیا اور کوے کی کہانی سننے پر مصر ہوتا ہے۔ طالب علم الف لیلہ اور طلسم ہوشربا کے سنسنی پیدا کرنے والے قصے پڑھنا چاہتا ہے۔ نوجوان رومانی اور کیف آور افسانوں کا مطالعہ کرتا ہے۔ اور معمر آدمی اپنی بیکار زندگی کے خلا کو پُر کرنے کے لئے ایسے ہی کوئی افسانہ پڑھنے لگتا ہے۔ الغرض زندگی کی کسی منزل میں بھی انسان افسانے کی ضرورت سے بالکل بے نیاز نہیں ہو جاتا۔ لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ افسانے کا مقصد صرف وقت گذارنے میں مدد دینا ہوتا ہے۔ ادبی افسانوں کا مرتبہ اس سے بلند تر ہے۔ یہ افسانے زندگی کی کلفتوں کے لئے دافع تشنجات یا جائے پناہ کے طور پر استعمال نہیں ہوتے۔ بلکہ ان افسانوں میں طویل یا مختصر طور پر کئی واقعات بیان کرکے کوئی نہ کوئی مفید نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے۔ یا قارئین کو کوئی مفید نتیجہ اخذ کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے جسطرح قرون اولیٰ کا افسانہ گو سامعین کے سامنے کوئی فرضی یا حقیقی قصہ بیان کرکے اس قصے سے مذہبی معاشرتی یا اخلاقی درس دینا چاہتا تھا۔ اس طرح اس زمانے میں بھی ہر ایک عمدہ افسانے کی تشکیل میں یہی جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔

اب میں یہ بیان کروں گا کہ عمدہ افسانے کے کیا عناصر ہیں۔ ان عناصر کی توضیح کے لئے اردو کے کامیاب طبعزاد مختصر افسانوں کی مثالیں استعمال کی جائینگی۔ لیکن سب سے پہلے ایک حقیقت کا بیان کرنا ضروری ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اُردو زبان میں مختصر افسانہ ایک نئی چیز ہے۔ شاعری کیطرح مختصر افسانہ خالصتہً ہندوستان کی پیداوار نہیں۔ بلکہ اس کی تخلیق کے لئے مغربی معاشرت اور مغربی ادب کا اثر ذمے وار ہے۔ اسی لئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اردو کی مختصر افسانہ نویسی ابھی تک ابتدائی منازل طے کر رہی ہے اور ابھی تک بہت کم اچھے طبعزاد افسانے لکھے گئے ہیں۔ ہمارے سستے (CHEAP)

افسانہ نگاروں نے مغرب کی کورانہ تقلید میں جو افسانے لکھے ہیں انکو ہندوستانی فضا، ہمارے سماج، ہمارے مفروضاتِ اخلاق اور ہماری روایات سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ ان اسباب کا ذکر کرنا سُود مند نہ ہوگا۔ لیکن آپ نے کئی دفعہ ایسے افسانے پڑھے ہونگے جنکا پلاٹ، جنکے کردار اور جنکی فضا ہمارے لئے بالکل اجنبی ہوتی ہے۔ اسکی وجہ یہ ہوتی ہے کہ یہ افسانے طبعزاد ہونے کے باوجود اجنبی اثرات کو قبول کرکے لکھے گئے ہوتے ہیں۔ ایسے ہی افسانوں پر تبصرہ کرتے ہوئے اگلے دن مرزا محمد سعید صاحب ایم۔ اے (ریٹائرڈ۔ آئی۔ ای۔ ایس) نے ریڈیو پر ایک تقریر کے دوران میں کہا۔ کہ مردہ قوم کا ادب بھی زندہ اور کیف ہوتا ہے۔ یہی حال ہمارے افسانوں کا ہے۔ جن میں زندگی کی کوئی روح نہیں ہوتی اور نہ ہی انہیں ہماری زندگی سے کوئی تعلق ہوتا ہے۔ (الفاظ میرے ہیں) لیکن اس کے باوجود گذشتہ چند سال میں ادب اردو میں چند نہایت اچھے افسانوں کا اضافہ ہوا ہے۔ اور دن بدن یہ رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ کہ جسطرح مغرب مختصر افسانوں کو اپنی زندگی کے آئینہ کے طور پر استعمال کر رہا ہے۔ اسی طرح ہم بھی افسانوں کو ہیجان انگیز جذبات اور سنسنی پیدا کرنے والے واقعات کے بیان سے گریز کرکے اپنی زندگی کا آئینہ دار بنائیں۔ اس سلسلے میں پروفیسر سید عابد علی عابد، منشی پریم چند آنجہانی، حضرتِ عاشق بٹالوی، ابوالاثر حفیظ جالندھری۔ پروفیسر سید فیاض محمود، مرزا عظیم بیگ چغتائی، مسٹر کرشن چندر اور حضرت وقار انبالوی کی کوشیش نہایت کامیاب ہیں۔
افسانے کی سب سے نمایاں اور پہلی خصوصیت "حرکت" ہوتی ہے۔ افسانے میں ایک زمانہ دوسرے زمانے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ کچھ واقعات رونما ہوتے ہیں۔ کوئی دخترِ صحرا رانی بن جاتی ہے، سپاہی جانبازی کے ثبوت دیتا ہوا فوج کا افسر بن جاتا ہے۔ اور کارخانے کا ملازم مالک کی اکلوتی لڑکی سے شادی کرکے اپنے مالک کا شریکِ کار اور بعد میں مالک بن جاتا ہے۔ یہ تمام واقعات دلخوش کُن ہوتے ہیں۔ لیکن بعض دفعہ افسانے کے کردار کی حرکت مختلف سمت میں ہوتی ہے۔ ایک جری سپاہی ذلیل ہو کر سفاک قاتل بن جاتا ہے۔ یا ایک نیک خصلت انسان کسی کے بے مروتی سے متاثر ہو کر تمام دنیا سے متنفر ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ حرکت بھی دلچسپ ہوتی ہے اور ہم اس حرکت کی دلکشی سے مسحور ہو جاتے ہیں۔ "حرکت" افسانے کا ایک ایسا لازمی عنصر ہے جس کے بغیر ہم افسانے کو پسند نہیں کر سکتے۔ خواہ یہ افسانہ مذہبی تمثیل کی شکل میں ہو یا کسی افسانہ نویس کی دماغی اختراع۔

کئی افسانوں میں حرکت نہایت وسیع پیمانے پر کی جاتی ہے۔ افسانے کے مختلف تار مختلف سمتوں میں ایک پلاٹ کو سُننے کے لئے بڑھتے رہتے ہیں اس صورت میں بھی حرکت افسانے کی جان ہوتی ہے۔ حرکت کی رفتار بعض دفعہ بہت تیز ہوتی ہے۔ اور بعض دفعہ نہایت سُست اس رفتار کو سنبھالنا کوئی آسان کام نہیں۔ کیونکہ دیکھا گیا ہے کہ بعض دفعہ کسی افسانے کے آغاز میں واقعات نہایت تیزی سے رونما ہوتے ہیں۔ لیکن ان واقعات کو کسی دلچسپ اختتام تک پہنچانے کے لئے درمیان میں افسانے کا تار و پو

... یہاں صدوقت صرف ہوتا ہے کہ افسانہ ... جاتا ہے۔ حرکت کی کامیاب مثالیں منشی ... آنجہانی کے افسانوں میں کثرت سے ملیں گی۔ وہ ... کرداروں کی شخصیت سے بالعموم افسانے کے آغاز میں ہی مکمل سا تعارف کرا دیتے ہیں۔ یہی تعارف افسانے کے اختتام تک کردار کی حرکت کے لئے ذمہ دار ہوتا ہے۔ افسانہ پڑھنے والے کو افسانے کے وسط میں یا ادھر اُدھر تکلیف نہیں دی جاتی کہ افسانے کی دلچسپ حرکت سے توجہ ہٹا کر کسی نئے کردار یا کسی مذکورہ کردار کے کسی نئے رخ سے تعارف پیدا کرے۔ "ماتا" میں چار کردار پیش کئے گئے ہیں جن کا افسانے کے آغاز میں ہی یوں تعارف کرا یا گیا ہے:۔

" بابو رام رکھا داس دہلی کے ایک مرفہ الحال کھتری تھے بہت ہی خوش وضع اور انتہا درجے کے اپ ٹو ڈیٹ۔ ان کی مہمان نوازی کی سارے محلے میں دھوم تھی۔ آئے دن احباب کسی نہ کسی تقریب سے جمع ہو جاتے ٹینس کھیلتے۔ تاش سے دل بہلاتے۔ ہارمونیم سے شوق کرتے۔ چائے پانی کا لطف اٹھاتے اور اپنے دریا دل میزبان کی فراخ دلی اور مہمان نوازی کی داد دیتے .......... آمدنی ... واقر تھے۔ مگر بابو صاحب کو اتنی فرصت نہ تھی کہ ... دیکھ بھال کرتے ..........

بابو صاحب کی قومی ہمدردیاں اور کوششیں نمائشی ... دبلی تھیں۔ ہاں اگر انہوں نے کسی اچھی ... تو وہ خاندان مشترکہ کی مخالفت ... مرحوم کے انتقال کے بعد بیوہ ماں سے ... ان کی بیوی

... مددگار تھیں۔ بیوہ ماں ... رہ سکتی۔ اس سے بہو کی آزادی میں فرق ...

.......... اس میں شک نہیں کہ انہوں نے ... راہ دے کر دس ہزار روپے اپنی ماں کے ... .......... لیکن بیٹے کی اس سعادت مندی ... ٹوٹا کہ وہ دہلی چھوڑ کر اجودھیا جا رہیں"۔

"اسی محلے میں ایک سیٹھ گردھاری لال رہتے تھے ... کا لین دین تھا ..........۔ ان سے مسٹر رام رکھا کی بہت ... تھی مگر جب کبھی روپوں کی ضرورت ہوتی تو سیٹھ گردھاری لال کے یہاں سے بے تکلف منگا لیا کرتے۔ آپس کا معاملہ ... صرف رقعے پر روپیہ مل جاتا .......... موٹر ... دس ہزار کی ضرورت ہوئی تو وہ وہیں سے آیا۔ گھوڑ دوڑ کے لئے ایک آسٹریلین گھوڑا ڈیڑھ ہزار میں لیا۔ وہ بھی سیٹھ جی کے یہاں سے آیا۔ رفتہ رفتہ کوئی بیس ... معاملہ ہو گیا"

بابو رام رکھا، ان کی اہلیہ، ان کی والدہ ... سیٹھ گردھاری لال کی شخصیتوں سے واقف ... کے بعد منشی پریم چند سرعت سے افسانہ کو حرکت ... بابو رام رکھا کی لا ابالی زندگی سے ... دن ... ہے سیٹھ گردھاری لال تقاضا کرتے ... بجیں ہوتے ہیں۔ کشیدگی عناد کی صورت ... سیٹھ جی نالش کر دیتے ہیں۔ اور بابو جی کی ... نیلام کرا دیتے ہیں پھر بھی کچھ ... بابو جی انتقامی جذبہ ... کی ...

سیٹھ جی سے یہ ملتا ہے کہ وہ اپنے قرضے کے عوض میں بابو جی کو قید کرا دیتے ہیں (غالباً ان دنوں قرضہ بل پاس نہ ہوا تھا) یہ خبر بابو جی کی بوڑھی ماں کو اجودھیا سے واپس کھینچے لاتی ہے۔ وہ سیٹھ جی کی منت سماجت کرتی ہے۔ کچھ روپیہ بھی واپس دینے کا وعدہ کرتی ہے سیٹھ جی پسیج جاتے ہیں اور اپنے فعل سے نادم ہو کر بابو رام رکھا کو رہا کرا دیتے ہیں۔ بابو جی کی والدہ اپنا روپیہ سیٹھ جی کے حوالے کر دیتی ہے۔ اور سیٹھ جی بابو رام رکھا کو اپنا جنرل منیجر بنا کر کاروبار شروع کر دیتے ہیں لیکن بابو رام رکھا کی اہلیہ کی کج خلقی کی وجہ سے انکی والدہ اجودھیا واپس لوٹ جاتی ہیں۔ "ماتا" کا مجمل طور پر یہ خلاصہ ہے۔ منشی پریم چند کے دیگر افسانوں میں بھی "حرکت" کا عنصر نہایت خوبی سے شامل ہوتا ہے۔ اور اس کی رفتار اس قدر تیز ہوتی ہے کہ آپ سارے افسانے کو ایک ہی سانس میں پڑھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہ خصوصیت سید عابد علی صاحب عابد اور حضرت عاشق بٹالوی کے افسانوں میں بھی نظر آئیگی۔

اچھے افسانے کا دوسرا عنصر کردار ہوتا ہے۔ بہت سے قارئین کرام کو اس جزو کی کچھ نہ کچھ شناخت ہوتی ہے۔ وہ ڈرامہ دیکھنے والوں کی طرح ہیرو کی تعریف کرنے اور بدمعاش پر آوازے کسنے کے لئے تیار رہتے ہیں لیکن شناخت کی یہ مقدار صرف آغاز کی حیثیت رکھتی ہے۔ کردار کی لازمی خصوصیت اس کا ارتقا ہے۔ ایک جگہ کھڑے رہنا کسی کو مرغوب نہیں۔ لہٰذا افسانے کے کردار کا کسی نہ کسی سمت میں ارتقا ضروری ہے۔ وہ حالات کے دباؤ کی وجہ سے یا تو قوی تر ہوتا جاتا ہے اور یا زوال پذیر ہو کر کمزور ہو جاتا ہے۔

کردار کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اسے حقیقی زندگی کا آئینہ دار ہونا چاہیئے۔ یہ وہ خصوصیت ہے جس کی مدد سے ہم آسانی سے اچھے اور بُرے افسانوں میں حدفاصل کھینچ سکتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ کردار حقیقی ہیں یا کہ نہیں۔ ان میں مختلف حالات کے زیر اثر مختلف تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں یا نہیں۔ یا محض مصنف اُن پر اچھے یا بُرے کا لیبل لگا کر افسانے میں ان سے ہر جائز یا ناجائز فعل تو سرزد نہیں کرا لیتا۔ بعض افسانوں کی ابتدا میں کسی کردار کی صفات بیان کر دی جاتی ہیں۔ یعنی یا تو اُسے ہیرو بنایا جاتا ہے۔ اور یا بدمعاش۔ پھر یہ کردار افسانے کے اختتام تک ویسے کا ویسے ہی رہتا ہے اُسے تبدیل ہونے کا کبھی موقعہ نہیں دیا جاتا۔ اس کی حیثیت صرف کٹھ پتلی کی ہوتی ہے۔ اور وہ مصنف کے اشاروں پر ناچتا رہتا ہے۔ ہیرو ہر ممکن اور ناممکن صورت حالات پر قابو پا لیتا ہے۔ اور بدمعاش سنگدل سے سنگدل انسان کو موم کر دینے والے مناظر سے بھی متاثر نہیں ہوتا ایسے افسانے کسی صورت میں بھی اچھے نہیں کہے جا سکتے۔ کیونکہ ان کے کردار انسانی کمزوریوں اور خوبیوں کے حامل نہیں ہوتے۔

کردار نگاری میں پروفیسر سید فیاض محمود، پروفیسر سید عابد علی عابد اور مسٹر کرشن چندر کو کمال حاصل ہے۔ ان حضرات کے افسانوں کے کردار زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں ہوتے ہیں۔ اور ہر لحظہ عام انسانوں کی طرح مختلف حالات کا اثر قبول کرتے رہتے ہیں طویل مثالوں کی گنجائش نہیں ورنہ میں پروفیسر سید فیاض محمود کے دو تین افسانے "لاری میں" "سکینہ" اور "نقش رنگیں" آپ کو پڑھ کر سناتا پروفیسر سید عابد علی عابد کے افسانے "محبت کی شام"

میں ایک کردار کے اخلاق کو مختلف حالات میں مختلف طور پر متاثر ہوتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ عاشق ایک مفلس لیکن خوددار آدمی ہے۔ وہ افلاس سے نجات پانے کے لئے جوا کھیل کر اپنی شمیر میں پہلی دفعہ گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ قمار خانے میں اناڑی ہونے کی وجہ سے وہ اپنا تمام جمع ہوا اگر اندوختہ سرمایہ ایک جعلساز کی نذر کر دیتا ہے۔ اور یہ معلوم کر کے کہ اُسے فریب دیا گیا ہے وہ جعلساز سے قصاص لینے کے لئے تل جاتا ہے۔ جعلساز کے مکان پر پہنچ کر عاشق اُس کی لڑکی کی نگاہوں کا ایک نظر شکار ہو جاتا ہے۔ حیاتِ معاشقہ کچھ طویل ثابت نہیں ہوتی۔ عاشق اور لڑکی کی پہلی ملاقات پر ہی لڑکی کا باپ لڑکی کو قتل کر دیتا ہے۔ کیونکہ لڑکی کو اس کے حریف سے محبت ہے اور وہ باپ کے سامنے اس کا اقرار بھی کر لیتی ہے۔ اس المیہ کا اثر عاشق عمر بھر فراموش نہیں کر سکتا وہ سوسائٹی سے انتقام لینے کے لئے ڈاکہ زنی کرتا ہے، قتل کرتا ہے اور ہر ایک ظلم روا رکھتا ہے لیکن کسی عورت کے زیور کبھی نہیں لوٹتا کیونکہ اس کے قلبِ سیاہ کا ایک کونہ عورت کے لئے جذباتِ نیائش سے ہمیشہ معمور رہتا ہے۔

حقیقی کردار کا نمونہ دیکھنے کے لئے مسٹر کرشن چندر کے اُن دو افسانوں کا مطالعہ بھی مفید ثابت ہوگا۔ جو "لاہور سے بہرام گلہ تک" اور "جہلم میں ناؤ پر" کے عنوانات سے لکھے گئے ہیں اور جدید ہمایوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

افسانے کا تیسرا عنصر فن کاری ہے۔ ہر ایک فن کار مختلف قسم کے مسالے اس لئے جمع کرتا ہے کہ وہ اِن مسالوں کو اپنا مقصد واضح کرنے کے لئے کوئی خوبصورت شکل دے اسی کوشش کا نام فن ہوتا ہے۔ اور اس کوشش کے دوران میں فن کار کے ذہن اور جمع کئے ہوئے مواد میں کشمکش پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر فن کار کسی ایسے مصور یا صنم گر کی طرح ہے جو سیاہی، رنگ یا مٹی سے اپنی انگلیاں میلی کرنی پسند نہیں کرتا تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ وہ فنی لحاظ سے کوئی قابلِ قدر چیز پیدا نہیں کر سکتا۔ اور اگر اس کا مواد یا مسالہ اس کے قابو سے باہر ہو جائے تو بھی وہ کام کی چیز نہیں بنا سکتا۔ اس لئے فن کار کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ کہ وہ اپنے جذبات اور مسالے میں ایک خوشگوار سا توازن قائم رکھے۔ جیسا کہ آپ حضرات کو معلوم ہوگا الفاظ کا مسالہ نافرمان اولاد یا منہ زور گھوڑے سے کسی طرح بہتر نہیں ہوتا لیکن اس کے باوجود جب ہم کسی ماہرِ قلم کی تصنیف کا مطالعہ کرتے ہیں۔ تو ہمیں الفاظ اس قدر سانچے میں ڈھلے ہوئے نظر آتے ہیں کہ ہم ہر ایک فقرے پر عش عش کرنے لگتے ہیں۔ بلکہ بعض دفعہ ہم یہ محسوس کرتے ہیں۔ کہ مصنف کے الفاظ سے کوئی بہتر لفظ تجویز ہی نہیں کیا جا سکتا۔ مصنف کی اس کامیابی سے قارئین بہت لذت اندوز ہوتے ہیں۔ مصنف قارئین کے تخیل کو اپنے الفاظ کی رو میں بہا کر لے جاتا ہے وہ الفاظ کی مدد سے ماضی کی افسوسناک یاد تازہ کرتا ہے۔ مکالمے کے چھوٹے چھوٹے فقروں بلکہ ایک ایک لفظ سے غم و مسرت کے جذبات کو مہیج کرتا ہے۔ اور پھر مہیج جذبات کو رفتہ رفتہ معمولی حالت پر لے آتا ہے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ وہ یہ کام کیسے کرتا ہے۔ کیا اس کے دل میں اس زبان کے لئے احترام موجود ہے جس سے وہ یہ اثرات پیدا کر رہا ہے۔ کیا اس کے ساتھ ہی وہ استعداد نڈر بھی ہے کہ اپنا مقصد واضح کرنے کے لئے وہ زبان کی

پابندیوں کو بالائے طاق رکھ کر ضرورت کے مطابق نئی چیزیں ایجاد کر لیتا ہے؟ کیا وہ ایک آدھ لفظ سے بھی غم و غصہ اور ابتہاج و مسرت کی انتہائی حالتوں کو بیان کر سکتا ہے؟ کیا اس کا اسلوبِ بیان اس قدر دلچسپ اور ذاتی ہے کہ اُس کی ہر اک تحریر آسانی سے پہچانی جا سکے؟ یہ تمام امور غور کے قابل ہیں اور اگر ان کا جواب اثبات میں ملے تو یہ مصنف کی کامیاب افسانہ نویسی کی روشن دلیل ہے۔

اچھا افسانہ نویس تشبیہات کا نہایت مفید استعمال کرتا ہے۔ اُسے معلوم ہوتا ہے کہ کسی چیز کی تعریف کرنے اور خصوصیات بیان کرنے کی بجائے اُسے کسی اور چیز سے تشبیہ دینے سے قارئین پر زیادہ اچھا اثر ڈالا جا سکتا ہے۔ ذیل کی دو مثالوں میں بالترتیب غم کی 'فراوانی' اور 'عجزِ لیاطہ' کو تشبیہات سے واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے:-

"[1] گاہے گاہے صحرا کی کسی پرسکون چاندنی رات میں ناگہانی طور پر طوفانِ باد و باراں شروع ہو جاتا ہے۔ اور دلفریب فضا کی تمام رعنائی آن کی آن میں غصب کر لیتا ہے اس وقت اس کی شدت اس قدر خوفناک ہو جاتی ہے۔ کہ محفوظ ترین قصور و محلات میں استراحت کرنے والے لوگ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے در و دیوار سے ہوا دلدوز آہیں پیدا کرتی ہوئی سنائی دیتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے عناصرِ فطرت انسان کی عظمت سے برسرِ پیکار ہیں اور فطرت انسان کی محدود ہستی کا مضحکہ اڑا رہی ہے لیکن طوفان تھمنے پر یہ خوف ناک یاد زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہتی۔ مطلع صاف ہونے پر انسانی ذہن ماضی کے خوف کو پس پشت ڈال دیتا ہے۔ بالکل یہی کیفیت غم کی ہے۔ بسا اوقات زندگی کے صاف مطلع پر غم دفعتاً کسی ناگوار واقعے کی تاریکی بن کر چھا جاتا ہے سنگین دل اور آہنیں اعصاب والے انسانوں کے حواس پر بے حسی طاری ہو جاتی ہے۔ غم کی تفصیلات مہیب شکلوں میں انسان کی قوتِ برداشت سے نبرد آزمائی کرتی ہیں۔ اور تقدیر انسانی عزائم کی شکست و ریخت کا مضحکہ اڑاتی ہے۔ لیکن یہ کیفیت دیرپا نہیں ہوتی غم کا طوفان بھی طوفانِ باد کی طرح ہنگامی ہے۔ البتہ یہ فرق ضرور ہے کہ اس کی یاد اتنی جلدی فنا نہیں ہوتی۔ اور بعض اوقات انسان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ناکارہ کر دیتی ہے۔"

"[2] تم نے کبھی کسی بڑے شہر میں عظیم الشان عمارات کو جلتے دیکھا ہے؟ اگر ایسی آگ لگے تو ہر ایک آدمی کی خواہش اُن فلک بوس شعلوں کو قریب سے دیکھنے کی ہوتی ہے۔ جو اپنی ہولناکی کے باوجود دوسروں کے لئے جاذبِ نگاہ ہوتے ہیں۔ لیکن صرف تماشائیوں کیلئے اگر تمہیں اس آگ کو فرو کرنے کی خدمت تفویض ہو تو یہ منظر تمہارے لئے یکسر دلچسپی سے معرا ہو جاتا ہے۔ پھر اس منظر کے سب اجزا مہیب صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ دھواں

[1] مصنف کے افسانہ 'حالات' سے انتخاب (مطبوعہ ادبی دنیا اپریل ۱۹۳۵ء)۔
[2] مصنف کے افسانہ 'سیاہ کار' سے انتخاب (مطبوعہ ادبی دنیا مارچ ۱۹۳۶ء)۔

جبس، ملتہب شعلے اور عمارت کی شکست و ریخت تمہارے جذبۂ جانبازی کا امتحان لینے لگتی ہے۔ اور تم آگے بڑھنے سے خائف ہو جاتے ہو۔ نا ہید ۔۔ ابی کی بھڑکتی ہوئی آگ کا مجسمہ تھی۔ میری شست اس کے سامنے پرِ کاہ سے زیادہ نہ تھی وہ اپنی تعلیم و تہذیب کے باوجود بسا اوقات اپنی آزادانہ زندگی سے مجھے خائف کر دیتی تھی۔ لپکتے ہوئے شعلے کی طرح اسے قریب سے دیکھنا مجھے بہت مرغوب تھا لیکن اپنے آپکو اس کی لپیٹ کے سپرد کرنے کا یارا مجھے نہ تھا۔ اس خیال سے میرا دم گھٹنے لگتا۔ مجھے اپنی کمزوری کا احساس تھا۔"

کامیاب فن کاری کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ افسانہ نویس بے جان چیزوں میں زندگی کی روح پھونک دیتا ہے۔ اس کے افسانوں میں بعض دفعہ در و دیوار باتیں کرنے لگتے ہیں۔ تصویریں کردار کا مضحکہ اڑاتی ہیں۔ ہوا کسی کی تحقیر کے لئے اس کی پگڑی اچھالتی ہے۔ پروفیسر عابد صاحب کے افسانہ 'مسافر' کا ایک انتخاب ملاحظہ ہو ۔ ۔ ۔ ۔

"انتہائی کوشش کے باوجود مجھے نیند نہ آئی ممکن ہے کہ شور میری بے خوابی کا باعث ہوا۔ بہرحال یہ درست ہے کہ جہاز کا ہر ایک حصہ کراہ رہا تھا۔ چیخ رہا تھا۔ ٹھنڈی سانسیں بھر رہا تھا۔ میرے ساتھ کے کمرے میں کوئی شخص ڈک کے تختہ اسپیئر نے کی مشق میں مصروف تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ای اتنا میں میرے برتھ کے نیچے سے میرا ٹرنک لڑھک کر باہر آگرا۔ میں نے بٹن دبا کر روشنی کردی۔ تاکہ اس کی حرکات کا مشاہدہ کر سکوں۔ میرا ٹرنک باوقار اور متین انداز سے کمرے سے باہر نکلنے کی کوشش میں مصروف نظر آتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ جہاز کو خیرباد کہنا چاہتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اس معاملے میں مجھے اس سے ہمدردی تھی۔ لیکن مصیبت یہ ہوئی کہ ابھی ٹرنک دروازے تک بھی نہ پہنچا تھا۔ کہ میرا سوٹ کیس بھی باہر آیا اور ٹرنک سے گتھم گتھا ہو گیا۔ میں نے بتی بجھا دی۔ اور ان دونوں کو اندھیرے میں اپنے اختلافات طے کرنے کے لئے چھوڑ دیا۔ کچھ عرصہ تو ایسا معلوم ہوتا رہا گویا مباحثہ بڑے زور و شور سے جاری ہے اور ان دونوں میں سے کوئی ایک اپنی جگہ سے انچ برابر بھی ہٹنے کو تیار نہیں ہے۔ مگر کچھ عرصے کے بعد نسبتاً خاموشی ہو گئی۔"

حرکت اور کردار کے وجود کا ادراک وقت اور مقام کے بغیر قطعاً ناممکن ہے۔ یہ دونوں اجزا یعنی مقام اور وقت مل کر ماحول تیار کرتے ہیں۔ اور یہی افسانے کا چوتھا عنصر ہے۔ افسانہ نویس کبھی قارئین کے تخیل کو گھسیٹ کر ماضی میں لے جاتا ہے اور کبھی مستقبل پر سے پردہ اٹھا دیتا ہے مقام کی حدود تباہ ہو جاتی ہے۔ اور ہم افسانہ نویس کے سحر کے زیر اثر خوشگوار مقامات کی سیر کرنے لگتے ہیں۔

ماحول بیان کرتے وقت یہ خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے کہ وہ افسانے کے کرداروں کے مطابق ہو۔ اور اس اثر میں اضافہ کر رہا ہو جو مصنف افسانے کے دیگر عناصر سے پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ابو الاثر حفیظ جالندھری کے افسانہ 'آوارگی' میں سوسائٹی کے ایک ٹھکرائے ہوئے فرد کے جذبات کو بیان کرنے سے پہلے ماحول یوں تیار کیا گیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"شام سے ہی آسمان پر سیاہ بادل گھرے ہوئے

تھے جوں جوں وقت گذرتا گیا بازار کے چراغ ایک ایک کر کے خاموش ہوتے گئے۔ خوانچے والے، تمباکو فروش تنبولی، نصف شب تک لہرا لہرا کر گرما گرم چائے، کی صدا لگانے والے آج دس بجے ہی اپنے بچے کچھے سودے سمیٹ سمٹا گھروں کو جا چکے تھے۔ اکا دکا مسافر، بہکے ہوئے شرابی، آوارہ مزاج سیلانی تماش بینوں کے گروہ طوفان کی آمد آمد دیکھ کر اپنے اڈوں کی خیر منا رہے تھے۔

میرے لئے اس کے سوا چارہ کار نہ رہا کہ آج معمول سے پیشتر اپنی ویران کوٹھڑی کی خیال آغوش تنہائی میں چلا جاؤں،

. . . میں نے دیا سلائی کی ڈبیہ سے جس میں دن بھر کی سگرٹ نوشی کے سبب صرف چند دیا سلائیاں باقی تھیں ایک سلائی اور موم بتی کا ٹکڑا جو چارپائی کے داہنے پائے پر چسپاں تھا۔ روشن کر دیا۔ اور ایک چھلتی ہوئی نگاہ اپنی کوٹھڑی اور اس کے سامان پر ڈالی۔

ایک فرسودہ چارپائی تھی جس پر نامکمل بستر تھا۔ دو کمل ایک تکیہ تھا۔ چند پرانے ادبی رسائل جو کباڑی کی دکان سے خریدے گئے تھے۔ دو کتابیں۔

چارپائی کے دو نو طرف سینکڑوں سگرٹوں کے جلے ہوئے ٹکڑے، سوختہ دیا سلائیاں، سگرٹ کے خالی بکس، دو تین ملے دلے کاغذ جن پر میرے تازہ نتائج افکار یعنی وہ اشعار درج تھے۔ جو نیند کو بلانے کے لئے مجھے ہر شب موزوں کرنے پڑتے تھے ؟؟

بعض دفعہ ماحول کو تقابل کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اور اس سے ایک پس نظر تیار کیا جاتا ہے۔ جس سے تقابلہ ہونے پر افسانے کے کئی دیگر محاسن نمایاں طور پر نظر آنے لگتے ہیں۔ اور علاوہ اثر نہایت شدت سے محسوس ہوتا ہے۔ خوبصورت ماحول سے بعض دفعہ نہایت غم انگیز اثر پیدا کیا جاتا ہے۔ چاندنی راتوں میں غمزدہ دل اور بھی زیادہ ملول ہو جاتا ہے۔ کسی دلکش راگ سے دکھے ہوئے دل کے آنسو بہنے لگتے ہیں۔ اور کسی فقیر کے مکروہ اور گھناؤنی شکل دیکھ کر اس پر رحم آنے کی بجائے آدمی قہقہہ لگا دیتا ہے۔ افسانے کے اصلی موضوع کے برعکس ماحول تیار کرنا۔ افسانے کو موت بنانے کے لئے نہایت کامیاب ترکیب ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ ترکیب نہایت خطرناک بھی ہے۔ کیونکہ اگر اس کوشش میں کامیابی نہ ہو تو افسانہ نہایت بھونڈا بن جاتا ہے۔

اس وقت تک میں افسانے کے پانچ عناصر میں سے اُن چار کا ذکر کر چکا ہوں۔ جن سے ایک عمدہ افسانہ تیار کیا جاتا ہے۔ افسانے کا آخری عنصر نہایت اہم اور اس کے ساتھ ہی نہایت لطیف بھی ہے۔ اس دنیا میں ہم ہر ایک فعل کے لئے وجہ دریافت کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ہم ایک عرصے تک سطحی باتوں سے مطمئن نہیں ہوئے۔ افسانے کی سریع حرکت، کرداروں کے ارتقا، مناظر کی تبدیلی، ماحول کی خوبصورتی اور الفاظ کی دلکشی سے ہم متاثر ضرور ہوتے ہیں۔ لیکن صرف ان چیزوں سے مطمئن نہیں ہوتے۔ افسانے کی ہر ایک سطر (پڑھنے والے) کے دل میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ یہ کہ مصنف نے یہ افسانہ کیوں لکھا ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ اگر اس سوال کا جواب اطمینان بخش ہے تو مصنف کا افسانہ کامیاب ہے۔ ورنہ اُس کی ساری محنت رائگاں سمجھی جائے گی۔ کسی افسانے کو ادبی لحاظ

سے اُس وقت تک غیر فانی زندگی نہیں مل سکتی جب تک اُس کا کوئی مقصد نہ ہو۔ اور جب تک اس میں ہمارے ہر روز کے مسائل حیات مثلاً موت و حیات، محبت و نفرت اور زندگی کی کشمکشوں کا بیان نہ ہو۔ ان مسائل میں انسان ہمیشہ دلچسپی لیتا ہے۔ ان افسانوں کا مواد ہمیشہ نیا ہوتا ہے۔ اور ان میں جن بنیادی جذبات کا ذکر ہوتا ہے وہ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں اور ہر زمانے، فیشن اور انداز کے بدلنے پر بھی انسان کو متاثر کرتے رہتے ہیں۔ اس کے برخلاف ادنیٰ درجے کے افسانہ نگاروں کے افسانوں میں صرف ہنگامی دلچسپی لی جاتی ہے۔ زمانے کے رجحان میں تھوڑی سی تبدیلی ہونے پر اُن سے ساری دلچسپی ختم ہو جاتی ہے۔ ایسی کتابوں اور ایسے افسانوں کا ذکر کرنا مستحسن نہیں لیکن حاضرین اگر اپنے حافظے پر زور دیں تو انہیں کئی ایسی افسانوں کی کتابیں یاد آئیں گی جن کا مطالعہ چند سال پہلے ہر کہ و مہ کو مرغوب تھا۔ لیکن آج صرف کسی تاجر کتب کی فہرست میں انکا نام رہ گیا ہے اور شاید چند دنوں تک یہ نام بھی مٹ جائے۔

ہر ایک افسانے کا ایک مقصد معین کرنے میں منشی پریم چند آنجہانی نے نہایت کاوش سے کام لیا ہے۔ ان کا کوئی افسانہ بغیر کسی مقصد کے نہیں لکھا گیا۔ حضرت عاشق بٹالوی نے اپنے تمام افسانوں کا مقصد اپنے افسانوں کے مجموعے 'سوز تمام' میں یوں بیان کیا ہے:

'ہندوستان میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کی زندگی خارجی و داخلی انقلابات سے بری طرح متاثر ہو رہی ہے۔ مغرب و مشرق کے اتصال سے ہمارے پرانے رسم و رواج مٹ رہے ہیں اور حالات و واقعات کی موجودہ روش دیکھ کر وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ معاشرتی تبدیلیاں کہاں جا کر ختم ہوں گی۔ اور ہماری تہذیب کون کون سے قدیم عناصر ترک کر کے کون کون سی جدید باتیں اپنے اندر جذب کرے گی۔ اور اس کے بعد ہمارا تمدن کون سی وضع اختیار کرے گا۔ اِس کتاب (سوز نا تمام) میں آپ بیشتر افسانے ایسے ملاحظہ فرمائیں گے جو اُس روحانی و ذہنی کشمکش اور اس قلبی و دماغی اضطراب کے آئینہ دار ہیں۔ جس کا شکار ہمارے ملک کے جدید تعلیمیافتہ نوجوان ہو رہے ہیں'

'سوز نا تمام' کے مطالعے کے بعد مصنف کے ادعا کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اور محسوس ہوتا ہے کہ مصنف اپنے نظریات کی توضیح کرنے میں کامیاب رہا ہے۔

(نسیم رضوانی)

---

# سہ آتشۂ خیّام

ازجناب یزدانی صاحب جالندھری

(عمر خیام)

من بندۂ عاصیم رضائے تو کجاست تاریکِ دلم، نور صفائے تو کجاست
مارا تو بہشت اگر بطاعت بخشی این مزد بود لطف وعطائے تو کجاست

(آغا شاعر قزلباش)

پاپی سہی، پر تیری رضا ہے وہ کہاں تاریک ہے دل، نور صفا ہے وہ کہاں
گر مجھ کو بہشت بندگی سے بخشا اُجرت ہوئی یہ، لطف وعطا ہے وہ کہاں

(یزدانی جالندھری)

ہوں غرقِ گنہ، تیری رضا ہے تو کہاں ہے قلب سیہ، نور صفا ہے تو کہاں
بخشے جو بہشت تو عبادت کے عوض یہ مزد ہوئی، لطف وعطا ہے تو کہاں

(۲)

(عمر خیام)

گویند کہ مردرا ہنر می باید یانسبتِ عالئ پدر می باید
امروز چناں شدست درنوبتِ ما کاینہا ہمہ ہیچ، زر می باید

(آغا شاعر قزلباش)

سنتے تھے کہ مرد کو ضروری ہے ہنر  یا اچھی ہو اچھی باپ والا گوہر
آج اپنے زمانے میں عجب نوبت ہے  وہ سب ہیں فضول چیز، زر چاہیئے زر

(یزدانی جالندھری)

کہتے ہیں کہ مرد کو ہنر ہے لازم  یا نسبتِ عالیٔ پدر ہے لازم
لیکن اس دورِ پرفتن میں ہمدم  یہ سب ہیں فضول و ہیچ، زر ہے لازم

# (۳)

(عمر خیام)

عمرِ تو بہ دو صد و چہ سہ صد چہ ہزار  زیں کہنہ سرا ترا برندت ناچار
گر بادشہی وگر گدائے بازار  ایں ہر دو بیک نرخ بود آخرِ کار

(آغا شاعر قزلباش)

سَو دو سَو کی ہو عمر تری یا کہ ہزار  اس ٹوٹے کھنڈر سے لے چلینگے چار
سلطان ہو تُو کوئی کہ بازاری فقیر  ہے ایک ہی بھاؤ دونو کا آخرِ کار

(یزدانی جالندھری)

سو سال ہو عمر تیری ہو یا کہ ہزار  جانا ہی پڑے گا اس سرا سے ناچار
ہو بادشاہ یا کہ ہو گدائے بازار  انجام ہے دونوں کا یہی آخرِ کار

(یزدانی جالندھری)

# دل کی پیاس

از جناب حیات ترین صاحب

گذشتہ سے پیوستہ

"ہاں یہ مزدور ہیں کاریگر ہیں اور میرے زرخرید ہیں" سرمایہ دار نے مزدوروں کو حقارت سے دیکھتے ہوئے ظفر کے سوال کا جواب دیا۔

"سب کچھ سہی مگر کیا تمہاری طرح انسان نہیں ہیں"

"پھر کیا یہ انسانیت کا عجب وغرور اور عقل انسانی کا جنون وفتور نہیں ہے" ظفر نے ترش رو ہو کر کہا "ایک انسان نازو نعمت اور مال ودولت کے فانی سروسامان سے بہرہ مند ہو کر ہوا میں اپنا مقر نخوت وشخصیت تعمیر کرے اور لاتعداد انسان اُسکے سایہ سے کچلے جائیں"

"جناب صاف صاف بتائیے آپ کا مطلب کیا ہے؟" سرمایہ دار بگڑ کر بولا۔

"میں کہتا ہوں کہ جب فطرتاً ہر انسان انسان ہے تو ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ ہونی چاہئے" ظفر نے تلخ لہجہ میں کہا۔

"کیا آپکا مطلب یہ ہے۔ کہ دولت مند اپنی محنت اور عقل سے کمایا ہوا روپیہ غریبوں کو مفت بانٹ دیں۔ خوب یہ تو عجب احمقانہ قانون ہوگا" سرمایہ دار زیر لب مسکرا کر بولا۔

"اگر ایسا ہو تو تعجب کی کیا بات ہے جبکہ یہ تمہارا مال ودولت انہیں غریبوں کے خون سے سینچی ہوئی ایک کائنات ہے" ظفر نے کہا۔

"مگر ہر انسان کی تقدیر یکساں نہیں ہو سکتی"

"نہیں ہو سکتی تو اُسے یکساں کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے"

"ایسا نہیں ہو سکتا" سرمایہ دار غصہ میں چلا کر بولا "اگر مزدور سرمایہ دار کی ہمسری کرے گا۔ تو سرمایہ دار اسے اپنے راستے کی ٹھوکر سمجھ کر لات مار دے گا۔ مزدور صرف ہماری رعایت وعنایت سے بنا ہوا ایک متحرک پتلا ہے جس کا رشتہ حرکت ہمارے ہاتھ میں ہے اگر ہمارے ہاتھ آج ٹھہر جائیں تو مزدور کی صبح شام سے اور زندگی موت سے بدل جائے"

"بے شک گویا آپ ہی ان کے خدا ہیں" ظفر نے باواز بلند کہا "اے خودی پسند خدافروش انسان! تیرے ذہن کی یہی غلطی تجھے درد انسانیت سے محروم کئے ہوئے ہے۔ سر جھکا اور غور کر جس خدا نے مزدور کو تیرا مملوک ومحتاج بنایا ہے کیا اس میں اتنی قوت نہیں کہ تجھے مزدور کا غلام بنا دے"

سرمایہ دار ہنٹر پھٹکارتے ہوئے بولا:- "ہوگی۔ مزدور اب تو ہمارا آلۂ کار ہے اگر وہ ہمارا شکر ادا نہ کرے تو گنہگار ہے"

یہ مغرورانہ الفاظ سن کر ظفر کی آنکھوں میں غصہ کی چمک نمودار ہوئی۔ نہایت ہی تلخ لہجہ میں سرمایہ دار سے مخاطب ہو کر چلا دیا:-

اے مزدور کا پاک خون چوسنے والے ناپاک اژدھے! تیرا ضمیر [illegible] ہے۔ مزدور تیرے جور و بے جا سے تنگ آ گیا ہے۔ اس کی رگ رگ تیری عادتِ استبداد سے کچلی ہوئی ہے اور وہ [illegible] سے بیکار رہتے ہیں۔"

"چپ رہو" سرمایہ دار نے ترش رو ہو کر کہا "مزدوروں کی حمایت میں [illegible] نہ بولو۔ تمہیں کیا معلوم ہے کہ مزدوروں کا [illegible] ان بیچاروں کا جیسے اور کتنا سخت لوہے کا دل ... [illegible] رہتے ہیں"

"مجھے سب معلوم ہے" ظفر طیش آمیز الفاظ میں بولا "تم لوگ ان غریب طبقے کے خون سے اپنی زندگی کا باغ سینچتے ہو لیکن ان کی آبیاری کا مطلق خیال نہیں کرتے ۔۔۔ دیکھو تمہاری نخوت و تغافل نے انہیں [illegible] یہاں تک [illegible] ہیں۔ اپنی فربہ اندامی اور زرق برق لباس پر نظر ڈالو۔ اس کے بعد ان کی نازک حالت پر غور کرو"

"یہ سب ناشکرے اور احسان فراموش ہیں" سرمایہ دار مزدوروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حقارت آمیز الفاظ میں بولا۔

ظفر کی اس قابل قدر بحث سے تمام مزدور متاثر ہوئے ان کی [illegible] بھڑک اٹھی۔ ایک مزدور سرمایہ دار سے مخالف ہو کر چلایا۔

"احسان فراموش ہم نہیں تم ہو۔ ایک روپیہ کا مال آٹھ آنہ میں لے کر اپنا خزانہ بھرتے ہو۔ اور پھر بدنام ہمیں کرتے ہو"

دوسرا بولا "دس روپیہ میں چار روپے دیکر میرا مال لیا اور داموں کو کل پر ٹال دیا۔ آج دو مہینے ہو گئے۔ چھ روپے ابھی تک نہیں ملے۔ دس چکر کئے۔ ہزار منتیں کیں۔ مگر تمہارا دل نہ پسیجا۔ یہ احسان ہے یا ظلم ہے"

"جھوٹ ہے غلط ہے" سرمایہ دار غیض و غضب میں آکر ہنٹر گھماتے ہوئے چلایا۔ "خبردار خاموش ہو جاؤ۔ ورنہ ابھی ہنٹر کی ایک ہی گردش سے ان کمزور جسموں پر خوبصورت بیل بوٹے بنا دونگا"

"ایسا نہیں ہو سکتا" ظفر نے بآواز بلند کہا "یہ ہنٹر کی گردش اور یہ خود نمائی و خود داری کی نمائش صرف اس وقت تک ہے جبتک مزدور کی رگوں میں خونِ حمیت غصے اور غیرت کی آگ سے تپ کر جوش میں نہیں آتا۔ جس دن مزدور کو اپنے انسان ہونے کا احساس ہو گیا۔ تو سمجھ لو۔ کہ تمہارا ستیاناس ہو جائیگا"

"بس میرا وقت خراب نہ کرو" سرمایہ دار دوسری طرف منہ پھیرتے ہوئے زور سے چلایا۔

"وقت ہی نہیں یہ مظلوم تمہاری قسمتوں کو بھی خراب کرنے والے ہیں" ظفر نے بلند لہجہ میں کہا "وہ وقت بہت قریب ہے جب انسان انسان کی محکومیت کا جوا اپنے کاندھوں سے اتار کر پھینک دے گا۔ اور دنیا آزادی کی پُرسکون فضا میں سانس لے گی"

ظفر اور سرمایہ دار کی اس بحث و تکرار نے ایک اچھا خاصا مجمع اکٹھا کر لیا تھا۔ تمام لوگ ظفر کی جادو بیانی اور سحر انگیز بحث سے مسحور ہو رہے تھے۔ ظفر کو آنکھوں پر جگہ دینے لگے۔ ایک مزدور نے زور سے کہا۔ "مزدوروں کا حمایتی" تمام نے فلک بوس لہجہ میں پکارا "زندہ باد" گویا ایک فلک شگاف نعرہ گونج اٹھا جس نے سرمایہ دار کو آٹھ آٹھ آنسو رلا دیا۔ وہ اپنی زندگی کو خطرے میں دیکھ کر بڑبڑاتا ہوا اپنے گھر میں داخل ہو گیا۔ "اگر مزدور باغی ہو گئے تو شبہ نہیں ان کی حالت تمام ہوگی۔ مگر مزدور مزدور ہی رہیگا"

سرمایہ دار کے چلے جانے کے بعد تمام لوگ ظفر کو تکنے لگے۔ اس کی اس بہادری پر عش عش کر اٹھے۔ آپس میں اس کی تعریف کے خوب پُل باندھے۔ اور چہ میگوئیاں بکثرت

ہوئیں۔ ظفر کسی گہرے خیالات میں منہمک تھا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد پبلک سے مخاطب ہو کر ظفر نے تقریر کی:۔

اے میرے ہموطن بھائیو! اور بزرگو!! دیکھو یہ دنیا ایک عجیب جگہ ہے ایک شخص کماتا ہے دوسرا کھاتا ہے۔ ایک محنت کرتا ہے دوسرا اسکی محنت کی بدولت گلچھڑے اڑاتا ہے ایک پالکی اٹھاتا ہے دوسرا پالکی میں سوار ہوتا ہے۔ ایک کو بھوک ستاتی ہے تو دوسرا بھوک کو ترستا ہے۔ ایک کوڑی کوڑی کے لئے محتاج ہے دوسرا بے انتہا دولت کا مالک ہے ایک کو صاف اور صحت بخش پانی نصیب نہیں۔ دوسرا دس پندرہ روپے شراب کی ایک بوتل پر خرچ کر ڈالتا ہے۔"

ظفر کی اس دردناک تقریر سے تمام لوگوں کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ ظفر نے مزید تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا:۔

"آہ — آبادی کا ایک طبقہ ایسا ہے جس کو اپنے گھر مٹی کا دیا جلانے کی توفیق نہیں۔ دوسرا طبقہ ایسا ہے جس کے در و دیوار بجلی کے چراغ کی بے پناہ روشنی سے جگمگا رہے ہیں۔ آبادی کا ایک طبقہ ایسا ہے جس کو اپنا تن ڈھانپنے کے لئے موٹے سے موٹا کپڑا میسر نہیں ہوتا۔ دوسرا ایسا ہے جس کے کتوں کے لئے مخمل کی پوشاکیں تیار ہوتی ہیں۔ آبادی کا ایک طبقہ ایسا ہے۔ جس کو مونج کی چارپائی نصیب نہیں ہوتی۔ دوسرا ایسا ہے جسکو اعلیٰ سے اعلیٰ کمانی دار پلنگوں اور نرم سے نرم مخملی گدیلوں اور تکیوں سے بھی بے اطمینانی رہتی ہے۔ بنی نوع آدم کا ایک حصہ دن رات محنت شاقہ کرتا ہے۔ اور پھر بھی گوناگوں زحمتوں، اور مصیبتوں کا شکار رہتا ہے۔ دوسرا حصہ لس سے مس نہیں کرتا۔ لیکن پھر بھی دنیا کی تمام آسائشیں اُن کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی رہتی ہیں۔ یہ قدرت کا . . . اصول ہے۔ کہ وہ ایک انسان کو اتنا بے کس و مجبور، ایک کو اتنا متکبر و مغرور بناکر ایک کے لئے دنیا کو دوزخ اور دوسرے کیلئے جنت بنادیتی ہے — آہ یہ بزم عالم کا گوشہ شورش کدہ حیات ہے۔ مزدور اپنی فلاکت و مظلومی کا شکار ہے سرمایہ دار اپنی نخوت و پندار میں گرفتار ہے۔ بچا الٰہی — ! ہمیں اس پاپی دنیا کی الجھنوں سے بچا"

تقریر ختم کرتے ہی ظفر نے ایک سمت کا رخ کیا اور چشم زدن میں غائب ہو گیا۔ دیگر افراد بھی اس کی بلند خیالی کا تصور لئے اپنے اپنے گھر روانہ ہو گئے۔

## (۴)

دس بج چکے تھے۔ ستاروں نے اپنے روئے روشن پر ایک دامن سفید رنگ کا ڈالا ہوا تھا۔ کاش بیگانے اسے ہٹا کر اپنا دل بہلانے کیلئے دنیا سے آنکھیں لڑا لیتے۔ روئے فلک پر ایک عجیب دلکش منظر دکھائی دے رہا ہے۔

ظفر کھانا کھانے کیلئے گرانڈ ہوٹل کے ایک عالیشان کمرہ میں داخل ہوا۔ کھانا طلب کیا۔ اور نوش کرنا شروع کر دیا۔ اسکے کمرے کے ساتھ والے بڑے ہال میں مختلف میزوں کے سامنے مختلف مذاق کے لوگ کرسی نشین تھے۔ ایک پر چند شرابی ایک پر چند جواری ایک پر گنجفہ باز اور کچھ لذائذ پسند اشخاص اپنے اپنے شغل میں مصروف تھے۔ سامنے نیم وا درمیانی دروازہ میں سے ظفر سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ شرابی۔ جواری اور گنجفہ باز اپنی اپنی دھن میں مست تھے آخر ایک شرابی کی تعریف میں بولا:۔

"آہا۔ شراب بھی کیا چیز ہے۔ کیسا ہی غم ہو، کتنا ہی

سنج ہو۔ ادھر ایک جام چڑھا۔ ادھر آنکھوں میں سرور آیا۔ خدایا! صرف شراب پینے کا یقین ہو تو دنیا میں کئی ہزار سال تک سکون سے زندگی بسر کر سکتا ہوں۔"

سکون کا نام سنتے ہی ظفر چونک پڑا۔ شرابی کی سکون منتشر باتوں کی طرف متوجہ ہوا۔ اور تو یہ خط اٹھانے لگا۔ ایک جواری اپنی آنکھ آسمان پر کھینچتے ہوئے بولا۔

"دولت پانی ہے جیسے یہ بہتا پھرتا ہے آج میں کئی لاکھ روپے تک دنیا کی دولت بڑھانے کیلئے آغوشِ سکون میں پرورش پا سکتا ہوں۔"

گنجفہ باز بھی خاموش نہ رہا۔ وہ بھی اپنے آپ کو شاخِ زعفران سمجھتے ہوئے بولا۔

"شرابی اور جواری سب سوسائٹی کے گنہگار ہیں۔ گنجفے باز بڑے نکوکار ہیں۔ ہوٹلوں میں، جلوت میں، خلوت میں طوائفوں کے بالاخانوں میں، ایکٹرسوں کے کاشانوں میں، ریل میں غرضیکہ ہر جگہ گنجفہ کھیلنا جائز ہے۔ فلیش۔ ترپ کاٹ۔ غلام کاٹ۔ غلام چوپرست کاٹ۔ بیتے کیسے پیارے نام ہیں۔ گنجفہ بازی و تاش بازی بڑے شریفوں کے کام ہیں۔ ہم ہر روز تاب سکون سے نہایا کرتے ہیں۔"

شرابی۔ جواری اور گنجفہ باز کی باتوں نے ظفر کے سکون طلب دل کو موہ لیا۔ وہ ان باتوں سے حظ اٹھا رہا تھا۔ دل میں سوچ لیا تھا کہ آج میں منزلِ سکون تک پہنچ گیا ہوں۔ اور یہ بھی تہیہ کر لیا تھا کہ میں بھی جواری شرابی یا گنجفہ باز بن کر سکون حاصل کروں گا۔ اسی کشمکشِ خیالات میں محو تھا کہ ایک گنجفہ باز نے دوسرے گنجفہ باز کو تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا:۔

"ترپ میں نے لگایا تھا۔ تو نے پتے کیوں اٹھا لیئے۔ اسے تیرے باپ نے بھی کبھی ترپ لگایا تھا" دوسرا بولا۔

کیا بکتا ہے مردود۔

یہ کہتے ہی ہاتھاپائی شروع ہو گئی۔ جواری اور شرابی بھی لٹھم لٹھا خوب لے دے ہونے لگی۔ فرش پر نقرئی سکوں کے گرنے کی جھنکار شراب کی بوتلوں کی ٹوٹنے کی آواز۔ گالی گلوچ اور ہاتھاپائی سے ہال کمرہ گونج اٹھا۔ چند میزیں و کرسیاں ٹوٹ گئیں۔ دیواروں پر لٹکے ہوئے رنگین شیشے نیچے فرش پر سجدہ ریز ہونے لگے۔ کمرے کی آرائش بگڑ گئی۔ اتنے میں مالک ہوٹل پہنچ گیا۔ وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی باآواز بلند للکارا:۔

"تم لوگوں نے کیا شور مچا رکھا ہے۔ ابھی پولیس آئے گی تو چالان ہو جائے گا۔

"چالان کیسے ہو جائیگا" ایک جواری بولا۔ "ہم پولیس کو دس روپے پیشگی پہلے چڑھا آئے ہیں۔"

"میاں انسپکٹر تو میں ہوں۔ چالان کون کرے گا" ایک شرابی نے سر چڑھ کر کہا۔

گنجفہ باز بادشاہ اور بیگم کا پتا دکھاتے ہوئے بولا:۔

"بادشاہ اور بیگم تو میرے ہاتھ میں ہیں۔ حکومت میری ہے تم سب چپ رہو۔"

اس پر تمام از سرِ نو بھڑک اٹھے۔ پھر ہاتھاپائی زور پکڑ گئی مالک ہوٹل ٹیلیفون کی طرف بڑھا۔ ظفر کی خاموشی کے بادل پھٹ پڑے۔ آگے بڑھ کر ہوٹل والے سے مخاطب ہو کر بولا:۔

"ٹھہرو ان لوگوں کو کوئی گرفتار نہیں کر سکتا۔"

"آپ کون؟" ہوٹل والے نے دریافت کیا۔

سوسائٹی کے رسم و رواج کو کچلنے والا ایک انسان" ظفر نے

جواب دیتے ہوئے کہا ”دنیا کی تخریب گاہوں کو پامال کرنے والا ایک شہری حق کو باطل سے نکالنے والا ایک ناخدا، سماج کے مفروضہ قوانین کو کمزور شیشے کیطرح توڑ دینے والا ایک بہادر اور ہنگامہ راز عالم میں سکون، شانتی اور پریم کا متلاشی ایک دیوانہ“

ہوٹل والا فرضی قہقہہ لگا کر زور سے بولا ”کیا آپ کو جنون تو نہیں ہوگیا“

ہاں مجھے جنون ہوگیا ہے دنیا میں جو شخص شورش و فساد پھیلائے وہ ہوشیار ہے۔ اور سکون کا متلاشی ہو وہ پاگل ہے“ ظفر نے باواز بلند کہا۔

ہوٹل والے نے ٹیلیفون پر پولیس کو اطلاع کر دی۔ تھوڑی دیر میں پولیس بھی آدھمکی۔ گرفتاریاں شروع ہوگئیں۔ پانچ منٹ ہی میں تمام کو ہتھکڑیاں پہنا کر پولیس چلتی بنی۔ ظفر مایوس کن حالت میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کرسی پر بیٹھتے ہی باریک آواز میں بولا۔

ہوٹل، تفریح گاہیں، شراب خانے، پارک سب اس لئے بنائے گئے ہیں۔ کہ انسان یہاں آکر سکون حاصل کرے۔ میں بھی یہاں سکون کی تلاش میں آیا تھا مگر معلوم ہوا کہ یہاں سکون ذبح کیا جاتا ہے۔ یہاں سکون نیلام ہوتا ہے۔ اور یہاں سکون کی قربانی ہوتی ہے۔ میں کتنا بیوقوف ہوں۔ آتشکدے میں برف اور سمندر کی تہوں میں آگ کا متلاشی ہوں۔ آہ سکون! سکون!!

یہ کہتے ہی بستر پر لیٹ گیا۔ اور تھوڑی دیر میں عالم خواب کی گہرائیوں میں سو گیا۔

## (۵)

اگلے روز جبکہ مشرقی افق ابھی تاریکی میں تھا۔ ظفر ہوٹل سے اٹھا اور گذشتہ شب عبرتناک کیفیات کے نشے میں مست گھنے اور سرسبز جنگل میں نئے نئے چشموں کو چھانتا ہوا بہت دور نکل گیا۔ وہ آبادی کا تمام حصہ چھوڑ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں دنیا کے نشیب و فراز پر غور کرتا ہوا دیوانہ وار پھر تا رہا۔ کبھی کبھی اپنے خاموش دل کا اظہار انہیں الفاظ میں کر دیتا:۔ ”دنیا کس قدر نشیب و فراز سے مرکب ہے۔ کہیں پہاڑ ہیں۔ کہیں جنگل ہیں۔ کہیں دریا ہیں۔ کہیں غار ہیں، جب سطح عالم ہی اسقدر ناہموار ہے۔ تو اہل عالم کے خیالات کی ناہمواری کوئی عجیب بات نہیں“

وہ انہیں خیالات کی رَو میں بہتا ہوا ایک نامعلوم منزل کیطرف جا رہا تھا۔ آخر طویل مسافت طے کرنے کے بعد ظفر ایک تاریک غار کے قریب آکھڑا ہوا۔ اُس کو دیکھتے ہی بولا:۔

”اُف یہ غار کس قدر مہیب اور عمیق ہے۔ گر انسان دنیا کی ناہمواری سے گھبرا کر ایسے غاروں میں ہمیشہ کے لئے آسودۂ فنا ہو جائے۔ تو اسکی بیکسی و بربادی کا پردہ رہ سکتا ہے“ ......“

ابھی ظفر کچھ اور ہی کہنا چاہتا تھا۔ کہ پیچھے سے ایک اجنبی نے آکر ظفر سے پوچھا:۔

اے شخص تو یہاں کس کی تلاش میں کھڑا ہے۔

”سکون کی تلاش میں“ ظفر نے اسے دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

”آؤ ہو تو آؤ میں تمہیں سکون کی دعوت دیتا ہوں“ بناوٹی ہنسی و مسکراہٹ سے کہا ”میں ایک ایسی جماعت کا سردار ہوں۔ جو اپنی قوت حکمت اور حوصلے سے ان سرمایہ داروں کو لوٹتی ہے جو مساوات فطرت کے خلاف غریبوں اور مزدوروں کا خون پی کر دولت جمع کرتے ہیں۔ اور اسے صرف اپنی ملکیت قرار دیتے ہیں۔ فطرت نے ہم لوگوں کو وبال انتقام کیطرح انکے سروں اور خزانوں پر مسلط کر دیا ہے۔ ہم رات کے اندھیرے میں تلوار کے اُجالے میں پستول کی

خوفناک آواز میں انکے زمین دوز خزانوں کو غریبوں کے لئے باہر کھینچ لیتے ہیں۔ اور اسطرح انہیں قانون مساوات کا درس دیتے ہیں۔"

"میں آپکی گفتگو کچھ سمجھ تو گیا ہوں مگر پورا مطلب اچھی طرح نہیں سمجھا" ظفر نے مشفقانہ انداز میں کہا۔

"مقصد یہ ہے" اجنبی جواب دیتے ہوا بولا "یہ ڈاکوؤں کا پُر اسرار غار ہے اور بیاز مند ڈاکوؤں کو سزا دیتی ہے۔ اگر آپ سکون چاہتے ہیں۔ تو ہماری جماعت میں شریک ہو جائیے امیروں کو لوٹیئے۔ غریبوں کو مدد پہنچائیے اور ——!"

"آہ کیا میں ڈاکو بن جاؤں؟" ظفر بات کاٹ کر بولا۔

"جی ہاں"

"مگر سردار میں نے دولت اور نام آوری کی درخواست نہیں کی بس تو سکون کا جویا اور تسکین قلب کا بھوکا ہوں۔" اسے بغور دیکھتے ہوئے ظفر نے کہا۔

"مگر وہ آپکو ہماری ہی جماعت میں رہ کر اسی خلوت میں تک مل سکتا ہے۔" ڈاکو نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا "چلو میں تمہیں اس سکون گاہ کی دعوت دیتا ہوں"

"میں ضرور چلوں گا —— میں ضرور دیکھوں گا —— مگر ایمان کی روشنی اور ضمیر کی موجودگی کے ساتھ" ظفر اسکے ہاتھ میں ہاتھ دیتے ہوئے بولا:—

"آپ چلیں تو سہی۔ یہ دونوں چیزیں باب غار میں پہلا قدم رکھتے ہی آپ سے خود رخصت ہو جائینگی" ڈاکو نے زیر لب مسکرا کر کہا۔

"دیکھا جائیگا"

ظفر یہ کہکر اسکے ساتھ غار میں داخل ہو گیا۔ غار کا تاریک اور پیچ راستہ طے کرنے کے بعد دونوں ایک آراستہ پیراستہ قلعہ کے قریب آئے۔ ڈاکو ظفر سے مخاطب ہو کر بولا:—

"آؤ دیکھو! اے مہمان عزیز! یہ ہمارا مامن ہے۔ کائنات کی ہر چیز یہاں موجود ہے۔ دوزخ بھی یہاں ہے۔ اور جنت بھی یہاں ہے۔ دیکھو ان حوروں کو دیکھو۔ جو اپنے کھلے ہوئے بالوں میں سے گھٹائیں بناتی ہوئی چاند اور سورج کیطرح محو خرام ہیں۔ دیکھو۔ ادھر طاؤس و کبک رقصاں ہیں —— دیکھو وہ آب مصفا کی نہریں ہیں"

ظفر حیران و پریشان ہر ایک چیز کو بغور دیکھ رہا تھا۔ ڈاکو مزید تعارف کراتے ہوئے بولا: "آؤ ذرا اس کمرہ میں آؤ۔ دیکھو —— اس کا فرش لعل و جواہرات سے بنایا گیا ہے، اس کی دیواروں میں سونے کی اینٹیں چنی گئیں ہیں۔ اس کا گارا سچے موتی کوٹ کر بنایا گیا ہے —— اس قصر کی طلائی زمین دیکھ چکے —— اب اس کا خونیں آسمان بھی دیکھو —— دیکھو یہ ملک التجار کا سر ہے —— یہ ایک بخیل کا سوکھا ہوا پنجہ ہے —— یہ ایک مغرور حسین عورت کا دل ہے —— یہ ایک شمشیر آزما دشمن کے ہاتھ ہیں —— اور یہ ایک سرمایہ کے محافظ شب بیدار سیٹھ کی آنکھیں ہیں"

ظفر کا دل ان خوفناک مناظر سے کانپ رہا تھا۔ دل کی دھڑکن شروع ہو گئی تھی۔ مگر حوصلہ ہمگیر تھا۔ ڈاکو مزید مناظر سے آگاہ کرتے ہوئے بولا:—

"ادھر آؤ —— سامنے دیکھو —— وہ آگ کے شعلے جو جہنم کی طرح بھڑک رہے ہیں۔ ہمارے مجرموں کو کھا جانے کیلئے ہر وقت بے تاب رہتے ہیں —— دیکھو یہ دو معصوم بچوں کی لاشیں ہیں۔ جو ایک محل میں غارتگری کے وقت رو کر خفتگان محل کو جگانا چاہتے تھے۔ ہمارے آہنی ہاتھوں کی مضبوط گرفت نے

نکے گلے داب کر انہیں ہمیشہ کے لئے سُلا دیا"

بچوں کی معصوم لاشوں کو دیکھ کر ظفر کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تمام بدن میں لرزہ طاری ہو گیا۔ ڈاکو سے مخاطب ہو کر بآواز بلند چلایا ۔

دیکھا دیکھا ۔۔ بہت کچھ دیکھا ۔۔ اے خدا ناشناس لٹیرو! ۔۔ قانون و مذہب کے ڈاکوؤ!! ۔۔ رحم و ہمدردی کے غارتگرو ۔۔ یہ گناہوں کے اسباب سے بھرا ہوا تاریک اور غلیظ کاشانہ ۔۔ یہ جہنم سے زیادہ مہیب اور قبر سے زیادہ ہولناک غار ۔۔ کسی طرح ایک باضمیر انسان کو سکون مند نہیں کر سکتا۔ مجھے جانے دو ۔۔ میں تمہارے اس خانہ معصیت کی دنیا کو اطلاع دوں گا ۔۔ قانون اور مذہب کو تمہاری اس بیجا آزادی اور بربریت پر مسلط کروں گا۔ اور تمہیں مجبور کر دوں گا ۔ کہ خدا کی زمین اور خدا کے آسمان کے نیچے تم اس گنہگاری کے متعفن اڈے کو زیادہ دیر تک قائم نہ رکھ سکو گے"!

ڈاکو ایک اونچی آواز سے طویل قہقہہ لگاتے ہوئے بولا:۔

تم جیسے سینکڑوں حکومت کے جاسوس سکون و امن کی تلاش کے حیلے سے یہاں آئے اور جب راز کھلا تو تمہیں معلوم ہے اُنکا کیا حشر ہوا ؟"

ڈاکو نے زور سے تالی بجائی۔ چند لاشیں الٹی لٹکی ہوئی نظر آنے لگیں۔ ظفر گھبرا کر چلایا ۔۔

"آہ پناہ الٰہی تیری پناہ"

ڈاکو نے قہر آلود نگاہ سے ظفر کو دیکھتے ہوئے زور سے کہا۔

"سکون کے متلاشی نادان مسافر! اب میں تمہیں بھی ایسی ہی سزا دونگا ۔ اور قانون و مذہب کو اس غار کی اطلاع دینے سے پہلے تجھ کو اپنے قانون اور مذہب کی قوت دکھا دوں گا"

یہ کہتے ہی ایک بار پھر تالی بجائی لٹکی ہوئی لاشیں چشم زدن میں غائب ہو گئیں۔ ایک آتشیں حلقہ نے ظفر کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ڈاکو کی اس نیرنگ سازی پر ظفر حیران و پریشان بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ ہاتھ اٹھا کر خدا سے دعا مانگنے لگا:۔

"اے قادر قیوم خدا! ۔۔ مجھے بچا ۔۔ تو نے آتش نمرود کو اپنے خلیل پر سرد کر کے نمرود کو ایک پشہ حقیر کی غذا بنا دیا تھا۔ آج اپنے قہر و جبروت سے اس عصیاں کدے کو الٹ دے"

بادل زور سے گرجنے لگے ظفر کے مردہ جسم میں مسرت کی تر و تازہ لہر دوڑ گئی ۔ ڈاکو سے مخاطب ہو کر بولا ۔

"سن اے خدا کے نافہم انسان! میرے خدا کی آواز سن ۔"

اب ڈاکو کے بدن میں مرچیں لگ گئیں۔ اس کی آنکھوں میں خون برسنے لگا۔ ظفر سے نہایت ہی کرخت لہجہ میں بولا ۔۔

"اب کچھ دیر میں تیری ہڈیوں کے جلنے اور چٹخنے کی آواز بھی سنو گا"

دفعتہ بجلی ڈاکوؤں کے مہیب غار پر گری۔ تمام چیزیں معہ ڈاکوؤں کے جل کر خاک و سیاہ ہو گئیں۔ اور ظفر متحیر کھڑا رہ گیا +

(باقی آئندہ)

# مرزا غالب اور دیگر شعرا

جناب پروفیسر ... لال کول غالب کاشمیری صاحب
ایم۔ اے۔ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس۔ منشی فاضل ادیب فاضل

(گذشتہ سے پیوستہ)

ذوق کا ایک اور شعر ہے ؎

کیا اعتبار ہستیٔ ناپائدار کا
چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا

مرزا نے اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے ؎

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیٔ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

ایک فارسی شاعر کہتا ہے ؎

زضعفِ تن عجب حال است بیمارِ محبت را
کہ نتواند کشید از ناتوانی بارِ صحت را

مرزا تھوڑے سے فرق کے ساتھ اردو میں اسی خیال کو یوں ادا کرتے ہیں ؎

ہوں فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود
قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

ممنون کہتے ہیں ؎

تفاوت قامتِ یار اور قیامت میں ہے کیا ممنون
وہی فتنہ ہے لیکن یاں ذرا سانچے میں ڈھلتا ہے

مرزا نے یہی مضمون اپنے کلام میں اس طرح داخل کیا ہے ؎

ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

کم گو کشمیری کا ایک شعر ہے ؎

زخضر عمر فزوں است عشقبازاں را
اگر زعمر شمارند روزِ ہجراں را

مرزا کسی قدر پہلو بدل کر یہی مضمون اردو میں یوں پیش کرتے ہیں ؎

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں
شبہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

شمس تبریزی فرماتے ہیں ؎

در شرابم چیز دیگر ریختی    بادہ تنہا نیست ایں آمیختی

مرزا نے اسی مضمون کو مندرجہ ذیل شعر میں ادا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن حق تو یہ ہے کہ شمس تبریزی کے شعر کے مقابلے میں پست ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

ایک شاعر متخلص بہ ثبات کا شعر ہے ؎

باآنکہ ہمہ عمر نہ رفتم ز درِ او
پرسد ز من از ناز ترا خانہ کدام است

مرزا اپنے انداز میں ایک ایسے ہی خیال کو ظاہر کرتے ہیں۔ اگرچہ یہاں ان کا شعر ثبات کے شعر سے ماخوذ

ہونے کا احتمال نہیں رکھتا ؎

وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

عنصری لاری کا ایک مصرعہ ہے ع

در بزم او گفتے بہ بدی ہم نبرد نام

مرزا نے اس طرح اس مصرعہ کا ترجمہ کرتے ہوئے مضمون کو کس قدر بلند کر دیا ہے ع

ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں

شیخ سعدی شیرازی فرماتے ہیں ؎

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بہ تو دادم
باید اول بہ تو گفتن کہ چنیں خوب چرائی

اس کو میر تقی میر یوں ادا کرتے ہیں ؎

پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ
ان سے بھی تو پوچھئے تم اتنے کیوں پیارے ہوئے

امیر خسرو کہتے ہیں ؎

جراحتِ جگر خستگاں چہ مے پرسی
ز غمزہ پرس کہ ایں شوخی از کجا آموخت

ملا فیاضی قمی نے شیخ اور خسرو کے انہی دو شعروں کے مضمون کو یکجا کر کے یوں کہا ہے ؎

ہر کس کہ زخم کاری ما را نگاہ کرد
تا حشر دست و بازوئے او را دعا کند

مرزا ذیل کے شعر میں یہی مضمون اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

مرزا کا یہ شعر بہت مشہور اور قابل تعریف ہے۔ لیکن فیاض کے شعر سے ماخوذ ہے۔

ذوق فرماتے ہیں ؎

جو ہے سو پہلے میرے اٹھانے کی فکر میں
محفل میں اس کی کیا کوئی چوسر کا رنگ ہوں

مرزا نے دوسرے رنگ میں اسی مطلب کو بیان کیا ہے ؎

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

ایک فارسی شاعر کہتا ہے ؎

تا ببینند ہر کہ تن پرور بود       خوش بود گر دانہ نبود دام را

مرزا کا یہ شعر اسی فارسی شعر سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے ؎

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

حیدری تبریزی کا شعر ہے ؎

چو ریزم اشک از دل آہِ دردآلود مے خیزد
بلے چوں آب بر آتش بریزد دود مے خیزد

مرزا نے اپنے ایک شعر میں اسی مفہوم کو ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن صاحبِ مذاق اصحاب سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ ان کا یہ شعر حیدری کے مقابلے میں ناقص ہے ؎

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا
ہر کوئی درماندگی میں نالہ سے ناچار ہے

حضرت بیدل کا ایک شعر ہے ؎

مے روم از خویش و در اندیشۂ باز آمدن
ہمچو عمرِ رفتہ یارب بر نہ گردانی مرا

مرزا اسی مفہوم کو یوں ادا کرتے ہیں ؎

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیٔ خیال
تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے

ذوقی سمرقندی کہتے ہیں ؎
مکن تغافل ازیں بیشتر کہ مے ترسم
گماں برند کہ ایں بندہ بے خداوند است

مرزا کے اس شعر کا مضمون ذوقی کے شعر سے ماخوذ ہے ؎
زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

شرف قزوینی کا ایک شعر ہے ؎
ہست صد منت بجاں از غیبِ بدگو مرا
چوں بایں تقریب من آرد بیادِ او مرا

مرزا کے مندرجہ ذیل شعر کا ماخذ یہی فارسی شعر ہے۔
جو معاً بلتّاً زیادہ واضح ہے ؎
گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے بایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

ایک فارسی شاعر کا شعر ہے ؎
تو ملولی زما و ما مشتاق    دل بدل میرود چہ حال است ایں

مرزا کہتے ہیں ؎
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار    یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

یہ شعر فارسی شعر کا ترجمہ ہے جو خفیف سا فرق مصرعۂ ثانی میں باعتبارِ معنی پایا جاتا ہے۔ بحر کی پابندی اور ترجمے کی قید سے لازمی تھا۔

زلالی خوارزمی کا ایک شعر ہے ؎
تنہا نصیبِ من غم و دردِ حبیب نیست
از ہیچ درد و غم دلِ ما بے نصیب نیست

مرزا نے مندرجۂ ذیل شعر میں اسی مفہوم کو الفاظ و تخئیل میں تصرف کر کے ادا کیا ہے ؎
تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

رضی سمرقندی کا ایک شعر سنئے ؎
ستارہ ایست دُرِ گوش آں ہلال ابرو
زروئے حسن بہ خورشید میزند پہلو

مرزا کے مندرجہ ذیل شعر کا اس شعر سے مقابلہ کیجئے ؎
گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا
کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

اس میں شک نہیں کہ دونوں شعر اپنی اپنی جگہ خوب ہیں لیکن باوجود اس امر کے کہ دونوں کے مفہوم میں کسی قدر اختلاف ہے مرزا کا مضمون رضی کے شعر سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے فیضی کہتے ہیں ؎
نوشدارُوئے محبت را مپرس اجزا کہ چیست
سودۂ الماس در زہر ہلاہل میکنند

مرزا ہو بہو اردو میں اسی کا ترجمہ یوں پیش کرتے ہیں ؎
نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا
کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے

عرفی شیرازی فرماتے ہیں ؎
کسے لازم است بادہ کشیدن زجام زر
مقصودِ تو گرانیست قصورِ سفال چیست

مرزا کا شعر ہے ؎
اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

مرزا کا یہ شعر مشہور ہے اور عرفی کے شعر کے مقابلے میں پُرزور بھی لیکن مضمون اس میں بھی ان کا نہیں۔

فتحی تبریزی کا شعر ہے ؎

یاد چو مے زنم آمدہ مے شوم از دور
دیدہ حال مرا وقت بے قراری حیف!

مرزا کا شعر ملاحظہ ہو ؎

اُن کے دیکھنے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

یہ شعر مرزا بلکہ اردو زبان کے بہترین اشعار میں سے سمجھا جاتا ہے۔ اور فی الواقع ہے بھی خوب لیکن اس میں بھی سوائے زبان اور بندش کے مرزا کا کوئی حصہ نہیں۔

حسن بیگ رفیع کا بھی ایک شعر سُنیئے ؎

خوش دلم زیں کہ باد نامہ نویسم شب و روز
مقصدم نیست کہ مکتوب رسد یا نرسد

مرزا قریب قریب یہی بات اردو میں کہتے ہیں ؎

خط لکھیں گے گرچہ کچھ مطلب نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

مضمون یکساں ہے اور طرزِ بیان میں بھی کوئی خاص فرق نہیں۔

ذوق کا ایک نہایت مشہور شعر جس کی مرزا بھی خود بڑی تعریف کیا کرتے تھے یہ ہے ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

مرزا نے اپنے الفاظ میں اسی خیال کو جامہ پہنانے کی یوں کوشش کی ہے ؎

ہائے واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا
لیگیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے

ذوق کے شعر کا مضمون بلند تر ہے اور اسی وجہ سے زیادہ شگفتہ نظر آتا ہے۔

عرفی شیرازی کا ایک اور شعر ہے ؎

بیار بادہ کہ جانم دمے زنالہ برآید
ہزار زمزمہ از دل بیک پیالہ برآید

مرزا کے مندرجہ ذیل شعر کا ماخذ عرفی کا یہی شعر ہے ؎

پھر دیکھئے اندازِ گل افشانیٔ گفتار
رکھدے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

امیر خسرو فرماتے ہیں ؎

گفتم چگونہ مے کُشی و زندہ میکنی
از یک نگاہ کُشت و نگاہِ دگر نہ کرد

مرزا یہی مضمون یوں باندھتے ہیں ؎

کرنے گئے تھے اُس سے تغافل کا ہم گلہ
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

عاقل خاں رازی کہتے ہیں ؎

نہ مرا کرد رقیب از سرِ کوے تو جدا
اول ایں حادثہ بر آدم و حوا بگذشت

مرزا کا مشہور شعر ہے ؎

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

یہ شعر بھی قریب قریب فارسی شعر کا ترجمہ ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ مرزا کے شعر میں اندازِ بیان نے جان ڈال

دی ہے۔

فریدوں خراسانی کا ایک شعر ہے ؎

از ضعفِ دل منال فریدوں ز بیکسی
بیدار دل قوی کہ کسِ بیکسان خداست

مرزا اپنے شعر میں اس مضمون کو زیادہ مؤثر پیرائے میں یوں ادا کرتے ہیں ؎

بیدل نہ ہو بیگانگیٔ خلق سے غالب
کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

متاخرینِ ایران میں سے کسی کا شعر ہے ؎

مشاطہ را بگو کہ براسبابِ حسنِ دوست
چیزے فزوں کند کہ تماشا بہ مارسید

مرزا کا مندرجۂ ذیل شعر اسی مطلب کو برنگِ دیگر ادا کرتا ہے ؎

زمانہ عہد میں اس کے ہے محوِ آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے

مثنوی پدماوت میں عبرت کا ایک شعر ہے ؎

نزاکت سے شکم میں بچہ اس کا
نظر آوے تھا جوں مینا میں صہبا

مرزا نے اس مضمون کو لے کر فارسی میں اس طرح باندھا ہے ؎

چوں صورتِ آئینہ ز فرطِ لطافت
آید بنظر بچۂ او از شکمِ او!

اسی طرح مرزا کے فارسی کلام میں بھی اس قسم کے بہت سے اشعار پائے جاتے ہیں۔ جن کا تذکرہ بطورِ خود ایک علیحدہ مضمون چاہتا ہے ہم اس سلسلے کو یہاں بخوفِ طوالت قلم انداز کرتے ہیں۔ صرف نمونے کے طور پر ایک دو شعر نذرِ ناظرین کئے جاتے ہیں۔

حافظ شیرازی کا شعر ہے ؎

شبِ تاریک و بیمِ موج و گردابے چنیں حائل
کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحل ہا

مرزا کا شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز
گسستہ لنگرِ کشتی و ناخدا خفت است

مرزا کے مصرعہ ثانی میں بجائے اس کے کہ سبکسارانِ ساحل کو حال معلوم نہیں انہیں مشکلات اور سختیوں کا حال پایا جاتا ہے۔ جن کا ذکر دونوں شاعروں کے مصرعہ اوّل میں موجود ہے۔ اس سے شعر میں زور پیدا ہوا ہے۔ خواجہ حافظ کے اور دو شعر مختلف بحروں میں ملاحظہ فرمائیے ؎

حلاج بر سرِ دار ایں نکتہ خوش سرائد
از شافعی مپرسید امثال ایں مسائل

رازِ درونِ پردہ ز رندانِ مست پرس
کیں حال نیست صوفیٔ عالی مقام را

مرزا نے انہی دو شعروں کے مضمون کو ایک کر کے دوسرے لباس میں اسطرح جلوہ گر کیا ہے ؎

آں راز کہ در سینہ نہاں است نہ وعظ است
بردار تواں گفت و بہ منبر نتواں گفت!

اس میں شک نہیں کہ مرزا نے یہ شعر اختصار اور خوبی کے ساتھ بہتر الفاظ میں لکھا ہے۔ ناظرین خود اس فرق کو محسوس کرتے ہیں +

(طالب کاشمیری)

(باقی آئندہ)

# کیفیات

از جناب معین احسن صاحب جذبی بی اے

داغِ غم دل سے کسی طرح مٹایا نہ گیا — میں نے چاہا بھی مگر تم کو بھلایا نہ گیا
ہوش یوں کھوئے کہ پھر ہوش میں لایا نہ گیا — مطمئن ہو کے میں سویا تو جگایا نہ گیا
عمر بھر یوں تو زمانے کے مصائب جھیلے — تیری نظروں کا مگر بار اُٹھایا نہ گیا
روٹھنے والوں سے اتنا کوئی جا کر پوچھے — خود ہی روٹھے رہے یا ہم سے منایا نہ گیا
مختصر ہے مری بربادیٔ دل کا قصہ — اس نے اِس درجہ مٹایا کہ مٹایا نہ گیا
پھول چننا بھی عبث سیرِ بہاراں بھی فضول — دل کا دامن ہی جو کانٹوں سے بچایا نہ گیا
اُس نے اِس طرح محبت کی نگاہیں ڈالیں — ہم سے دنیا کا کوئی راز چھپایا نہ گیا

تھی حقیقت میں وہی منزلِ مقصد جذبیؔ
جس جگہ تجھ سے قدم آگے بڑھایا نہ گیا

(معین احسن جذبی)



# بچوں کی دنیا

## آہن پوش سردار

پرانے زمانے میں ملک انگلستان کی ایک ملکہ تھی جس کا نام گلیڈس تھا۔ وہ اپنی دانائی، انصاف، حسنِ انتظام اور غربا پروری کے لئے دور دور مشہور تھی۔ اس کی شہرت کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ وہ یہ کہ اس کے دربار میں بہت سے شریف بہادر اور جنگجو نائٹ رہتے تھے۔ جب کبھی ملک کے کسی گوشے میں فتنہ فساد نا انصافی، ظلم و شرارت کا دور دورہ ہوتا۔ ملکہ فوراً ان میں سے ایک شیر دل سردار کو منتخب کر کے امن و آمان قائم کرنے، گرفتارانِ بلا کو مصیبت سے رہائی دینے اور بیکسوں کو مدد کرنے کے لئے روانہ کر دیتی۔

انگلستان کے شمال میں ایک اور ملک سکاٹ لینڈ ہے۔ اب تو وہ سرکار انگریزی کے قبضہ میں ہے۔ اور سلطنتِ انگلستان کا ایک حصہ، مگر جس وقت کا ذکر ہم آپکو سنا رہے ہیں۔ وہ ایک خود مختار سلطنت تھی۔ اس کے ذرائع وسیع، پہاڑ قیمتی معدنیات سے پر، اور زمین زرخیز تھی۔ اس کے باشندے گورے چٹے، بلند و بالا، محنتی اور جفاکش تھے۔ یہاں کا بادشاہ ایک قدیم اور اعلے خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ اور اس کی نیک دلی۔ سخاوت اور شرافت کی وجہ سے اس کی رعایا اس پر جان قربان کرتی تھی۔ مگر چند سال سے اس سلطنت پر ایک ناگہانی مصیبت نازل ہو گئی تھی۔ ایک ایسا دشمن پیدا ہو گیا تھا جس نے خلاصی

حاصل کرنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ یہ انسان کا دشمن، صحت سلامتی کا بیری، فلاکت عذاب اور موت کا قاصد ایک مہیب و خوفناک اژدھا تھا۔ جس پر غلبہ پانا انسانی طاقت سے باہر نظر آتا تھا جسطرف بھی یہ اژدھا نکل جاتا کوسوں تک تباہی ہی تباہی پھیل جاتی۔ اس علاقے میں کسی فردو بشر کا نام تک نہ رہتا۔ لوگ اپنے گھر چھوڑ چھوڑ کر بھاگ جاتے۔

آخر نوبت یہاں تک پونہچی کہ بادشاہ اور ملکہ اپنی جان بچانے کی خاطر افسران اور کچھ فوج کے ساتھ ایک مضبوط فولادی قلعہ میں پناہ گزیں ہوگئے جیکے سامنے رات دن اژدہا اس انتظار میں پڑا رہتا تھا۔ کہ اب موقعہ ملے۔ اور وہ اپنی خونآشامی کی ہوس کو پورا کرے۔

اس بادشاہ کی ایک پیاری لڑکی بھی تھی۔ جو دیکھنے میں چاند کی صورت حسن کی مورت اور نور کا ٹکڑا تھی۔ اور عادت و خصائل میں سچائی کی دیوی، نیکی کی مورتی، اور محبت کی پتلی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ بہت بہادر اور بلند ہمت بھی تھی۔ جب اس کو اپنے ماں باپ کی مصیبت کا حال معلوم ہوا تو وہ فوراً انگلینڈ ملکہ گلیڈس سے مدد مانگنے کی غرض سے روانہ ہوگئی۔ اس نے سر سے پاؤں تک ایک لمبا سیاہ لبادا پہنا۔ منہ پر ایک بھاری نقاب ڈالی۔ سفید براق الاغ پر سوار ہوئی۔ جس کے سر پہ ایک طلائی مرصع کلغی لگی ہوئی تھی۔ اور اس پر بھیڑ کے بچے کی تصویر تھی۔ یہ معصومیت کا نشان تھا۔ اس کے پیچھے ایک عظیم الشان صحیح النسل جنگی مشکی گھوڑا تھا۔ جس کا لگام ایک چھوٹے بونے کے ہاتھ میں تھا۔ اس گھوڑے پر ایک بھاری قیمتی زرہ بکتر چار آئینہ خود غرضیکہ ایک مکمل آہنی جنگی لباس رکھا تھا۔ یہ لباس صدیوں سے شاہی خزانے میں چلا آتا تھا۔ مگر اسقدر مدّت دراز گذر جانے کے باوجود اس کی آب و تاب میں کچھ فرق نہ آیا تھا مشہور تھا۔ کہ اگر یہ جنگی لباس کسی شخص کو پورا آجائے۔ تو پھر وہ دنیا میں ایسے ایسے کارنامے نمایاں

انجام دے سکتا ہے۔ کہ عقل دنگ رہ جائے۔

اس شان اور اس انداز میں حور صفت شہزادی ملکہ گلیڈس کے دربار میں پہنچی۔ ملکہ نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بہت عزت و توقیر کی۔ آنے کا سبب پوچھا۔ شہزادی سب حالات سنا کر مدد کی طالب ہوئی۔ اب آپ ذرا توجہ سے سنئے۔ اسی روز شہزادی کی آمد سے ذرا پیشتر ایک مضبوط، طاقتور، بلند و بالا مگر اپنے اندر ایک طرح کی وحشیت لئے ہوئے نوجوان دربار میں حاضر ہوا۔ اور التجا کی۔ کہ آج جو سب سے پہلے مہم پیش آئے۔ اس پر مجھ کو مامور کیا جائے۔ تو گویا انصاف کی رو سے اس مرحلے کو طے کرنے کا حق نووارد نوجوان کو تھا۔ مگر معاملہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اور مقابلہ ایسے خونخوار دشمن کا تھا جس نے سینکڑوں کار آزمودہ اور جہاں دیدہ سپاہیوں کو مغلوب کر دیا تھا۔ اور ہزاروں بہادر سردار اس کی سرکوبی کی تمنا میں موت کی گھاٹ اتر چکے تھے۔ اس لئے ملکہ اس دشوار طلب مہم کو ایک ناتجربہ کار نوجوان کے ہاتھوں میں دینے پر پس و پیش کر رہی تھی۔ اگرچہ نووارد اس پر بہت ہی مصر تھا۔ آخر سب کے مشورے سے یہ قرار پایا۔ کہ تمام حاضرین سرداروں میں سے جس کو آہنی جنگی لباس موزوں آئے۔ وہی اژدہے کی سرکوبی پر مقرر کیا جائے۔ اب باری باری سب نے اس لباس کو پہننا شروع کیا۔ مگر کسی کو ڈھیلا کسی کو تنگ، کسی کو لمبا۔ کسی کے چھوٹا ثابت ہوا۔ سب کے بعد نووارد نوجوان کی باری آئی۔ لوگوں کے حیرت و استعجاب کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کہ وہ لباس اس کے نہ صرف پورا ہی آیا۔ بلکہ اس کو پہنکر خوبصورت نوجوان کا حلیہ ہی بدل گیا۔ تمام دیہاتی وحشت کافور ہوگئی۔ نوجوان اس وقت سب سے زیادہ وجیہہ باوقار اور پرشان و شوکت نظر آرہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ صدیوں پیشتر یہ لباس صرف اسی شخص کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ اس وقت سے ہم نوجوان کو آہن پوش سردار کہیں گے۔ شہزادی اور آہن پوش نوجوان تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے۔ کہ ان کو ایک شخص ملا۔ اس نے لمبا سیاہ چوغہ

پہنا ہوا تھا۔ سفید ڈاڑھی بلا مبالغہ گود میں کھیلتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ گلے میں موٹے دانوں کی تسبیح تھی۔ اور منہ سے کچھ بڑبڑاتا جاتا تھا۔ وضع قطعہ گرچہ راہبانہ تھی۔ مگر دراصل یہ شخص ساحر تھا۔ اور نیکی اور عافیت کا دشمن۔ اس نے جب خوبصورت شہزادی کو آہن پوش سردار سے محبت و خلوص کی باتیں کرتے دیکھا تو بڑا جلا۔ اور دل میں کہنے لگا۔ کہ میں ان دونوں میں جاکر جادو کے زور سے جدائی ڈلوا دونگا۔ پھر حسین شہزادی میرے ہاتھ آجائے گی۔ چنانچہ اس نے کوئی عمل پڑھنا شروع کردیا۔ اب سردار شہزادی کو دھوکا باز سمجھنے لگا۔ اس کو شہزادی کی شکل و صورت بھی خراب نظر آنے لگی۔ یونے نے اور اس نے شہزادی کا ساتھ چھوڑ دیا اور دونوں غلط راستے پر اصلی شہزادی کی جستجو میں روانہ ہوگئے +

(باقی آئندہ)

# عام فہم سائنس

## بارش کیوں ہوتی ہے!

کرۂ ہوائی میں آکسیجن نائٹروجن کاربن ڈائی اوکسائڈ کے علاوہ مٹی کے ذرات اور آبی بخارات کی ایک بڑی مقدار ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ ہم آبی بخار کو دیکھ نہیں سکتے۔ اور اس لئے اس کی ہستی کو ہمیشہ بھول جاتے ہیں۔ زندگی کی سہولتوں میں اس کو بہت بڑا دخل ہے کسی مقام کی آب و ہوا زیادہ تر اس پر منحصر ہے۔ ہماری عادتیں کام اور کھیل کود سب اس بارش کے ماتحت ہو جاتے ہیں۔ جو آبی بخارات سے برستی ہے۔

اگر درجۂ حرارت زیادہ ہو۔ تو ہوا اپنے اندر آبی بخارات کی زیادہ مقدار جذب کر سکتی ہے۔ پانی کے بہت بڑے بڑے قطعے دنیا میں موجود ہیں۔ مثلاً سمندر جھیلیں دریا وغیرہ ان سے ہر وقت پانی بخار بنتا رہتا ہے۔ اور ہوا میں شامل ہو جاتا ہے۔ اب یہ ہوا جس میں آبی بخارات کی بہت بڑی مقدار موجود ہے۔ اوپر کو اٹھتی ہے۔ اس کا سبب یہ بھی ہے۔ کہ آبی بخار ہوا سے ہلکا ہوتا ہے۔ اس لئے آبی بخارات اور ہوا کا ممزوج ہوا سے ہلکا ہوا یہ اوپر کو چڑھتا ہے۔ کرۂ ہوائی کے بالائی حصے سرد ہیں۔ وہاں جانے پر یہ بخارات جم جاتے ہیں۔ اور بہت سی ننھی ننھی بوندیاں بنجاتی ہیں۔ اتنی چھوٹی کہ وہ ہوا میں معلق رہ سکتی ہیں۔ گویا ایک پھوار سی ہوتی ہے۔ ان چھوٹی بوندوں کی بہت بڑی تعداد کروڑ ہا ہمیں دور سے نظر آتی ہے۔ ہم اسکو بادل کہتے ہیں۔

جب اور سردی پہنچتی ہے۔ تو کئی ننھی ننھی بوندیں یکجا ہو جاتی ہیں۔ بخارات آبی زیادہ

مقدار میں جمتے ہیں۔ بوندیں بڑی ہو جاتی ہیں۔ اور وہ ہوا میں نہیں ٹھیر سکتیں۔ اس لئے نیچے گرنی شروع ہو جاتی ہیں۔ اسے ہم بارش کہتے ہیں۔ سائنس دانوں نے یہ بھی معلوم کیا ہے۔ کہ یہ ننھی بوندیاں کسی چیز پر بنتی ہیں یعنی مٹی کے چھوٹے چھوٹے ذرات پر یا ہوا کے ذرات پر اس لئے ان چیزوں کا موجود ہونا بہت ضروری ہے۔ اگر ہوا بالکل مصفا ہو تو کبھی بارش نہ ہو۔

یہ بھی کوشش کی گئی ہے۔ کہ بارش مصنوعی طور پر برسائی جائے۔ ہوائی جہاز کے ذریعہ ریت کے نہایت باریک ذرے جن میں بجلی بھری ہوتی ہے۔ بلند ہواؤں میں چھوڑے جاتے ہیں جس سے بارش کا امکان ہو سکتا ہے۔ ابھی تک اس میں بہت زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ تجربات ہو رہے ہیں۔ اور یہ طریقہ بہت مہنگا ہے۔

گرم ہوا میں بخارات آبی کی بہت بڑی مقدار جمع ہو جاتی ہے۔ اور جب یہ بلند ٹھنڈے ہوا کے طبقات میں پہنچتی ہے۔ تو اس کے بخارات جم جاتے ہیں یہی سبب ہے کہ پہاڑوں پر زیادہ بارش ہوتی ہے خاص طور پر وہ پہاڑ جو سمندر کے قریب واقعہ ہوں۔ اور انکی طرف سمندری ہوائیں چلیں۔

صحرا ان علاقوں میں بن جاتے ہیں۔ جہاں یا تو نہایت سخت سردی ہو یا نہایت سخت گرمی۔ منطقۂ حارہ کی صحراؤں میں بارش بہت کم ہوتی ہے۔ اسکا سبب یہ کہ ہوا گرم ہو جاتی ہے۔ اور وہ بخاراتِ آبی کی بہت بڑی مقدار اپنے اندر جذب کر سکتی ہے۔ یعنی وہ پانی دینے کے بجائے لینے کو تیار رہتی ہے اسکے برخلاف برفانی صحراؤں میں بارش اسلئے نہیں ہوتی۔ کہ ہوا بہت ٹھنڈی ہوتی ہے۔ اسقدر ٹھنڈی۔ کہ اس میں بخاراتِ آبی کی تھوڑی سی مقدار بھی شامل نہیں ہو سکتی۔ بارش کیسے ہو۔

ہوا کی سمت اور رفتار سمندری اور پہاڑوں کی بلندی اور سمت وغیرہ کا اثر بارش اور اس کی مقدار پر ہوتا ہے۔ اور اس زمانے میں سائنس نے اتنی ترقی کر لی ہے۔ کہ ہم کسی حد تک بارش ہونے یا نہ ہونے کا پتہ لگا سکیں۔ یہ ظاہر ہے کہ ہوا کے بغیر بارش نہیں ہو سکتی۔ ہوا چلتی ہے۔ تو اپنے ساتھ بخاراتِ آبی بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی ہے ✦

# محقق کے متعلق آرا

**محقق بہاولپور** خواجہ شجاع منعمی ایم۔اے (علیگ)، ایم۔ایس۔سی۔ایم۔اے (پنجاب) پروفیسر بہاولپور کالج ناظرین رہنمائے تعلیم کے لئے کوئی نئے بزرگوار نہیں۔ کہ اُن سے تعارف کرایا جائے بعرصہ سے آپ کے قیمتی مضامین اسکے اوراق کی زینت کا موجب ہوتے رہے ہیں۔ آپکی ڈائرکٹری میں یہ مولود جنوری ۱۹۳۷ء سے عالم وجود میں آکر بزم تحقیقات کا خادم اور پیشوا ہونے کا مدعی ہے اسکے زیر ریویو نمبر اور ان کے مضامین نظم و نثر اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ جن آرزو کو لے کر یہ مولود خدمتگذاری کی دنیا میں آیا ہے بہت جلد اس پر فائز ہو جائے گا۔ اور چشم بددور اپنے ناظرین کا محبوب القلوب ہو کر انکے شوق علم کو پورا کرے گا۔ خواجہ صاحب سائنس کے علامہ اور ان کا قلم سائنس کی معلومات کے اظہار پر آمادہ۔ اسطرح محقق سائنس اور علوم جدیدہ سے ناظرین کی آگہی کا موجب ہو کر اسم با مسمی محقق ہوگا۔ ارباب تحقیق کی آرزوئیں برلانے کا موجب ہوگا۔ آپکے ہمراہی کارکنان کے نام ہی اس امر کی ضمانت ہیں۔ کہ محقق روز پیدائش سے ہی خوش قسمتی کو ساتھ لے کر آیا ہے۔ سالانہ چندہ تین روپے۔ شائقین کو ادارہ کی حوصلہ افزائی کرنا چاہیئے۔ خریداری کے لئے دفتر رسالہ محقق۔ بہاولپور کافی ہے +

(رہنمائے تعلیم لاہور)

---

**رسالہ محقق بہاولپور** بہاولپور سے "محقق" نامی ایک رسالہ نکلا ہے۔ جسکے ادارتی ذمہ وار چھ صاحبان ہیں۔ اس رسالہ کا مذہب اور سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔ ادبی۔ علمی۔ اور تاریخی رسالہ ہے پروفیسر خواجہ شجاع منعمی، ایم۔اے اسکے ڈائرکٹر ہیں اور حافظ عبدالرحمان "مولوی فاضل" نگران عربیات ہیں۔ علاوہ ازیں حضرت علامہ ارشد بہاولپوری جیسے فاضل حضرات اس کے مضمون نگار ہیں۔ علم پرور حضرات اس کی سرپرستی فرماویں۔ کتابت۔ طباعت دیدہ زیب۔ قیمت سالانہ تین روپے۔ ملنے کا پتہ ا۔ دفتر رسالہ "محقق" بہاولپور۔

(ملاپ ۱۷ر جون ۱۹۳۷ء)

**جریدہ "محقق" بہاولپور** یہ جریدہ تقریباً چھ ایڈیٹروں کی ذمہ واری میں سرزمین بہاولپور سے شائع ہوتا ہے۔ تمام حضرات اپنے اپنے فن کے ماہر ہیں پروفیسر خواجہ شجاع منعمی ایم۔اے کی ذات ستودہ صفات علمی دلدادگی اور انتہائی ذوق پرستی کے باعث محتاج تعارف نہیں آپ نہ صرف اس رسالہ کے ڈائرکٹر ہیں۔ بلکہ مسلسل علمی اور تاریخی مضامین سے رسالہ کی سرپرستی فرما رہے ہیں اور ادیب شہیر حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب جامی مولوی فاضل اس جریدہ کے نگران عربیات ہیں انکا نام اس شعبہ کی بلند پائیگی اور تکمیل کا پورا پورا ضامن ہے اسکا دور حیات نہایت ہی مختصر ہے مگر ترقی حیرت انگیز ہے۔ کتابت طباعت دیدہ زیب حجم ساٹھ صفحہ تک قیمت تین روپئے سالانہ ا۔ ملنے کا پتہ ا۔ جریدہ "محقق"۔ بہاولپور۔

(روزنامہ سیاست لاہور)

باہتمام برکت علی پرنٹر آرمی پریس ہسپتال روڈ لاہور میں چھپکر دفتر محقق بہاولپور سے ایف ایم شجاع منعمی پبلشر نے شائع کیا

May 1938

# THE MOHAQQIQ

BAHAWALPUR

A High Class Literary Monthly

# محقق

بہاولپور

ڈائرکٹر۔ خواجہ شجاع منعمی

ایڈیٹر۔ رازی عرفانی

محکمۂ تعلیم پنجاب کا منظور شدہ

# مُحقّق

فنی- علمی- ادبی- صنعتی-

چندہ
سالانہ تین روپے
طلباء سے دو روپے
ممالک خارجہ سے دس شلنگ
والیان ریاست سے یکصد روپیہ
امراء سے دس روپے
فی پرچہ چار آنہ

بہاولپور

مئی سنہ ۱۹۳۸ء

## ادارۂ تحریر

چیف ایڈیٹر:- خواجہ شجاع منعمی- ایم- اے (علیگ) ایم- ایس- سی- ایم- اے (پنجاب)

ایڈیٹر:- رازی عرفانی

نگران عربیات:- حافظ عبدالرحمٰن علامہ مولوی فاضل

مہتمم شعبۂ نسواں:- بیگم ح- ش- رفعت- دہلوی- بی- اے- افسانہ امین حزیں

نگران سنسکرت:- پنڈت مدن سنگھ شاستری ودیا بھاسکر

مذاکرۂ علمیہ:- پروفیسر ایم- ایف قریشی

| جلد ۲ | فہرست مضامین ماہ مئی ۱۹۳۹ء | نمبر ۵ |
|---|---|---|

# شذرات

## محکمہ تعلیم پنجاب نے رسالہ محقق بہاولپور کو تمام پنجاب کے سکولوں کیلئے منظور فرمالیا۔

جناب ڈائرکٹر صاحب بہادر صیغہ تعلیم پنجاب نے محقق کی علمی خوبیوں کو دیکھکر اور پورے طور پر اس بات کا ملاحظہ کرنے کے بعد کہ محقق ہر طرح سے مفید اور سبق آموز رسالہ ہے۔ اپنی چٹھی نمبر ۶۰۴۰ مرقومہ ۷ مارچ ۱۹۳۸ء محقق کو صوبہ پنجاب کے تمام سکولوں کے لئے منظور فرمایا۔

ہم ان ہیڈ ماسٹر صاحبان سے جو صحیح معنوں میں اپنے شاگردوں کی تربیت اور تعلیم کو اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ یہ توقع رکھتے ہیں۔ کہ وہ اس قدر مفید رسالے کی سرپرستی فرمائیں گے۔ اور لڑکوں کو موقع دیں گے۔ کہ وہ ضروری علم حاصل کر سکیں بڑھتے ہوئے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے جن کا دماغ ابھی موم کیطرح سے نرم اور ہر نیک و بد سے متاثر ہونے کے لئے تیار رہتا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ ان کے نگران اس امر کو اپنا اہم فرض سمجھیں۔ کہ ان ملک و قوم کی آئندہ امیدوں کے ہاتھوں میں صرف وہی علمی رسائل وجرائد دیں جو دل و دماغ کی تربیت صحیح طریقے پر کر سکیں بطور اس غرض کے لئے محقق سے بہتر آپ کو کوئی رسالہ نہیں ملیگا۔ محقق مطہر ارفع اور سبق آموز ہونیکا دعوے کرتا ہے۔ اور اس اپنے لائحہ عمل پر شدت سے کاربند ہے۔

اپنے ماحول کو پیش نظر رکھتے ہوئے۔ ہم صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں۔ کہ میر ولی اللہ کے الفاظ میں سے

ہمنشیں میر کو تو چشم حقارت سے نہ دیکھ    ایبٹ آباد کی رونق ہے اسی کے دم سے

**محقق کی طباعت** بہاولپور میں طباعت کے آسان ذرائع میسر نہیں۔ اور اس لئے مجبوراً محقق کی طباعت کا انتظام آرمی پریس لاہور کیساتھ کیا گیا تھا۔ اس مرتبہ اس پریس کے ارباب بست وکشاد نے کچھ ایسی بے اعتنائی سے کام لیا ہے۔ کہ اگر تمام قصہ وارث شاہ کو سنایا جائے تو اُسے ایک اور ہیر رانجھے کا مواد میسر آ سکے۔ خط وکتابت کے جواب میں ہم آخر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ لاہور کے ڈاکخانے والوں کو حکم یہ معلوم ہوتا ہے کہ لاہور سے کوئی خط بہاولپور کو نہ بھیجا جائے۔ نہیں تو آرمی پریس ہمیں مزید لکھتا کہ انہیں کیا دقت پیش آگئی ہے۔ ہم اپنی طرف سے تمام کوشش کر رہے ہیں کہ رسالے کے انتظام اور اشاعت میں کوئی بے ربطی واقع نہ ہو۔

# بزم جہاں

**جرمنی اور آسٹریا**

جرمنی جدید سائنس کے میدان میں جادوگر ہے۔ مگر اب ثابت ہوا ہے کہ ہر ہٹلر سیاسی میدان میں بھی اتنا بڑا شعبدہ باز ہے۔ اس ترقی یافتہ زمانے میں ایک پوری متمدن قوم پر قبضہ جما لینا اور پھر یہ کہ ایک گولی تک نہ چلائی جائے کس قدر حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے۔

گماں مبر کہ بپایاں رسید کار مغاں - ہزار بادۂ ناخوردہ در رگ تاک است

**چین جاپان**

حرص و ہوس انسانی قالب میں جب سرشار ہوتی ہے تسکین دامن کا خرمن جل کر خاکستر ہو جاتا ہے اور دوزخ ایسا ہے کہ ھَلْ مِنْ مَزِیْد کی آوازیں جتنا پر کرو اتنا ہی زیادہ سنائی دیتی ہیں۔ جاپان اس میں کوئی شک نہیں کہ تمام جدید آلات سے مسلح ہے۔ اور چین کے ایک حصے پر اس کا قبضہ جما لینا کوئی عجیب بات نہیں۔ اس کو تو وہ غصب کرنا نہیں اپنے باپ دادا کا حق سمجھتا ہے۔ لیکن مصیبت حرص کے بڑھنے سے بڑھتی ہے۔ جنگ نے طول کھینچا ہے۔ اور جاپان مشکلات میں مبتلا ہے۔ بارود خانے سے یہ جنگی آلاؤ اگرچہ بہت دور ہے مگر چنگاری کو پہنچتے دیر نہیں لگا کرتی۔ اور ایک چنگاری سے تمام جنگل جل سکتا ہے۔

## محقق آپ کی سرپرستی کے لائق ہے۔

# یادگار غالب پر ایک نظر

گذشتہ سے پیوستہ

## یادگار کی فوقیت کے وجوہ

**یادگار کی اولیت:** شاید انگریزی تعلیم اور مغربی طرز تنقید کے پرستار بھی اس امر سے متفق ہو گئے۔ کہ (تنقیدی نقطۂ نظر سے بھی) غالب کے متعلق بہترین کتاب ایسے شخص کی لکھی ہوئی ہے۔ جو انگریزی سے قریباً قریباً نابلد تھا۔ یعنی حالی۔ یہ صحیح ہے کہ یادگار غالب پرانے نمونوں پر لکھی گئی ہے۔ اور جیسا کہ ڈاکٹر لطیف نے بتایا ہے۔ اس میں کئی خامیاں ہیں۔ لیکن ابھی تک کوئی اور تبصرہ ایسا نہیں شائع ہوا۔ جس میں اس سے کم خامیاں ہوں۔ [1]

یہ غالب نامہ کا خیال ہے اور ہم اس فیصلہ کیساتھ بہت حد تک اپنے آپ کو متفق پاتے ہیں یہ درست ہے۔ کہ یادگار میں غالب کی شخصیت کا مجموعی تصور پیش نہیں کیا گیا۔ اور اس کے مضامین کی ترتیب کچھ اس طریق پر رکھی گئی ہے کہ اس میں تصویر کا صرف ایک ہی رُخ نظر آتا ہے۔ اور دیکھنے والا دوسرے پہلوؤں سے بھی بے خبر رہتا ہے۔ لیکن اس زمانے کے عام اسلوب تحریر و تالیف کے پیش نظر ہم جدید ترین توقعات ایک قدیم کتاب سے کیسے وابستہ کر سکتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یادگار کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ اس کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔ آزاد کی "آب حیات" میں بے شک مفصل تذکرہ ملتا ہے۔ لیکن علاوہ کسی قدر مختصر ہونے کے اس میں غالب کی حقیقی پایۂ عظمت کا اعتراف نہیں کیا گیا۔ وجہ ظاہر ہے کہ آزاد ذوق کے شاگرد تھے اور استاد کا درجہ بلند ثابت کرنا چاہتے تھے اس کے علاوہ اعلیٰ درجہ کے انشاپرداز بھی تھے۔ جہاں کہیں انہیں اپنے استاد کا پلہ ہلکا نظر آیا دلائل کی کمی کو انشاپردازی سے پورا کر لیا۔

**غالب کا ہمعصر ہونا:** حالی کو باقیماندہ تذکرہ نگاروں پر ایک اتفاقی فوقیت حاصل ہے۔ کہ وہ غالب کے نہ صرف ہمعصر تھے۔ بلکہ شاگرد بھی تھے۔ اس حیثیت سے غالب کی سیرت اور شخصیت کو جاننے والا حالی سے بڑھ کر کون ہوگا۔؟ مرزا نے جو لوگوں کو فکر شعر سے منع کیا کرتے تھے حالی کو شعر و سخن کی مشق کو جاری رکھنے کا مشورہ دیا تھا۔ مرزا غالب کو ان سے بہت محبت تھی۔ اور اسکی شہادت کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔

حالی کی تلقین نماز کے مسئلے پر مرزا کے ساتھ جو معمولی سی شکر رنجی ہو گئی تھی۔ اور اس موقعہ پر یک گونہ بیت "تلخی" کا انداز بھی پیدا ہو گیا تھا [2] اس میں غالب کا حالی سے معذرت کرنا ایکطرح

[1] غالب نامہ صفحہ ۱۰۵ [2] غالب نامہ صفحہ ۱۰۴ [3] یادگار غالب صفحہ ۵۷

کی محبت اور حسن تعلقات کا ثبوت ہے۔ پس ان حالات میں حالی کی معلومات کا رتبہ دوسرے لوگوں کے بیانات سے کتنا بلند ہوگا۔ اور اس کی رائے مختلف معاملات میں کسقدر محرمانہ اور آشنایانہ ہوگی۔

تاہم یہ افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے مصنف نے اس خداداد موقع سے وہ فائدہ نہیں اٹھایا۔ جو خاص حالات کی وجہ سے اٹھایا جا سکتا تھا۔ باسول کی شہرت اور اس کی کتاب کی خوبی کا سب سے بڑا راز اسی میں تھا۔ کہ اس نے ڈاکٹر جانسن سے واقفیت پیدا ہوتے ہی اپنے موضوع کو تلاش کر لیا تھا۔ اور جانسن کے عین حیات ہی میں اس کی زندگی کے حالات کی جستجو میں رہا۔ اس کی گفتگو نقل و حرکت بحث و تمحیص اور دیگر عادات و اطوار کے متعلق یادداشتیں مفصل قلمبند کیں۔ اسی جستجو اور تلاش کا نتیجہ یہ ہے کہ اس نے اپنے ہیرو کی ایک مکمل اور جامع لائف لکھی۔ جس میں زندگی کا کوئی پہلو فراموش نہیں ہوا۔

حالی یہ تو لکھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص ان کے (غالب کے) تمام ملفوظات کو جمع کرتا تو ایک ضخیم کتاب لطائف و ظرائف کی تیار ہو جاتی ہے لیکن اس فرض کی بجاآوری کے لئے خود انہی کی ذات سے بڑھ کر کون موزوں و مناسب تھا۔ مولانا مہر نے اس معاملے میں حالی کی اس فروگذاشت کی جو شکایت کی ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ تاہم اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ کہ یادگار میں جو کچھ ہے مستند ہے۔ اور یادگار نہ لکھی جاتی تو بہت سے واقعات نہ معلوم ہو سکتے اور اکثر پر پردہ پڑ جاتا۔

## غالب کی شہرت میں یادگار کا حصہ

مرزا غالب کو آج جس قدر شہرت حاصل ہے۔ اور ملک کے نوجوانوں نے اس کے سر پر سخنوری کا جو تاج رکھا ہے اس کو چمکانے میں مولانا حالی کا سب سے زیادہ حصہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ آخر میں مرزا "استاد شاہ" بھی ہو گئے تھے۔ اور دربار میں انہیں وہ عزت نصیب ہو گئی تھی۔ جس کی خواہش انہیں ابتدا سے ہی رہی۔ یہ بھی درست ہے کہ مرزا کے سینکڑوں شاگرد استاد کا انتہائی احترام کرتے تھے۔

لیکن ان سب باتوں کے باوصف اسے مرزا کی خوش قسمتی سمجھنا چاہیئے۔ کہ انہیں حالی جیسا شاگرد نصیب ہوا۔ جس کے قلم نے ان کی شاعری اور زندہ دلی کا پیغام جدید ہندوستان کے کانوں تک پہنچایا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ غالب کی شہرت میں حالی کی شخصیت کا بھی حصہ ہے۔ حالی ہندوستان کا شاعر انقلاب تھا۔ مسدس بچے بچے کی زبان پر تھی۔ وہ ہندوستان کے رہنما سرسید احمد خاں کے قافلہ کا ایک فرد تھا۔ نئی نسلیں اس کی شخصیت اور عظمت کا دل سے اعتراف کرتی تھیں۔ اور اس کی ہر بات کو حقیقت کا ترجمان سمجھتی تھیں اسی شخص نے مرزا غالب کی شاعری کا ناقوس بجایا۔ جس کی اپنی شاعری اور قابلیت کا بھی زمانہ معترف تھا۔ پس اس نے غالب کے کلام پر جو تبصرہ کیا۔ اور جس رنگ میں کیا وہ سب کو بھایا۔ سب نے اس کو پسند کیا۔ اور مرزا کی عقیدت کا تعویذ گلے میں ڈال لیا۔ اور اس پیشگوئی کے پورا ہونے کا موقعہ پیدا ہو گیا۔ ع

**شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن**

نوٹ: پرچہ نہ ملنے کی اطلاع ۱۵ تاریخ سے پیشتر پہنچنی چاہیئے۔ ورنہ عدم تعمیل کی شکایات معاف

**میانہ روی** یادگار کی ایک خوبی ایسی ہے۔ جو غالباً ہمیشہ نقادانِ فن کے تحسین کی مستحق ہو گی۔ اور وہ حالی کی تنقید میں میانہ روی ہے۔ ان گہرے تعلقات کے باوجود جو مرزا اور حالی کے درمیان موجود تھے۔ اور اس رشتۂ تلمذ کے باوجود جو عام طور پر بے اعتدالی اور جانبداری کیطرف مائل کر دیتا ہے حالی اپنے ہیرو کے متعلق عموماً واشگاف حقائق قلمبند کرتے ہیں۔ حالانکہ زمانہ کی پرت کا اقتضا کچھ اور تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ خذ ما صفا دع ما کدر "عام زندگی کے علاوہ فن سوانح نگاری میں بھی معمول بہ تھا۔ جو لوگ یادگار کا دوسرے تذکروں سے مقابلہ کریں گے وہ ضرور محسوس کریں گے کہ ڈاکٹر بجنوری اور ریلیف صاحب کی افراط و تفریط کے درمیان ایک متوسط اور معتدل تبصرہ بھی ہے۔ جس میں حقیقت پر ٹھنڈے دل کیساتھ غور کیا گیا ہے۔ بجنوری کے نزدیک غالب ولی اور اس کا کلام" وید مقدس" کا ہم پلہ تھا۔ اور ریلیف صاحب کے نزدیک غالب ایک معمولی رتبہ کا انسان اور اس کا کلام "شاعری کے شائبہ تک سے خالی تھا" لیکن حالی غالب کو فرشتہ نہیں بلکہ انسان اور کمزوریوں اور خوبیوں کا مجموعہ انسان تصور کرتے ہیں۔ اور اس کے شاعرانہ رتبے کو اکابر شعرائے فارسی و اردو کے برابر خیال کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بجائے مقدس اور الہامی کتابوں سے مقابلہ کرنے کے غالب کے کلام کا مقابلہ نظیری وغیرہ کے کلام سے

کیا ہے۔ یہ سب کچھ اس اندھی اندھری دیوی کی اطاعت یعنی عقیدت کے باوجود ہے۔ جس کی زبردستی اور حکومت کے آگے مصلحت اندیشی کے پر جلتے ہیں۔

**یادگار کا مستند ہونا** یادگار غالب کے بیانات اکثر حالات میں صحیح اور مستند ہیں اور ان کی صداقت میں بہت کم کلام ہے۔ یہ صحیح ہے۔ کہ مولانا حالی نے بعض امور میں تلاش و تفحص کا حق ادا نہیں کیا۔ تاہم ہم بلا تامل کہہ سکتے ہیں۔ کہ حالی کے تذکرہ میں جتنے واقعات درج کئے گئے ہیں۔ انہیں سے اکثر درست ہیں۔ جو درج ہونے سے رہ گئے ہیں۔ وہ البتہ ایک فروگذاشت تھی۔ جس کے متعلق آئندہ نسلیں حالی سے شکوہ گذار رہیں گی۔ مولانا مہر کا یہ خیال "کہ یادگار اپنی تمام خوبیوں کے باوجود غالب کی صحیح اور مفصل اور مستند سرگزشت حیات نہیں کچھ قرین صواب نہیں معلوم ہوتا۔ یادگار مفصل نہیں! یہاں تک اُن کی رائے درست ہے۔ لیکن یہ کہ صحیح اور مستند بھی نہیں اس میں کلام ہے۔ مہر صاحب نے اپنی کتاب میں یادگار کے کم و بیش بیالیس موقعوں پر حوالے دیئے ہیں جنیں سے چار پانچ امور میں اختلاف کیا ہے۔ مثلاً یہ کہ غالب نے سفر کلکتہ ۱۸۲۸ء میں نہیں کیا۔ یا یہ کہ پنشن کا حال یادگار میں بہت مجمل ہے۔ حالانکہ اس سے زیادہ ہو سکتا تھا یا پنشن کے متعلق جو دعوے غالب نے کیا تھا۔ اس کی حقیقی بنا وہ نہیں جو حالی نے لکھی ہے۔ یا روشن الدولہ اور معتمد الدولہ میں ان کا التباس وغیرہ۔ پس مولانا مہر کی تحقیق ان حالات؟ میں بیشک درست ہے اور صائب ہے۔ لیکن صرف بعض غلطیوں کی بنا پر کتاب کے متعلق مجموعی طور پر نہیں کہا جا سکتا۔ کہ یہ

صحیح اور مستند نہیں۔ انسانی تحقیق اور تلاش کا قدم روز بروز آگے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اور ہر نیا تذکرہ نگار اپنے پیشرؤں کے نظریات احوال اور نتائج تحقیق کے متعلق نئی معلومات حاصل کر لیتا ہے۔ خود محترم مہر صاحب کی اس مستند کتاب کے چند دن بعد اکرام صاحب آتے ہیں۔ اور ان کی اکثر فروگذاشتوں کا راز فاش کر دیتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مہر کی مذ

پایہ تصنیف صحیح "مفصل اور مستند سرگزشت نہیں"

مولانا شبلی یادگار غالب کو اردو کی بہترین کتابوں میں شمار کیا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے ایک خط میں ایک دوست کو لکھا۔ "کہ مرزا غالب کے حالات اور ریویو مولانا حالی صاحب نے جس تفصیل سے لکھے ہیں۔ اس کے بعد کسی اور کتاب کی کیا ضرورت ہے اور ایک رنگ میں ایک معاصر کا دوسرے معاصر کے متعلق یہ فیصلہ غلط نہیں۔ (باقی آئندہ)

## نامہ نگاران کی توجہ کے لائق

جن حضرات کے علمی وادبی مضامین۔ سبق آموز افسانے اور دلچسپ نظمیں محقق کے صفحات پر ایک سال کے عرصہ میں زیادہ تعداد میں شائع ہونگی۔ ان کے نام محقق کا پرچہ مفت جاری کیا جاوے گا اور اگر کوئی شخص دس خوشنویس مضمون نگاروں کے مکمل پتے ارسال کریگا اسے چھ ماہ کے لئے رسالہ بھیجا جائے گا۔ بشرطیکہ وہ فہرست منیجر صاحب کے پسند آجاوے۔

(ایڈیٹر)

# ہدیۂ اخلاص و ارادت بتقریب سعید جشن تاجپوشی

بخدمت عالیہ عالیجناب مہاراجہ صاحب بہادر آف پٹیالہ سٹیٹ

از قلم میرزا محمد سیف اللہ خاں - فاروق

آج نکلا آفتاب چرخِ حشمت ضوفگن — آج دل کی وادیوں میں فرحتیں ہیں خیمہ زن
آج دیکھے صاحبانِ زیب و زینت خندہ زن — آج ہیں صحنِ چمن میں بلبلیں بھی نغمہ زن
کیا عجب بادِ مسرت کا فضا میں ہے خرام
ہیں خوشی سے نونہالانِ چمن بھی شادکام

محفلِ گل میں نسیمِ دہر ہے عنبر فروش — فصلِ گل کے میکدہ میں گل بھی ہیں مینا بدوش
آبشارِ تاجپوشی میں ہے پیدا پُرخروش — تاجپوشی کی خوشی میں جوش میں الفت کا جوش
ہر غزالِ شادمانی اس سے ہے محوِ خرام
یہ سکوتِ سازِ دل کو زیر و بم کا ہے پیام

ہو مبارک تاج تجھکو اے شہِ ذی احتشام — سلطنت کا بام ہو تو زینتِ بالائے بام
ارتقا کی وسعتوں میں تیرا اسپِ تیزگام — کرتا ہو طے مثلِ برق و باد ہر عالی مقام
خاتمِ انسانیت میں خوبیوں کا ہو نگیں
حکمرانی کے چمن میں تو ہو نزہت آفریں

دامنِ اسلاف میں ہو بارشِ گوہر فشاں — ہو رعایا کارواں تو تو درائے کارواں
اسقدر اوصاف پیدا تجھ میں ہوں اے حکمراں — خلقِ کل ہو وصف میں تیری ہی رطب اللساں
ہو ریاست کا چمن اور تیری ہستی باغباں
دستِ گلچیں سے رہے محفوظ تیرا گلستاں

اے شہِ فرخندہ اختر ماہِ کامل خوبرو — گردشِ دوراں سے ہو محفوظ تیری آبرو
تشنہ کاموں کے لئے گردش میں ہو تیرا سبو — مرجعِ عالم ہو تیری ذات وہ ساقی ہو تو
ہے دعا سورج ترے اقبال کا چڑھتا رہے
تیرا اوجِ سلطنت شام و سحر بڑھتا رہے

# بلا کی تقدیر

میرے اکثر خوشحال دوست کہا کرتے ہیں۔ تقدیر کوئی چیز نہیں یہ محض ایک لفظ ہے یا وہم کہیئے۔ جو نا اہل اور نا قابل لوگوں نے اپنی غلط تدابیر کے بد انجام پر تسکین خاطر کے لئے گھڑا ہوا ہے ہر انسان اپنی قسمت خود بناتا ہے۔ اس پر کوئی بیرونی قوت اثر انداز نہیں۔

میرے وہ تدبیر پرست دوست آئیں۔ اور دیکھیں کہ منشائے تقدیر کے سامنے بہترین تدبیریں کس بیچارگی سے دقف حیرت نظر آتی ہیں۔

شادی کے تین مہینے بعد میں نے لاہور میں وکالت شروع کر دی اور ایک گنجان محلے میں مکان کرایہ پر لے لیا۔

اب میرے وہ دوست آئیں۔ اور دیکھیں کہ میرے اس مکان کے بائیں طرف کا مکان کس بے تکلفی سے ملحق واقع ہوا ہے ان دونوں کا زینہ اس لئے ایک ہی کہا جا سکتا کہ اس کے بیچوں بیچ ایک پست سی دیوار حائل ہو گئی ہے۔ اگرچہ زینہ پر آتے جاتے وقت ہر شخص دونوں مکانوں کے صحن کا بخوبی جائزہ لے سکتا ہے۔ اس مکان کی پشت پر یہ دھرم سالہ ہے جو بالکل ویران ہزاروں بندروں کا مسکن دھرم سالہ کے صحن میں یہ پیپل کا درخت ہے۔ جو اس ملحقہ مکان پر چھایا ہوا ہے۔ اس کی شاخوں پر بندر ہر وقت جھولا جھولتے رہتے ہیں۔

اب دیکھئے واقعات محض سادہ۔ اور غیر متعلقہ واقعات کس طرح ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ کاش میرے تدبیر پرست دوستوں کو معلوم ہو سکے کہ یہ تمام باتیں میرے ارادہ کے بغیر میری زندگی پر کس ظالمانہ رویہ کیساتھ اثر انداز ہوئیں پرسوں کا واقعہ میری کل بربادیوں کا اولین پیغام تھا۔ میں اپنے بالاخانہ کے بارجہ میں کھڑا ہوا تھا۔ میری قوت متخیلہ میری نصف احسن سائرہ کا دھندلا سا نقشہ بنا بنا کر پیش کرنے میں محو تھی۔ یہ ایک پرسکون ماحول تھا۔ میں اس پرکیف دنیائے تخیل میں کھویا ہوا تھا۔ کہ ایک پرسحر آواز میری روح کی عمیق گہرائیوں میں سما گئی میری نظر اضطراری طور پر اسی آواز کی جانب اٹھی! میری نگاہ نے اس وقت مجھے کتنا زبردست دھوکہ دیا۔ میرے اس خیال میں کسی تذبذب کو بروئے کار نہیں آنے دیا۔ کہ اس نورانی مجسمہ میں ممکن ہے۔ میری سائرہ کا کچھ پرتو ہو مگر درحقیقت یہ سائرہ نہیں ہے۔ اور اس فریب نظر کا خاتمہ بہت جلد اس لئے ہو گیا۔ کہ وہ باعصمت حسینہ مجھے قہر آلود نظروں سے گھورتی ہوئی پردے میں ہو گئی۔

فرط ندامت نے میری اس خود فراموشی کا آن واحد میں خاتمہ کر دیا۔ میرا ضمیر مجھے لعنت کرنے لگا۔ یہ شرمندگی مجھے پیوند زمین کرنے پر آمادہ تھی۔ کیونکہ اس سے پیشتر میری باحیا نگاہیں ان جذبات میں ڈوبی ہوئی کبھی کسی عورت پر نہیں پڑی تھیں۔ جو محض سائرہ کی بے پایاں محبت نے پیدا کر دئے تھے۔

واقعات کی ستم ظریفی یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ اور دیکھئے اس کے فوراً بعد ایک بندر میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اور میز

پرے کھے ہوئے گلدستہ میں سے ایک ننھی ننھی سی شاخ نوچ کرلے بھاگا۔ جس پر گلاب کا پھول لگا ہوا تھا۔ میں نے تعاقب کیا۔ وہ ایک جست میں پیپل پر چڑھ چکا تھا۔ اس کود پھاند میں وہ پھول میری ہمسایہ کے صحن میں گر پڑا۔ ایک سال خوردہ عورت فوراً پھول کی جانب گئی۔ اور وہ بولی "نادرہ! یہ پھول کدھر سے آیا ہے؟"
نادرہ نے بندر کی طرف خیال نہ کیا۔ صرف گرتے ہوئے پھول کو دیکھا۔ اُدھر نگاہ کی تو سامنے میں تھا۔ اس کی آنکھیں فرطِ غضب سے خون آلودہ ہو گئی تھیں۔ یہ وہی حسینہ تھی۔ میرے دماغ نے اظہارِ برّیت کے لئے سینکڑوں فقرے وضع کرنا چاہے۔ مگر میری قوتِ گویائی سلب ہو چکی تھی۔ میں بحرِ ندامت میں ہمہ تن ڈوبا ہوا کھڑا تھا۔ مجھے بے حد ذہنی کوفت تھی۔ میرا ہر لمحہ سراسیمگی میں گذر رہا تھا۔ وکالت کا کام بھی بے فروغ تھا۔ دماغ نے فیصلہ کیا۔ کہ کسی اور شہر میں قسمت آزمائی کیجاوے۔ دوسرے دن کی صبح کو میں نے اپنی نصف احسن کے نام لکھنا شروع کیا۔

میرے فردوسِ شوکت کی حورِ ارمی! خوش رہو!!
میں سخت پریشان ہوں اور یہ پریشانی عنقریب ترکِ شہر پر مجبور کرے گی۔ کیا تم بھی میرے اس ارادہ کو پسند کرو گی؟ میں جب سے یہاں آیا ہوں۔ تمہارے حسین تصور میں دن گذار رہا ہوں۔ میری زندگی کا یہی تنہا سہارا ہے۔ مگر دو روز سے خیالات میں ایسا ہیجان و اضطراب ہے۔ جو ہر لمحہ میرے اختیار و قدرت سے باہر ہوتا نظر آرہا ہے۔

خط کو یہاں تک لکھنے کے بعد طبیعت خود بخود رک گئی۔ میں اُٹھ کر کمرے کے برآمدہ میں ٹہلنے لگ گیا۔ اور اس بات پر غور کرنے لگا۔ کہ یہ مکان مجھے کرایہ پر دیا گیا ہے یا بندروں کو وہ جب چاہتے ہیں۔ اس میں بے تکلفی سے داخل ہو جاتے ہیں۔ اور پھر ان کی شرارتیں میری زندگی پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا۔ کہ اتنے میں پھر ایک بندر میز پر سے اُس کاغذ کو اُٹھا کر لے بھاگا۔ جس پر خط کا آغاز کیا گیا تھا۔ بندر کا رُخ لازماً نادرہ کے مکان کی جانب ہوتا تھا۔ کیونکہ پیپل جو تمام بندروں کا ماوا و ملجا ہے۔ وہ بےشک نادرہ کے مکان و صحن پر چھایا ہوا ہے۔ اس مرتبہ میں نے دانستہ بندر کا پیچھا نہ کیا کیونکہ گذشتہ واقعات کا تجربہ ہو چکا تھا۔ تاہم میں خوف زدہ تھا کہ کہیں یہ بھی نادرہ کے مکان میں نہ پہنچ جائے۔ کچھ عرصہ کے بعد ایک سفید کاغذ میرے کمرہ کے آگے آکر گرا میں دیوانہ وار اس کی طرف بڑھا اُٹھا کر دیکھا اُس کے ایک گوشے میں عبارت ظہری کے طور پر لکھا تھا۔

"میں حیران ہوں کہ تم مہذب اور وکیل کہلانے کے باوجود یہ زہرہ گداز ذلت بار بار کیسے برداشت کرنے کی جرأت کرتے ہو۔ کیا تم عزتِ نفس کے احساس سے بالکل محروم ہو۔ کیا توقع رکھوں کہ اس کے بعد تم اپنے آپ کو اس سے زیادہ ذلیل کرنے کی کوشش نہ کرو گے؟"

یہ پڑھ کر میری آنکھوں سے بے اختیار آنسوؤں کا ایک دریا بہہ نکلا۔ یہ صدمہ مجھے اپنی قوتِ برداشت سے باہر نظر آرہا تھا۔ میں بچوں کی طرح روتا ہوا بیہوش ہو کر گر پڑا۔ یہ بیہوشی شاید نیند کی صورت اختیار کر گئی کیونکہ میں دیکھ رہا تھا کہ میرا سر میری سائرہ نے اپنے مخملیں زانو پر رکھا ہوا ہے۔ اور اپنا پُر محبت دستِ سیمیں میرے دل پر۔ وہ مجھے نرم نرم آواز میں کہہ رہی ہے "تم گھبرا کیوں گئے میں تمہارے پاس ہوں۔ ایک بیہودہ خوف نے تم پر حملہ کیا ہے۔ اپنے دل کو ذرا مضبوط کرو۔ تم مرد ہو مرد بنو۔ تم نے کسی کی چوری نہیں کی تمہارا دل لگا ہے۔

نے کسی دوشیزہ و پاکدامن کو پیغام مسرت دری نہیں دیا۔ تم اپنے ساری سے دور رہے مدہوش رہی آؤ۔ دیکھو میں تمہاری سائرہ تمہارے پاس ہوں۔ مجھے اتنا احساس ہے کہ میں کراہ رہا تھا۔ مگر مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی بھاری پتھر میرے سینہ پر رکھا ہوا ہے۔ پھر مجھے پتہ لگا کہ میں اپنے صحن میں زینہ کے قریب زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اور میرا منشی میرے منہ پر پانی کے چھینٹے دے رہا تھا۔

اس کے بعد یہاں کی زندگی میرے لئے موت کا مترادف ہو گئی تھی۔ میں اس مکان کو ہمیشہ کے لئے چھوڑنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اور شاید آج ہی چھوڑ دیتا۔ مگر آہ تقدیر میرے ارادوں پر مسکرا رہی تھی۔ ہاں آج سے ٹھیک چار دن جب میں کچہری جانے کی تیاری کر رہا تھا پھر ایک بندر میری خوشیوں اور بربادیوں کا پیغام لیکر آیا۔ اور چھوٹی میز پر سے جو کمرہ کے شمالی گوشے میں رکھی ہوئی ہے۔ ایک رومال اٹھا کر دوڑ پڑا۔ یہ رومال میری سائرہ نے مجھے رخصت کرتے وقت دیا تھا۔ ان الفاظ کے ساتھ "یہ آپ کو تسکین دیگا۔ اس وقت جب آپ میرے لئے پریشان ہوں گے" آہ وہ کمبخت میرا کتنا قیمتی سرمایہ لیکر بھاگ چلا تھا۔ اب میرا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ میں کسی انجام پر نظر کئے بغیر اپنی بندوق لیکر اس کے پیچھے بھاگا۔ زینہ کو طے کر کے میرا قدم مکان کی چھت پر پڑا ہی تھا۔ کہ ٹھیک اسی وقت نادرہ کا قدم بھی اپنے مکان کی چھت پر پڑا۔ اس کے ہاتھ میں ربڑ کی ایک غلیل تھی۔ اور وہ والہانہ انداز میں چلا رہی تھی بندر بندر میری ریشمی اوڑھنی لے بھاگا۔ میں نے سمجھا وہ دوسرا بندر میرا بھی ایک قیمتی سرمایہ لئے ہوئے بیٹھا ہے۔ شاید آپ نے بڑی احتیاط سے اس کو سکھایا ہے۔ کہ وہ میری ہر چیز آپ کے مکان میں پھینک

دیا کریں - ان فقروں کیساتھ ہی ہم دونوں کی نگاہیں بیک وقت ایک دوسرے پر پڑیں - اُس کے ہاتھ میں وہ غلیل کھنچی کی کھنچی رہ گئی - بیشک وہ بلا کی حسینہ تھی - اس کے لمبے لمبے سیاہ بال اُس کے گھٹنوں کو بوسہ دے رہے تھے - اس کی بڑی بڑی نشہ پرور آنکھوں میں شباب کا سحر انگیز خمار تھا - وہ ہاتھ میں غلیل لئے ایک عجیب شاہانہ شوکت کیساتھ کھڑی ہوئی تھی - اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ نظام عالم کو ابھی ایک اشارہ میں درہم و برہم کر ڈالیگی - اسطرف میں کھڑا تھا - خاموش تصویر کے کھلونے کیطرح بندوق خود بخود میری حالت ہی ہو گئی تھی - جیسے کوئی مسلح سپاہی اپنے جرنیل کو سلامی دیکر منتظر حکم کھڑا ہو - میں نے ذرا اپنے حواس درست کئے اور کہا " محترم پاکدامنہ آپ کو کچھ علم ہوا - کہ ان بندروں نے میرے متعلق آپ کو کس قدر غلط فہمی میں ڈالا ہوا تھا - وہ مجھے بے حجابانہ طور پہ دیکھ رہی تھی - اب اُسکی نگاہوں سے وہ تندی اور خونِ آشامی کی جھلک بالکل زائل ہو چکی تھی - جو آج سے پہلے اس کا جزو طبیعت بنی ہوئی تھی - تاہم میں اپنے جسم میں رعشہ محسوس کر رہا تھا - یکایک اُس کے پتلے پتلے نازک ہونٹوں پہ تبسم کی ہلکی سی لہر نمودار ہوئی - اور مجھے مخاطب کرکے بولی مجھے معاف کر دیجئے - میں ایک دلفریب غلط فہمی میں مبتلا تھی خدا کے لئے میرے گستاخانہ اقدامات کو بالکل بھلا دیجئے -

اس کے بعد مسکراہٹ کی نہایت خفیف سی جنبش پھر اُس کے ہونٹوں پر ظاہر ہوئی - میں نے کچھ کہنا چاہا - مگر وہ فوراً نظروں سے اوجھل ہو گئی - اب میں تنہا کھڑا تھا - مجھے ایسا محسوس ہوا کہ تمام جہاں کو خیرہ کر دینے والی ایک بجلی چمکی تھی - جو آنِ واحد میں میرے متاعِ دل کو برباد کر گئی -

یہ واقعہ ایک مضراب تھی جس نے میرے سازِ دل کی خاموش تاروں میں ایک وجد آفریں نغمہ پیدا کر دیا تھا۔ یہ نغمہ خاموش تھا اور یہ مسرت اندوز۔ یہ بھی ایک کرشمۂ تقدیر تھا۔ واقعات وہی تھے۔ انہیں کوئی تفاوت نہ تھا۔ مگر اثرات کس قدر مختلف!

اس کے بعد ہر لمحہ اہم ترین ہو گیا تھا۔ مجھے ایک زبردست امتحان میں ڈال دیا گیا تھا۔ ایک گھنٹہ بھی نہ گذرا ہوگا کہ مسٹر چوپڑہ جو یہاں ایک خوش مذاق رئیس اور میرے دوست ہیں۔ اچانک میرے کمرہ میں داخل ہوئے اور نہایت بے ساختگی سے کہنے لگے۔ واہ جناب! آپ تو بہت چھپے رستم نکلے۔ یہ آج تمام محلہ میں کیا شور ہو رہا ہے؟ اس بندوق سے یوں کام نکالے جاتے ہیں؟ ان الفاظ سے میرے ہوش و حواس باطل ہو چکے تھے۔ تاہم میں نے جرأت کی اور پوچھا۔ کیا ماجرا ہے۔ اس پر ان کا جواب تھا "مجھ سے پوچھتے ہو ماجرا؟ گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ مسٹر شرما کی بیوی نے اپنے مکان کی چھت پر کھڑے ہوئے سب کچھ دیکھ لیا ہے۔ آپ بندوق سے مسلح ہو کر نادرہ کے گھر میں گئے۔ اس نے رومال سے نکلتے ہوئے تمکو اپنی آنکھ سے دیکھا۔ یہی نہیں بلکہ نادرہ منیر اوپر تک بحفاظت چھوڑ گئی۔ مجھے ابھی ابھی سٹ رامانے یہ قصہ بتایا ہے۔ یہ ہے ماجرہ۔ جس کو کہتے ہیں محبت اور دل رقیب میں کھٹکنے کے لئے زمانت۔ اب سمجھے ماجرہ؟"

اس قسم کی دو چار پھبتیاں کس کر مسٹر چوپڑہ تو رخصت ہو گئے مگر میری پریشانی اور اضطرابی میں اضافہ کرنے کے لئے کافی مواد چھوڑ گئے۔

میں نے کچھ نہیں کیا تھا۔ مگر نادم تھا۔ میں پہلے سے بھی شرمسار تھا۔ اب مجھ میں اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ اپنے مکان کے بارجہ میں بھی کھڑا ہونیکی جرأت کر سکوں۔ معلوم نہیں خیالات کی اس کشمکش میں کتنا وقت گذر گیا۔ اسی حالت میں میری نظر صحن میں پڑے ہوئے ایک ریشمی رومال پر پڑی۔ میں نے اس کو اٹھایا دیکھا اس کے اندر ایک لفافہ ہے۔ رومال اور لفافہ میں سے عطر کی بہترین خوشبو نہایت فیاضی سے میرے دل و دماغ کو فرحت پہنچا رہی تھی۔ لفافہ کھولا تحریر تھا۔

میرے ........

ایک خوددار ........ کا اعتراف شکست قبول کیجئے۔ برخلوص درخواست ہے۔ جواب دیجئے۔ کس چیز کی توقع رکھوں؟ محبت؟ یا نفرت؟ اتنا ضرور سمجھ لیجئے کہ عورت اپنے ارادوں کی تکمیل میں وہ استقلال و استحکام رکھتی ہے۔ جو پہاڑوں کو ملا ہے۔ اور وہ شجاعت و بہادری جو جنگل کے آزاد شیروں کا حصہ ہے۔ ازدواجی تعلقات کے لئے مرد کا انتخاب عورت کی زندگی کا اہم ترین مسئلہ ہے۔ عورت اگرچہ مغلوب جذبات کہلاتی ہے۔ مگر میں بتاتی ہوں۔ کہ میں یہ خط آغاز و انجام پر کامل غور و خوض کے بعد لکھ رہی ہوں۔ اور یہ عورت کی فطرت ہے کہ جب وہ اپنے لئے کسی شخص کا انتخاب کر چکتی ہے۔ تو اس کے اس حتمی فیصلہ کو صرف موت بدل سکتی ہے۔ اور ہاں یہ انتخاب ہی صرف عورت کی زندگی کا ایک کمزور پہلو ہے۔ اس انتخاب کے سامنے وہ مستحکم پہاڑ موم ہو جاتے ہیں۔ اور عورت کی ہستی ختم ہو جاتی ہے۔ آج میں اپنے نسائی وقار کو آپ کے قدموں پر نچھاور کرنیکا آخری فیصلہ کر چکی ہوں۔ صرف وہ

لفظوں میں جواب چاہتی ہوں۔ وہ یہ سمجھ
لیجئے کہ وہ دو لفظ میری موت و حیات کا مسئلہ
طے کریں گے۔ جلد ترین جواب دیجئے کہ میں
توقع رکھوں۔ کہ آپ میری خودداریوں کے
سوال کو ترجیح دیں گے۔؟ فقط"

آپ کی ہمسایہ

میں نے خط کو کامل غور کے ساتھ پڑھا۔ مطلب صاف تھا۔ یہ میری کتاب زیست میں پریشانی و اضطراب کا جدید اور انوکھا باب تھا۔ میرے کمزور دل و دماغ کے لئے پُر پیچ حوصلہ آزما امتحان۔ سائرہ پر نادرہ کو ترجیح؟ کٹھن سوال تھا۔ ہاں وہ سائرہ جس کے لئے میری زندگی نے کئی انقلاب دیکھے ہیں۔ رفیقۂ حیات جس نے میرے لئے ایثار و قربانی کی انتہائی حدیں قابل عمل کر دکھائیں۔ اس کی تمام زندگی میری آنکھوں کے سامنے آگئی میں فیصلہ نہ کر سکا۔ زندگی میں آج بھی بھر کر رو چکا ہوں۔ اور خوب رو رہا ہوں۔ شاید اسکے بعد پھر کبھی موقع نہ ملے۔ ہاں میں ایک محروم ہوا اس غلط فکر کی طرح کمرہ میں ٹہل رہا تھا۔ قدم تیز تیز اٹھ رہے تھے۔ جسم میں ایک رعشہ سا محسوس ہو رہا تھا۔ اس وقت دوپہر کا ڈیڑھ بج چکا تھا۔ ملازم نے کئی مرتبہ کھانے کی تاکید کی مگر آج غم و فکر کی سیر حاصل غذا نے معدہ والے کھانے کی ضرورت سے بے نیاز کر دیا تھا۔ میں کافی دیر تک خیالات کے نہ ختم ہونے والے سلسلہ میں خود فراموش رہا۔ اور آہ! شومیٔ قسمت سائرہ بھی اسی حالت میں میرے پاس اوپر کمرہ میں پہنچ گئی۔ میں حیران تھا کہ یہ کیونکر ممکن ہوا۔

میں نے پوچھا۔ پیاری سائرہ! خیریت ہے۔ کیوں تکلیف گوارا کی۔

سائرہ! ہاں اب تسکین ہو گئی۔ خیریت ہے۔

میں یہ کیسے؟

سائرہ دو روز سے میں بے حد مضطرب تھی۔ میرا ہر لمحہ بیقراری میں گذر رہا تھا۔ اور دل کو ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ کہ شاید آپ کے دشمنوں کی طبیعت ناساز ہے۔ آپکا حسب معمول خط بھی نہ آیا تھا جب میں اس کشمکش کو برداشت نہ کر سکی۔ تو بھائی جان کی موٹر میں فوراً چل پڑی۔

میں۔ بہت اچھا آپ گئیں۔ میں سخت پریشان تھا

سائرہ۔ بات کاٹ کر تیزی اور تعجب سے) میرے محترم پریشانی کیسی؟

ایک منٹ تک کوئی جواب نہ دے سکا۔ دماغ نے کئی فقرے سوچے لیکن زبان ان کو ادا کرنے پر مائل نہ ہوئی۔ آنکھوں میں پھر آنسو بھر آئے۔

سائرہ۔ محترم کیا معاملہ ہے؟ یہ ہاتھ میں کیسا پرچہ ہے کیا اس کو پڑھنے کی جرأت کر سکتی ہوں؟

میں نے بغیر کچھ کہے کانپتے ہوئے ہاتھ کیا تو وہ خط سائرہ کو دیدیا۔

نادرہ کی وہ تحریر پڑھی غالباً کئی مرتبہ۔ میں دیکھ رہا تھا پڑھتے پڑھتے اس کی نیلگوں آنکھوں میں خود بخود سرخی کے ہلکے ہلکے ڈورے کھنچ گئے تھے۔ اس کے بعد پانی کی لہروں کو جنبش سی ہوئی مگر نظر بغیر پلک جھپکے خط پر گڑی ہوئی تھی۔ پانی کی وہ لہریں طوفان بنیں۔ طوفان میں موجیں آئیں اور پھر ان موجوں نے

آنسوؤں کا ایک قطرہ نوکِ مژہ پر اس قرینہ سے پہنچا دیا جیسے کسی بے کس و لاچار کو پھانسی پر لٹکا دیا جاتا ہے۔ آخر اس قطرۂ اشک کی عمر طبیعی ختم ہو گئی۔ اور وہ آسمان سے ٹوٹے ہوئے تارے کی طرح خط پر آ گرا۔ سائرہ نے ایک بہت لمبی آہ بھر کر یہ کہتے ہوئے خط مجھے واپس کر دیا۔

میری خوشیوں اور تمناؤں کے مرکز!

آپ کو میری طرف سے پوری اجازت ہے۔ جس سے چاہو دل کو بہلاؤ۔ مردوں کے لئے عورتیں ایک کھلونا بنائی گئی ہیں۔ مرد کو یہی زیب دیتا ہے۔ کہ وہ ہر نئی صبح نئے کھلونے کی جستجو کرے۔ میں ہر حالت میں آپ کو خوش دیکھنے کی خواہشمند ہوں۔

یہ کہکر کچھ دیر سائرہ خاموش کھڑی رہی۔ پھر بولی اچھا اب مجھے اجازت دیجئے۔ میرا اطمینان ہو گیا۔

میں۔ یہ یک طرفہ ڈگری دینا تو ناانصافی ہے۔ میرا عذر بھی تو سنئے۔

سائرہ۔ میں نہ وکیل ہوں اور نہ جج۔ اس لئے نہ عذر سننے کی قابلیت نہ ڈگری دینے کا حق۔ میں بہر حال آپکی ناچیز خادمہ ہوں۔ خدمت پر فخر کروں گی۔ لیکن اس وقت مؤدبانہ گذارش ہے کہ مجھے جانیکی اجازت بخشدیجئے۔ کیونکہ اب زیادہ دیر تک یہاں ٹھیرنے کی مجھ میں طاقت نہیں۔

اس کے بعد سائرہ فوراً موٹر میں امرتسر کو روانہ ہو گئی۔ اور میرے لئے غم و انتظار کی مکدر فضا چھوڑ گئی۔ اب میرے قابل تدبیر احباب آئیں۔ میری رہنمائی کریں میں کسطرح سائرہ کو یقین دلاؤں کہ نادرہ کو خط لکھنے کی جرأت دلانے میں میرا کوئی حصہ نہیں ہے۔ میں نے نادرہ کے خط کا جواب سائرہ کے چلے جانیکے فوراً بعد بھیجدیا تھا۔ لکھدیا گیا تھا۔

آپ کے عزم و ارادہ کا پتہ چل گیا۔ آپکے زرین خیالات کے اظہار کا شکریہ۔ مگر کاش آپ کو اس ارادہ کی پختگی سے پہلے معلوم ہو سکتا کہ میری شادی ہو چکی ہے۔ اور آپ کی تحریر کو خلاف قیاس و امید میری شریکۂ زندگی نے بھی پڑھ لیا ہے۔

افسوس آپ نے بہت دیر میں انتخاب کیا اور بہت غلط۔ گو آپ فہم و ادراک کا سرمایہ دار معلوم ہوتی ہیں۔ تاہم میری یہ التجا ہے کہ اس خط کو پڑھنے کے بعد عقل کو جذبات کا مطیع نہ ہونے دیں۔

فقط
دل شکن
"پردیسی"

میری سہ روزہ زندگی کا یہ صحیح مرقع ہے۔ جس کو میں نے آج ½ ۳ بجے سے لیکر ½ ۵ بجے تک قلمبند کیا ہے سوچ رہا تھا کہ یہ تیز رفتار واقعات کا فسانہ کب اور کس طرح مکمل ہوگا۔ شکر ہے تکمیل کا پیغام غروب آفتاب سے قبل پہنچ گیا۔ اب میرے سامنے بہت طولانی سفر ہے۔ لکھنے میں وقت نہیں گزارا جا سکتا۔ صرف ایک ہی فقرہ کا اضافہ کرنا تھا۔ وہ یہ کہ "

آفتاب غروب ہو چکا تھا نادرہ اور شوکت کے مکانوں کے سامنے لاتعداد مجمع کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ معلوم ہوا ابھی ابھی نادرہ کنوئیں میں گر کر اور شوکت اپنے بندوق مار کر تفکرات کی دنیا سے ہمیشہ کے لئے آزاد

ہو چکے ہیں۔ لوگوں نے دیکھا شوکت کی لاش نزدیک بندوق
میز پر ایک ٹیلیگرام جس میں لکھا تھا۔

از امرتسر۔ امرتسر کے ایک میل کے فاصلہ پر
موٹر کار ٹکرائی۔ مہلک چوٹیں تمہاری سائرہ
کی موت کا موجب ہو گئیں۔ جلد پہنچو"

اس ٹیلیگرام کے پاس ہی مذکورہ بالا طولانی تحریر نہایت سلیقہ سے رکھی ہوئی تھی جسکا عنوان تھا۔

**ہلاک تقدیر**

اور آخری سطر یہ ہے۔

اب مجھے صرف ایک ہی فقرہ کا اضافہ کرنا ہے۔ وہ یہ کہ سائرہ کے بعد زندہ رہنا بے سود۔ زندگی کا افسانہ مکمل تھا اب میں مرتا ہوں تاکہ یہ مکمل ہو جائے۔ اور میں سائرہ کے پاس جلد پہنچ جاؤں۔ "شوکت"

(ظہیر شاہ آبادی)

# پنہاری

کون آئے کون ایسے میں کسی کو تھامنے
آرہی ہے ایک البیلی حسینہ سامنے

گوری باہوں میں گھڑے کو اس طرح تھامے ہوئے
آرزوئیں دل میں کوئی جس طرح تھامے ہوئے

بوجھ سے نازک کمر کھائی ہوئی بل اس طرح
زور دینے سے لچک آئے کماں میں جس طرح

رخ سے اک مدہوش کن رنگِ تمنا آشکار
جیسے غنچوں کے لبوں پر مسکراہٹ کی بہار

کھلکھلاتی سی جوانی مسکراتا سا جمال
خواب میں جیسے کسی رنگین زمانے کا خیال

سرخ رخساروں سے کچھ کرنیں سی بکھراتی ہوئی
جیسے اٹھے چشم آہو کیف برساتی ہوئی

نرم ہاتھوں کو حنا کے خون میں دھوئے ہوئے
مہر کے جلوے شفق کی گود میں سوئے ہوئے

ریشمیں زلفیں حسیں گالوں پہ بل کھاتی ہوئیں
جیسے کالی بدلیاں سورج پہ لہراتی ہوئیں

ہر نفس نزہت بداماں ہر نظر بندہ نواز
جس طرح محمود کی نظروں میں تصویرِ ایاز

آہ یہ رنگیں جوانی اُف مجسم دلبری
کر رہی ہے جسم میں پیدا مرے اک تھرتھری

ہائے یہ بیخود فضائیں آہ یہ شانِ عجیب
کاش یہ سادہ تمدن شہریوں کو ہو نصیب

(الطاف مشہدی)

# مرزا عبدالقادر بیدلؔ

جناب سید ضیا جعفری صاحب

(گذشتہ سے پیوستہ)

ہر کسی حالت یا کسی شے کی تعریف اس طرح پر کی جائے کہ اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھنچ جائے **محاکات** کہلاتی ہے۔ شعر بالعموم محاکات سے خالی نہیں ہوتا۔ تخییل کو محاکات سے اور محاکات کو تخییل سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ہر بلیغ شعر ان دونوں سے کبھی خالی نہیں ہوتا۔ یا اس میں تصویری محاکات ہو گی یا تخییلی۔ جس میں صوری پہلو غالب ہو۔ وہ محاکات تصویری کہلائیگا۔ اور جس میں خیالی پہلو غالب ہو۔ وہ محاکات تخییلی۔

بیدل کے کلام میں تخییلی محاکات کا عنصر غالب ہے مگر بعض بعض اشعار میں صوری محاکات بھی ہیں۔ مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

زکوہسار بروں سیلاب وحشت خوردہ مے آید
بچشم آہوئے دشت چوں تو نیا رخ پلنگ است را

کوہسار جنوں کا نقشہ کس انداز سے کھینچا ہے ؎

بیدل اندر جلوہ گاہِ چین ابروئے کسے
کشتیٔ نظارہ در موجِ خطر واریم ما

تشبیہ کا تسلسل دیکھئے۔ چینِ ابرو میں نگاہِ عاشق بیتاب نہیں ٹھیر سکتی۔ جیسے کہ طوفان کی آغوش میں کشتی خطرہ میں ہو۔ ؎

خاکِ ما نامۂ بجانب یار
می نویسد دلے بخطِ غبار

مشتِ غبارِ عاشق کا کیا دردناک منظر پیش کیا ہے۔ عاشق کی خاکِ پریشان حسرت و حرمان نصیبی کا خط اخطِ غبار سے معشوق کی جانب لکھتا ہے۔ دوسرے مصرع میں گویا یاس و اندوہ کو مجسم کر دیا ہے ؎

سراسر چمن دہر نرگستان است
تو نیز آئینہ بر تراش و حیران باش

چمن دہر سراپا حیرت و استعجاب کا نقشہ ہے۔ نرگستان کی تشبیہ نے کیا حسن پیدا کیا ہے۔ (اس سراسر حیرانگی کے عالم میں) تو کیوں بیکار بیٹھا ہے۔ تو بھی اپنے لئے آئینۂ حیرت تراش۔

**عام فہم اور سلیس اشعار** جہاں کسی مضمون کو عام فہم طریقہ سے ادا کیا ہے۔ وہاں انداز بیان نہایت صاف اور واضح ہے۔ زبان کا لطف پیدا ہوتا ہے ؎

بیدل بجرم آنکہ چو آئینہ سادہ ایم
خاکستر زمانہ بسر مے کشیم ما

آئینہ کو خاکستر سے جلا دی جاتی ہے۔ اب اس شعر کے معانی پر غور کریں۔ تغزل ملاحظہ ہو ؎

بود بغیر نام تو ذکر زبانِ ما　　یک حرف بیش نیست زباں در دہانِ ما
رنگ شکست آئینۂ بیخودی بس است　　یارب زبانِ ما نشود ترجمانِ ما
چوں شمع دم زشعلۂ شوق تو مے زنیم　　خالی مباد از تپِ گرم استخوانِ ما
ما معنیٔ مسلسلِ زلف تو خواندہ ایم　　مشکل کہ برگ قطع کند داستانِ ما
بیدل بجوم گریۂ ما را سبب مپرس　　بے مقصد است کششِ اشکِ روانِ ما

**اعتمادِ نفس یا جذبۂ خودی** کا یہ مطلب نہیں کہ انسان سرے سے وجودِ مطلق میں اپنی ہستی کو فنا کرنے سے اپنی ہستی مٹا دے۔ یا خودی کو فنا کر دے۔ بلکہ اپنی انفرادی ہستی کو اس قدر جاذب بنائے۔ کہ وہ اخلاقِ الٰہی کو جذب کر سکے۔ اور فردِ یکتا سے مشابہ ہو جائے۔ جسقدر یہ اپنی انفرادیت میں کامل ہوگا۔ اسی قدر اسی ذاتِ یکتا سے قریب تر ہوتا جائے گا۔ اور جسقدر اس کی انفرادیت کمزور ہوگی۔ اسی قدر ناقص رہیگا۔ فی زمانہ علامہ اقبال اسی نظریہ کو خودی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور اس کے علمبردار کہلاتے ہیں۔ ہمیں اس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں مگر غور کی نظر سے دیکھا جائے تو متقدمین کے کلام میں بھی اس کی جھلک پائی جاتی ہے۔ خودی جب ہی مستحکم ہو سکتی ہے جب اعتمادِ نفس حاصل ہو۔ چنانچہ مرزا بیدل فرماتے ہیں ؎

کیفیتے ہو نشۂ وفا ں نمے رسد
چشمے بخویش واکن و جامِ شراب گیر

(چشم بخویش واکن) اپنی خودی اور انفرادیت کی تکمیل کر اور پھر اپنے میخانے سے جامِ شراب لے کیونکہ عرفانِ نفس کی کیفیت کو کوئی خارجی نشہ نہیں پہنچ سکتا۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

زیں بحر یک دو آئینہ دست شراب گیر
گر تشنۂ چو آبلہ از خویش آب گیر

اپنے بحرِ خودی سے ساغر طلب کر۔ اگر تو پیاسا ہے تو آبلہ کیطرح اپنے سے پانی حاصل کرے

دلِ آسودۂ ما شورِ امکاں در نفس دارد
گہر دزدیدہ است اینجا عنانِ موج دریا را

اعتمادِ نفس و اعتبارِ خودی کا نقشہ اس سے بہتر الفاظ میں کھینچنا مشکل ہے۔

ہمارا دلِ آسودہ کائنات کا زلزلہ اپنے ہر سانس میں پنہاں کئے ہوئے ہے۔ یہاں تو گہر موجِ دریا کی سرکش باگ روکے ہوئے ہے۔ گوہر کی آب و تاب کو دریا کی لہر سے تشبیہ دی گئی۔

ستم است اگر ہوست کشد کہ بسیرِ سرو و سمن درآ
تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ درِ دل کشا بچمن درآ

انسان خود ایک ایسا غنچۂ ناشگفتہ ہے۔ جس کی پتی پتی بذاتِ خود ایک گلستاں ہے۔ اعتمادِ نفس پیدا کر اور اپنے دل کا دروازہ کھول اور اسی چمن میں داخل ہو تا کہ تو اپنی خودی سے اس کی نِدائی تک پہنچ سکے۔

**بیدل کی خصوصیات** بیدل نے بعض الفاظ اپنا لئے ہیں۔ اور بعض خیالات بھی رفعتِ تخیل کی بنا پر اس کا حصہ ہو گئے ہیں۔ لفظ آئینہ و حیرت گویا ان کا حاصلِ شاعری ہے۔ شاید کہ فارسی اساتذہ متقدمین اور متاخرین کے جملہ مجموعہ کلام میں لفظ آئینہ اور مضمون حیرت اسقدر کثرت سے استعمال نہوا ہو۔ جسقدر مرزا کے ہاں استعمال ہوا ہے۔ علاوہ بریں عام طور پر ان الفاظ کو کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ رم وحشت۔ نفس۔ نالہ۔ جرس کاروان۔ غبار۔ حباب نیستان صبح۔ قیامت۔ آبلہ شرار۔ حیرت۔ جوہر وغیرہ۔

حیرت اور آئینہ کے متعلق ان کا ہر شعر ایکدوسرے سے انداز بیان میں جداگانہ ہے۔ مطالعہ کے دوران میں اس تواتر سے جی نہیں اکتاتا۔ چنانچہ بعض ردیفیں بھی آئینہ دار آئینہ است وغیرہ رکھی ہیں شعر ملاحظہ ہوں۔

با ہمہ نیک است یکرنگی ہوس آئینہ را
نیست اظہارِ خلافِ ہیچکس آئینہ را

علتِ حیرت نگر در پردۂ سازِ معاں
جلوہ دارد کہ می سازد فغاں آئینہ را

عالم اقبال محو پردۂ ادبار ماست
صد بہار گم کردہ در بال شکستِ آئینہ را

رہتے نظارہ ہا از جلوۂ حسن تو زیور ہا
رنگ برنگِ گل از عکسِ تو دو آئینہ جوہر ہا

آں روز کہ بیدلِ نفس ما را اثرے بود
ہر ذرہ آئینہ جنبِ نظرے بود

دل گشتہ تماشائی حسن است و در
آئینہ بہ پیشِ تو شکستن ہنرے بود

صد سنگ شد آئینہ و صد قطرہ گہر گشت
افسوس ہماں خانہ خراب است دل ما

ما ہم بہ خلوتِ تو بار بار آئینہ است
نگاہ بر دو جہاں مذہبِ آئینہ است

مرزا اکثر بحرِ کامل میں شعر لکھنا پسند کرتے ہیں۔

من سنگدل چہ از برمِ حضور ذکر دوامِ او
چو نگیں نشستہ کہ فرو روم بگو وا ز خجالتِ نامِ او

مرزا کی تکمیل فن اور والہانہ طرزِ بیان کا اس سے بین ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کے قدیم اقبال شاعر اور فلسفی مرزا غالب مرحوم ان کی تتبع کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

رنگِ بیدل میں ریختہ لکھنا  اسد اللہ خاں قیامت ہے

انہیں خود بھی اپنی استادی پر ناز ہے۔ اور بجا طور پر ناز ہے چنانچہ فرماتے ہیں ؎

مدعی درگذر از دعویٰ طرزِ بیدل  سحر مشکل کہ بکیفیتِ اعجاز رسد

کلیات میں بعض غیر منقوط اشعار بھی پائے جاتے ہیں۔
مثال کے طور پر ؎

دلِ اگر محو مدعا گردد  محو اسرارِ طرۂ او را
درد درکام ما دوا گردد  رگِ گل دامِ مدعا گردد

**وفات** بقولِ آزاد مرحوم ۱۱۹۳ھ ہجری میں فوت ہوئے۔ دہلی دروازے شہر دہلی کے باہر ان کی قبر ہے تاریخ وفات یہ ہے

آہ سر کردۂ اربابِ سخن  از غم آباد جہاں نرم رفت
گفت تاریخ وفاتش ہاتف  مرزا بیدل ازیں عالم رفت
۱۱۹۳ھ

ان کا دیوان بحروف جلی خوشخط لکھا ہوا قبر پر دھرا رہتا ہے
انا للہ وانا الیہ راجعون۔  سید ضیا جعفری ۱۰ ارجوری ۱۹۳۸ء

# انتباہ

از قلم گوہر بار جناب تابش صدیقی صاحب بی۔ اے۔ آنرز

(۱)

ہ وفاؤں کے خدا مجھے میری وفاؤں کی قسم!
جنہیں نہ تو بھی سن سکا انہیں نواؤں کی قسم!
عزیز ہیں جو جان سے انہیں دعاؤں کی قسم!
مجھے تجھی سے عشق ہے تیری حیاؤں کی قسم!

(۲)

یہ بلبلیں گواہ ہیں مجھے تجھی سے عشق ہے
یہ ظلمتیں گواہ ہیں مجھے تجھی سے عشق ہے
لطافتیں گواہ ہیں مجھے تجھی سے عشق ہے
صعوبتیں گواہ ہیں مجھے تجھی سے عشق ہے

(۳)

ترے حصول کے سوا نہیں ہے کوئی آرزو
تری تلاش کے سوا نہیں ہے کوئی جستجو
تری ہی گفتگو میں گم رہی ہر ایک گفتگو
مگر مجھے تری قسم بہت ہے مجھ سے دور تو

(۴)

میری طلب ہی نہیں کہ آہ، تجھ کو پا سکوں
کہاں میرے نصیب یہ کہ خود میں تجھ تک آ سکوں
جو مجھ میں تجھ میں فرق ہے وہ کس طرح مٹا سکوں
فلک کے ماہتاب کو زمیں پہ کیسے لا سکوں

(۵)

یہ کس طرح ہوں کہ میں زندگی کو بھول جا
مرے غموں پہ اشکبار ہو، ہنسی کو بھول جا
جُدا ہے طرز عشق ہر خوشی کو بھول جا
اگر ہوں تو یہ بھول کر تو مجھی کو بھول جا

(۶)

اگر تجھے مری وفا پہ صبر آ سکے۔ تو آ
اگر یہ عشق تیرے رنج و غم ہٹا سکے۔ تو آ
اگر یہ درد دل مرا تجھے لبھا سکے۔ تو آ
مرا غریب خانہ گر محل بنا سکے۔ تو آ

(۷)

وگرنہ مجھکو رہنے دے تو اپنی آرزو سے دور
مجھے پیالہ چھوڑ دے شراب اور سبو سے دور
خموش اور سکوت میں مجال گفتگو سے دور
خیال کے طلسم میں جہانِ رنگ و بو سے دور

(۸)

فراق سے نہ یاس سے نہ موت سے ڈروں گا میں
ترے بغیر تیری ہی پرستش کروں گا میں
مئے وفا و درد سے ہی جام دل بھروں گا میں
تری ہی یاد میں جیوں گا اور یونہی مروں گا میں

(۹)

مرا گناہ معاف کر یہی مرا گناہ ہے
کہ مجھکو تجھ سے عشق ہے تجھی سے مجھکو چاہ ہے

یہ ترکِ آرزو نہیں فقط اک اشتباہ ہے
اگر اب نہ سکے تو آ یہی وفا کی راہ ہے

(۱۰)

نہیں ہے عذر نہیں سہی خزانہ وفا تو ہے
سکوں نہیں تو کیا ہوا سکوں کا آسرا تو ہے
فریب ہے برا کرے فریب دلربا تو ہے
زمین والے ہیں عدو ہوا کریں خدا تو ہے

(۱۱)

اگر تو آ سکے تو پھر نہ غم رہے نہ بیکسی
نہ مفلسی کا رنج ہو نہ صرفِ غم ہو زندگی
نہ فکرِ طنزِ غیر ہو نہ حسنِ زر کی دلبری
مصیبتیں بھی کاٹ دیں مزے مزے خوشی خوشی

# قصیدۂ مدحیہ

## در توصیف منبع جود و ہستی عالیجناب سر لیاقت خانصاحب وزیر اعظم پٹیالہ سٹیٹ

از قلم
مرزا محمد سیف اللہ خان۔ فاروق

تو ریاست کے فلک پر ماہتابِ پُر ضیا ظلمتِ شب جس سے ہے کافور ساری سر تا پا
انتہائے جود و حاتم سے ہے تیری ابتدا موتیوں سے دامنِ گرداب تو نے بھر دیا
عقل و حکمت کے صدف میں گوہرِ رخشاں ہے تو
یہ وزارت کیا ہے تیری زینت ہر آبرو
ہیں تیرے ممنونِ احساں سب ریاست کے مکیں کہتے ہیں سب یک زباں ہو کر وزیر بہترین
تو ریاست کے چمن میں آج ہے گُل آفریں انتظامِ ملک میں ثانی ترا ملتا نہیں
صبح کے انوار راتوں کو مہیا کر دیے
جسقدر تھے جوہر ناپید پیدا کر دیے
صد ہزاراں کام تجھ سے پا رہے ہیں انصرام ایک تیری ذات پر ہے سب ریاست کا نظام
ہو ریاست کو مبارک تیری شانِ اہتمام قابلِ تقلیدِ عالم ہے ترا ہر ایک کام
ہے ریاست گر صدف تو ابرِ نیسانی ہے تو
یہ گہر باری تیری ہے موتیوں کی آبرو
تیری قسمت کا ستارہ ہر فلک پر ضو فگن آفریں کہتی ہے تجھ کو کامیابی کی دلہن
تجھ سے قائم ہو گئی ہے عزتِ ہر انجمن کامگاری تیرے آگے ہے چمن اندر چمن
اے لیاقت تو ریاست میں ہے اسرارِ حیات
ہے ریاست کے افق پر مہرِ انوارِ حیات

# جُلد بازی

جناب ڈاکٹر غلام سرور صاحب۔ ایچ۔ ایم۔ بی۔ (ہومیو)

مثل مشہور ہے کہ "اناؤ لا سو باؤ لا" آناؤ لا جلد باز کو کہتے ہیں۔ اسی لئے جلد باز اور عجلت پسند طبیعت کو نیم جنونی بھی کہہ دیتے ہیں۔ جلد بازی ایک بڑا نقص ہے۔ اور باوجودیکہ لوگ از منۂ ماضی سے یہی کہتے چلے آ رہے ہیں۔ "کہ تعجیل کار شیاطین بود"۔ جلدی کام شیطان کا۔ مگر زمانے کی چال نے اسقدر پلٹا کھایا کہ اس وقت لاکھوں افراد میں سے شاید ایک آدمی بھی مشکل سے ملیگا۔ جو اس نقص پر غالب آ کر مختار رہتا ہو۔ ہاں اور جس طرف اپنے خیال کے گھوڑے دوڑائیں ایک ہی سی حالت ملتی ہے۔ ہر ایک شخص نے اپنے دور حیات کے کاروبار یا مشاغل زندگی میں خواہ وہ سرکاری ہو یا غیر سرکاری کسی نہ کسی طرح عجلت پسندی کا شکار بنا ہوا ہے۔ دل و دماغ کی قوت کو کثیر مقدار میں ضائع اور برباد کر رہا ہے۔ ان کو یک رُخنے اور ایک سُر ہونے کا موقع نہیں ملتا۔ انسانی طبقہ چاہتا ہے کہ آج بیج بویا جائے اور کل اس نخل کے پختہ اور شیریں ثمر سے لطف اندوز ہو۔

یہ سموم فضا صرف ہمارے غلام آباد ملک کی حدود میں ہی پھیلتی دکھائی دیتی ہے۔ جس کے باعث ہر گروہ کی دماغی لیاقتیں ساقط و جامد ہو چکی ہیں۔ سوچ و فکر کی خوشگوار عادات اسقدر تیزی و تندی اور سرعت سے نیست و نابود ہو رہی ہیں۔

جیسے صانع قدرت نے ہندوستانیوں کو یہ چیز ازل سے ہی عطا نہیں کی تھی۔ ناخن تدبیر سے اپنی سیاسی گتھیاں سلجھانا مجلسی اور خانہ داری پیچیدہ مشکلات کی عقدہ کشائی کرنا ہمارے لئے ممکن ہے۔ کسی کام کو ادھورا چھوڑ دینا ہمارے بس کی بات نہیں رہی۔ بلکہ اگر کوئی شخص احتیاط کو مدنظر رکھتا ہے۔ تو اس کو ہم سست کاہل اور نکما کے بدترین خطاب سے یاد کرتے ہیں۔ ہمارا ملک اپنی شان و شوکت اور سنجیدگی کیلئے مشہور تھا۔ ایجادات و اختراعات اس کی مرہون منت تھیں۔ دستکاری اور صنعت و حرفت کیلئے مثل کام ہوتا تھا۔ اس سرزمین نے وہ وہ شخصیتیں پیدا کیں جو رہتی دنیا تک آسمان شہرت پر چار چاند ہو کر چمکتی رہینگی۔ مگر اب اس زبوں حالی کی وجہ؟

اگر میں اس بحث و تمحیص کو تحریر کرنا چاہوں تو اس کی طوالت کثیر وقت کی متقاضی ہے۔ البتہ میں چند سطور مختصر طور پر لکھنے کی کوشش کروں گا "گر قبول افتد زہے عز و شرف"۔ اس کا اولین سبب یہ ہے کہ ہم نے اپنے بزرگان سلف کے نقش قدم اور ان کے کارناموں کو یکسر فراموش کر دیا ہے۔

انکی زندگیوں کا ہر لمحہ ہمارے لئے بلا مبالغہ شمع ہدایت تھا۔ مگر ہم نے اپنی کوتاہ اندیشی اور خام کاری عقل کی بنا پر فائدہ حاصل کرنے کی بجائے اُسے بدبختی و بدنصیبی کی پھونک سے بجھا دیا۔ اُن کے زریں افعال و اقوال اور نیک عادات و اطوار سے روگردانی کی ان کی لکھی ہوئی تاریخوں کو اپنے نجس اور ناپاک ہاتھوں سے ملیامیٹ کیا۔ آہ ........ متقدمین کو کیا خبر تھی کہ مستقبل میں ہمارے سپوت ہی اپنی نالائقی و نافہمی کی کند چھری ہماری گردن شہرت پر رکھیں گے۔ یقیناً انہیں یہ سمجھنے میں دھوکا ہوا

کہ آنیوالی نسلیں ہماری پیروکار رہکر اس بڑھتی ہوئی عزت و آبرو کو ترقی و عروج کی منزل تک پہنچانے کی کوشش میں رہیں گے۔ اور جو خامی ہم سے رہ گئی ہے۔ وہ پوری کریں گی

ع اگر پدر نتواند پسر تمام کند۔ لیکن ہم نے اپنی جاہلیت کے سبب ان کی تمام آرزوؤں کو خاک میں ملا دیا۔

جب ہم اپنے بزرگوں کے راستے سے بھٹک گئے۔ اور ہماری ناقدرشناس نظریں انہیں پہچان نہ سکیں۔ ہماری عقل و دانش حق و باطل کے تمیز کرنے سے عاجز ہوگئی تو یہ ضروری تھا۔ کہ عدل و انصاف کا وہ تاج کسی دُوراندیش اور عقلمند قوم کو ہمارے آباؤ اجداد کی وراثت کا محافظ بناتا۔ تاکہ وہ اس کے سنہری قوانین پر عمل پیرا ہو کر فائدہ اٹھا سکیں۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جسکو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا۔

آخر ایسا ہی ہوا۔ جے چند نے بغیر سوچے سمجھے پرتھوی راج کو شکست دینے کیخاطر محمد غوری کو جلد پہنچنے کا پیغام بھیجا۔ وہ شیر کیطرح ...... دھاڑتا ہوا آیا۔ اور اس پر پل پڑا۔ پہلی دفعہ ناکامی ہوئی۔ لیکن دوسری بار پرتھوی راج مارا گیا۔ اور فتح و نصرت نے غوری کے قدم چومے۔

اب جے چند اسکی نظروں میں کانٹا معلوم ہوتا تھا۔ لہذا اسے بھی اپنے کئے کی سزا بھگتنی پڑی۔ اسیطرح مغلیہ خاندان نے بھی ایک بڑے جاہ و جلال اور تزک و احتشام سے حکومت کی۔ نظام سلطنت اور بیدار مغز بادشاہوں کیوجہ سے حکومت کے پاؤں اسقدر مستحکم ہوگئے کہ ہندوستان والوں کو اس کے غیر فانی ہونیکا یقین ہو گیا تھا۔ کسی حد تک یہ خیال درست بھی تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ میرا یہ کہنا بھی بیجا نہ ہوگا کہ یہ خیال بالکل صحیح تھا۔ کیونکہ اگر مغلیہ خاندان کا آخری تاجدار اپنے اسلاف کو نہ بھول جاتا اور اپنے عیش و عشرت کا سامان مہیا کرنے میں اس قدر جلدبازی سے کام نہ لیتا تو رنگون کی نظربندی تک نوبت ہی نہ آتی۔ اسیطرح کی ایک مثالیں ایسی ہیں۔ جن کا تذکرہ کرنا مضمون کو طول دینا ہے۔ غرضیکہ جب مغلیہ خاندان کا آخری چشم و چراغ زندان میں تھا۔ تو اسوقت انگریز کا قدم ہندوستان میں جم چکا تھا۔

اب یورپ کی تہذیب و تمدن اور اخلاق و عادات کا مجسمہ ہندوستانیوں کے سامنے پیش کیا گیا۔ ہم نے الحمدللہ کہکر ہاتھ بڑھائے اور بارک اللہ کے شور و غل سے اس کے آگے سر تسلیم خم کیا۔ ہمیں اس کی سچ و صحیح معنوی شکل و صورت بناؤ سنگار زرق برق اور اوپری پوشاک نے اپنا رام کر لیا۔ ہم حیران دستشدر اور مبہوت ہوگئے۔ اور ہماری عقل و خرد اس کے نفع و نقصان کے سوچنے سے بالکل قاصر تھی ؎

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند
ہر کہ آئینہ سازد سکندری داند

چنانچہ ہم نے بغیر کسی حیل و حجت کے اُسے قبول کیا اور اس کے ایسے والا و شیدا ہوئے کہ شاید ہی ہم روز حشر تک اس کی غلامی سے آزاد ہو سکیں۔ یہ تہذیب نو کی آندھی اس زور سے چلی کہ اُس کے برق رفتار جھونکوں نے مشرقی معاشرت کی سنجیدہ زندگی کے دامن کو تار تار کر دیا۔ مشرق مغرب ہی چکاچوند سے متاثر ہو گیا۔ اور تقلید کی خو بُو اسقدر سما گئی کہ اپنی اصلیت بھی بھول گیا۔ مرد عورتوں کے رُوپ میں زندگی بسر کرنے کے لئے بیتاب ہیں۔ اور ہر ممکن طریق سے اس کی کوشش کیجاتی ہے۔ نوجوان مرد نے اپنی ڈاڑھی مونچھوں کا اس قدر

صفایا کیا ہے۔ جیسے یہ اس کے لئے کلنک کا ٹیکا تھا۔ علی الصبح جب خوابِ غفلت سے بیدار ہوتا ہے تو پہلے انہیں کی خبر لیجاتی ہے اور بعد میں بالوں کے بنانے میں مشغول ہوتا ہے۔ وہ قدرت سے برسرِ پیکار ہے۔ اپنے آپ کو عورت کے مشابہ بنانے کی حتی الوسع جد و جہد کرتا ہے۔ گھر میں فاقے ہوں۔ لیکن ہمارے نوجوان والدین سے عطرِ کنگھی۔ صابن خوبصورت اور قیمتی کپڑوں کیلئے تکرار کرتے ہیں۔ اور جب والدین کا سایہ سر سے اُٹھ جاتا ہے۔ تو سوائے اپنی تہذیبِ نو کے رنگ میں مانگنے اور چوری کرنیکے اور کوئی چارہ کار ہی نہیں ہوتا۔ اگر کچھ غیرت ہو تو اپنی نامردی و بزدلی کا ثبوت دیتے ہوئے کسی چلتی گاڑی کے نیچے سر دیکر یا کسی نشی اشیاء کا استعمال عمل میں لاکر خودکشی کر لیتے ہیں۔ "نہ بانس ہو نہ بانسری بجے" نہ زندہ رہیں گے اور نہ کمانا پڑے گا۔ مرد فطرتاً قوی ہیکل اور مضبوط ہوتا تھا۔ مگر وہ صفات انہیں مفقود ہو چکی ہیں۔ اب عورتوں کی سی نزاکت اور لطافت کا خواہاں ہے۔ خانہ داری اسد کی اُلفت اس کے دل سے کافور ہو چکی ہے۔ اور اس کی جگہ تاش، شطرنج، سینما۔ بائیسکوپ۔ تھیٹر۔ اور آوارہ گردی کا مشغلہ زیادہ دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ سوائے خوشنما انگریزی جوتوں کے زمین پر چلنا انہیں ناگوار لگتا ہے۔ اگر وقت ہوتا تو میں انہیں وضاحت سے بیان کرتا۔ اور جو چیزیں رہ گئی ہیں انہیں بھی درج کرتا۔ گو یہ سب جملے معترضہ ہیں لیکن یہاں میں طبقۂ نسواں کا بھی ایک دھندلا سا خاکہ کھینچنا چاہتا ہوں۔

اگر مرد عورتیں بننے کے خواہشمند ہیں۔ تو پھر طبقۂ نسوانی کو یہ کب گوارا ہو سکتا ہے کہ نسلِ انسانی کی دونوں صنفیں یکساں ہو جائیں۔ چنانچہ وہ اپنے لطیف اور نازک جسم میں لوہے جیسی سختی پیدا کرنا چاہتی ہیں۔ بلکہ روزمرہ کے پروگرام میں کھیلوں اور ورزشوں کا وقت زائد کیا گیا ہے۔ ہاکی فٹ بال۔ ٹینس کرکٹ کے میچ کھیلے جاتے ہیں۔ میل میل اور دو دو میل کی دوڑ کیجاتی ہے۔ اپنے جسم کو برہنہ اور عریاں رکھنا عار خیال نہیں کیا جاتا۔ اِس پہ طرّہ یہ کہ بال کٹانے شروع کر دیئے ہیں۔ ملازمتیں اختیار کیجاتی ہیں۔ تاکہ مردوں کی محتاج نہ رہیں۔ اور وہ حضرت ہیں کہ بیکاری کو بہتر سمجھتے ہیں۔ عورتیں اپنے دوستوں کیساتھ بیچوں و چرا باہر سیر و تفریح کو جا سکتی ہیں۔ والدین کے سامنے اپنے دلی مقاصد کو کھلے بندوں ظاہر کرنا ان کے لئے آسان ہے۔ بسا اوقات دنداں شکن جواب دینے سے اُسے بالکل شرم نہیں آتی۔ گھر کے کھانے پکانے سے اُسے کوئی سروکار نہیں۔ البتہ بائیسکل پر بیٹھکر شہر کا چکر لگانا۔ موٹر دوڑانا۔ ہوائی جہازوں پر سوار ہونا۔ دوڑوں میں شریک ہونا۔ بے حیائی اور بے حجابی کا مظاہرہ کرنا۔ اُس کی نسوانیت کے عناصر میں شمار کئے جانے لگے ہیں۔ دن کا زیادہ وقت اُس کے ہار سنگار میں صرف ہوتا ہے۔ خاوند کا خرید اہوا کپڑا اُسے پسند نہیں۔ اِسلئے وہ خود دوکانداروں کے پاس جاتی ہے۔ اور بہت قیل و قال کے بعد اپنی خواہش کے مطابق کپڑا خریدتی ہے۔ ہاں یہی چیزیں ہیں۔ جو آج ہماری بیکاری فاقہ مستی۔ اور بدحالی کا باعث ہو رہی ہیں۔ اور جبتک ہم نے انہیں خیرباد نہ کہا ہمارے گردشِ ایام کا پھرنا محال ہے۔ اور یہ دن اسی لئے دیکھنا پڑا کہ ہم نے اِس تہذیب کو بغیر سوچے سمجھے اپنی نادانی اور کم عقلی کے باعث اُسے جلدی قبول کر لیا۔

میں یہ نہیں کہتا کہ کام کو اسطرح کرو۔ کہ وہ ختم ہونے پر نہ آئے نہیں میرا مدعا یہ ہے۔ کہ "پہلے بات کو تولو پھر منہ سے بولو"! پر عمل کرو۔ جس کام کو کرنا ہو پہلے اس کے ذرائع اور نتیجہ پر غور کرو اگر اس کا نتیجہ آپ کو اچھا معلوم ہوتا ہے تو پھر بیشک آپ س

جلدی تکمیل کرو۔ مگر جب تک اُس کے نتیجے سے باخبر نہیں ہو جاتے۔ یا اس کے ماحول کو نہیں سمجھ سکتے۔ تو خواہ پندرہ بیس دن گذر جائیں اُسے ہت نہ لگاؤ تاکہ بعد میں پشیمانی نہ ہو۔ آپ قاعدہ طور و غور کے بعد اپنے کام کے معیار کو تقسیم کرو۔ صبر اور تحمل سمجھو نہ کام کیا جائیگا اتنی ہی تم میں طاقت ہوگی۔ ایک ہی وقت بہت سے کاموں کو دماغ میں جگہ مت دو۔ ورنہ ایک کام کا انجام دینا ہی مشکل ہو جائیگا۔ ایک سے۔ و ہزار سودا کا خیال بالکل بست ہے۔ یاد رکھو کہ کام وہی اچھا اور بہترین ہوتا ہے۔ جس میں جسم دل دماغ اور روح متحد ہو کر کام کرتے ہیں۔ جو شخص باقاعدہ ایک اصول پر کام کرتے ہیں۔ ان کو کبھی پریشانی سے سابقہ نہیں پڑتا۔ بلکہ کام ایک طرح کی تفریح بن جاتا ہے۔ اور اُنکی زندگی کے فرائض بڑی خوش اسلوبی کیساتھ انجام ہوتے رہتے ہیں۔ میانہ روی ہی انسان کو خوش و خرم بنا سکتی ہے۔

فقط

# ایک سہیلی کا خط بچھڑی ہوئی سہیلی کے نام

## جناب مرزا قدیر بیگ اخضر دہلوی

میری کبھی کی اچھی سی سہیلی۔ پیاری سائرہ۔ نا معلوم کتنے دنوں سے تمہیں خط لکھنے کی ٹھانی تھی۔ لیکن خدا خدا کرکے آج وہ گھڑی آئی ہے۔ جگ بیتی نہیں آپ بیتی ہے۔ بھلا تمہیں اب گھر بار کے کام دھندوں سے چھٹکارا کہاں۔ کہ اس داستان کو اوّل سے آخر تک اوسان سے ایکبار بھی دیکھ لو۔ تم تو دیکھتے ہی کانوں پر ہاتھ دھر دو گی۔ کہ اے ہے کون پڑھے اس شیطان کی آنت کو مگر تمہیں بھی میرے سر ہی کی قسم جو اسے سب کو ہی نہ پڑھو۔ پھر چاہے مجھے دل میں کتنا ہی برا کیوں نہ کہہ لینا۔ مگر دس کام چھوڑ کر اس کو ضرور پڑھنا۔

جب سے تم چھوٹی ہو وہ دن ہے اور آج کی گھڑی جو ایک سانس کا بھی ولا ہوا ہو۔ جب تک ایک دیس رہنا ہوا۔ تو کبھی کبھار دیکھکر ہی جی بہلا لیا۔ اور اب تو ہزاروں کوس برسوں کا رستہ تم کہاں اور ہم کہاں۔ مگر خیر جب تک سانس ہے آس ہے۔ تم تو جی میں کہتی ہو گی تا نحسے مُندے دل سے دور اور یہ انگریزوں میں بھی کہاوت ہے مگر یقین جانو کوئی نحس دن ایسا ہوتا ہوگا۔ جو دس پانچ بار تمہاری یاد نہ آجاتی ہو۔ تمہیں تو کیوں اس کا یقین آنے لگا۔ تم تو اپنی ہی سی بات سب کی جانتی ہو۔ بہتیرا اس جی کو سمجھایا۔ کہ ارے جی کون کس کا ہوا ہے۔ بھلا کسی کو کیا پڑی۔ جو کسی کو یاد کرے سب اپنے اپنے کاموں میں گرفتار۔ نت نئی سہیلیاں نیا نیا بہوار۔ یہ بھی بس منہ دیکھے کی محبت ہوتی ہے۔ پھر بھولے کو جو کبھی چھٹے چھمانس یاد ہو گئی۔ تو ہو گئی۔ ورنہ اللہ! اللہ خیر صلاح اور جہاں گذرے دو ایک برس پھر تو جیسے کسی کی جان پہچان ہی نہ تھی۔ اگر اتفاق سے کسی کے گھر بیاہ شادی میں ملنا ہوا۔ تو سو خیر وں کی ایک خیر۔ بہت کیا تو سلام کے نام ماتھے کی مکھی مار لی۔ گویا بڑا "ہدف" پر تیر مارا اور دنیا بھر کا احسان کیا۔

تم بیچاری کا کیا گلہ شکوہ۔ اب تو سارے زمانے کی یہی ریت ہے پہلے یہ باتیں نہ تھیں بڑے بوڑھوں سے سنا ہے۔ پہلے تو جس سے جس کی ایکبار بھی ملاقات ہو گئی۔ تو پھر کیا مجال۔ جو تس سے مس ہو۔ مرتے مر جائیں پر ساتھ نہ چھوڑیں۔ وقت بے وقت کے شریک خدا نہ کرے۔ کوئی ہرج مرض ہوا تو ایسی جی کو لگجاتی جیسے کسی اپنے کی بلکہ ایکبار تو اپنے بھی گھبرا جائیں۔ لیکن یہ جو کبھی الکسا دیں یا ماتھے پر شکن تک لائیں۔ پھر خوشی کی خوشی غم کا غم۔ پھر جب تو وہ ست جگ کہلایا۔ تو کیا بات تھی۔ کہ ایک کا دوسرے کو درد تھا۔ اور اخیر دم تک کا ساتھ تھا۔ اور اب تو ہر جگہ اس کے خلاف ہی دیکھ لو تو کیا مجھ ہے۔ کہ گھر گھر لڑائی۔ ٹنٹا۔ مار پٹائی۔ ایک دوسرے کو دیکھکر جلے۔ قرب قیامت کی نشانی ہے۔ میں نے تو اکثر اس کو سوچا کہ آخر یہ بات کیوں ہو گئی۔ تو میں تو جانوں کہ جب سے اس ملک

میں یہ رنگی لوگ آئے ہیں۔ جب سے ہی یہ باتیں پیدا ہوئی ہیں۔ غدر سے پہلے کوئی ان کو جانتا بھی نہ تھا۔ سب سیدھے سادے لوگ باگ تھے۔ ان نگوڑوں میں بھلا محبت اور اخلاص کہاں سے آیا۔ بس جو ہے ظاہری ٹیپ ٹاپ ہے۔ ظاہر میں تو ایسے ملیں گے کہ ان سے زیادہ دنیا میں کوئی دل نواز نہیں اور پیٹھ پیچھے جو کبھی نام سنیں۔ ان میں وفا کہاں۔ جہاں منہ پھیرا اور لوگوں نے آنکھیں پھیریں۔ سو جب سے ان کی حرص کی اور ہر بات میں ان کی ریس برتی۔ جب سے ہی ان کی سی عادتیں ہو گئیں۔ وہی مثل ہو گئی کہ

حرص پہ مری جولاہی
سرنی پہ پہن بندھائی

اب جسے دیکھو فرنگی بنا چلا آ رہا ہے۔ گٹ پٹ گٹ پٹ کرتے ٹوپ ٹائی لگائے چھڑی چھٹے اکڑتے پھرتے ہیں۔ نہ عربی جانیں نہ فارسی اور اردو بولنا تو کالے آدمیوں کا کام ہے۔ انگریزی ظاہر ہی ہے کیا خاک آئے گی۔ بس نہ ادھر کے ہوئے نہ ادھر کے ہوئے۔ آج اس سے یارانہ ہے تو کل اس سے آشنائی۔ پرسوں کسی دوسرے سے ..... جا دوستی کی۔ بھلا ان شگنوں کی دوستی کس کام کی۔ جب ایک کے ہی ہو کر نہ رہے تو کسی دوسرے کے کیا خاک ہوں گے۔ پھر ان سے بھلائی کی کیا امید۔ دوستی کیا ہوئی بازار کا سودا سلف ہو گیا۔ جہاں پیسہ ڈالا سستا مول دیکھا خرید لیا۔ بس تو نتیجہ کیا ہوتا ہے نہ تو میرا نہ ہی تیرا۔ کام پڑے گدھے کو باپ بنا لیا۔ کام نکل گیا مونچھوں کو تاؤ دیا۔

اے خدا بچائے اس چودھویں صدی سے ابھی جانے اور کیا کیا ہوتا ہے۔ اس سے تو پہلے ہی زمانے کے آدمی اچھے تھے۔ اپنی کیسی پیار محبت سے گذار گئے۔

میری پیاری بہن ذرا وہ دن تو یاد کرو جب ہم تم ایک ہی مدرسے میں پڑھا کرتی تھیں۔ وہ بھی کیا بے فکری کا زمانہ تھا۔ پھر ہم تم دونوں کو ایک ہی کمرے میں جگہ ملی تھی۔ صبح ہوئی تم نے آگ جلائی۔ میں نے پتیلی چڑھائی۔ اور ذرا کی ذرا میں ہنڈکلیا پک کر تیار ہو گئی۔ دونوں نے مل جل کر پیار محبت سے کھائی پھر مدرسے ساتھ جانا ساتھ آنا۔ پڑھنے سے جی اکتایا اچھی اچھی باتیں کریں۔ نہ کسی کے لینے میں نہ دینے میں۔ اچھے میں نہ برے میں اپنے کام سے کام۔ ایک دوسرے کا کیا کچھ درد دکھ تھا۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ اب سے دور میرے سر میں درد ہوا اور تم نے ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی۔ میں نے بہتیرا کہا۔ ننھی سارہ ذرا کی ذرا تو آنکھ لگا لے جی اور سا ہو جائیگا۔ مگر ایک نہ سنی اور اسیطرح صبح کر دی۔ ایسی آپس میں محبت تھی کہ اس کا گمان بھی نہ ہوتا تھا کہ کبھی جدائی ہو گی۔ لیکن نہ جانے کونسی منحوس گھڑی تھی کہ جو تم نے آنکھیں پھیریں۔ وہ پہلی سی بات کہاں۔ سچ مچ کی تو بات ہی اور ہوتی ہے۔ اور یوں اوپرے دل سے دنیا داری برتنے کو مل بھی لئے تو کیا ہوا۔ اللہ میاں نے دل کی کسوٹی سب کو دی ہے۔ اسی پر ظاہر داری اور سچ مچ کا حال سب کچھ کھلتا ہے۔

اے لو تم بھی کہو گی کہ خط کیا ہے شیطان کی آنت ہے۔ پڑھتے پڑھتے اکتا گئی اور یہ ہے کہ ختم ہونے میں نہیں آتا۔ پھر تم اس گھریلو زبان کی عادی بھی نہیں ہو۔ تم تو عربی فارسی کے موٹے موٹے بڑے بڑے لغت بولتی ہو۔ اچھا لو اب رخصت تمہاری اماں بی بی تمہیں سلام کہتی ہیں۔

راقمہ عظیمہ ۲۲ جون ۱۹۳۷ء

# صبح کے ستارے

بجلی چمک رہی ہے بادل برس رہے ہیں
گذرا ہوا زمانہ پھر یاد آ رہا ہے
پھر رات بھر تڑپنا خونِ جگر ہے پینا
کروٹ بدل بدل کر پھر دل کو تھام لینا
آتی ہیں یاد اب وہ عہد وفا کی باتیں
دل میں ہے یاد تیری آنکھوں سے خون جاری

تم خوش ہو اپنے گھر میں اور ہم ترس رہے ہیں
دل غم کو کھا رہا ہے غم دل کو کھا رہا ہے
جل جل کے ہو رہا ہے صد طور اپنا سینا
اک آہ سرد بھرنا اور تیرا نام لینا
ساون کا وہ مہینہ بھیگی ہوئی سی راتیں
اب اس طرح سے باقی ہے زندگی ہماری

او صبح کے ستارے آتا ہے کام میرا
ان سے ملو تو جھک کر کہنا سلام میرا

ممتاز دیروی

# نقوش محبت

جمیلہ خاتون قمر کلکتہ

آگرہ

پیارے ظفر

میں تمہیں خط لکھ رہی ہوں۔ مگر اس حال میں کہ میں بستر مرگ پر پڑی ہوں اور اس درد سے بے چین ہو رہی ہوں جو تم نے اپنی جدائی سے پیدا کر دیا ہے آہ! تم نے مجھے اس وقت چھوڑا ہے جب میں بے حد محتاج تھی۔ تم نے مجھ سے اس وقت کنارہ کیا جب تم ہی میری امید اور تم ہی میرا آسرا تھے۔ اب تمہاری جدائی میں میری ہر تمنا پر اوس پڑ گئی ہے

تمہیں کیا معلوم کہ میں تمہاری خاطر کن کن مصیبتوں کا سامنا کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتی تھی۔ کاش کہ تم کو اس کا ذرا بھی علم ہوتا۔ تم نے مجھ سے علیحدگی اختیار کی صرف اس عذر پر کہ میں نے تمہارے ساتھ بدعہدی کی اور تمہارے سوا کسی اور سے محبت کی۔ تمہاری قسم تمہارے نازک دل کی قسم یہ غلط اور سراسر غلط ہے۔ کاش میرے منہ میں عورت کی زبان نہ ہوتی تو میں تمہیں بتا سکتی کہ میرا دل تمہیں کس وارفتگی سے پیار کرتا ہے۔ خدا نے مجھے عورت کا دل دیکر مرد کی زبان کیوں نہ دی۔ . . . . . مگر ہاں اب اس کی ضرورت نہیں۔ تم بار بار کہتے ہو کہ میں نے تمہارے ساتھ بیوفائی کی آہ تم نہیں سمجھ سکتے کہ عورت کا دل جب پہلی مرتبہ محبت سے بھر جاتا ہے تو پھر کبھی خالی نہیں ہوتا۔ یعنی ایک عورت صرف ایک ہی مرتبہ محبت کر سکتی ہے ایک ہی کو دل دیکر ہمیشہ کے لئے اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دیتی ہے۔ چاہے اس میں وہ مایوس کیوں نہ ہو۔

پیارے یہ سب تمہارا خیال ہے تم نے جو رائے میرے متعلق قائم کر رکھی ہے وہ ایک طلسم خیال سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ شاید وہ وقت تمہیں یاد نہیں جب ہم سفیدہ اور دیودار کے درختوں کے سائے میں بیٹھکر گھنٹوں اپنے راز ایک دوسرے کو سنایا کرتے تھے میرے کالے اور لانبے بال ہوا میں اڑا کرتے تھے۔ میں پھولوں کے ہار بناتی اور اپنے کو طرح طرح سے سنوارتی۔ بعد پھر انکو جھنجلا کر بکھیر دیتی تھی۔ جسے تم دیکھکر سرتاپا خوش ہوتے تھے۔ کیا وہ دن بھول گئے جب ہم تاج محل کے میناروں پر بیٹھا کرتے تھے۔ تم گانا سنا کر میرا دل بہلایا کرتے تھے۔ اور میں مبہوت ہو کر سنا کرتی تھی۔ شاید میرے ہی لئے تم نے وہ طرز موسیقی ایجاد کی تھی جو نہ صرف کانوں کے لئے خوش آئند تھی بلکہ دماغ میں عجیب مبہم خیالات و حالت بیقراری پیدا کر دیتی تھی۔ . . . . . . کیا تم نے ان خوشگوار لمحوں کو فراموش کر دیا ہے جب کہ ہم چاندنی کی ضیا پاش کرنوں میں پھولوں کے معطر سایہ میں بیٹھکر پیار و محبت کی باتیں کیا کرتے تھے۔ اور زندگی پر بحث کرتے ہوئے تم میری بات کاٹ کر کہا کرتے تھے کہ یہ زندگی تو ایک چھوٹا سا خواب ہے اور نہ جانے ایسے ایسے کتنے حسین خواب ہم اپنی زندگی میں دیکھیں گے یہاں تک کہ یہ سلسلہ ازل سے چلتا ہے۔ ازل و ابد ایک ہے۔ اس سے میں نے سبق حاصل کیا اور انسان کی حقیقت پہچانی اور زندگی کے سربستہ راز پائے۔

تمہارا خیال ہے کہ میرے دل میں تمہاری قدر نہیں بھلا یہ تم کیونکر کہہ سکتے ہو میں نے گھر اور گھر والوں کو چھوڑا تو تمہارے لئے مصیبتیں اور ایذائیں جھیلیں تو تمہاری خاطر اور ہائے اگر آج آستانۂ ابدیت

پر کھڑی ہوں تو تمہاری وجہ سے تم نے یہ شاید سب کچھ بُھلا دیا۔ اور مجھ سے دُور کلکتہ میں بیٹھے شاید تم اس لئے ناراض ہو کر حاسدوں نے تم سے میری چغلیاں کھائیں اور ایسی باتیں کیں کہ جن میں اصلیت کا شائبہ تک نہ تھا۔ تم نے ان سب باتوں کو شوق سے سُنا اور یہ نہ سمجھا کہ میرا دامن ان سب باتوں سے پاک ہے اور میں ان سے بری ہوں۔

آہ! تم کو معلوم ہوتا کہ کون سا جذبہ غلطی اس غمناک وقت میں موجزن ہے جس نے میرے دل میں ایسا گہرا زخم کر دیا ہے۔ جو موت کے سوا کسی اور سے اچھا نہیں ہو سکتا۔ تو تم ضرور آنسو بہانے میں میری شرکت کرتے مگر افسوس کہ تم اس حال سے بے خبر ہو لہٰذا میں تمہیں معذور خیال کر کے تمہارا گناہ معاف کرتی ہوں۔ اور خدا سے بھی اس کی معافی چاہتی ہوں۔

پیارے یہ سب باتیں میرے خلوت خانۂ دل کے وہ راز ہیں جنہیں اگر تم میرے سامنے ہوتے تو میں قیامت تک بھی زبان پر نہ لاتی۔ مگر اس وقت تم نے مجھ سے آنکھیں پھیر لی ہیں نہایت آزادی کے ساتھ لکھتی چلی جا رہی ہوں۔ اور اپنے حیاتِ ماضی کے خزانے جو میرے دل کے اندر محفوظ تھے۔ کھول رہی ہوں۔ اگر تم نے ذرا غور و تحمل سے کام لیا تو مجھے یقین کامل ہے کہ تم اپنے قصور کا اعتراف کر لوگے۔ مگر وہ بے وقت ہوگا۔ کیونکہ میرا کام جلد تمام ہونیوالا ہے اور تم مجھ سے دُور ہو ورنہ کوشش کرتی میں تمہیں اپنے پاس بیٹھا ہوا دیکھوں۔ میری سانس ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائیگی مگر یہ نہ سمجھنا کہ ہم پھر نہ ملیں گے۔ ملیں گے اور ضرور ملیں گے۔ اگر خدا ہے اور اس کے قوانین میں بہشت ہے نیکیوں کا اجر ہے تو پھر ایسے ملیں گے کہ کوئی طاقت ہمیں جُدا نہ کر سکے گی۔

ہمیشہ تمہاری
فاطمہ

# اعتراف شکست

"جناب عطار حسین شاہ صاحب طالب جعفری"

فخر جہاں فاتح دوران شہنشاہ معظم سکندر اعظم کا نام نامی آسمان شہرت کے بلند ترین مقام پر زرین و جلی حروف میں رہتی دنیا تک آفتاب و ماہتاب کی طرح نمایاں طور پر درخشاں رہیگا۔ شہرت عام اور بقائے دوام ہمیشہ اس اسم گرامی پر نازاں رہیگی۔ ربع مسکوں کے فاتحین کی فہرست میں اس کا نام چوٹی پر منقوش رہیگا۔ جاہ و جلال اور اقبال اب تک اُس کے نام کے بے دام غلام اور شجاعت و ہمت اُس کے در کی ادنےٰ کنیز شمار ہونے پر شاداں و فرحاں ہے۔ اس کے لشکر کو تعداد میں مور و ملخ سے اور بہادری میں رستم و سہراب سے تشبیہ دینا آئینہ داران معنی و سخن سنج حضرات کا معمول ہے۔ سلطنت کی وسعت اُس کے قابل بہادر دانا منتظم اور جنگجو ہونے پر ناقابل تردید مہر تصدیق ہے۔

جاہ و حشم کا مالک راہ فتوحات کا سالک مقدونیہ کا انتظام اپنے ایک قابل و مدبر حاکم کے سپرد کرکے لشکر جرار کی معیت میں مشرقی ممالک سر کرنے میں مصروف و مشغول تھا۔ اکثر راجے مہاراجے اور بادشاہ سراسیمہ و ہراساں ترساں و لرزاں لشکر کی رسیدگی سے قبل ہی اُس کی ہیبت و دبدبہ سے خائف و مرعوب ہوکر استقبال کرکے

بیش بہا تحائف نذر گذارنے میں ہی سعادت سمجھتے اور اگر کسی راجہ کی رگ حمیت جوش میں آتی اور وہ بسبب ہمت و جرأت مقابلہ کرنیکا عزم صمیم کرتا۔ تو اُسے بھی جلد ہی چھٹی کا دودھ یاد آجاتا۔ اور اطاعت قبول کرنے میں ہی عافیت نظر آتی۔ گویا سکندر کی یلغار طوفان نوح سے کسی طرح کم نہ تھی۔ ہر کہ ومہ اسکے مقابلہ میں بے حقیقت عاجز اور بے بضاعت ثابت ہوکر اس کے رعب وداب اور سطوت میں اضافہ کا باعث بنتا۔

وطن سے آنیکے بعد حاکم مقدونیہ سے نامہ و پیام کا سلسلہ باقاعدہ جاری تھا۔ حاکم مذکور مقدونیہ کی سیاسی لہا ملک کے مدوجزر سے باخبر کرتا رہتا۔ سکندر بھی اُسے فہم وفراست کے زیر اثر موقع ومحل کے مطابق مناسب ہدایات سے سرفراز فرماتا۔ اب کے پیام بر کی معرفت جو خط موصول ہوا۔ اس میں مرقوم تھا کہ

سکندر کی والدہ ماجدہ حاکم وقت کے پہلو بہ پہلو سلطنت کے معاملات میں دخل انداز ہوتی ہے۔ جو ضبط انتظام کے حق میں سخت منافی و مضر ساں ہے۔ اس لئے جہاں پناہ سے کمال عجز وانکساری سے التماس کیگئی تھی۔ کہ وہ رموز سلطنت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اپنی والدہ کو اس حرکت سے روگردانی کا مشورہ دیں گے۔ تاکہ ملکی معاملات میں کسی قسم کا خفیف سا نقص بھی رونما نہ ہونے پائے۔ ورنہ میں اس کے نتائج کا ذمہ وار نہ ہوں گا۔

سکندر جوں جوں عبارت پڑھتا گیا سنجیدگی کے اثرات اسکے بشرے پر نمودار ہوتے گئے۔ طائر فکر فضائے تامل وتدبر میں پرواز کرنے لگا۔ سمند ذہن منزل مقصود کی جستجو میں سرپٹ ڈال دیا گیا۔ عقل وادراک کو جنبش دی آخر دل ودماغ نے اس فیصلہ پر پہنچایا کہ والدہ کو دخل در معقولات کی پالیسی سے روک

دینے ہی میں مصلحت ہے۔ کیونکہ بعض اوقات معمولی لغزشیں بھی خوفناک نتائج کی حامل ہوتی ہیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ سکندر کی والدہ کو حاکم کی معرفت اس حکم سے آگاہ کیا گیا تو اس نے صرف نہایت لاپروائی کا اظہار کرنے پر ہی اکتفا نہ کی۔ بلکہ اس مشورہ کا خوب مضحکہ اُڑایا اور اپنی روش پر بدستور قائم رہی۔ حاکم نے بارِ دیگر اطلاع دی کہ آپ کی والدہ اس مشورہ سے بہت ملول ہوئی ہے۔ اور اُسے اپنی روش میں سر مو تبدیلی کرنا بہت ناگوار ہے۔ سکندر نے جواباً تحریر کیا کہ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔ کہ اس وقت میں جاہ و جلال اور شان و شوکت کا میں حامل ہوں۔ وہ آج تک کسی بھی جلیل القدر بادشاہ کو نصیب نہیں ہوا۔ میری سلطنت کی وسعت بطور ضرب المثل بیان کی جایا کرے گی۔ زبردست سے زبردست انقلاب روزگار بھی میری شہرت کو صفحۂ تاریخ سے محو کرنے میں ناکام و نامراد رہیگا۔ اطراف و اکناف عالم میں میرا سکہ بیٹھ چکا ہے۔

بڑے سے بڑا دلاور اور جابر بادشاہ بھی میرے نام سے لرزہ براندام ہے۔ لیکن یہاں معاملہ ماں اور بیٹے کا ہے۔ جہاں میری تمام قہرمانی اور جبروتی قوتیں سرد اور تمام ہتھیار بیکار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ میرا حساس دل ورد مادر ماں کے شیشۂ دل کو ہر لمحہ محفوظ و مامون اور آلائش غم سے منزہ و مبرا دیکھنے کا آرزومند ہے۔ ایسی کئی سلطنتیں اس پر قربان کی جا سکتی ہیں۔ آپ کے ایسے سینکڑوں خطوط والدہ صاحبہ کے طوفانِ غم اور سیلابِ اشک کے روبرو پرِ کاہ جتنی اہمیت بھی نہیں رکھتے۔ آنسو اور پھر ماں کے آنسو سنگدل

# مسرت

مقامات مقدسہ کے نقشے اور تصویرات جن کو ایکبار دیکھنے کے باوجود بھی کئی بار دیکھنے کی خواہش ہو نقشے اور تصویریں آٹھ رنگ میں ہمارے ١٩٣٨ء کے کلینڈروں میں چھپے ہیں۔ دو آنہ کا پوسٹ ٹکٹ آنے پر ایک اور پانچ آنے کا پوسٹ ٹکٹ پر تین کلنڈر بھیجے گئے

نوٹ: بک سیلروں اور بیوپاریوں کو خاص رعایت

عین الشفاء کلینڈر ڈیپارٹمنٹ ١١٥ ابراہیم رحمت اللہ روڈ بمبئی

سے سنگدل آدمی کو بھی موم سے زیادہ نرم بنا کر رقت انگیز کیفیت طاری کر دیتے ہیں۔ حق و باطل کی تمیز سے بے نیاز سود و زیاں سے بے پرواہ اور نیک و بد کے انجام سے ناآشنا بنا دیتے ہیں۔ دنیا کا یہی وہ آخری اور سخت ترین حربہ ہے جسکے

روبرو ان کو سر تسلیم خم کرتے ہی بن پڑتی ہے۔ چنانچہ میں خود خندہ پیشانی سے اپنی اس کمزوری کا صاف اور غیر مبہم الفاظ میں اعتراف کرتا ہوں۔ کہ میں بھی اس سے مستثنےٰ نہیں رہ سکتا۔

# ریویو

اقبال نمبر رسالہ اخلاق لاھور قیمت آٹھ آنے چاہ میراں روڈ لاہور

غالب کا کہنا ہے۔

ذکر اس مری وش کا اور بیان اپنا۔ بن کر رقیب آخر جو تھا رازداں اپنا" ایک تو شاعر مشرق مفکر اسلام علامہ اقبال کا تذکرہ اور پھر ایسے لوگوں کے قلم سے جنہوں نے زندگی کا نصب العین ادب کی خدمت قرار دیا ہے رضا ہمدانی فارغ قادری۔ سرور القادری۔ شبلی (جونیئر) جعفری سرحدی۔ فارغ بخاری وغیرہ نام نظر آتے ہیں۔ یوں معلوم دیتا ہے۔ کہ آجکل کسی وجہ سے امین آباد لکھنؤ نے اپنا مسکن قصہ خوانی پشاور میں بنا لیا ہے۔ سرحد کی سخن پروری اور پشتو زبان جوانوں کی ریاضت قابل تقلید و ستائش ہے اقبال شاعر غیر فانی" ادب لطیف از صنف نازک منجانب محترمہ بلقیس جمال نگہت متعلمہ بی۔ اے ناگپور رپتہ مکمل ہے آپ کی نظر سے اوجھل نہیں رہنا چاہیئے۔

حضرت برق مدیر داد کے طالب نہ ہو مگر

بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے۔ وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے۔ ان کا مذاق برق خرمن میں نہیں برق درخشاں ثابت ہو رہا ہے۔

خواجہ شجاع منعمی

(چیف ایڈیٹر)

# ایک عجیب و غریب نایاب نسخہ
## جس کے شاید آپ بھی متلاشی ہوں

اشتہار بازی کی موجودہ فضا اور برادران وطن کی ناگفتہ بہ ابتلا کو مد نظر رکھتے ہوئے از راہِ خدمت الناس ایک قیمتی صدری نسخہ طلا دافع سستی و نامردی پیش کیا جاتا ہے۔ جو اصحاب ہزاروں روپے اشتہاری طلاؤں پر برباد کر کے بھی صحت سے محروم ہوں۔ اسے خود اپنے ہاتھوں تیار کر کے اس امید کو گوہر مراد سے بھر لیں۔ اور بندہ کو دعائے خیر سے یاد کریں۔ رگ و پٹھوں کی کمزوری، پتلی رگوں کا ابھر آنا، لاغری کجی، ناہمواری غرضیکہ ہر قسم کی سستی، کمزوری و نامردی وغیرہ شکایات کو چند دنوں میں بغیر کسی تکلیف کے رفع کر کے برسوں کے مایوس مریض کو مرد بلکہ قابل فخر مرد کہلانے کا مستحق بنا دیتا ہے۔ سن رسیدہ حضرات بھی اس سے جوانوں کی سی طاقت پیدا کر سکتے ہیں۔ وہ نسخہ یہ ہے۔

**نسخہ طلا!** جونک خشک تازہ حراطین۔ برادہ دندان فیل۔ بیخ کنیر سفید گل۔ جاوتری۔ لونگ۔ مغز پنبہ دانہ۔ مغز چلغوزہ۔ مغز اخروٹ ہر ایک ایک تولہ۔ پیشتر ان ادویہ کو ایک پاؤ شراب برانڈی میں کھرل کریں جب شراب جذب ہو جائے تو اس مرکب میں ایک درجن زردی بیضہ مرغ ڈال کر پھر سحق کریں۔ اور گولیاں بنا کر خود تیار کر کے بذریعہ پاتال جنتر روغن کشید کریں۔ برآمد شدہ روغن میں پیہ بوٹی، پستہ رنگ، مچھلی ہر ایک ایک تولہ۔ شتر مرغ دو تولہ۔ چربی شیر۔ چربی ریچھ۔ چربی سانڈہ۔ مسکہ گائے۔ روغن ماہی (بطریق طب قدیم تیار کردہ) روغن قاسقورس (بطریق طب قدیم تیار کردہ) ہر ایک ایک تولہ شامل کر کے تین روز سحق کریں۔ بعد کسی موٹے کانچ کے مرتبان میں ڈال کر دو تین دن تیز دھوپ میں رکھیں۔ تہ نشین ہونے پر روغن نتھار کر علیحدہ کریں۔ اب اس علیحدہ شدہ روغن میں مشک نیپالی اصلی دو ماشہ۔ زعفران کشمیری اصلی دو ماشہ ملا کر دو گھنٹہ متواتر سحق کریں۔ بس طلا تیار ہے۔ دو تین قطرے انگلی پر پاش کر نرم ہاتھ کی مالش سے جذب کریں۔ سوزش بھی قطعاً بالکل نہیں۔ جو جزو نسخہ مذکورہ خالص اور تازہ نہ مل سکے بندہ سے طلب کریں۔ آپ نسخہ کو محفوظ رکھیں۔ جب آپ تمام اشتہاری طلاؤں کے تختہ مشق رہ کر مایوس ہو جائیں۔ تو اس سے فوراً فائدہ اٹھائیں۔ اس نسخہ کا تیار شدہ طلا ہمارے ہاں بھی ہر وقت تیار رہتا ہے۔ جس کا نام عجیب غریب طلا ہے۔ جو اپنی زود اثری کی وجہ سے گورنمنٹ آف انڈیا سے باقاعدہ رجسٹری شدہ ہے قیمت فی شیشی جو ایک مریض کو کافی ہے۔ ... محصولڈاک رجسٹری بذمہ

یوں تو سلاجیت کے استعمال سے ایک دنیا واقف ہے

**شوق سلاجیت!** طب یونانی اور آیورویدک میں اس کو اکسیر اعظم سمجھا گیا ہے۔ مگر افسوس کہ آجکل خالص سلاجیت کمیاب ہے۔

ہم نے بڑی محنت اور جستجو کے بعد خالص سلاجیت فراہم کر کے ورق طلا (سونا) ورق چاندی و دیگر مفید اجزا کی آمیزش سے اور بھی مفید ترین بنا لیا ہے جس کا نام شوق سلاجیت ہے۔ اس کے چند روزہ استعمال سے جریان۔ کثرت احتلام۔ ضعف باہ۔ ضعف دل۔ جگر گردہ مثانہ۔ معدہ ضعف دماغ۔ ذیابیطس (بار بار پیشاب آنا) کمی خون۔ نزلہ دائمی وغیرہ شکایات رفع ہو جاتی ہیں۔ جریان اور ضعف باہ کے مایوس مریض کے لئے مژدہ صحت لاتی ہے۔ ہر مرد اور ہر مزاج میں یکساں مفید ہے۔ اور موافق ہے قیمت شیشی جس میں ڈیڑھ تولہ سلاجیت ہوتی ہے بلغ عہ/ (ایک روپیہ آٹھ آنے) محصولڈاک ویکنگ ایک شیشی سے پانچ شیشیوں تک عہ/ بذمہ خریدار

**رعایت کا آخری موقعہ!** چونکہ اس سال اعلان رعایت اخبارات اور رسائل میں بہت دیر سے چند یوم کیلئے شائع ہوا تھا۔ اس لئے بہت سے اصحاب رعایت سے محروم رہ گئے ہیں۔ لہٰذا مکرر اعلان کیا جاتا ہے۔ کہ جو اصحاب ۵ مئی ۱۹۳۶ء کے اندر اندر ہر دو ادویات بھی طلب کریں گے انہیں ہر دو صرف عہ/ میں دی جائیگی۔ کوئی ایک دوا علیحدہ منگانے کی صورت میں پوری قیمت چارج ہوگی محصولڈاک ویکنگ عہ/ بذمہ خریدار

یوں تو ہر دوا فروش بانگ دہل اعلان کرتا ہے کہ ہمارے پاس اپنی دواؤں کی بابت ہزار ہا سرٹیفکیٹ موجود ہیں۔ لیکن وقت پر ایک بھی پیش نہ کر سکے لیکن خدا کے فضل سے ہمارے پاس فی الحقیقت اپنی ادویہ کے متعلق مختلف اطراف ہند کے شائقین اور رؤسا کی کافی تصدیقات موجود ہیں۔ جنہیں معززین بہاولپور نے بچشم خود ملاحظہ کر کے متفق الرائے ہو کر مندرجہ ذیل سرٹیفکیٹ دیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

**سرٹیفکیٹ!** ہم نہایت مسرت سے اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ مہتمم آفتاب زندگی شوق منزل بہاولپور کے پاس ان کی ادویہ مثلاً بہار شباب، عجیب و غریب طلا اور رجسٹرڈ) وغیرہ کے متعلق ہندوستان کے مختلف مقامات کے ڈاکٹروں، حکماء، شائقین اور رؤسا کی تصدیقات کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ بعض تصدیقات تو ملک کی اہم ہستیوں سے تعلق رکھتی ہیں جس سے پتہ ملتا ہے کہ آپ تیاری ادویہ میں کس دیانتداری اور جانفشانی سے کام لیتے ہیں۔ آپ کی ادویہ زود اثر ہونے کی وجہ سے ممالک غیر میں بھی جاتی ہیں۔

اشتہار بازی کے اس پر آشوب دور میں جبکہ جھوٹے اور سچے میں تمیز کرنا امر محال ہو چکا ہے آپ کی ادویہ کا زود اثر ہونا فرزندان وطن کے لئے مفید ثابت ہوگا۔

## اسمائے گرامی تصدیق کنندگان

جناب افسر الاطبا حکیم عبد الرشید صاحب طبیب شاہی۔ جناب منشی محمد منیر صاحب میر منشی دربار بہاولپور

جناب سید صادق علی صاحب ایم۔ اے۔ ایم او۔ ایل پروفیسر صادق ایجرٹن کالج بہاولپور

جناب محمد نظیر الدین صاحب ایم۔ اے۔ ایم۔ ایس۔ ایم۔ بی۔ او ای (آنرز) پرنسپل اینگلو ورنیکلر ٹیچنگ کالج بہاولپور

جناب سید محمد امین شاہ صاحب لیفٹیننٹ صادق انفنٹری

جناب مولانا مولوی غلام رسول صاحب منشی۔ فاضل

جناب ملک نور محمد صاحب۔ بی۔ اے۔

جناب منشی احمد علی صاحب۔ سیف

جناب تاج الدین احمد صاحب تاج سپرنٹنڈنٹ گورنمنٹ پریس بہاولپور

جناب منشی لعل چند صاحب محاسب

جناب حکیم محمد دائم صاحب کامل طب و جراحت

**نوٹ!** پبلک کی آسانی کے لئے مسٹر محمد امین صاحب مالک امین ٹیکسٹائل ایجنسی بازار مچھلی بہاولپور کے ہاں بھی ایجنسی قائم کر دی گئی ہے۔ ان کے ہاں سے بھی ہماری ادویہ ہر وقت مل سکتی ہیں۔ بیرونجات کے حضرات براہ راست ہمارا حوالہ دیکر مندرجہ ذیل پتہ سے رعایتی قیمت پر طلب کریں۔

**ملنے کا پتہ! مہتمم آفتاب زندگی (رجسٹرڈ) شوق منزل بہاولپور سٹیٹ بہاولپور**

# بیسویں صدی کی بہترین ادویات

پبلک نے اخباروں میں اکثر پڑھا ہوگا۔ کہ امریکہ میں کایا پلٹ علاج کے ذریعہ بڈھے جوان ہوگئے۔ مگر اس قدر گراں علاج ہے۔ کہ غریب تو کجا امیر کی بھی ہمت نہیں پڑتی کہ ایسے علاج سے فائدہ اٹھا سکے۔ اس لئے ہم نے چند مرکب ادویات ایسی تیار کرائی ہیں جو نہایت مجرب زود اثر ارزاں اور بے ضرر ہیں۔ بغرض رفاہ عام پیش کیجاتی ہیں تاکہ ہر شخص فائدہ اٹھا سکے۔

**گنوریا پلز** خواہ پرانا ہو یا نیا سوزش ہو یا جلن۔ پیپ آتی ہو یا ریم سب کو کھو دینے والی ہے۔ اس کے استعمال سے ایک اور فائدہ ہے۔ کہ جب گنوریا کو کسی دوا سے آرام ہو جاتا ہے۔ تو اکثر جریان کی شکایت ہو جاتی ہے ان گولیوں میں یہ خوبی ہے۔ کہ ایک پنتھ دو کاج سوزاک اور جریان دونوں کو مفید اور قیمت ارزاں صرف ۱؎ فی بکس۔ ترکیب استعمال ہمراہ بکس۔

**جریان پلز** جریان آجکل ایک عام مرض ہے۔ کسی کو کم اور کسی کو زیادہ شاید ہی کوئی اس سے بچا ہو۔ جب مرض طول پکڑ جاتا ہے تو زندگی برباد ہو جاتی ہے۔ یہ گولیاں رقت و کثرت احتلام کو کھوتی ہیں۔ سرعت انزال میں رکاوٹ پیدا کرتی ہیں۔ مثانہ معدہ کو قوی کرتی ہیں۔ بھوک خوب لگاتی ہیں۔ اس کے استعمال سے جسم میں توانائی آتی ہے۔ اور خوبی یہ ہے کہ قابض نہیں اور بالکل بے ضرر قیمت صرف ۱؎ فی بکس ترکیب استعمال ہمراہ بکس

**شباب عالم** دنیا میں جوانی عجیب نعمت ہے۔ ہر فرد بشر امیر و غریب اس کا خواہاں رہتا ہے۔ اور ڈھلنے کے بعد ہاتھ ملتا ہے۔ جو اصحاب اپنی قدرتی طاقت بدعنوانیوں کی وجہ سے زائل کر چکے ہوں۔ تو وہ شباب عالم کا استعمال کریں۔ کچھ عرصے میں اعضا رئیسہ میں عجیب طاقت پیدا کر دیتا ہے۔ جوانی پھر پلٹ آتی ہے بالکل بے ضرر ہے۔ قیمت مکمل بکس پانچ روپے ترکیب استعمال ہمراہ بکس۔

**نوٹ** (۱) یہ کمپنی دہلی کی دیگر اشیاء ایک چوتھائی قیمت پیشگی آنے پر بذریعہ وی۔ پی۔ سپلائی کرا سکتی ہے
(۲) اپنا پتہ صاف تحریر کریں۔ تاکہ تعمیل میں دقت نہ ہو۔

**ملنے کا پتہ:- دی فرینڈس جوائنٹ ٹریڈنگ کمپنی لمیٹڈ اجمیری گیٹ دہلی**



# بچوں کی دنیا

## ماہی گیر

محلہ کا بچہ بچہ مصیبت زدہ گلاب سے واقف تھا۔ آدمی اس کو دیکھکر ترس کھاتے۔ عورتیں آتی جاتیں۔ جب کبھی اسکو پریشان حال، کپڑے پھٹے، سیاہ لمبے بالوں کی جٹائیں سینہ اور پیٹ پر بکھریں اپنے گھر کے دروازے میں دیوانہ وار کھڑے یا گلی میں اپنی بڑی بڑی متوحش آنکھوں سے جھانکتے دیکھتیں تو آنسو ضبط نہ کرسکتیں۔

دنیا میں بعض ایسی حرمان نصیب ہستیاں بھی موجود ہیں۔ جن کے لئے زندگی مثل ایک لمبے خوفناک خواب کے ہے۔ جس کے مہیب عذاب سے موت کے بعد روح کی بیداری ممکن ہے۔ نجات دلا سکے۔ ورنہ تو ایسا نظر آتا ہے۔ کہ قدرت نے ان کو پیدا ہی اس لئے کیا ہے۔ کہ زندہ رہیں اور مصیبت اٹھائیں۔

گلاب ایک غریب ماہی گیر کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس کی زندگی کی بے بہا دولت اس کی خوشی کا تنہا مخزن۔ جب وہ شام کو سارے دن کا بھوکا پیاسا۔ کبھی خالی ہاتھ اور

کبھی دو چار مچھلیاں لیکر آتا۔ تو گلاب کو دیکھ کر آنکھیں روشن اور دل پُر نور ہو جاتا۔ بھوک۔ پیاس۔ غربت و فلاکت سب بھول جاتا۔ ایک عظیم الشان سلطنت کا بادشاہ اپنے ملک و مال پر وہ فخر و ناز نہ کرتا ہوگا۔ جسقدر کہ اسکو اپنی گلاب پر تھا۔

اکبر اگرچہ ماہی گیر تھا۔ مگر خاصہ کھاتا پیتا۔ پکی حویلی میں رہتا۔ اس کی اپنی بڑی سی کشتی تھی۔ جس میں بیٹھکر ہر صبح مچھلیاں پکڑنے جاتا۔ چار نوکر اس کے کام میں اس کی مدد کرتے تمام افسر انگریزوں کی کوٹھیوں پر وہی مچھلیاں پہنچاتا۔ ہر روز شام کے وقت جب گلاب اپنے پیارے باپ کو لینے سمندر کے کنارے جاتی۔ اکبر شفق کی رنگین روشنی میں گلاب کا حسین شگفتہ چہرہ دیکھتا۔ یہاں تک کہ اس کو تمام کائنات عالم میں گلاب ہی گلاب نظر آنے لگی۔ جب وہ سمندر میں اپنا جال ڈالتا۔ تو شفاف سمندر کی موجوں میں وہی دو معصوم درخشاں آنکھیں اس کو نظر آتیں۔ جس وقت طوفان خیز ہوائیں چلتیں تو اس قیامت خیز ہنگامے میں اسکو گلاب کے ترنم خیز قہقہے کی آواز آتی۔ عالم سو جاتا اور اکبر بے چین گلاب کے خیال میں پلنگ پر کروٹیں بدلا کرتا۔ آخر کار اس کو معلوم ہونے لگا۔ کہ وہ گلاب کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔

اکبر نے گلاب کے باپ کی سو طرح خوشامدیں کیں۔ اور آخر کار بیٹی دینے پر رضامند کر لیا۔ شادی ہو گئی۔ اکبر پھولا نہ سماتا تھا۔ مگر جلد ہی اس کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ اور محبت نفرت وحقارت سے بدل گئی۔

وہ دل میں کہتا۔ میں نے ناحق ہی اس مفلس و نادار لڑکی سے شادی کی کسی امیر گھر کی بیٹی

بیاہ کرلاتا۔ برادری میں عزت ہوتی۔ لوگ تعریف کرتے۔ ہوتے ہوتے اس کو گلاب سے ایک طرح کی عداوت سی ہو گئی۔ اسکی خدمت و فرمانبرداری بھی ایک آنکھ نہ بھاتی۔ صبح اُٹھتے ہی غریب لڑکی پر گالیوں کی بوچھاڑ شروع کر دیتا۔ قصور ہو یا نہ ہو۔ یہ کیا کچھ کم خطا تھی۔ کہ غریب باپ کی بیٹی تھی شام کو جب وہ دوسری عورتوں کیطرح شوہر کو لینے سمندر پر جاتی۔ تو کشتی ابھی کنارے سے دور ہی ہوتی۔ کہ اکبر نظر پڑتے ہی اس کو بے نقط سنانی شروع کر دیتا۔ چاروں طرف لوگ تماشا دیکھنے جمع ہو جاتے ہر روز یہی منظر ہوتا۔ آگے آگے گلاب روتی ہوئی پیچھے پیچھے اکبر بکتا جھکتا۔ اس کے تمام خاندان پر لعنت بھیجتا۔ وہ اسی پر اکتفا نہ کرتا اور ہر دوسرے تیسرے دن نہایت سنگدلی اور بیدردی سے پیٹتا۔ مار کھاتے کھاتے گلاب کے نازک جسم پر جا بجا نیل پڑ گئے تھے۔ لوگ گلاب کو دیکھکر ترس کھاتے۔ مگر کسکی مجال تھی کہ ظالم شوہر سے ہاتھوں سے اس کو بچا سکتا۔

اسی طرح زندگی کے کئی سال بیت گئے ایک شام سمندر میں بڑا طلاطم تھا طوفان خیز ہوائیں شدت سے چل رہی تھیں۔ جو ماہی گیر مچھلیاں پکڑنے گئے ہوئے تھے۔ ان کے رشتہ دار پریشان حال کنارے پر کھڑے اُنکی واپسی و سلامتی کی دُعائیں مانگ رہے تھے۔ گلاب آج معمول سے زیادہ خوفزدہ تھی۔ وہ ہاتھ میں لالٹین لئے کھڑی اکبر کی آمد کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اسکے غضبناک چہرہ کے تصور سے کانپ اُٹھتی۔ آج اس کی خیر نہ تھی کیونکہ جس دن اکبر کو مچھلیاں پکڑنے میں کوئی خاص دقت پیش آتی۔ موسم خراب ہوتا یا پھر اس کی اپنی طبیعت

درست نہ ہوتی۔ تو گلاب پر چار چوٹ کی مار پڑتی۔

آدھی رات گذر گئی۔ اکبر واپس نہ آیا۔ گلاب غریب رو رہی تھی۔ تمام رات گذر گئی۔ صبح ہوئی تو اکبر کی ٹوٹی ہوئی کشتی کے ٹکڑے لوگوں نے پہچانے۔ اکبر ابھی تک غائب تھا۔ گلاب ایک عرصہ تک اسکی واپسی کا انتظار کرتی رہی کہ ممکن ہے طوفان کی خوفناک موجیں اس کو دور کسی جگہ لے گئی ہوں۔ وہ ہمیشہ کھانا تیار رکھتی۔ کہ کہیں آکر ناراض نہ ہو۔ سب کام درست کر کے اس کی آمد کے انتظار میں بیٹھی رہتی۔ رات کو بھی کئی کئی بار ڈر کر آنکھ کھلتی۔ سوتے سوتے کان میں آواز آتی۔ اور یہ ایکدم ننگے پاؤں بستر سے نکل دروازے کیطرف دوڑتی "اچھا اچھا میں دروازہ کھولتی ہوں"

اب اگرچہ گلاب گھر میں بغیر مرد کے بالکل غیر محفوظ تھی۔ مگر پھر بھی ظاہری طور پر اس کی زندگی پرسکون تھا۔ وہ بیوہ تھی مگر شوہر کے تمام مال واسباب اور مکان کی مالک۔ ایک روز وہ اپنی پڑوسیوں کی صحبت میں بازار گئی۔ ایک شخص طوطا مینا بہت قسم کے جانور بیچ رہا تھا۔ ایک طوطا جس کی قیمت دس روپیہ تھی بڑا مشہور تھا۔ باتیں بڑی بے تکلفی سے کرتا تھا۔ بالکل یوں معلوم ہوتا کہ واقعی کوئی انسان بول رہا ہے۔ دوسری عورتوں نے گلاب سے کہا تم تو امیر آدمی ہو۔ اس طوطے کو خرید لو۔ تمہارا دل بہلایا کرے گا۔ گلاب پہلے تو خاموش ہو گئی۔ مگر پھر طوطا خرید لیا۔ پرندہ بڑا ذہین تھا۔ وضع وضع کی بولیاں بولتا۔ جو کچھ کسی کو کہتے سنتا۔ بالکل اسیطرح نقل اتار دیتا۔ گلاب اس کو بہت پیار کرتی۔ اور اس کے کھانے پینے کا بہت خیال رکھتی تھی۔

ایک روز ابھی بالکل تڑکا ہی تھا۔ گلاب بیخبر سو رہی تھی کہ معاً اس کے کان میں آواز آئی۔

یہ کم بخت منحوس عورت ابھی تک سو ہی رہی ہے" وہ کانپ کر آنکھیں ملتی اُٹھ بیٹھی - پھر آواز آئی اُٹھ جلدی کھانا تیار کر - مجھے بھوک لگ رہی ہے - گلاب نے چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا - اکبر کہیں نظر نہ آیا - مگر وہی الفاظ تھوڑی دیر میں پھر سنائی دئے - گلاب کانپتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی - اور ڈرتے ڈرتے بولی - کیا تم آگئے - ناراض کیوں ہوتے ہو - میں ابھی کھانا تیار کئے دیتی ہوں - میں تو ہر وقت تمہارے آنے کی راہ دیکھا کرتی تھی - گلاب جلد جلدی کھانا تیار کرنے لگی - مگر دل میں حیران تھی کہ اکبر بولتا تو ہے - سامنے کیوں نہیں آتا - اس نے سمجھا کہ شاید یہ بھی ایک نئی طرز ستم ہوگی - پھر آواز آئی " یہ منحوس کام میں دیر لگاتی ہے - اب تو گلاب سے ضبط نہ ہو سکا - اور وہ کھانا چھوڑ ہر طرف اکبر کو تلاش کرنے لگی - سارا گھر ڈھونڈ مارا - اکبر کا کہیں پتہ نہ تھا - گلاب زمین پر بیٹھ کر زور زور رونے لگی - قریب ہی کیل پر طوطے کا پنجرہ لٹکا ہوا تھا - پھر آواز آئی جلدی کھانا پکا - مجھے بھوک لگ رہی ہے - گلاب نے جو آنکھ اُٹھا کر دیکھا - تو دراصل طوطا اس کے گم شدہ شوہر کی بولی بول رہا تھا - گلاب سناٹے میں آ گئی - دل سے ندا آئی دیکھا مرنے کے بعد بھی اکبر کی روح مجھے ستانے کے لئے طوطے کی جون میں آئی ہے - گلاب بھوکی شیرنی کی طرح پنجرے پر جھپٹی طوطے کو کھینچ کر نکالا - اس کے پر نوچ ڈالے - گردن مروڑ کر توڑ دی - ذرا سے پرندے کی اوقات ہی کیا تھی - دم کے دم میں خاتمہ ہو گیا - اب گلاب نے مردہ طوطے کے خون آلود بال و پر کو احتیاط سے کپڑے میں لپیٹا اور جا کر سمندر میں پھینک دی - اس واقعہ کے بعد سے گلاب نیم پاگل ہو گئی - اس کو یقین تھا کہ وہ اپنے شوہر کی قاتل ہے -

اور اب اپنا بدلہ لینے اکبر ضرور کسی نہ کسی شکل میں آئیگا۔ وہ گھنٹوں اپنے گناہ کو یاد کرکے روتی۔ پہروں سڑک پر کھڑی ہر آنے جانے والی شکل کو بہت غور سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا کرتی کہ کہیں اکبر نے اب کوئی اور نیا قالب اختیار نہ کر لیا ہو۔ ہر نئے شخص سے اکبر کی بابت دریافت کرتی۔

پروسیو نکی تمام ہمدردی، سب سمجھانا اور تسلی دینا بیکار ثابت ہوتا تھا۔ اس کی زندگی ایک مسلسل بیتابی تھی۔ سکون سے ناآشنا، عافیت سے دور۔ اس طرح اکبر موت کے بعد بھی اس کو سزا دے رہا تھا۔

# عام فہم سائنس

## بجلی کی چمک اور بادل کی گرج

بجلی جب چمکتی ہے۔ تو کرہ ہوائی میں گرج بھی اس کے ساتھ ہی پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے یہ دیکھنا ضروری ہے۔ کہ کرہ ہوائی میں کون سی تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ جس کے سبب چمک اور گرج پیدا ہو گی۔ پانی سمندروں دریاؤں وغیرہ سے ہر وقت بخارات بنتا رہتا ہے۔ جب یہ بخار پانی کو چھوڑ کر الگ ہوتا ہے۔ تو سائنس کے قاعدے کے مطابق اس میں ایک قسم کی بجلی ہوتی ہے اور پانی میں دوسری قسم کی۔ اب یہ بجلی سے بھرا ہوا آبی بخار اوپر کو چڑھتا ہے تو ایک اصول یہ بھی ہے۔ کہ جب ہوائیں چڑھتی ہیں تو ان میں درختوں اور عمارتوں سے رگڑنے کے سبب بجلی پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسرا

ہوائیں چڑھتی ہیں تو ان میں آپ سے آپ بجلی پیدا ہو جاتی ہے۔ گویا اس طرح سے ہوا ہر وقت بجلی سے پر (current) رہتی ہے۔ اگرچہ اسکی ولٹیج (voltage) بہت ہی قلیل ہوتی ہے۔

یہ گرم ہوا جس میں بخارات آبی ہوتے ہیں۔ اب کرۂ ہوائی کے طبقات میں پہنچتی ہے جو کہ ٹھنڈے ہیں اس کا درجۂ حرارت کم ہو جاتا ہے۔ سرد ہوا بہت کم مقدار آبی کو اپنے اندر جذب کر سکتی ہے۔ اس لئے بخارات آبی کا کچھ حصہ جم کر ننھی ننھی بوندیں بنجاتا ہے۔ جن کو ہم بادل کہتے ہیں۔ تو گویا یہ بادل بجلی سے بھی پر ہیں۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہ بادل جن میں بجلی چمکتی ہے۔ زمین سے بہت بلند ہوتے ہیں اور ان کا حجم بھی بہت زیادہ ہوتا ہے۔ بعض دفعہ ایسا بادل نیچے سے لیکر چوٹی تک ۲ میل اونچا ہو سکتا ہے۔ لمبائی۔ چوڑائی بھی بہت وسیع۔ یہ حجم بہت بڑا ہے۔ اس کے جو حصے زمین کے قریب ہوتے ہیں۔ ان کا درجہ حرارت زیادہ ہوتا ہے۔ اس لئے ان میں مقدار آبی زیادہ جذب ہو سکتے ہیں۔ اس بادل کے بلند طبقات پر بخارات آبی کا زیادہ حصہ جم کر ننھی ننھی بوندیاں بنجاتا ہے۔ اسطرح بجلی کی زیادہ مقدار بخارات سے نکل کر ان بوندوں پر ظاہر ہو جاتی ہے۔ تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ اس بلند اور وسیع بادل کے تلے میں اوپر اور نیچے کے حصوں کا ولٹیج یعنی فشار برقی مختلف ہوتا ہے۔ آخر کار ولٹیج میں یہ تفاوت اتنا بڑھجاتا ہے۔ کہ وہ بادل کے لئے ناقابل برداشت ہوجاتا ہے اور اوپر کے حصوں سے کچھ بجلی نیچے کیطرف دوڑ کر آتی ہے۔ تاکہ برقی فشار کو برابر کردے قاعدے کی رو سے بجلی ہمیشہ یہی چاہتی ہے کہ اس کا فشار جہاں تک ممکن ہے۔ برابر رہے۔ اس زیرین

اور بلند طبقات کی بجلیوں کے ملنے سے چمک پیدا ہوتی ہے۔ جسے ہم بجلی کا چمکنا کہتے ہیں۔ اور اُسی وقت گرج کی آواز بھی پیدا نکلتی ہے۔

اب بادل کے گ ہے یعنی رعد کے متعلق بھی سن لیجئے گا۔ بجلی دو قسم کی ہوتی ہے۔ مثبت اور منفی۔ ان دونوں کے آپس میں ملنے سے چمک پیدا ہوئی گرمی بہت مقدار میں اس میں سے نکلی۔ کچھ ہوا کے ذرات جل گئے۔ ان کا حجم بہت زیادہ بن گیا۔ اور جس طرح بارود کا گولہ اسلئے پھٹتا ہے۔ کہ آگ لگنے پر گیسیں جو بنتی ہیں۔ وہ بہت زیادہ حجم گھیرتی ہیں۔ اسی طرح سے یہاں بھی بجلی سے جلے ہوئے ہوا کے ذرات بہت زیادہ جگہ گھیرتے ہیں۔ زور سے ایک دھماکے کی آواز ہوتی ہے یوں معلوم ہوتا ہے۔ جیسا کہ گولہ پھٹا۔ اسے ہم بجلی کی کڑک کہتے ہیں۔ یہ سب کچھ سیکنڈ کے ایک چھوٹے سے حصہ میں ہو جاتا ہے۔ رعد یا گرج کے اسقدر خوفناک سنائی دینے کا سبب ایک اور ہے۔ چاروں طرف آسمان میں بادل چھائے ہوتے ہیں۔ جب بجلی کی کڑک پیدا ہوتی ہے۔ تو اس آواز کا انعکاس مختلف بادلوں کی سطحوں سے ہوتا ہے۔ اور وہ ایک بہت لمبی گرج کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یہ انعکاس پہاڑ کی دیواروں وادیوں اور بلند عمارتوں سے بھی ہو سکتا ہے۔

(باقی آئندہ)